www.Paksociety.com
MAY 2011
ماہنامہ
کرن
اس شمارے کے ساتھ
کرن کتاب
سبزیوں کے پکوان
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
www.paksociety.com
Scan & PDF
WWW.PAKSOCIETY.COM

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

مستقل سلسلے

مئی 2011
جلد 34 شمارہ 2
قیمت 50 روپے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ) ------ 600 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ------ 4000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ------ 5000 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔
پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: khawateendigest@hotmail.com , info@khawateendigest.com

اداریہ

منیرہ

مئی کا کرن آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

صبح و شام موت و زندگی کا کھیل جاری ہے اور جاری رہے گا۔ جس نے زندگی کا لطف اٹھایا ہے وہ موت کا ذائقہ ضرور چکھے گا۔ مگر اجل کے مسافروں کے انداز جدا جدا ہوتے ہیں۔ بعض جانے والے اپنے پیچھے کچھ نہیں چھوڑتے اور بہت سے آخری سفر پر جانے والے اپنی یادوں اور اپنی جدوجہد کی طویل داستان چھوڑ جاتے ہیں۔

محمود ریاض صاحب بھی ایسی ہی ہمہ گیر شخصیت تھے۔ اُن کی پہلو دار شخصیت میں بہت ہی خوبیاں یکجا ہوگئی تھیں۔ انہوں نے بہت کم عمری میں ہی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ زندگی میں بہت سے کٹھن مقامات سے گزرے اور ان حالات کا بڑے وقار، ہمت اور حوصلے سے مقابلہ کیا۔

محمود ریاض صاحب 10 مئی کو ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئے تھے۔ ان کو ہم سے بچھڑے دس برس گزر گئے۔ اُن کے جانے سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ کبھی پُر نہیں کیا جا سکتا۔ محمود ریاض صاحب جیسے لوگ کبھی بھلائے نہیں جا سکتے۔

قارئین سے التماس ہے کہ وہ محمود ریاض صاحب کی مغفرت کے لیے دُعا کریں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، اور انہیں جنت الفردوس میں اعلا مقام سے نوازے۔ (آمین)

اس شمارے میں،

- بیادِ محمود ریاض،
- اداکارہ "روز کمالی" سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اداکارہ "مہگن کاظم"، قارئین کی عدالت میں،
- "مجھ سے ملیے" میں "آمنہ ریاض" کی باتیں،
- اداکارہ "صائمہ قریشی"، دو کے پہاڑے کے ساتھ،
- "پیا کا گھر پیارا لگے" میں "شاد ریحان اسدی" کے گھر کی باتیں،
- ایف ایم 93 کی آر جے "ردا"، کی نایاب جیلانی سے گفتگو،
- "دستِ کوزہ گر"، فوزیہ یاسمین کا سلسلے وار ناول،
- "دردِ دل"، نبیلہ عزیز کا سلسلے وار ناول،
- "عشق آتش"، سعدیہ راجپوت کے طویل مکمل ناول کی آخری قسط،
- "برگ زرد"، آصفہ عنبرین قاضی کا مکمل ناول،
- "گوری کرت سنگھار"، نبیلہ عزیز کا مکمل ناول،
- "بخت آور" روشنی بخاری کا دلچسپ ناولٹ،
- صبا احمد، نازیہ جمال، الماس یاسین، عاصمہ ریاض اور شاہدہ ملک کے افسانے اور مستقل سلسلے،

مفت،

کرن کتاب "سبزیوں کے پکوان"، کرن کے ہر شمارے کے ساتھ مفت حاصل کریں۔

حمد باری تعالیٰ

وہ ذاتِ اقدس جو رونقِ منزل عما ہے وہی خدا ہے
وہ پاک ہستی جو میری سوچوں سے ماورا ہے وہی خدا ہے

وجود ہے بے مثال جس کا، یہ بزمِ کن ہے کمال جس کا
جو اس کا سارا نظام تنہا چلا رہا ہے وہی خدا ہے

چمن، دمن، پھول، پھل، شجر کیا، شفق، دھنک، چاندنی، گہر کیا
جو شان اپنی ہر ایک شے میں دکھا رہا ہے وہی خدا ہے

صفات جس کی ہیں جاودانی، نہ جس کا ہمسر نہ جس کا ثانی
جو اپنی قدرت سے جان مٹی میں ڈالتا ہے وہی خدا ہے

جو میری شہہ رگ کے بھی قریں ہے، جو میری نس نس میں جاگزیں ہے
جو ہر گھڑی میرے ساتھ رہتے ہوئے جدا ہے وہی خدا ہے

جسے علیم و خبیر کہیے، جسے سمیع و بصیر کہیے
جو سب کی حالت کو دیکھتا اور جانتا ہے وہی خدا ہے

لبوں پہ ہے جس کا نام جوہر، ہوں دل سے جس کا غلام جوہر
وہ مجھ میں رہ کر مری نظر سے چھپا ہوا ہے وہی خدا ہے

جاوید رسول جوہر

نعت رسول مقبول

ایسے کہاں نصیب جو جانا نصیب ہو
دیدارِ روضہ پاک کا پانا نصیب ہو

پرنم ہے چشم، چشم کی ہے آرزو یہی
خاکِ درِ رسول ﷺ لگانا نصیب ہو

اے کاش جو مدینے کی گلیوں میں ہو گزر
آنکھوں سے بحرِ اشک بہانا نصیب ہو

فرقت میں آپ کی جو گزاری ہیں رات دن
اک اک گھڑی کا حال سنانا نصیب ہو

ہو جاؤں خوش نصیب زیارت جو ہو نصیب
برباد دل کو کوئی ٹھکانا نصیب ہو

پہنچا دے مجھ کو میرا مقدر جو روضہ پر
یارب نہ لوٹ کر مجھے آنا نصیب ہو

جاؤں میں پھول گجرے مضطر لیے ہوئے
روضہ پہ کاش پھول چڑھانا نصیب ہو

مضطر بخاری

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ محمود ریاض صاحب نے عملی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا، وہ روزنامہ "امروز" میں کالم لکھتے تھے امروز کا شمار اس وقت سنجیدہ اور باوقار روزناموں میں ہوتا تھا اور صحافتی دنیا میں اس کا بڑا مقام تھا پانچ، چھ سال تک وہ اس اخبار میں کالم لکھتے رہے۔ ماہنامہ کرن کا اجرا ہوا تو محمود بابر فیصل کے اصرار پر ریاض صاحب نے "بات سے بات" کے عنوان سے کالم لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ لیکن اس وقت جو سیاسی حالات تھے ان کو دیکھتے ہوئے قدرت اللہ شہاب نے ریاض صاحب کو محتاط رہنے کا مشورہ دیا چنانچہ یہ سلسلہ زیادہ دیر جاری نہ رہ سکا۔

ذیل میں محمود ریاض صاحب کا کالم دیا جارہا ہے۔ یہ کرن میں شائع ہوا تھا۔

بیادِ محمود ریاض

بات سے بات

محمود ریاض

کہتے ہیں کہ دنیا کا سب سے بڑا جھوٹ یہ ہے کہ ایک جگہ دو عورتیں بیٹھی تھیں...... خاموش؟

پچھلے دنوں عورتوں کا ایک وفد کراچی اور کراچی کے مضافات سے میرے پاس آیا کہ عورتوں پر یہ سراسر تہمت ہے۔

آپ تو عورتوں کی بات کرتے ہیں ہم نے ایک مرد کو بھی خاموش کبھی نہیں دیکھا۔

اس وفد میں ایک نے تو مثال بھی دے ڈالی۔

ہم دو لڑکیاں جارہی تھیں کہ کھمبے کے ساتھ کھڑا مرد اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔

"کوڑوں کا ڈر نہ ہوتا تو چھیڑتے۔"

ایک اور جگہ سے گزر ہوا تو ایک صاحب بولتے جارہے تھے "موسم کی سی چال ہے۔"

اور بھی بہت سی مثالیں وفد نے دیں۔ اور انہوں نے ثابت کر دکھایا کہ مرد بھی خاموش نہیں بیٹھتے۔ چاہے ایک جگہ پر ایک ہی کیوں نہ ہو۔

تو آئیے بات شروع کریں۔ تاکہ بات سے بات پیدا [illegible]

[illegible]

مشورہ بھی دیا تھا کہ اس بار ایک سے بات نہ پھیلاؤ بلکہ اس صفحے کو خالی چھوڑ دو۔ پھر تم دیکھنا کہ اس خالی صفحے کو دیکھ کر قاری بہنیں کتنا خوش ہوتی ہیں، کس طرح ہاٹ کیک کی طرح بکتا ہے۔ ہاٹ کیک کا محاورہ انگریزوں کا ایجاد کردہ ہے۔ اردو والے ٹھنڈے کیک سے بھی گزارا کرلیتے ہیں۔ اور تمہارا پرچہ کس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ بابر صاحب کو [illegible] میری اس بات کے جواب میں خاموش [illegible] لیکن بقول عورتوں کے یہ مرد خاموش نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ بابر صاحب بھی خاموش نہ رہے۔ فوراً پوچھا۔

"کیا فائدہ؟"

"فائدہ! بھئی یہ کیا کم فائدہ ہے کہ یہ کالم نہیں پڑھنا پڑے گا۔ اس صفحے پر پسندیدہ اشعار لکھے جاسکتے ہیں۔ ٹی وی کے پروگرام نوٹ کیے جاسکتے ہیں۔ کھانا پکانے کی ترکیبیں بھی نوٹ کی جاسکتی ہیں۔ اس کے لیے الگ کاپی کی ضرورت نہ پڑے گی۔"

بابر صاحب بولے۔ "کھانا پکانے کی ترکیبیں ہمارے پرچے میں چھپتی ہیں اور ٹی وی والے اتنے بور پروگرام دیتے ہیں کہ ہم نے اپنا ٹی وی بیچ دیا ہے ایک بھوسی ٹکڑے والے کے ہاتھوں۔"

آج کل صبح ہی صبح اخبار اٹھاؤ تو اس قسم کے اشتہاروں پر نظر پڑتی ہے۔

☆ سونے کی کان کا نیلام
☆ اپنی رقم دگنی کرلیں۔
☆ اپنا گھر اپنی جنت۔
☆ ستاروں سا حسن بخش صابن۔
☆ پیٹ بڑھالو چربی چڑھالو۔
☆ کپڑے چمکیں جیسے تارے۔
☆ روپ نکھارے حلیہ سنوارے۔
☆ رنگ گورا کرنے والی کریم۔

[illegible]

اب بتائیں اس میں ہمارا شمار چالیس میں ہوتا ہے یا ایک میں......

ان اشتہاروں میں سب سے زیادہ جس اشتہار سے ہمیں دلچسپی پیدا ہوئی۔ وہ رقم دگنی کرنے کا ہے۔ ہم نے اپنے بینک والی رقم... 172 روپے کو فوراً" دو سے ضرب دے لی لیکن اشتہار کے باقی مضمون کو پڑھ کر ہمارے ارمانوں پر اوس پڑ گئی... یہ کچھ دکانوں، مکانوں کے اشتہار تھے اور رقم بھی 172 روپے سے زیادہ درکار تھی۔ ایسے میں ہمیں وہ پیر فقیر یاد آگئے جو رقم دگنی کرنے کے لیے کوئی شرط نہیں لگاتے۔ اور اس وقت تک رقم دگنی کرتے رہتے ہیں، جب تک پکڑے نہ جائیں۔

دوسری قسم کے اشتہار فلیٹوں اور بنگلوں کے ہوتے ہیں...

ہمیں ایک ایک بنگلہ یا ایک ایک فلیٹ دینے کے لیے ہر اشتہار والے مصر نظر آتے ہیں۔

بنگلوں کی خوب صورت تصاویر، پھول، پودے، درخت... اور کار کبھی کبھی کسی خاتون کو بھی کھڑا کر کے ہمیں پھانسنے کے پروگرام بنائے جاتے ہیں۔

لیکن ہم تو راہ چلتی خواتین کو دیکھ کر آنکھیں بند کرلیتے ہیں

بلکہ اسی چکر میں بوہری بازار میں ایک مہ جبیں سے بھی... جا ٹکرائے۔

اس نے غصے سے پوچھا۔ "اندھے ہو۔"

ہم نے کہا۔ "شاید نہیں۔"

"پھر مجھ سے اس طرح کیوں آ پکڑا ہے۔"

ہم نے کہا۔ "دراصل راہ چلتے ہم نامحرم عورتوں کو نہیں دیکھتے۔ ایمان کمزور ہوتا ہے۔ آنکھیں بند کر کے چلتے ہیں......"

بنگلوں اور فلیٹوں میں خواتین دکھانے والوں کی خدمت میں عرض ہے کہ وہ ہمارا ایمان اور خراب کرنے کی کوشش نہ کریں۔

وہ تو پہلے ہی سے خاصا خراب چلا آرہا ہے....

آخر میں، بہن سلمیٰ کے نام خط کا جواب ہے۔

بہن سلمیٰ؟

یہ تم نے رنگ گورا کرنے کی ترکیب پوچھی ہے۔ سچ سچ بتادو کہ یہ ترکیب تمہارے لیے ہے یا دولہا بھائی کے لیے؟ اگر ہمیں یہ ترکیب معلوم ہوتی تو ہمارا رنگ کیوں کالا ہوتا خود کریم بنانے والوں کے بچے کلوے کیوں پھرتے۔

ایک شخص مہرباں سا

سمیحہ عنبرین آفریدی

جبران نے کہا۔ ”تم میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے پاس کم ہوتا ہے، لیکن وہ سب دے دیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو زندگی پر یقین رکھتے ہیں اور زندگی کی سخاوت پر یقین رکھتے ہیں اور ان کا صندوق کبھی خالی نہیں ہوتا۔“

پہلے جبران کے اس خوب صورت جملے کا عقدہ مجھ پر نہیں کھلا تھا جیسے کہ اب آج ظاہر ہوا ہے۔

ریاض صاحب میرے لیے ایک عمارت کی پہلی اینٹ تھے، وہ اینٹ جس کے ہونے پر ہی عمارت تعمیر ہوتی ہے اور جو نہ ہو تو عمارت ڈھیر کے سوا کچھ نہیں رہتی۔ ریاض صاحب کے اس سفر کو جب میں ایک طالب علم کی حیثیت سے دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں، زندگی جہد مسلسل کیسے ہوتی ہے کیونکہ ایک نقطے سے ایک خوب صورت تصویر میں ڈھل جاتی ہے، ایسی مکمل تصویر جس میں رنگ نہ شوخ ہوں نہ مدھم، سفید لمحوں میں رنگ بھرنا آسان کام نہیں اور ریاض صاحب مشکل کاموں سے گھبرانے والے انسان نہیں تھے، ان کی ایک ہی سوچ تھی کہ زندگی میں کچھ کر دکھانا ہے۔

لگن تھی کہ انہوں نے اس زمانے میں ”خواتین ڈائجسٹ“ کا اجرا کیا۔ جب خواتین رسالوں کے کچھ گنے چنے نام ہی تھے اور خواتین کے لیے چھپنے والے پرچوں کا کچھ اتنا زیادہ اسکوپ نہیں تھا، مگر انہوں نے ہمت کی اور اس میدان میں اتر آئے یوں قافلے سے قافلہ بنتا گیا۔ محبتوں کی چراغ اندھیرے راستوں کو روشنی دکھاتے چلے گئے۔ یہ سفر شروع ہوا تو رکا نہیں تھا۔ ریاض صاحب جانتے تھے سب دے دینا کیا ہوتا ہے، کیا معنی رکھتا ہے۔ سب دینے کا مطلب ہے آپ اپنا آپ فنا کردیں، کیونکہ خود اپنی ذات کی نفی کیے بغیر آپ کبھی کسی کو سچی خوشی نہیں دے سکتے اور انہوں نے یہ کٹھن کام کیا ہے۔

یہ ان کی ذات کی سخاوت تھی کہ انہوں نے محبت دونوں ہاتھوں سے بانٹی، یہ ان کا زندگی پر یقین تھا کہ زندگی حرارت، محبت اور لطف کا دوسرا نام ہے اور انہوں نے اسی زندگی کے یقین کو آگے بڑھایا۔

لوگ کہتے ہیں انسان مرجائے تو اس کا عمل رک جاتا ہے، اس کی ذات کی جزا ختم ہوجاتی ہے، مگر میں سمجھتی ہوں اگر انسان کے لفظ زندہ رہیں، عمل زندگی کے بعد بھی جاری رہے، اس کے لفظوں میں اس کے بعد بھی کچھ سیکھنے کا سفر جاری رہے تو یہ ایسی دعا ہے جسے جزا کے اثر نے جکڑ لیا ہو۔ ایسی جزا جو دعا ہو مسلسل سفر میں ہو اور ریاض صاحب ایسی ہی شخصیت تھے، ان کے الفاظ، ان کا عمل سب ان کی بعد بھی جاری ہے۔

جو کونپل انہوں نے ”خواتین ڈائجسٹ، شعاع اور کرن“ کی صورت میں لگائی تھی، اس نے تناور درخت کی صورت اختیار کرلی۔ کونپل سے نئی کونپل پھوٹتی چلی گئی۔

لوگ آج بھی اس سایے دار درخت کے نیچے اپنے خیالات کی ٹینشن سے کچھ لمحے کے لیے دور چلے جاتے ہیں اور علم کا ایک ذخیرہ ہے جو مستقل سلسلوں کی صورت میں ذوق کو تسکین دیتا ہے۔ ہر ماہ ان کے یہ پرچے جو جہاں پڑھتا ہے، ان کے لیے یقیناً ”دعائے خیر“ ضرور کرتا ہے۔

دعائے خیر جو زندگی میں زندگی کے لیے بہت بڑا سرمایہ ہے۔

یہی دعائے خیر جو ان کی زندگی میں ان کی خوشیوں کے لیے کی جاتی تھی اور آج یہ ہی دعائے خیر ان کے جنت میں درجات بلند کرنے کے لیے مانگی جاتی ہے۔

ان دعاؤں کا سلسلہ دراز ہے، ان کی ہاتھ بھر بھر کر کی جانے والی سخاوت آج بھی جاری ہے۔ کچھ دلوں میں وہ واقعی تاابد زندہ رہیں گے، وہ کچھ لوگ ان کے گھر والے بھی ہیں اور وہ لوگ بھی جو انہیں ان کے پرچوں کی بدولت اپنے گھر کا ایک فرد سمجھتے تھے۔

یہ فہرست بہت طویل ہے اور امنگ کا یہ جہاں دراز ہے۔

خواب دیکھنے والی آنکھیں آج بھی ان کی ذات کو اپنے لیے رول ماڈل سمجھتی ہیں۔

اور دل والے، کبھی ان کی بے لوث محبت کو بھلائے نہیں بھولیں گے۔

اللہ تعالیٰ ان کے اس سفر کو جاری رکھے اور ان کی قبر پر دعاؤں، محبتوں کے پھول یوں ہی کھلاتا رہے۔

اللہ تعالیٰ ایسے لوگ بہت کم پیدا کرتا ہے جو ایک نئی سوچ کا بیج بوئیں اور اس سوچ کی آبیاری کریں۔ اپنا وقت، اپنی توانائی خرچ کریں اور صلے کی پھر بھی تمنا نہ رکھیں۔ ایسے لوگوں کو جتنا سراہیں کم ہے۔

جتنی زیادہ انہوں نے علم اور علم والوں سے محبت کی، میری دعا ہے اللہ تعالیٰ ان سے بھی اتنی ہی محبت کرے۔ (آمین)

☼ ☼

رزکمالی سے ملاقات

شاہین رشید

اب راتوں رات شہرت حاصل کرنے والا دور گزر گیا ہے۔ اب شہرت بہت محنت سے کام کرنے کے بعد حاصل ہوتی ہے اور وجہ صرف یہ ہے کہ چینلز کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ تعداد میں ڈرامے بن رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے مقابلے کا رجحان بڑھ گیا ہے۔ اور یہ بڑی بات ہے کہ اتنے مقابلے میں کوئی اپنی پہچان کروالے۔

رزکمالی بھی ایک ایسی ہی فنکارہ ہیں جنہوں نے اپنی صلاحیتوں کی بدولت الگ پہچان کروائی ہے آج کل آپ انہیں ڈرامہ سیریل "مدہوش" جو کہ ٹی وی ون سے پیش کیا جا رہا ہے اور "سمدھن" جو کہ ہم ٹی وی سے پیش کیا جا رہا ہے میں دیکھ رہے ہیں۔ ان سے ہوئی گفتگو نذر قارئین ہے۔

★ "کیسی ہیں..... اور آپ کا نام رز کچھ زیادہ ہی مختصر نہیں ہے کیا؟"

✱ "نہیں..... نام تو میرا "رووانہ" ہے جو کہ ایک عربی نام ہے چونکہ میں ابوظہبی میں پیدا ہوئی ہوں اور میری بنیادی تعلیم بھی شیخ زاید اسکول میں ہوئی تو وہاں میرے جتنے بھی دوست اور اساتذہ تھے تو وہ مجھے رووانہ (رضوانہ) ہی کہتے تھے تو وہاں مختصراً" مجھے رو کہتے تھے یہاں آئی تو سب نے رز کہنا شروع کر دیا۔ تو یہ ہے رزکمالی کی کہانی۔"

★ "آپ ماشاء اللہ کافی اچھا پرفارم کرتی ہیں اور میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ زیادہ تر نگیٹو رول کرتی ہیں جیسے کہ آج کل سیریل سمدھن چل رہا ہے؟"

✱ "نہیں ایسی بات نہیں ہے کہ میں زیادہ تر نگیٹو کرتی ہوں ابھی حال ہی میں میرا ڈرامہ سیریل "صندل" ختم ہوا ہے اس میں بھی پوزیٹو رول تھا اور "مدہوش" میں بھی پازیٹو رول ہے اور سمدھن کے رول کو بھی آپ نگیٹو نہیں کہہ سکتیں۔ اگر کردار کا بیک گراؤنڈ دیکھیں تو اس میں وٹے سٹے کی شادی ہونی تھی اور ایک لڑکی جس کو چار پانچ سال یہی کہا جائے کہ تمہیں اس گھر میں جانا ہے اور پھر لڑکا اچانک کسی اور جگہ شادی کرلے تو لڑکی یا تو بہت زیادہ ٹوٹ جاتی ہے یا پھر اس میں بدلے یا انتقام کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ بہت قدرتی ردعمل ہے۔"

★ "ہمارے ڈراموں کا عام زندگی پر اثر ہوتا ہے یا یہ ہماری زندگی کے قریب ہوتے ہیں؟"

✱ "جی بالکل جو کردار ہم کر رہے ہوتے ہیں وہ ہماری عام زندگی سے ہی ہوتے ہیں۔ ہمارے اردگرد ہی ہوتے ہیں اور اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب سمدھن آن ایئر ہونے کے بعد ایک ڈرامے کی شوٹ کے لیے میں مارٹن کوارٹر گئی تو وہاں ایک ہی گھر میں تین بھابھیاں اکٹھی رہتی تھیں جب لنچ ٹائم ہوا تو بیچ والی بھابھی میرے پاس آئیں اور کہنے لگیں کہ آپ سمدھن میں جو کردار کر رہی ہیں وہ بالکل ویسا ہی ہے جیسے میری چھوٹی بہن کی زندگی میں ہوا ہے۔ میرے دیور کے ساتھ اس کی بات پکی ہوئی تھی گزشتہ دو ڈھائی سال سے مگر دیور نے کسی اور کو پسند کر کے شادی کرلی اب میری بہن کہتی ہے کہ میں نہیں اور شادی نہیں کروں گی کروں گی تو بس اس بندے کے ساتھ اور وہ ابھی سمدھن ڈرامہ شوق سے دیکھتی ہے۔"

★ "مگر ایسے کردار نجی زندگی پر بھی بہت اثر انداز ہوتے ہیں۔ ایسے میں اگر آپ کا رشتہ آجائے تو؟"

✱ "اب اس بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتی لیکن میرے ڈراموں کا رسپانس بہت اچھا رہا ہے اور میں کہیں بھی چلی جاؤں لوگ پہچان کر سوالات پوچھتے ہیں اور میرے کرداروں کا ذکر کرتے ہیں۔"

★ "اور آج کل کیا مصروفیات ہیں؟"

✱ "تین پروجیکٹ ایسے ہیں جو بہت اچھے ہیں جو آن ایئر ہوں گے تو آپ ضرور دیکھیے گا۔ مدہوش تو آن ایئر ہے۔ پھر عالیہ امام کا ایک سوپ کر رہی ہوں جو کہ سو اقساط کا ہے اور بہت اچھا ہے اور میرا خیال ہے کہ ٹی وی ون سے آن ایئر ہوگا۔

اسی طرح ایک اور سوپ جو سو اقساط کا ہوگا اسے نعیم خان کر رہے ہیں اور بابر جاوید کی پروڈکشن میں "اختر حسنین کی پروڈکشن میں "تین ملہار" کر رہی ہوں جو ورلڈ کپ کے بعد پی ٹی وی سے آن ایئر ہوگا۔ "جلتی ہاش" کے نام سے ہی اختر حسنین کی ایک اور پروڈکشن ہے اس میں بھی میں ہوں۔ ماشاء اللہ بہت سارے کام ہیں جو کہ میں کر رہی ہوں اور سب آن ایئر ہوں گے ایک کے بعد ایک سب میں میرے اچھے رول ہیں۔"

★ "آپ کو کون سے کردار پسند ہیں؟"

✱ "وہ کردار جو ایک عام لڑکی سے تعلق رکھتے ہوں پسند ہیں۔ ڈرائنگ روم اسٹائل والے کردار مجھے پسند نہیں۔ جس میں اسٹارپلس والا انداز نہ ہو کہ باتیں شروع ہوتی ہیں۔ لاکھوں سے کروڑوں سے۔ ایسے کردار بالکل بھی پسند نہیں لیکن پھر بھی نہ چاہتے ہوئے بھی ہم یہ کردار کر رہے ہوتے ہیں..... تو مجھے ایسے کردار پسند ہیں جو عام زندگی کے قریب ہوں جیسے کہ میں نے ڈرامہ سیریل "رشتے محبتوں کے" میں کیا اور اس میں نگیٹو سے پوزیٹو کردار تھا میرا اور بہت اچھا رول تھا اور اس کو میں نے بغیر میک اپ کے کیا تھا۔ اور جب میں کوئی کردار بہت ڈوب کر کرتی ہوں تو مجھے خود بھی مزا آرہا ہوتا ہے۔"

★ "شوبز میں آمد کیسے ہوئی؟"

✱ "شوبز میں آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا کوئی شوق بھی نہیں تھا میں نے ہوسٹنگ سے شروع کیا اور کچھ

اس طرح کہ ایک ٹاک شو میں اپنے انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے گئی تھی اور وہاں مجھے ڈیبیٹ کرنی تھی اور چونکہ موضوع اچھا تھا تو تقریر بھی اچھی ہو گئی چنانچہ وہاں مجھے ہوسٹنگ کی آفر ہوئی اور ایک ٹیلی فلم کی بھی آفر ہوئی ہوسٹنگ کے لیے میں راضی ہو گئی فلم کے لیے میں نے منع کردیا۔ چونکہ ان دنوں چھٹیاں تھیں تو میں نے اے آر وائی کے ایک شو میں جس میں سات کیمرے لگے ہوئے تھے وہ میں نے ہوسٹ کیا' پھر پی ٹی وی کا مارننگ شو کیا اور اس کے بعد مجھے ڈراموں میں کام کرنے کی آفر ہوئی اور انجم شہزاد رمضان المبارک کے لیے ایک سیریل کر رہے تھے۔ اس سیریل سے میں نے اسٹارٹ لیا بس پھر ایک کے بعد ایک آفر ہوتی گئی اور میں کرتی گئی۔"

★ "یعنی آپ نے ہر آفر کو قبول کیا؟"

✻ "نہیں ایسا نہیں ہے۔ میں بہت محدود کام کرتی ہوں' ہر پیشکش کو قبول نہیں کرتی اچھے لوگ ہوں اچھا کام ہو تو کرتی ہوں اور پھر میں روپے بھی دیکھتی ہوں کہ کتنے ملیں گے۔"

★ "کتنے سال ہو گئے اس فیلڈ میں اور گھر والوں نے پسند کیا یا اعتراض کیا کہ یہ فیلڈ اچھی نہیں ہے مت کرو؟"

✻ "مجھے تقریباً" ڈھائی سال ہو گئے ہیں اس فیلڈ میں اور مجھے گھر والوں کی طرف سے کوئی پرابلم فیس نہیں کرنی پڑی۔ اگر گھر والے کہتے کہ نہیں تو میں کبھی بھی اس فیلڈ میں نہ ہوتی' کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ ماں کا ساتھ دینا اس کی رضامندی حاصل کرنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ میری ممی اگر کسی بات میں ہاں کرتی ہیں تو میں وہ کام کرتی ہوں ورنہ نہیں۔ خواہ کوئی چھوٹے سے چھوٹا معاملہ ہو یا بڑے سے بڑا کوئی کام ہو' حد تو یہ ہے کہ اگر میں اپنی پسند کے کپڑے لے آؤں اور وہ کپڑے میری ماں کو پسند نہیں آئے تو میں وہ کپڑے واپس کر آتی ہوں اور امی کی پسند کے لے کر آتی ہوں۔"

★ "گھر والوں کی اجازت ہو تو پھر کام بھی اچھا ہوتا ہے ایسا ہی ہے نا؟"

✻ "جی بالکل ایسا ہی ہے اور میرے ابو میری ہوسٹنگ کو پسند کرتے ہیں اور ممی اداکاری اور ہوسٹنگ دونوں کو پسند کرتی ہیں اور دونوں اچھی خاصی تنقید بھی کرتے ہیں کہ یوں نہیں یوں کرو وغیرہ وغیرہ تو میں سمجھتی ہوں کہ یہ ایک آرٹ ورک ہے ایک کریٹو ورک ہے اور میری امی بھی یہی کہتی ہیں کہ اگر میری بیٹی میں صلاحیت ہے تو وہ ضرور کام کرے لیکن ایک حد میں رہ کر اور سب کو اپنی حدود میں رہ کر کام کرنا چاہیے اور مجھے اور میرے بھائی کو اس کا اندازہ ہے۔"

★ "آپ نے بتایا کہ جیو سے پہلا سیریل کیا تھا' کیا نام تھا اور شہرت کس نے دی؟"

✻ "پہلا چاند" رمضان المبارک میں ہوا تھا اور اے آر وائی سے جو ایک گیم شو ——— تھا... اور پی ٹی وی کے مارننگ شو میں "لباس" کے نام سے ایک سیگمنٹ کیا کرتی تھی اسے بھی لوگوں نے بہت زیادہ پسند کیا تھا۔ ایک سٹ کام کیا تھا "ہائے محبت" کے نام سے جو کہ آج ٹی وی سے ٹیلی کاسٹ ہوا تھا میرے شروع کے کام سے لے کر آج تک کے کاموں کو لوگوں نے بہت پسند کیا اور میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ کسی ایک پروگرام نے مجھے شہرت دی "میری ذات ذرہ بے نشاں" "بار" "دوراہا" اور کاظم پاشا کے عید پلے سب نے مجھے شہرت دی۔"

★ "معاوضہ اچھا ملتا ہے؟"

✻ "ہاں جی.... اچھا ملتا ہے مجھے یاد ہے کہ "پہلا چاند" کے مجھے 85 ہزار ملے تھے جو کہ میرے حساب سے بہت کم تھے اور جو گیم شو کیا تھا اس کے ایک پروگرام کے مجھے آٹھ ہزار ملتے تھے۔"

★ "کیا کیا تھا ان پیسوں کا؟"

✻ "خرچ کر دیے تھے' کیونکہ مجھے شاپنگ کرنے میں بہت مزا آتا ہے۔ اس لیے شاپنگ ہماری ضرورت بھی ہے کیونکہ پروڈکشن والے کپڑے تو دیتے نہیں بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ہمیں کپڑے دیتے ہیں ورنہ تو ہمیں خود ہی سب کچھ کرنا ہوتا ہے۔ تو میں خرچ کر دیتی ہوں۔ سنبھال کر رکھنا میری عادت نہیں ہے۔ میرا فلسفہ یہ ہے کہ اگر ہم خرچ کریں گے تو اللہ تعالیٰ ہمیں اور دے گا۔"

★ "آپ نے کہا کہ ہم خود کپڑے خریدتے ہیں ڈراموں کے لیے تو آج کل جس قسم کے کپڑے پہنے جا رہے ہیں کیا یہ سب آپ کی اپنی پسند ہوتی ہے یا ڈائریکٹر کی یا کردار کی ڈیمانڈ؟"

✻ "اکثر تو کردار کی ڈیمانڈ بھی ہوتی ہے۔ جیسے ایک سیریل میں ہماری ایک فنکارہ نے خاصی بولڈ ڈریسنگ کی تھی اور بولڈ ڈریسنگ اس لیے بھی دکھائی گئی تھی کہ وہ غریب لڑکی کا کردار کر رہی تھی ڈرامے میں اس کی شادی امیر بندے سے ہو جاتی ہے تو وہ ایک دم بے قابو ہو جاتی ہے۔ لیکن میں سمجھتی ہوں [illegible] ہر طبقے کے لوگ دیکھتے ہیں اور ٹی وی ایک [illegible] اب گھر کے فرد کی حیثیت اختیار کر گیا ہے تو ہمیں یہ ضرور خیال رکھنا چاہیے کہ ہم اس انداز میں آئیں کہ لوگ ہمیں سراہیں نہ کہ تنقید کریں۔ لڑکی کو ماڈرن دکھانے کے اور بھی بہت سے طریقے ہوتے ہیں۔ یہ [illegible] پر منحصر ہے کہ وہ لباس کو کس طرح پہنتی ہیں۔"

★ "صبح جلد اٹھنے کی عادت ہے یا دیر سے اور صبح کا آغاز کس طرح کرتی ہیں؟"

✻ "عموماً" جلدی ہی اٹھ جاتی ہوں۔ جس دن شوٹ پہ جانا ہو اس دن جلدی اٹھ جاتی ہوں۔ ورنہ تھوڑی دیر سے اٹھتی ہوں۔ جس دن شوٹ ہو ناشتا بھی گاڑی میں کرتی ہوں اور عام حالات میں صبح اٹھ کر پہلے کلمہ پڑھتی ہوں۔ تھوڑا قرآن پڑھتی ہوں دعا کرتی ہوں کہ آج کا دن اچھا گزرے پھر اس کے بعد اپنے اندر انرجی لانے کے لیے کچھ میوزک چینل لگا لیتی ہوں۔ اس بات پر مجھے ڈانٹ بھی پڑتی ہے۔"

★ "فیلڈ میں آکر اپنے آپ کو اسپیشل سمجھتی ہیں یعنی دوسروں سے مختلف؟"

✻ "ہاں جی بالکل اس طرح سے کہ بات کہوں گی کہ عام اور خاص دونوں سے مختلف ہے کہ مجھے پارٹیز میں جانا اچھا لگتا ہے ہر بات میں ممی سے مشورہ لینا اور ان کو بتانا مجھے اچھا لگتا ہے جبکہ لڑکیاں اتنی بولڈ ہوتی ہیں کہ خود سے سارے فیصلے کر لیتی ہیں مگر میں ایسا نہیں کرتی مجھے ملک سے باہر دبئی' ملائشیا اور اپنے ملک کے مختلف شہروں میں کام کرنے کی آفرز ہوئیں لیکن ممی کہتی ہیں کہ نہیں کراچی میں رہ کر ہی کام کرو میں کام کے لیے کراچی سے باہر کہیں نہیں جاتی۔ ان کی خواہش جس کام میں نہیں ہوتی میں وہ کام نہیں کرتی۔ تو کبھی کبھی مجھے مشکل بھی ہوتی ہے کہ بھئی یہ کیا بات ہوئی کہ جو وہ کہیں وہ ہی کیا جائے یہ اچھی بات بھی ہے اور بری بات بھی ہے۔"

★ "ملک سے باہر جانے کی بات ہوئی تو آپ نے کافی عرصہ ابوظہبی میں گزار' تو پاکستان آکر کیا سوچتی ہیں؟"

✻ "سوچنا کیا میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ پاکستان کے لوگوں کو نیک ہدایت دے اور اگر ہم اپنی اپنی جگہ رہتے ہوئے ٹھیک ہو جائیں تو سارا ملک ٹھیک ہو سکتا ہے۔ اگر ہم اپنے گھر میں دیا جلائیں گے تو پھر اس دیے سے ہم پڑوسی کے گھر میں بھی دیا روشن کر سکتے ہیں چھوٹی چھوٹی باتوں سے بھی بہت فرق پڑتا ہے۔"

★ "اور اگر آپ با اختیار ہو جائیں تو؟"

✻ "ہمارے گورنمنٹ کے اداروں میں سنا ہے کہ رشوت بہت عام ہے اور میرا خیال ہے کہ لوگ رشوت اسی وقت لیتے ہیں جب ان کی تنخواہ کم ہوتی ہے اور ان کی ضروریات زیادہ ہوتی ہیں.... تو اگر میں گورنمنٹ کا حصہ بنی تو چھوٹے گریڈ کے لوگوں کی تنخواہیں اتنی کر دوں گی کہ وہ اپنی بنیادی ضروریات کو باآسانی پورا کر سکیں اور حرام پیسہ نہ خود کھائیں نہ اپنی اولاد کو کھلائیں۔"

★ "آپ کی باتوں میں بہت گہرائی ہے۔ آپ کی سوچ بہت اچھی ہے اور بھی باتیں کرنی ہیں ـــ لیکن پہلے فیملی بیک گراونڈ بتائیں؟"

✻ "مجھے جو لوگ دیکھتے ہیں وہ تو یہ کہتے ہیں کہ آپ یا کشمیری ہیں یا عرب سے تعلق ہے یا پھر آپ پٹھان

قارئین کی عدالت میں

جگن کاظم

نازیہ کنول نازی

قارئین! جگن کاظم اس وقت ٹیلی وژن کی بے حد مصروف اور ہردل عزیز فنکارہ ہیں۔ اس ماہ "عوام کی عدالت" میں آپ کے بھیجے گئے سوالات کے جوابات انہی سے لیے جارہے ہیں۔ ماہ جون کے لیے اس سلسلے میں ہماری مہمان شخصیت "نعمان اعجاز" ہوں گے۔ قاری بہنیں اپنے سوالات جلد از جلد ارسال کردیں!

جویریہ طاہر کراچی سے پوچھتی ہیں

★ "جگن صاحبہ! آپ کی ڈیٹ آف برتھ، تعلیم اور اسٹار......؟"

✻ "جی میری ڈیٹ آف برتھ 7 جنوری اور تعلیم بی اے ود ڈپلومہ جبکہ اسٹار کیپری کارن ہے۔"

جوہر ٹاؤن لاہور سے مسز عظیم خان کا سوال ہے

★ "گھر والے پیار سے کیا کہہ کر بلاتے ہیں؟"

✻ "گھر میں سب پیار سے جگن ہی کہہ کر بلاتے ہیں۔"

رحیم یار خان سے مسز شاہد پوچھتی ہیں

★ "آپ کتنے بہن بھائی ہیں اور گھر میں آپ کا نمبر کون سا ہے؟"

✻ "جی ہم تین بہن بھائی ہیں۔ بڑی بہن شاہ بانو پنکی اس کے بعد میں ہوں۔ پھر مجھ سے تیرہ ماہ چھوٹا میرا بھائی ہے اسد، میں درمیان میں ہوں۔"

شاہ کوٹ سے زوبی رانا کا سوال ہے

★ "آپ جگن کاظم بھی ہیں اور مہ بانو بھی، حقیقی نام کیا ہے؟"

✻ "دیکھیے نام تو میرا مہ بانو ہی ہے اور یہی اتفاق سے میڈیا میں بھی پڑ گیا۔ خود مجھے بھی اپنا یہی نام زیادہ پسند ہے اور میری فرینڈز بھی مجھے مہ بانو کہہ کر ہی بلاتی ہیں۔ جگن تو بہت پرسنل سا نام تھا جو معروف ہوگیا تو بس چل پڑا اصل میں جب میں میڈیا کی طرف آئی اور یہاں دو تین دفعہ جگن استعمال ہوا تو میں نے اعتراض کیا کہ بھئی میں مہ بانو ہوں، مجھے مہ بانو لکھیں میرے ڈاکومنٹس وغیرہ میں بھی یہی نام ہے مگر اس کے باوجود بس جگن چل پڑا اور میں جگن ہی ہوگئی۔"

حافظ آباد سٹی سے سعدیہ ساجد اعوان پوچھتی ہیں

★ "آپ معصوم صورت اور منفرد نام کی حامل ہیں کیا یہی دو چیزیں وجہ شہرت بنیں؟"

✻ "نہیں دیکھیے یہ تو آپ کی قسمت ہوتی ہے جو آپ کو کامیاب یا ناکام بناتی ہے۔ میں سمجھتی ہوں

ہیں۔ جبکہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں اردو اسپیکنگ ہوں۔ میری ممی کا تعلق لکھنؤ سے ہے اور والد کا بھی ہم خالصتاً "اردو اسپیکنگ" ہیں۔ میں پچیس جنوری کو ابوظہبی میں پیدا ہوئی۔ اے لیول تک تعلیم حاصل کی اور اسٹوڈیو آرٹ سے ٹیکسٹائل ڈیزائننگ کا کورس کیا۔ ہم دو ہی بہن بھائی ہیں یعنی میں اور میرا بڑا بھائی اور یہ بھی بتاتی چلوں کہ اپنی شادی کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی ہونے کو کل بھی ہو سکتی ہے اور نہیں تو سال بعد بھی ہو سکتی ہے۔ جب قسمت میں لکھا ہوگا ہو جائے گی۔"

★ "کوئی عادت جو گھر والے ناپسند کرتے ہوں اور اپنی کون سی عادت پسند ہے؟"

✻ "شاید ایک دم سے میرا ناراض ہونا غصہ جلد آجاتا ہے اور میں نے محبت دے کر محبت لی ہے مجھے اپنی یہی عادت پسند ہے کسی کو محبت، عزت دو گے تو محبت، عزت پاؤ گے۔"

★ "جلدی سونے کی عادت ہے یا دیر سے؟"

✻ "جب بہت تھکی ہوئی ہوتی ہوں تو سو جاتی ہوں اور جب تھکی ہوئی نہیں ہوتی تو پھر ٹی وی لگا لیتی ہوں یا میوزک سنتی ہوں یا اپنی فرینڈ سے باتیں کرنے لگتی ہوں مجھے مطالعہ کا شوق ہے تو مطالعہ کر لیتی ہوں۔"

★ "کون آپ کی زندگی میں اہمیت رکھتا ہے اور کھانے پینے کی کوئی چیز ہو تو اس کے بارے میں بھی بتائیں؟"

✻ "جہاں تک کھانے پینے کی بات ہے تو مجھے فریش جوسز بہت پسند ہیں اور وہ مجھے لازمی چاہیے ہوتے ہیں اور دن میں ایک دو دفعہ میں ضرور لیتی ہوں اور اگر آپ انسان کی بات کر رہی ہیں تو میرا خیال ہے کہ ہر انسان ایک دوسرے کے ساتھ بھی رہ سکتا ہے اور ایک دوسرے کے بغیر بھی رہ سکتا ہے۔ بہت لوگ انسان کی زندگی میں بہت اہم ہوتے ہیں مگر زندگی کا نام چلتے رہنا ہے۔ جو کسی کے آنے یا جانے سے ——— ٹھہرتی ہے نہ ختم ہوتی ہے۔"

★ "سوشل ہیں یا لیے دیے رہتی ہیں؟"

✻ "میں سوشل ہوں۔ سب کے ساتھ فرینک ہوں ایسی بندی نہیں ہوں کہ کونے میں جا کر بیٹھ گئی کمیونیکیشن گیپ نہیں رکھتی بلاوجہ کی انگریزی نہیں بولتی مجھے انگریزی، اردو اور عربی زبانیں آتی ہیں اور جو جس زبان میں مجھ سے بات کرتا ہے میں اسی میں اس کو جواب دیتی ہوں ہاں ایک بات ہے۔ مجھ میں جو کہ ہونی نہیں چاہیے کہ بہت جلد کوئی بھی بات میرے دل کو لگ جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے میرا موڈ خراب ہو جاتا ہے اور ویسے آج کے دور میں انسان کو اتنا حساس نہیں ہونا چاہیے، جتنی کہ میں ہوں۔"

★ "ٹین ایج میں کبھی پیار ہوا؟"

✻ "کہتے ہیں کہ پہلا پیار بڑا سچا ہوتا ہے اور پہلا پیار انسان کبھی نہیں بھولتا اور پہلا پیار ہوتا بھی ٹین ایج میں ہی ہے اور ٹین ایج میں پیار کو سمجھنے کا سینس نہیں ہوتا اور مجھے یاد ہے کہ اسکول کے زمانے میں مجھے اپنے فزکس کے سر بہت پسند تھے جو کہ ظاہر ہے مجھ سے بڑے تھے اور تیس کے قریب تھے اور اس عمر میں انسان میں بہت کریز ہوتی ہے۔ تو مجھے وہ بہت پسند تھے اور جب وہ پڑھاتے تھے تو میں انہی کو دیکھتی رہتی تھی۔ ان کے لیکچر پہ توجہ نہیں دیتی تھی۔"

★ "اب سوچ کر کیسا لگتا ہے؟"

✻ "اب سوچتی ہوں تو ہنستی ہوں کہ وہ میرے لیے میرے قابل احترام استاد تھے۔ کچی عمر میں یہ باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔"

★ "موڈ کب خراب ہوتا ہے؟"

✻ "موڈ کب خراب ہوتا ہے، جب آف ڈے میں میں کام پر یا اپنی دوستوں سے ملنے چلی جاؤں اور دیر ہو جائے تو ممی کا موڈ بھی آف ہو جاتا ہے تو میرا موڈ آف ہو جاتا ہے اور میں کہتی ہوں کہ کیا میں اپنے لیے ٹائم نہیں نکال سکتی۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے انٹرویو کا اختتام کیا۔

☼ ☼

جگن سے زیادہ میرے لیے میرا اصل نام "مہرانو" زیادہ لگی رہا ہے اور میں جگن کی نسبت اپنے آپ کو مہرانو زیادہ سمجھتی ہوں۔ مہر محبت کو کہتے ہیں اور میرے اندر محبت کے ذخائر ہیں۔ یہ نام میری ذات کے اندر بہت ٹھہراؤ لے کر آیا ہے۔"

مری سے امید چوہدری کا بہت خوب صورت سوال

★ "آپ ایک خوب صورت' کامیاب فنکارہ ہیں پھر بھی کوئی ایسی خواہش جو پوری نہ ہوئی ہو؟"

* مسکراتے ہوئے "خواہش تو میری بس ایک ہی تھی کہ میرا گھر ہو' بچے ہوں۔ دو بچے تو ضرور ہی ہوں۔ حالانکہ شادی سے پہلے مجھے قطعی یہ خیال نہیں تھا کہ ایک عورت کی زندگی میں بچے کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ مگر..... شادی کے بعد جب میرا بیٹا ہوا تو مجھے پتا چلا کہ زندگی میں بچے کی کتنی ویلیو ہوتی ہے۔ نوجوان ہوتے ہوئے یہ کہنا کہ مجھے بچہ چاہیے بڑا عجیب سا لگتا ہے۔ مگر..... میرے پاس میرا بچہ ہے اور اب تو بس اسے بہترین زندگی دینا ہی میری سب سے بڑی خواہش ہے۔"

البیہ شانزے وہاڑی سے سوال کر رہی ہیں

★ "لوگ کہتے ہیں آپ کی ناکام ازدواجی زندگی نے آپ کو بہت متاثر کیا' کیا اس تجربے کو سامنے رکھتے ہوئے دوبارہ گھر بسائیں گی یا نہیں؟"

* "اگر کوئی اچھا شخص ملا جو میرا قدر دان ہو' بات بات پر گالی نہ دیتا ہو' مارتا نہ ہو' تو میں ضرور شادی کروں گی۔ اصل میں میرے بیٹے نے باپ کا پیار نہیں دیکھا۔ نہ اب تک کی زندگی میں اس نے اپنے باپ کی شکل دیکھی ہے تو یہ جس شخص کو بھی میرے شوہر کی حیثیت سے میرے ساتھ دیکھے گا لازمی طور پر اسے اپنا باپ تسلیم کرلے گا کیونکہ ابھی تک اس کا ذہن بالکل صاف ہے اور مجھے اپنے بیٹے کے لیے کسی نہ کسی اچھے شخص کی طرف تو دیکھنا ہی پڑے گا۔"

کراچی سے کرن وفا کا بڑا ذاتی سا سوال ہے

★ "کیا ڈائیورس نے آپ کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا؟"

* "نہیں..... میرے پاس میرا بیٹا ہے اس لیے میں سمجھتی ہوں کہ اگر میں نے کچھ کھویا ہے تو کچھ پایا بھی ہے۔ اگر بچہ بھی نہ ہوتا تب یہ ممکن تھا کہ میں ٹوٹ جاتی' تاہم اب ایسا کچھ نہیں ہے۔"

حمیدہ جاوید کہروڑپکا سے سوال کرتی ہیں

★ "ٹیلی ویژن کی طرف آپ کی آمد محض شوق تھا یا پروفیشن؟"

* "شوق بھی تھا اور پروفیشن بھی' کیونکہ میں نے یہی سوچا تھا اور مجھے ہمیشہ سے پتا تھا کہ مجھے میڈیا میں آنا ہے۔"

دانیہ خان کا ڈیرہ غازی خان سے آپ کے لیے سوال ہے

★ "جگن جی آج کل آپ ٹیلی وژن پر بہت زیادہ دکھائی دے رہی ہیں پھر بھی چہرے کی اداسی اور معصومیت نہیں گئی اس کی کیا وجہ یا راز ہے؟"

* مسکراتے ہوئے "یار میں چیزوں کو بہت بھسک لیتی ہوں۔ زندگی میں بہت سی چیزیں ہم ایسی دیکھتے ہیں جو کہ ہم کبھی بھی دیکھنا نہیں چاہتے' یہاں تک کہ ان کے بارے میں جاننا تک نہیں چاہتے پھر بھی وہ ہمیں دیکھنا پڑتی ہیں ہمیں ان کو فیس کرنا پڑتا ہے۔ اصل میں لڑکی جو ہوتی ہے اس کا ایک ہی خواب ہوتا ہے کہ اس کا گھر ہو' شوہر اور بچے ہوں مگر یہ خواب جب ٹوٹ جائے یا ایسا نہ ہو تو پھر وہ چیز آپ کی آنکھوں سے چھلکتی تو ہے نا۔"

ارم گل مہوباغ آزاد کشمیر سے پوچھتی ہیں

★ "ایک عورت کی حیثیت سے محبت کو کس زاویہ سے دیکھتی ہیں اور کیا مرد پر محبت کی ناکامی کا اثر پڑتا ہے؟"

* "جی بالکل پڑتا ہے۔ اصل میں خواتین میں شور مچانے کی عادت زیادہ ہوتی ہے کہ جی یہ ہو گیا وہ ہو گیا دل ٹوٹ گیا اس نے یہ کر دیا وہ کر دیا' مردوں کے اوپر بھی محبت کی ناکامی کا اثر پڑتا ہے مگر فرق یہ ہے کہ وہ اس کا تماشا نہیں بناتے' شور نہیں کرتے' ہم خواتین اس کا زیادہ اثر لیتی ہیں۔ ویسے بھی محبت کی جو stenth ہے وہ

سب کے لیے ایک جیسی نہیں ہوتی' کچھ مرد ایسے ہوتے ہیں جو بہت زیادہ ہرٹ ہوتے ہیں مگر وہ اظہار نہیں کرتے' ایک الگ شخصیت اور سوچ ہوتی ہے ان کی کہ وہ اپنے دکھ کا پتا ہی نہیں لگنے دیتے۔"

ثروت رشید گل آپ کی بہت بڑی فین ڈگری سے پوچھتی ہیں

★ "شہرت نے آپ کی زندگی پر کتنا اثر ڈالا؟"

* "بہت زیادہ اثر ڈالا۔ پہلے میں اتنی خاموش طبع اور تنہائی پسند نہیں تھی۔ اب ہو گئی ہوں۔ دوسرا طبیعت میں چڑچڑاپن بہت آگیا ہے۔ بات بات پر خوامخواہ غصہ ہو جاتی ہوں۔"

حمرا عرفان کا کوٹ رادھا کشن سے آپ کے لیے سوال ہے

★ "ٹی وی کی طرف کب آئیں اور پہلا پروگرام کیا تھا؟"

* "ٹیلی ویژن کی طرف تو بچپن میں ہی آگئی تھی۔ جب میں چار ساڑھے چار سال کی تھی تو میں نے جو سب سے پہلا کام کیا تھا وہ ایک کمرشل تھا۔ اس کے بعد چار چھ ماہ ٹھہر کر بھی ایک کمرشل ہی کیا تھا "لوڈ ک کا۔"

شاہدہ گڑیا رانی بہاول نگر سے پوچھتی ہیں

★ "زندگی کا کوئی خوب صورت یادگار دن؟"

* "یادگار دن وہی تھا جب میری فیملی نے میرے ٹیلی وژن پر کام کو سراہا اور تعریف کی۔ خاص طور پر میری ماں نے' کیونکہ انہیں میرا اس فیلڈ کی طرف آنا پسند نہیں تھا۔"

ناہید ناز کنول فیصل آباد سے سوال کر رہی ہیں

★ "اپنی زندگی میں کس رشتے سے بہت قریب ہیں؟"

* "اپنی ماں اور اپنے بیٹے حمزہ کے' جس میں میری جان ہے۔ ہاں ایک دوست بھی ہیں بلال۔ انہی کے زیادہ قریب ہوں۔"

بہاول پور سے اریبہ شاہ کا آپ کے لیے سوال ہے

★ "زندگی کا سب سے خوب صورت دن اور سب سے برا تجربہ؟"

* "زندگی کا سب سے خوب صورت دن جب میرا بیٹا حمزہ پیدا ہوا اور زندگی کا سب سے برا تجربہ شادی۔"

سدرہ اسلم کہروڑپکا سے پوچھتی ہیں

★ "آپ کو کھانے میں کیا کیا پسند ہے؟"

* "دال چاول' چائنیز اور اچار۔ سب سے زیادہ جو چیز پسند ہے وہ نہاری ہے اور میں کھانے پینے کے معاملے میں خاصی فراخ دل لڑکی ہوں۔"

نگہت اکرم کالاہور سے آپ کے لیے سوال ہے

★ "آپ کے علاوہ آپ کی فیملی میں کون کون شوبز کی طرف آیا؟"

* "نہیں میری فیملی کی طرف سے کوئی بھی اس طرف نہیں آیا' کیونکہ میری فیملی میں نہ تو کسی نے میری مستقل حوصلہ افزائی کی ہے اور نہ ہی کبھی اس کام کو پسند کیا ہے۔ جس نے بھی کی حوصلہ شکنی ہی کی۔ لیکن مجھے چونکہ شروع سے شوق اور جنون تھا تو میں اس طرف آگئی اور میں سمجھتی ہوں مجھے بہت پہلے ہی

اسے سمجھ لینا چاہیے تھا مطلب اس طرف آجانا چاہیے تھا۔"

لاہور سے ہی روبینہ اکمل جو کہ ڈاکٹر ہیں پوچھتی ہیں

★ "محبت عورت کی پوری زندگی اور مرد کے لیے صرف ایک لمحہ ہوتا ہے یہ بات کتنی صحیح ہے؟"

* "میں تو اس سے اتفاق نہیں کرتی' ایسا بالکل نہیں ہوتا اور نہ ہی محبت زندگی میں صرف ایک بار ہوتی ہے۔ ہاں جو پہلا شاک' پہلا جھٹکا ہوتا ہے۔ وہ شاید ایک دفعہ ہی ہوتا ہے اور وہ مرد کی زندگی میں بھی ایک بار ہی ہوتا ہے۔ بس یہ ہے کہ مرد چونکہ پریکٹیکل زیادہ ہوتا ہے تو وہ سوچتا ہے کہ رونے پیٹنے اور شور مچانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے سو آگے بڑھنا چاہیے مگر خواتین' جو ہیں وہ اسی ایک لمحے میں اٹکی رہتی ہیں کہ شاید یہ چیز ٹھیک ہو جائے' وہ لمحہ واپس آجائے' میں خود ایک پریکٹیکل لڑکی ہوں اور سمجھتی ہوں کہ غم کیسا بھی ہو اسے آگے لے کر چلو اس کا کچھ حاصل نہیں ہے کہیں نہ کہیں آپ کو آگے دیکھنا پڑے گا۔"

اٹک سے دعا ثانی کا آپ کے لیے سوال ہے۔

★ "کوئی ایسی بات یا جملہ جو کوئی آپ سے کہے تو آپ خوش ہو جائیں؟"

* "جی کوئی جب مجھے یہ کہتا ہے کہ میں اچھی ماں ہوں تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں مجھے زندگی میں کام کے حوالے سے تو بہت سے ایوارڈ ملے ہیں' مگر میرے لیے میرا سب سے بڑا قیمتی ایوارڈ یہی ہے کہ میں اچھی ماں ہوں اور میرے بچے کا خیال رکھنا ہی میری سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔ باقی یہاں جو کچھ بھی ہے سب دنیاوی ہے اگر آپ مرنے کے بعد اپنے پیچھے کچھ چھوڑ جاتے ہیں تو وہ بس یہی آپ کی اولاد ہی ہے۔"

مشعون علی اور اقصی اقبال کا ہارون آباد سے سوال ہے

★ "آج کل ٹیلی ویژن پر کیا کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟"

* "آج کل کچھ سیریلز ہیں۔ کچھ ٹاک شوز ہیں جو لائیو چل رہے ہیں۔ ابھی ہمایوں سعید کی پروڈکشن میں ایک سیریل "درمیانہ" ختم کیا ہے۔ ایک فلم بھی ہمایوں شوٹ کر رہا ہے اس میں بھی کام کیا ہے۔ اس کے علاوہ آگ کے اوپر میرا ایک ٹاک شو چل رہا ہے۔ تو بس یہی مصروفیات ہیں۔"

فیصل آباد سے شمائلہ اکرم کا سوال ہے

★ "بچپن میں کیا سوچا تھا بڑی ہو کر کیا بنیں گی؟"

* "یہی سوچا تھا کہ بڑی ہو کر ایکٹر بنوں گی۔ بچپن میں جب بھی مجھ سے پوچھا جاتا کہ آپ بڑی ہو کر کیا بنو گی تو میں یہی کہتی تھی کہ ایکٹر بنوں گی۔"

بہاولپور سے طاہرہ کنول کا محبت بھرا سوال ہے

★ "شادی ارینج ہونی چاہیے کہ لو' Love...؟"

* "میں تو سمجھتی ہوں کہ شادی میں ماں باپ کی شمولیت ہونی چاہیے۔ اگر آپ کو کوئی پسند ہے تو آپ اپنی فیملی کو بتا دیں ـــــ۔ اگر میرے والے کیس میں میری مما کی انوالومنٹ ہوتی تو وہ لڑکے کے بارے میں تھوڑا بہت پتا تو کرتیں نا؟ ـــــ اگر ہم دونوں چیزیں ساتھ لے کر چلیں مطلب لڑکا بھی اچھا اور قابل ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ کی فیملی آپ کا ساتھ نہ دے۔ لڑکے کے بارے میں جو جانچ پرکھ ہمارے والدین کر سکتے ہیں وہ ہم کبھی نہیں کر سکتے' کیونکہ ہم تو اس وقت پاگل ہوتے ہیں ہمارا تو دماغ ہی کام نہیں کر رہا ہوتا۔ تو اس وقت اگر ہمارے والدین سب چیک کر لیں تو چونکہ اتنی ایموشنل اٹیچ منٹ نہیں ہوتی لہٰذا اگر ایسی ویسی کوئی بات سامنے آجائے تو آپ خود کو سنبھال تو سکتی ہیں نا؟"

ہردلعزیز مصنفہ شگفتہ بھٹی کی والدہ گزشتہ دنوں روڈ ایکسیڈنٹ میں شدید زخمی ہو گئی ہیں اور ہاسپٹل میں زیر علاج ہیں۔ قارئین سے التماس ہے کہ شگفتہ کی والدہ کے لیے دعائے صحت کریں۔ اللہ تعالیٰ شگفتہ کی والدہ کو صحت کاملہ عطا فرمائے اور ان کا سایہ ان کے بچوں پر قائم رکھے (آمین) واضح رہے کہ شگفتہ بھٹی کی حقیقی والدہ کا 19 مارچ 2008ء کو انتقال ہو گیا تھا یہ ان کی پھوپھو ہیں جنہوں نے شگفتہ کو بچپن سے گود لے لیا تھا اور انہوں نے ہی درحقیقت شگفتہ کی پرورش کی ہے۔

سائرہ پروا کرن کوٹ چھٹہ سے سوال کر رہی ہیں

★ "کیا آپ محبت پر یقین رکھتی ہیں اور کس ہستی کی خاطر جان دے سکتی ہیں؟"

* "محبت پہ آف کورس یقین رکھتی ہوں۔ زندگی ہے ہی کیا محبت کے بغیر۔ میں سمجھتی ہوں دنیا میں جسے محبت کے بدلے سچی محبت مل گئی اسے پورا جہاں مل گیا۔ لیکن میری محبت ہر قسم کی ہے۔ میں اللہ تعالیٰ کے بعد اگر کسی ہستی کے لیے جان دے سکتی ہوں تو وہ میرا بیٹا حمزہ ہے۔"

فوزیہ ثمرین بٹ کا گجرات سے آپ کے لیے سوال ہے

★ "آپ کی زندگی کا پہلا دکھ کون سا تھا؟ اور کیا اپنے دکھوں کو کسی سے شیئر کرنا پسند کرتی ہیں؟"

* "زندگی کا پہلا دکھ جب میں نو سال کی تھی تو مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میری نانو کی ڈیتھ ہوئی تھی۔ میں نے نانو کو ہمیشہ اپنی ماں سمجھا کیونکہ میں اپنی ماما سے بہت پیار کرتی ہوں' بہت اٹیچ ہوں کیونکہ میری مما اور میں نانو کے پاس رہتے تھے جب ان کی ڈائیورس ہوئی تو انہوں نے ہی ہمیں سنبھالا یہ ٹریجڈی میرے لیے سب سے بڑی تھی اور دنیا میں کس کے پاس آپ کے دکھڑے سننے کا وقت ہے لہٰذا میں اللہ تعالیٰ سے اپنا دکھ شیئر کر لیتی ہوں۔"

انہی کا آپ کے لیے دوسرا سوال ہے

★ "آپ کا جیو پر جو ڈرامہ آ رہا ہے "کیا میری شادی شاہ رخ سے ہو گی" تو اگر پاکستان کے شاہ رخ یعنی ساحر لودھی صاحب آپ کو شادی کی آفر کریں تو کیا آپ قبول کر لیں گی؟"

* "دیکھیں مجھے ڈمپل کیٹ کا کوئی شوق نہیں ہے اور بہتر کاپی مجھے زیادہ پسند آتی ہے اور شاہ رخ خان کا تو ویسے بھی میری زندگی میں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ اس لیے چاہے پاکستان کے شاہ رخ ہوں یا جرمنی کے مجھے کوئی انٹرسٹ نہیں ہاں بریٹ پیٹ یا جان ابراہیم ہو تو اور بات ہے۔"

فوزیہ ثمرین بٹ کا تیسرا سوال

★ "پہلی نظر کی محبت پر یقین رکھتی ہیں کہ نہیں؟ اور غصے کا اظہار کیسے کرتی ہیں؟"

* "دماغ کی بات کروں تو پہلی نظر کی محبت سوائے اٹریکشن کے اور کچھ بھی نہیں۔ لیکن دل کی بات کی جائے تو یہ ہے کہ جو پہلی بار آپ کے دل کو بھا جائے پھر آپ ساری عمر ہی اس کی پوجا کرتے ہو۔ بہت سی ایسی خواتین کو دیکھا ہے میں نے جن کے شوہر بہت گڈ لوکنگ تھے مگر 20 سے 30 کے بعد خاصے بے ڈھنگے ہو گئے پھر بھی وہ خواتین اتنا ہی پیار کر رہی ہوتی ہیں کیونکہ ان کے دماغ میں ایک تصویر بیٹھ چکی ہوتی ہے مجھے بھی اپنے شوہر سے پہلی نظر میں ہی پیار ہوا تھا اور غصے میں میں چیخیں مارتی ہوں یا روتی ہوں۔ ویسے میرا

غصہ ایک منٹ کا ہوتا ہے۔ ایک ہی منٹ کے بعد میں مسکرا بھی رہی ہوتی ہوں۔"

چارسدہ سے ہماری بہن زرمینہ کمال پوچھتی ہیں

★ "آپ ڈرامہ، فلم، کمرشل، کمپیئرنگ ایک ہی وقت میں یہ سب کر رہی ہیں تو اتنی ساری چیزوں کو ایک ساتھ کیسے مینیج کرتی ہیں؟"

* "نہیں ایک ساتھ تو کچھ بھی نہیں کر رہی ہوتی۔ جب ڈرامہ کی شوٹ پر جا رہی ہوتی ہوں تو کمرشل نہیں کرتی، جب کمرشل کر رہی ہوتی ہوں تو کمپیئرنگ نہیں کرتی، اس لیے مجھے تو کبھی فیل نہیں ہوا کہ میں ایک وقت میں مختلف چیزیں کر رہی ہوں، ہاں یہ ہے کہ ایک ہی طرز کا کام کرکے آپ بور ہو جاتے ہیں مختلف کام کرنے سے یہ ہے کہ آپ کا انٹرسٹنگ لیول ٹھیک رہتا ہے۔ ابھی میں ایک ایڈ شوٹ کرکے آ رہی ہوں ہو سکتا ہے یہ مہینے بعد آن ایئر آئے اور اس وقت میرا مارننگ شو بھی چل رہا ہو۔"

زرمینہ کا ہی آپ سے دوسرا سوال ہے کہ شعر کا جواب شعر میں دیں

★ "بچھڑتے سمے بڑی دیر تک وہ رویا تھا
وہ اس سے بڑھ کر میرا اعتراف کیا کرتا؟"

*

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

خانیوال سے ثانیہ، شہلا، سدرہ اور ان کی بھابھی جان کا آپ سے سوال ہے

★ "ڈائجسٹ پڑھنے والی بہنوں کو کوئی اچھی سی نصیحت کا کہیں تو کیا کریں گی؟"

* "یہی کروں گی کہ زندگی میں جو بھی قدم اٹھائیں بہت سوچ سمجھ کر اٹھائیں تاکہ ایسا کچھ ہو ہی نا کہ آپ کو پچھتانا پڑے یا کوئی چوٹ لگے تو پھر کوئی راہ ہی دکھائی نہ دے۔ میں سمجھتی ہوں جب آپ باشعور ہو جائیں، زندگی میں اچھی طرح اسٹیبل ہو جائیں تب اپنے لیے کوئی فیصلہ کریں۔"

کورنگی کراچی سے رخسانہ جاوید مغل آپ سے پوچھتی ہیں

★ "ٹیلی ویژن کے ساتھ ساتھ کبھی فلم میں کام کا خیال آیا؟"

* "جی بالکل خیال آیا اور فلم میں نے کی بھی ہے۔ ایک بار جب میں کینیڈا میں تھی تو وہاں میں نے ایک فلم کی تھی اور وہ بہت اچھی رہی تھی ابھی بھی ہمایوں سعید کی ایک فلم میں کام کیا ہے دیکھیں کیا بنتا ہے۔"

اور ہمارے پاس جگن یہ آخری سوال ہے پروین افضل شاہین کا بہاول نگر سے پوچھتی ہیں

★ "کہا جاتا ہے محبت کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے آپ کیا کہتی ہیں اس بارے میں؟"

* "پیار ہو کیسے جاتی ہے؟ لڑکی کسی لڑکے کو لفٹ نہیں کروائے گی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرے گی تو محبت کیسے ہو جائے گی؟ دیکھیں جب ہم سولہ سترہ سال کے ہوتے ہیں تو ہر چیز اچھی لگتی ہے مگر زندگی کے اس اسٹیج پر آ کر میں سمجھتی ہوں کہ ایسا نہیں ہوتا۔ بہت ساری خواتین ہیں جنہوں نے پیار نہیں کیا، یا انہیں کسی سے پیار نہیں ہوا۔ کیوں نہیں ہوا.....؟ بھئی اس لیے کہ وہ پیار کرنا ہی نہیں چاہتی تھیں۔ آپ کو اگر کسی کی کوئی بات کلک کرتی ہے تو آپ اسے نظر انداز کر دیں، لڑکا اگر آپ کی تعریف کرے، آپ کو پھول بھجوائے یا کسی بھی طرح سے ٹریپ کرنے کی کوشش کرے تو اس کا مطلب ہے وہ آپ کو اندر سے کھولنا چاہتا ہے ایسے میں اگر آپ اسے لفٹ نہیں کروائیں گی تو وہ کیسے فریب دے سکتا ہے؟ تالی تو دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے نا۔"

بہت شکریہ جگن کہ آپ نے اتنی مصروفیات کے باوجود اتنا ٹائم نکالا۔ اللہ آپ کو بہت ساری خوشیاں دے۔ آمین

☆ ☆

مجھ سے ملیے

آمنہ ریاض

1 "نام بتایئے؟"
"آمنہ ریاض۔"
2 "تاریخ پیدائش / اسٹار۔"
"گیارہ جنوری / جدی capricorn۔"
3 "خدا سے تعلق؟"
"الحمدُ للہ بہترین ہے۔"
4 "فرصت کا وقت گزارنے کا بہترین طریقہ؟"
"موڈ پر منحصر ہے۔ کبھی کوئی اچھی کتاب یا کوئی اچھی مووی..... ویسے عموماً" فرصت کا وقت میری نیند کی نذر ہوتا ہے۔"
5 "کون سی چیز خوش گوار تاثر قائم کرتی ہے؟"
"صبح سویرے کی ہوا..... اچانک برسنے والی بارش..... ستاروں سے بھرا آسمان..... کسی دوست کی غیر متوقع کال یا ایس ایم ایس..... شدید تھکن میں گرما گرم چائے کا کپ..... گول گپوں کی بھری ہوئی پلیٹ (ہنسنے کی نہیں ہو رہی مجھے واقعی گول گپے بہت پسند ہیں) روتے ہوئے بچے کے چہرے پر اچانک نمودار ہونے والی ہنسی اور..... اور چاند کے گرد ہالہ..... یار! ایسی بہت ساری چیزیں ہیں جو میرے لیے خوشگوار تاثر لاتی ہیں کیا کیا بتاؤں۔"
6 "وہ چیزیں جو موڈ خراب کردیں؟"
"جب میں گھر سے باہر جا رہی ہوں اور کوئی مہمان آجائے جس کی وجہ سے مجھے بندھ کر بیٹھنا پڑے تو ظاہر ہے موڈ خراب ہو جاتا ہے۔"
7 "مشکل ترین لمحہ؟"
"الحمد للہ کوئی نہیں۔"
8 "بہترین تعریف جو وصول کی؟"
"یہ تو بھی اپنے منہ میاں مٹھو بننے والا سوال ہے۔ اس کو آپ رہنے دیں۔"

9 "وقت ضائع کرنے کا بہترین طریقہ؟"
"ایس ایم ایس پیکجز' سیاست دانوں پر تنقید۔"
10 "زندگی کا خوفناک واقعہ؟"
"خوفناک واقعہ یہ تھا کہ میری امی روڈ ایکسیڈنٹ میں بہت زخمی ہو گئی تھیں۔ میں اور عائشہ انہیں ہسپتال لے کر گئے گو کہ اس وقت بہت بری حالت تھی لیکن آپ اندازہ کیجیے کس قدر ڈرامائی صورت حال رہی ہو گی۔ ماں زخمی..... اور دو حسینائیں (بزعم خود) خوف و پریشان سے نیلی پیلی ہو رہی ہیں۔ حواس باختہ اس قدر کہ جانا دائیں طرف تو چل بائیں طرف رہی ہیں باقاعدہ کانپ رہی ہیں۔ عائشہ نے تو ڈاکٹر سے باقاعدہ جھگڑا کیا تب ٹریٹمنٹ شروع ہوا۔ یہ زندگی نہ ہوتی کوئی افسانہ یا ڈرامہ ہوتا تو کسی ہیرو کی آمد کے لیے یہ بڑی آئیڈیل پوزیشن ہو سکتی تھی لیکن..... حق ہاہ۔"
11 "بہترین تحفہ میری نظر میں؟"
"کتاب۔"
12 "ایسی تاریخی شخصیت جس سے ملنا چاہوں؟"
"بیربل..... میں دیکھنا چاہتی ہوں وہ بندہ واقعی ذہین تھا یا ایسے ہی قصے مشہور ہیں۔"
13 "پسندیدہ ساتھی؟"
"جیون ساتھی۔"
14 "پسندیدہ ہستی؟"
"میری ماں اور بڑی بہن تنزیلہ۔"
15 "پسندیدہ پروفیشن؟"
"لڑکیوں کے لیے تو ٹیچنگ ہی ہے۔"
16 "بہترین کاوش؟"
"عشق آتش۔"
17 "پسندیدہ ملکیت؟"

"میرا کمرہ' میری کتابیں۔"
18 "زندگی کی خواہش؟"
"میں ہوا میں اڑنا چاہتی ہوں اور ایک ستارہ لا کر اپنے پاس رکھنا چاہتی ہوں۔"
19 "پریشان کن لمحہ؟"
"وہی جب میری امی زخمی ہوئی تھیں۔"
20 "جب موڈ آف ہو تو کیا کرتی ہوں؟"
"خاموش ہو جاتی ہوں لیکن غصہ آ رہا ہو تو بول بول کر بھڑاس نکالتی ہوں۔"
21 "کوئی ایسا فرد جس کے سامنے کھڑی نہ رہ سکوں؟"
"ایسا کوئی نہیں ہے البتہ انڈر ٹیکر سامنے آگیا تو کھڑی نہیں رہ سکوں گی فوراً بے ہوش ہو جاؤں گی یار! اتنے خوفناک آدمی کے سامنے کون کھڑا رہ سکتا ہے۔"
22 "فیشن کب مسئلہ بنتا ہے؟"
"جب کسی فنکشن میں اچانک جانا پڑے اور آپ کے پاس Latest فیشن کا ایک بھی ڈریس نہ ہو۔"
23 "انسان کا دل کب ٹوٹتا ہے؟"
"جب توقعات زیادہ وابستہ کرلی جائیں۔"
24 "کیا چیز جذباتی کر دیتی ہے؟"
"ناانصافی۔"
25 "زندگی کا یادگار دن؟"
"جو دن اچھا گزرے وہی یادگار..... الحمدُ للہ میرا ہر دن اچھا ہے۔"
26 "موسیقی میرے نزدیک؟"
"اچھی چیز ہے۔"
27 "پسندیدہ گانا؟"
"سچ کہوں تو موسیقی سے بہت دلچسپی نہیں ہے جس وقت کانوں کو جو بھلا لگے سن لیتی ہوں لیکن اگر میری ہی پسند کو مد نظر رکھا جا رہا ہو تو کہتی ہوں "مینا ثانی" یا "نیر انور" کی کوئی غزل سنوا دو یا شفقت امانت علی اور راحت فتح علی [illegible] سے کسی کا گانا ہو۔"
28 "پسندیدہ فقرا؟"
"[illegible] نہیں..... میں نے کبھی غور نہیں کیا۔"

29 "پسندیدہ کردار؟"
"بہت سے ہیں..... فرحت اشتیاق نے انکل مبشر لودھی کا کردار لکھا تھا وہ بہت اچھا لگتا تھا۔"
30 "سب سے زیادہ عزیز اور قیمتی اثاثہ؟"
"میرے ناولز۔"
31 "اچھا اور خوب صورت موسم؟"
"سردی ہو یا گرمی..... بس موسم کے مزاج میں بہت شدت نہ ہو تو اچھا اور خوب صورت لگتا ہے۔"
32 "ناقابل فراموش واقعہ؟"
"کوئی نہیں۔"
33 "پہلی کاوش شائع ہونے پر تاثرات؟"
"بے حد خوش تھی۔"
34 "وہ رات جو کبھی نہ بھولے گی؟"
"ایسی تو کوئی رات نہیں۔"
35 "میرا خواب؟"
"میرا اپنا پبلشنگ ہاؤس ہو۔"
36 "پسندیدہ مزاح؟"
"مشتاق احمد یوسفی سے بہتر کوئی نہیں لکھ سکتا۔"
37 "حسد محسوس کرتی ہوں؟"
"الحمد للہ حسد کا مادہ نہیں ہے میرے اندر..... ہاں لیکن عائشہ کی رائٹنگ دیکھ کر بڑا رشک آتا ہے اس کی رائٹنگ بہت بہترین ہے۔"
38 "خوشبو پسند ہے تو کیوں؟"
"کیونکہ وہ خوشبو ہے۔"
39 "پسندیدہ خوشبو؟"
"Innocence۔"
40 "آخری کتاب جو میں نے پڑھی؟"
"قرۃ العین حیدر کی "آخر شب کے ہم سفر" اور فوزیہ یاسمین کی "زخم کو ضد تھی مسیحائی سے۔"
41 "پسندیدہ جگہ؟"
"میرا گھر۔"
42 "وہ جگہ جہاں چھٹی گزارنا پسند کروں؟"
"دو تین چھٹیاں ہوں تو گھر میں زیادہ چھٹیاں ہوں تو

"فانس پور میں۔"

43 "میری قوت ارادی؟"

"قوت ارادی کے بارے میں اب کیا کہوں، مجھے لگتا ہے شاعر نے میرے لیے ہی کہا ہے۔

ارادے باندھتا ہوں توڑ دیتا ہوں
کہیں ایسا نہ ہوجائے، کہیں ویسا نہ ہوجائے

44 "گھر کا پسندیدہ کمرہ؟"

"میرا کمرہ۔"

45 "کیا پہننا پسند کرتی ہوں لباس میں؟"

"شلوار قمیص، کرتا پاجامہ۔"

46 "پسندیدہ رنگ؟"

"مجھے ہر رنگ اچھا لگتا ہے۔"

47 "پسندیدہ مصنف؟"

"بانو قدسیہ، خدیجہ مستور، پریم چند، عطاء الحق قاسمی، مستنصر حسین تارڑ، قدرت اللہ شہاب، فائزہ افتخار، عالیہ بخاری، فرحت اشتیاق، ثروت نذیر، آمنہ مفتی، فوزیہ یاسمین ..... ایک لمبی لسٹ ہے یار! کس کس کا نام لکھوں۔"

48 "پسندیدہ شاعر؟"

"گلزار۔"

49 "ویران سنسان جزیرے پر سب سے پہلا کام کیا کروں گی؟"

"ویران سنسان جزیرے پر جاؤں گی ہی نہیں اور کسی وجہ سے چلی ہی گئی تو آیت الکرسی اور چاروں قل کا حصار باندھوں گی پھر جزیرے کو Explore کرنے نکلوں گی۔"

50 "خود اپنی بری عادت؟"

"بولتی بہت ہوں۔"

51 "کھانے کی پسندیدہ جگہ؟"

"ہوٹلنگ تو بھئی ہمیں پسند ہی نہیں ہے اس لیے کھانے کی پسندیدہ جگہ گھر ہی ہے۔"

52 "اگر مصنفہ نہ ہوتی تو؟"

"مصنفہ ہی ہوتی۔"

53 "ایک لفظ جو مجھے واضح کردے؟"

"میں خود کو ایک لفظ میں واضح نہیں کر سکتی لیکن چند روز پہلے ایک خاتون نے کہا تھا "آمنہ کو ایک لفظ میں واضح کرنا ہو تو میں کہوں گی سادہ اور پرخلوص۔" دیکھ لیں وہ بھی ایک لفظ کہہ کر دو الفاظ بولیں اور مجھے چونکہ دونوں ہی لفظ اچھے لگے اسی لیے ان کی بات پر یقین کرلیا۔"

54 "جنس مخالف کے بارے میں رائے؟"

"اب اس کا میں کیا جواب دوں۔"

55 "محبت کے بارے میں خیال؟"

"اچھی چیز ہوتی ہے۔"

56 "پسندیدہ رشتہ؟"

"دوستی کا۔"

57 "اگر محبت کی تو کیا نتائج نکلیں گے؟"

"یہ تو جب محبت ہوگی تب ہی پتا چلے گا۔"

58 "پسندیدہ لو اسٹوری؟"

"Poison Tree۔"

59 "کوئی ایسی فلم جو بار بار دیکھنا چاہیں؟"

"ایسی کوئی نہیں ہے۔"

60 "چہرے کچھ بتاتے ہیں؟"

"ہاں خوشی بتاتے ہیں، غم بتاتے ہیں، تھکن بتاتے ہیں، اداسی بتاتے ہیں، آپ کے پاس اگلوانے کی صلاحیت ہو تو چہرے سب بتاتے ہیں۔"

61 "شاعری کے بارے میں خیال؟"

"بڑی خوب صورت چیز ہے۔ مختصر الفاظ میں بڑی بڑی باتیں بیان ہوجاتی ہیں۔"

62 "بہترین کامیابی؟"

"پہلے ناول کی اشاعت۔"

63 "غم، وہم کا ازالہ کس طرح کرتی ہیں؟"

"بہنوں سے ڈسکس کرکے۔"

64 "سائنس کی بہترین ایجاد؟"

"موبائل فون۔"

65 "بدترین ایجاد؟"

"وہ بھی موبائل فون۔"

66 "ایسی شخصیت جو شدت سے یاد آتی ہے؟"

"ایسی کوئی شخصیت نہیں۔"

67 "بستر پر جانے سے پہلے کیا جانے والا آخری کام؟"

"کمرے کا بکھراوا سمیٹتی ہوں۔"

68 "ایک بات جو ہمیشہ یاد رہی؟"

"بات نہیں حضرت علی کا ایک قول پڑھا تھا جو ہمیشہ یاد رہتا ہے کیونکہ اس قول سے میں نے واقعی بہت سیکھا ہے اور قول کچھ یوں ہے کہ "جب بھی دعا مانگو تو دعا میں مقدر مانگو عقل نہ مانگو میں نے بہت سے عقل والوں کو مقدر والوں کے پاس کام کرتے دیکھا ہے۔"

69 "زندگی کا خوب صورت ترین دن؟"

"ہر دن خوب صورت ہے یار۔"

70 "پیغام قارئین کے نام؟"

"ہمارے قارئین ماشاء اللہ بہت باشعور ہیں بہت حساس ہیں ہمیں اچھا لگتا ہے جب آپ لوگ ہماری تحاریر کو سراہتے ہیں، کوئی غلط بات نظر آئے تو پوائنٹ آؤٹ کرتے ہیں لیکن ایک بات میں ضرور کہنا چاہتی ہوں جو "بساط دل" لکھتے ہوئے میں نہیں کہہ سکی اور وہ یہ کہ آپ لوگ اپنا تنقید کا شوق ضرور پورا کیجیے۔ تنقید سر آنکھوں پر..... اس پہ ہمیں کوئی اعتراض نہیں لیکن خدارا تنقید کرتے ہوئے اپنا ہاتھ ذرا ہلکا رکھا کریں۔ آپ کے لیے کہانیاں لکھنے والا بھی انسان ہی ہوتا ہے۔ ایک دل اس کے پاس بھی ہوتا ہے جو آپ کے سخت الفاظ پر بری طرح ہرٹ ہوجاتا ہے۔

ٹھیک ہے ادارے نے آپ کو کہہ دیا آپ اچھی تنقید کرتی ہیں یا آپ کے خطوط جامع ہوتے ہیں لیکن تنقید اور پتھر مارنے میں کچھ فرق ہوتا ہے۔ اس فرق کو سمجھ لیں تو مہربانی ہوگی میں یہ بات کرن کے سبھی رائٹرز کی طرف سے کہہ رہی ہوں امید ہے میری اس جسارت کا برا نہیں منایا جائے گا اور قارئین میری بات سمجھ لیں گے۔ باقی یہ کہ آپ کے لیے ہی لکھتے ہیں تعریف و تنقید دونوں قبول ہیں۔ آپ خوش رہیں اور مجھے دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔"

70 "کرن کے بارے میں رائے؟"

"کرن بہترین ہے اس سے زیادہ اور کیا رائے دوں ادارے کو بے حد مبارک باد اور ترقی کی ڈھیروں دعائیں۔"

ثنا ریحان اسدی

شاہین رشید

ریڈیو سننے والے ریحان اسدی سے واقف نہ ہوں یہ ممکن نہیں ہے ایف ایم 101 کے پریزنٹر ریحان اسدی 23 فروری 2011ء کو رشتہ ازدواج میں بندھے۔ ان کا تعلق اردو اسپیکنگ گھرانے سے ہے۔ یہ 19 اپریل کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ چھ فٹ چھ انچ ان کا قد ہے۔ انٹرنیشنل ریلیشن میں ایم اے کرنے والے ریحان اسدی کی دو بڑی بہنیں دو چھوٹی بہنیں اور درمیان میں یہ خود ہیں یعنی اکلوتا بیٹا اور اکلوتا بھائی..... اور اکلوتے ہونے کی وجہ سے گھر بھر کے لاڈلے..... اور تھوڑے سے خود سر اور موڈی..... موڈ کا تو یہ عالم ہے کہ اگر ان کا دل نہیں چاہ رہا کسی سے فون پر بات کرنے کا تو یہ فون ہی ریسیو نہیں کرتے۔ خواہ فون کرنے والا کتنا ہی Irritate ہو انہیں پروا نہیں ہوتی۔ تب بے چارے اس بندے کو Unknown نمبر سے بات کرنا پڑتی ہے۔ یہی حال ان کے S.M.S کا بھی ہے۔ کتنا ہی ضروری ہو اگر موڈ نہیں ہے تو جواب نہیں دینا..... چاہے کچھ بھی ہو جائے..... اور یہ ہم ہی جانتے ہیں کہ ان کی بیگم سے انٹرویو کے لیے ہمیں کتنی تگ و دو کرنی پڑی..... پھر بھی ہماری دعا ہے کہ یہ جوڑا ہمیشہ خوش و خرم زندگی گزارے۔ (آمین)

ریحان اسدی

* "ہمارے ادارے کی طرف سے آپ کو شادی کی بہت بہت مبارک ہو۔ کتنے مہینے ہو گئے شادی کو؟"

☆ "شکریہ اور 23 فروری 2011ء کو شادی ہوئی حساب لگا لیں۔"

* "اپنی پسند سے کی یا والدین کی پسند سے اور یہ بتائیں کہ ریڈیو کے علاوہ کیا کرتے ہیں؟"

☆ "ریڈیو کے علاوہ ایک ٹیلی کام کمپنی میں بحیثیت بزنس منیجر کے کام کرتا ہوں اور میری شادی 101 فیصد والدین کی پسند سے ہوئی ہے اور میری بیگم ثنا، میری خالہ کی بیٹی ہے۔"

* "مگر آپ جس فیلڈ سے تعلق رکھتے ہیں وہاں تو بہت سی لڑکیاں جو آپ کی فین ہوتی ہیں جو آپ کو پسند کرتی ہیں ان میں کوئی پسند نہیں آئی؟"

☆ "پسند تو انسان کو بہت سی شخصیات آتی ہیں۔ لیکن شادی صرف لڑکے اور لڑکی کا ملاپ نہیں ہوتا بلکہ دو خاندانوں کا ملاپ ہوتا ہے..... اس لیے بہتر ہے کہ یہ فیصلہ آپ اپنے والدین پہ چھوڑ دیں تو زیادہ بہتر ہے کیونکہ وہ اپنی زندگی گزار چکے ہوتے ہیں اور انہیں خاصا تجربہ ہوتا ہے اس لیے انہی پہ فیصلہ چھوڑ دینا

* "آج کل کی نسل زیادہ تر لو کو ارینج کر دیتے ہیں۔ تو آپ بھی ایسا کر سکتے تھے؟"

☆ "بالکل ایسا کیا جا سکتا ہے، لیکن ہر انسان اپنے انداز سے سوچتا ہے اور میری سوچ یہ تھی کہ میری زندگی کا فیصلہ میرے والدین ہی کریں۔ میں لو کو اگر ارینج کر دیتا تب بھی میری لو میرج ہی کہلاتی تھی۔"

* "ملاقات ہوئی تھی یا روایتی شوہر کی طرح پہلی رات کو گھونگھٹ اٹھا کر چہرہ دیکھا تھا؟"

☆ "ثنا میری خالہ کی بیٹی ہے اور ظاہر ہے کہ میں اسے بچپن سے دیکھتا آ رہا ہوں..... اور گھر والوں نے مجھے کہا کہ ہماری یہ مرضی ہے کہ ہم ثنا کو تمہاری دلہن بنائیں۔ اب تم بتاؤ کہ تمہاری کیا مرضی ہے تو میں نے مشرقی لڑکوں کی طرح ہاں کر دی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ فیصلہ مجھے پسند آیا تھا کیونکہ مجھے بڑوں کے فیصلے میں کوئی برائی نظر نہیں آئی۔ ویسے تو پرفیکٹ تو کوئی بھی نہیں ہوتا اور آپس میں کمپرومائز کرنا پڑتا ہے۔ ایک دوسرے کی خامیوں کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔"

* "خالہ کی بیٹی کو تو آپ نے دیکھا ہی تھا لیکن جب بات پکی ہو گئی تو پھر ملاقاتوں کا سلسلہ رہا؟ منگنی کتنا عرصہ رہی؟"

☆ "ہماری منگنی تین سال رہی اور آپ کو یہ سن کر بہت حیرت ہوگی کہ ہمارے یہاں جب بات پکی ہو جاتی ہے تو فون پر بھی بات کرنے کی اجازت نہیں ہوتی..... ملنا جلنا تو بہت دور کی بات ہے۔ تو تین سال تک ملاقات نہیں ہوئی اور پھر جب 16 فروری کو ہمارا نکاح ہو گیا تب پھر میں نے ان سے بات کی۔"

* "لو جی، منگنی کے بعد ہی تو ایک دوسرے کو پرکھنے اور سمجھنے کا پریڈ شروع ہوتا ہے اور یہ پریڈ آپ نے ایسے ہی گنوا دیا؟"

☆ "بحیثیت کزن کے تو میں اچھی طرح جانتا تھا اور وہ مجھے اچھی طرح جانتی تھیں..... لیکن کیا کریں ہمارے گھر کی جو رسم ہے کہ منگنی کے بعد نہ ملنا نہ بات کرنا ہے تو اس کی پاسداری تو کرنی ہی تھی۔"

* "شادی دھوم دھام سے ہوئی اور پرستاروں نے شرکت اور تحفے بھی دیے ہوں گے؟"

☆ "جی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی اور آدھے سے زیادہ مہمان تو میرے پرستار ہی تھے اور مجھے نہیں پتا کہ میری شادی کا دعوت نامہ کہاں کہاں تک پہنچ گیا اور کس طرح لوگوں نے شرکت کر لی اور دلچسپ بات تو یہ کہ پاکستان سے باہر رہنے والوں کو بھی میری شادی کا علم ہو گیا تھا اور وہاں شرکت کرنے والوں نے تحفے بھی دیے جو کہ ایک عام رواج ہے۔"

* "شادی کی رسموں میں کون سی رسم بور لگی اور کون سی انجوائے کی؟"

☆ "بور کرنے والی تو کوئی رسم نہیں تھی۔ البتہ ایک رسم ایسی تھی کہ جو میں نے بہت انجوائے کی۔ ہمارے یہاں ایک رسم ہے کہ ایک بڑے "تھال" میں دودھ اور پھول کی پتیاں ڈال کر ایک انگوٹھی ڈال دی تھی کہ دلہن دولہا میں جو اس انگوٹھی کو ڈھونڈے گا ساری عمر اس کی حکمرانی چلے گی..... اسی کا حکم چلے گا..... اور

بقیہ صفحہ 255 پر

نبیلہ عزیز

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں' مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خود کشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے' جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

ل اور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دلاتی ہیں۔

۹

نویں قسط

جودت کی نظریں مسکرا کر دیکھنے والی فاطمہ پہ نہیں بلکہ چادر درست کرتے ہوئے سمٹنے والی مریم پہ تھیں، وہ سائم اور کامی وغیرہ کے ساتھ چلتا ہوا قریب آگیا تھا۔

"ہیلو ڈیئر! ہیپی برتھ ڈے اینڈ مینی مینی ہیپی ریٹرن آف دی ڈے۔" سائم دو دن بعد گھر آیا تھا اس لیے اسے بہن کو وش کرنے کا موقع ابھی مل رہا تھا۔

"میری طرف سے بھی ہیپی برتھ ڈے۔" کامی نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بس؟" فاطمہ نے آنکھیں پھیلائیں۔

"کیوں؟ کچھ اور بھی کہنا چاہیے؟" کامی نے معصومیت سے پوچھا۔ سائم مسکراہٹ دبا گیا۔

"کہنا نہیں چاہیے بلکہ دینا چاہیے۔"

"کیا دینا چاہیے؟" کامی انجان بن رہا تھا۔

"گفٹ، میرا برتھ ڈے کا گفٹ۔" وہ زور دے کر بولی۔

"اچھا! برتھ ڈے پہ گفٹ بھی دیتے ہیں؟" وہ حیرانی سے کہہ رہا تھا۔

"ہاں! اس نے کبھی کسی کو دیا ہو تب نا؟" سائم نے چوٹ کی۔

"بس بس زیادہ طنز مت کر، دے دوں گا، تمہارے سارے گفٹس لوٹا دوں گا۔"

"کب؟" سائم تیزی سے بولا۔

"جب میں اپنے پیروں پہ کھڑا ہو گیا۔" اس نے سکون سے جواب دیا۔

"تو کیا اب تو ہاتھی کے پیروں پہ کھڑا ہے؟" سائم کاٹ کھانے کو دوڑا تھا۔

"تو مجھے چھوڑ اس کی بات کر، جو ہر وقت دل کے پیروں پہ کھڑا رہتا ہے۔ جس طرف دل چاہتا ہے اسی طرف چل پڑتا ہے۔" کامی نے معنی خیزی سے آنکھ دباتے ہوئے سائم کے کان میں سرگوشی کی، تب سائم نے چونک کر دیکھا اور اسے جودت کی چپ اور محویت کا احساس ہوا تھا۔ سائم کو دیکھنے پہ فاطمہ بھی متوجہ ہوئی۔

"جودت!" سائم نے اسے کہنی مارتے ہوئے متوجہ کیا۔

"ہوں؟"

"فاطمہ کو وش نہیں کرو گے؟" سائم چبا کے کہہ رہا تھا۔

"ہوں... ہاں ہیپی برتھ ڈے۔" اس نے چونکتے ہوئے ان کو دیکھا اور پھر فاطمہ کو وش کرنے کی فارمیلٹی نبھائی۔

"تھینک یو۔" فاطمہ کا تھینکس خفگی لیے ہوئے تھا۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہوں! ابھی تک تو ٹھیک ہی تھی، لیکن اب..." وہ بات ادھوری چھوڑتے ہوئے سر جھٹکنے لگا۔

"آیئے تو پھر اندر چلتے ہیں۔" فاطمہ نے اندر کی طرف اشارہ کیا اور مریم کو ساتھ لے کر اندر آ گئی، اس نے ان لوگوں کا مریم کے ساتھ تعارف بھی نہیں کروایا تھا اور مریم جو وہاں کھڑے کھڑے اس لڑکے کی بے باک نظروں سے بچنے کی ناکام کوششیں کر رہی تھی وہاں سے ہٹتے ہی اس نے شکر ادا کیا تھا۔ ان کے پیچھے سائم اور کامی بھی اندر کی طرف بڑھ رہے تھے کہ جودت نے سائم کو شرٹ سے پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا۔

"بات سنو۔" جودت سنجیدگی سے بول رہا تھا۔

"سناؤ۔"

"یہ لڑکی کون ہے؟"

"فاطمہ کی فرینڈ ہے۔"

"پہلے تو کبھی نہیں دیکھا؟"

"پہلے وہ کبھی آئی بھی تو نہیں، اگر آتی بھی ہے تو سالوں بعد۔" سائم نے کندھے اچکائے۔

"مڈل کلاس سے لگتی ہے۔" جودت نے اندازہ لگایا۔

"تمہیں کوئی پرابلم ہے؟"

"پرابلم تو ہے نا، مڈل کلاس کی لڑکیاں مشکل میں ڈال دیتی ہیں۔" جودت نے بال کھجاتے ہوئے کہا۔

"جودت اپنی سوچ کو لگام دو۔" سائم نے اسے سرزنش کرتے ہوئے باز رکھنا چاہا۔ جبکہ جودت ڈھٹائی سے مسکرا دیا تھا۔

"میری سوچ کو بے لگام کرنے والے بھی تو تم ہی ہو؟" جودت اسے کچھ جتا رہا تھا۔

"خیر چھوڑو اس بات کو، چلو اندر چلتے ہیں۔" سائم بات کو ٹال رہا تھا۔

"چلتے ہیں، پہلے نام بتاؤ۔" جودت ہنوز اپنی جگہ پہ کھڑا تھا۔

"نام؟"

"ہوں! اس لڑکی کا۔" جودت نے اندر کی طرف اشارہ کیا۔

"جودت یہ کیا بے ہودگی ہے؟"

"نام پوچھنا بے ہودگی ہے۔ حیرت ہے؟" جودت حیرانی سے کہہ رہا تھا۔

"ارے چلو یار کس تکرار میں الجھ گئے ہو؟" کامی پلٹ کر ان دونوں کے پاس آگیا۔

"اس سے نام پوچھ رہا ہوں لیکن یہ بتا ہی نہیں رہا۔" جودت اپنی بات پہ ڈٹا ہوا تھا۔

"تمہیں نام سے کیا مطلب؟" سائم گھور رہا تھا۔

"تم نام بتاؤ، مطلب میں بتا دوں گا۔" وہ انتہائی سکون سے کہہ رہا تھا سائم کو غصہ تو آیا لیکن پھر دبا گیا تھا۔

"اگر نہ بتاؤں تو؟"

"تو میرا اندر جانے کا کوئی فائدہ نہیں میں یہیں سے واپس چلا جاتا ہوں۔" وہ بھی اپنی ضد کا پکا تھا سائم جھنجلا گیا۔

"او وہ کم آن یار، ذرا سی بات کو خوامخواہ ایشو بنا رہے ہو تم۔"

"ایشو میں نہیں تم بنا رہے ہو، اس لڑکی کا نام ہی تو پوچھا ہے، دام تو نہیں پوچھا۔" جودت بھی جھنجلا کے بولا تھا۔

"جودت۔" سائم نے پھر غصے سے دیکھا۔

"نام بتا دو فائدے میں رہو گے۔" جودت مسکرا رہا تھا۔

"یار وہ بہن کی دوست ہے، کچھ شرم کرو۔"

"او کے میں شرم کر لیتا ہوں، چلا جاتا ہوں یہاں سے۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔ اور قدم واپس موڑ لیے تھے۔

"مریم نام ہے اس کا۔" سائم نے بالآخر ہتھیار ڈال دیے تھے وہ جودت کی ناراضی مول نہیں لے سکتا تھا دونوں کی بچپن کی دوستی تھی ایک دوسرے کا اچھا برا بھی برداشت کرنا پڑ ہی جاتا تھا جیسے اس وقت جودت کی ضد کے آگے ہار ماننا پڑی تھی اور نہ چاہتے ہوئے بھی اسے نام بتانا پڑا تھا۔

"تھینک یو یار! تم واقعی ایک اچھے دوست ہو۔" جودت اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرایا۔

"لیکن تم ذرا بھی اچھے دوست نہیں ہو' بات بات پہ تڑی دکھاتے ہو۔" سائم دانت پیس کے بولا تھا۔ جواباً" جودت قہقہہ لگاتے ہوئے اس کے ساتھ اندر آگیا تھا اور مہمانوں کی آمد بھی شروع ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ انہیں سیدھا فوڈ اسٹریٹ لے کر آیا تھا اور لاہور کے فوڈ اسٹریٹ تو ماشاءاللہ حیران کن حد تک بارونق اور گہما گہمی سے مالا مال تھے جگمگاتی روشنیاں طرح طرح کے لوگ اور طرح طرح کے کھانے مدحیہ واقعی حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ جبکہ کھانوں کی مہک نے سوئی ہوئی بھوک کو جگا دیا تھا۔

"بیٹھو یہاں۔" دل آور نے ایک کرسی کھینچ کر مدحیہ کو بیٹھنے کا کہا۔

"تھینک یو۔" وہ حیران سی کہتی ہوئی کرسی پہ بیٹھ گئی۔ پھر وہ دونوں بھی بیٹھ گئے تھے۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" دل آور نے پوچھا چہرے پہ مسکراہٹ تھی۔

"یہ سارا ماحول اور یہاں کی ارینج منٹ وغیرہ دیکھ رہی ہوں۔" اس نے اپنی حیرانی کا اظہار کیا۔

اس کی حیرانی کی وجہ یہاں کی عورتیں اور لڑکیاں تھیں' فیشن ایبل اور ماڈرن' بغیر کسی دوپٹے کے اور بغیر کسی حجاب کے کسی نے ہاف سلیوز پہن رکھی تھی اور کئی سلیولیس تھیں۔ ان کی شرٹس کے گلے بیک اور فرنٹ سے ایک جیسے ڈیپ تھے' ٹراؤزر کے پائنچے ٹخنوں سے کئی انچ اوپر تھے اتنے کہ گوری پنڈلیاں کئی منچلوں کے دل بہلا رہی تھیں' کھلے بال اور میک اپ سے سجے چہرے' مدحیہ کو ہلکا سا شاک لگا تھا کہ یہ پاکستان ہے؟

"اگر پاکستان کا یہ حال ہے تو پھر یورپ کو کیوں بدنام کر رکھا ہے کہ وہاں بے حیائی ہو رہی ہے؟ کیا یہ ہیں وہ مشرقی عورتیں جن کی مغرب میں دھوم مچی ہوتی ہے؟ مشرقی عورت' مشرقی عورت اور مشرقی عورت۔ کمال ہے ایسی مبالغہ آرائی؟" مدحیہ مسلسل سوچ میں گم تھی۔

"مدحیہ کیا سوچ رہی ہو؟" دل آور نے ٹیبل بجا کر اسے متوجہ کیا تھا۔

"صرف سوچ ہی نہیں رہی' دیکھ بھی رہی ہوں۔" وہ استہزائیہ بولی۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟"

"آپ کی فیورٹ عورتیں' یعنی مشرقی عورتیں۔" اس نے تمسخرانہ لہجے میں کہہ کر اشارہ کیا دل آور نے چونک کر اس کی نظر کے تعاقب میں دیکھا تھا ایک لڑکی اور ایک لڑکا ایک ہی پلیٹ میں کھانا کھاتے ہوئے ہنس رہے تھے اور ان کی آپس میں چھیڑ چھاڑ بھی جاری تھی دل آور کے چہرے کی رنگت سرخ پڑ گئی تھی۔

"تم ادھر میری جگہ پہ آجاؤ۔" وہ اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا یہ بات نبیل کہتا تو شاید وہ ضد پہ اڑ جاتی لیکن کہنے والا دل آور شاہ تھا۔

"کیا جگہ چینج کرنے سے ماحول بھی چینج ہو جائے گا؟" وہ طنز کرنے سے باز نہ آئی۔

"دیکھو مدحیہ پورا پاکستان ایک جیسا تو نہیں ہے نا؟ یہ امیر گھروں کی بگڑی ہوئی لڑکیاں ہیں۔"

"تو آپ مجھے کسی ایسی جگہ لے جاتے جہاں غریب گھروں کی سلجھی ہوئی لڑکیاں ہوتیں؟" مدحیہ اپنی طرف سے طنز کر رہی تھی کہ سب ایسی ہی ہیں۔

"مجھے تو لگ رہا ہے پاکستان نے فیشن کے سوا اور کسی کام میں ترقی نہیں کی؟" وہ دل کھول کے بھڑاس نکال رہی تھی۔

"یہ بحث کا وقت نہیں ہے میری جان کھانا کھاؤ۔" دل آور بحث کو ٹال گیا تھا ورنہ وہ تو ماہر تھا اس کام میں اسے تو بس موقع چاہیے تھا۔

"اپنا موبائل دیں گے مجھے؟" وہ کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو مدحیہ نے اس کا موبائل مانگا تھا۔

☼ ☼ ☼

تمہیں غیروں سے کب فرصت ہم اپنے غم سے کب خالی
چلو بس ہو چکا ملنا' نہ تم خالی' نہ ہم خالی

اپنی ڈائری سے شعر پڑھتے ہوئے اس کے دل سے عجب ہوک نکلی تھی اور وہ ڈائری بند کر کے رائٹنگ ٹیبل کے سامنے سے اٹھ گئی اس کا رخ ونڈو کی طرف تھا۔ اس نے آگے بڑھتے ہوئے دونوں پٹ کھول دیئے باہر دن میں رات چھائی ہوئی لگ رہی تھی گہرے سرمئی بادلوں نے پورے ماحول کو سرمئی بنا دیا تھا۔ زری اس سرمئی ماحول کو دیکھتی ہوئی بے وجہ ہی اداس ہونے لگی تھی شاید اسے اس سرمئی رنگ سے کسی کے سرمئی رنگ کے لباس کا خیال آگیا تھا اور لباس کے ساتھ اور بہت کچھ بھی' جن کو سوچتے ہوئے اس نے کھڑکی کے کھلے پٹ سے سر ٹکاتے ہوئے آنکھیں موند لی تھیں۔

"اتنی ٹھنڈ میں کیوں کھڑی ہیں؟ کیا بیمار ہونے کا ارادہ ہے؟" وہ جاتے جاتے دو پل کے لیے ٹھہرا تھا اس کے پاس اور زری کو لگا اس کے پاس پوری کائنات ٹھہر گئی ہو اور اس نے پلکیں اٹھا کر اس کو دھڑکتی نظروں سے دیکھا تھا۔

"بیمار ہو بھی جاؤں تو کون سا میری عیادت کو کوئی آجائے گا۔" بس زری کا اتنا سا کہنا تھا کہ اس نے نظریں چرا لی تھیں۔

"کسی کی عیادت کے لالچ میں خود کو بیمار کرنا سراسر بے وقوفی ہے' کیونکہ اس طرح بیماری طویل بھی ہو سکتی ہے' میرا مطلب ہے کہ عیادت کرنے والا نہیں بھی آسکتا۔" وہ اپنی بات پہ زور دے کر بولا۔

"آجائے گا تو کیا بگڑے گا اس کا' بلکہ کسی کی طبیعت ہی سنبھل جائے گی؟" زری اپنی بات پہ زور دے رہی تھی۔

"طبیعت سنبھل جائے گی لیکن حالات بگڑ جائیں گے۔"

"حالات؟" وہ نا سمجھی سے پوچھ رہی تھی۔

"خیر چھوڑیں آپ نہیں سمجھیں گی' اندر چلی جائیں ٹھنڈ بہت ہے۔" وہ واپس جا رہا تھا زری اس کے ہاتھ میں گاڑی کی چابی دیکھ چکی تھی۔

"ٹھنڈ تو واقعی بہت ہے آپ بھی تو باہر جا رہے ہیں؟" زری نے فوراً" کہا لیکن وہ خاموش ہی رہا۔

آج وہ سرمئی رنگ کے شلوار قمیص میں ملبوس اپنی تمام مردانہ وجاہتوں سمیت عبداللہ اور نبیل کے ساتھ بیٹھے ہوئے بھی نمایاں لگ رہا تھا زری کا دل کئی بار دھڑکنے پہ مجبور ہوا تھا۔ اور اس وقت بھی وہ اسے ہی سوچنے پہ مجبور تھی دل کسی اور طرف راغب ہی نہیں ہو تا تھا۔ اور ابھی نجانے وہ اور کتنا سوچتی کہ اس کے موبائل پہ بیل ہونے لگی پہلے وہ اگنور کرتی رہی لیکن جب مسلسل رنگ ہوئی تو اسے کھڑکی سے ہٹ کے بیڈ کے قریب آنا ہی پڑا لیکن جیسے ہی اس نے موبائل اسکرین پہ نمبر دیکھا اس کی آنکھیں بے یقینی سے پھیل گئی تھیں اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ "دل آور شاہ کالنگ" وہ موبائل اسکرین کو ہی دیکھے جا رہی تھی دل کی دھڑکنیں معمول پہ آتیں تو وہ کال سننے کا سوچتی اور بالآخر کال خود ہی بند ہو گئی۔

"نہیں؟ یہ کیا ہوا ہے۔" اس کا دل دھک سے رہ گیا وہ پاس آ کے چلا گیا زری کے روئیں روئیں میں بے چینی کا

ابال اٹھا تھا۔ لیکن شکر تھا کہ کال دوبارہ آگئی اس نے ایک ہاتھ سینے پہ رکھا اور سنبھل کے بیڈ پہ بیٹھ گئی کیونکہ ٹانگوں میں خوشی کے مارے سکت نہیں رہی تھی۔ اور یونہی دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے یس کا بٹن پریس کیا تھا۔

"السلام علیکم۔" اس کا سلام بھی لرز رہا تھا۔

"وعلیکم السلام یہ مدحیہ آپ کو کال کر رہی تھی۔ اس سے بات کریں۔" وہی دل پہ دھمک چھوڑتی ہوئی بھاری گمبھیر آواز زری کی سماعتوں میں اتری اور گم ہو گئی۔

"ہیلو۔" اب مدحیہ کی آواز سنائی دی تھی۔

"السلام علیکم۔" زری نے مشکل خود کو کمپوز کیا تھا ورنہ دل و دماغ تو منتشر ہی تھے۔ وہ اس کے دل و دماغ کو ستا کے رکھ گیا تھا۔

"وعلیکم السلام! کیسی ہو؟"

"اداس۔"

"کیوں؟ اداس کیوں؟"

"بس اکیلے دل نہیں لگ رہا۔"

"پاکستان آجاؤ۔"

"کوشش تو یہی ہے۔ بس ایگزامز کا انتظار ہے۔" زری اداسی سے بولی۔

"خیر تم سناؤ اتنے دنوں بعد آج کانٹیکٹ کر رہی ہو؟ کیا وجہ تھی؟" زری نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس ابھی میرا اپنا سیل نمبر نہیں ہے ہو سکتا ہے آج ہی لے لوں، آج ہم دل آور بھائی کے ساتھ لاہور گھومنے کے لیے نکلے ہوئے ہیں ابھی ابھی فوڈ اسٹریٹ سے کھانا کھایا ہے اور لاہور کے دلچسپ نظارے دیکھے ہیں۔" مدحیہ کہتے کہتے استہزائیہ انداز پہ اتر آئی تھی۔

"دلچسپ نظارے کیا مطلب؟"

"ارے وہی جن کو آپ لوگ مشرقی نظارے کہتے ہیں۔" مدحیہ ایک ہی بات پہ اڑی ہوئی تھی۔

"مدحیہ تم بھول رہی ہو کہ ہر ملک میں رہنے والے لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے' اچھے برے انسان تو ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔" زری نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"مجھے مت سمجھاؤ زری' میں سمجھنے والی نہیں ہوں' میں نے تو تمہیں اس لیے کال کی ہے تاکہ تمہیں تمہارے پاکستان کا حال لائیو سناؤں۔" مدحیہ کا انداز طنز لیے ہوئے تھا۔

"چار سالوں میں میری یادداشت اتنی کمزور نہیں ہوئی کہ میں اپنے وطن کا حال بھول جاؤں۔ بے شک میں یہاں رہ رہی ہوں لیکن میری جڑیں تو پاکستان میں ہی ہیں نا؟ میں نے لوٹ کر تو وہیں آنا ہے نا؟ اب اپنی فیملی کو ہی دیکھ لو' کتنے سال یہاں گزارے لیکن اپنے اصل کی طرف لوٹ گئے' پاکستان ہمارا اصل ہے اور اصل چاہے اچھا ہو چاہے برا' آخر قبول کرنا ہی پڑتا ہے۔" محبت کی باتیں کرنے والی زری ملک کی باتیں کر رہی تھی مدحیہ کو سن کر تعجب ہوا تھا۔

"ماشاء اللہ کافی اچھا بول لیتی ہو۔"

"تھینک یو۔" زری نے اس کے طنز کا جواب خفگی سے دیا تھا۔

"باقی سب کیسے ہیں؟" مدحیہ کو سب کا پوچھنے کا خیال آ ہی گیا تھا۔

"سب ٹھیک ہیں عبداللہ بھائی آفس گئے ہیں بھابھی اپنے پیرنٹس سے ملنے اور میں گھر پہ۔"

"[illegible] تم وہاں بور ہو رہی ہوگی؟ شاید اداسی بھی اسی لیے ہے؟"

"ہونہہ! اداسی کس کے لیے ہے' کسی کو پتا ہی نہیں۔" وہ دھیمے سے بولی۔

"کیا مطلب؟" مدحیہ چونک گئی۔

"مطلب کسی کے سمجھانے سے سمجھ نہیں آتا مدحیہ جانی۔" زری ہلکے سے ہنسی۔

"تم چھپا رہی ہو زری؟"

"چھپے ہوئے کو چھپانا کیسا؟"

"لیکن زری تم نے جو بات کہی ہے وہ۔"

"ارے مدحیہ یاد آیا کہ مجھے یونیورسٹی میں وہ جیزی ملا تھا۔" زری بات ٹال دینا چاہتی تھی۔

"جیزی کو گولی مارو' اپنی بات کہو۔"

"میری کوئی بات ہوگی تو تمہیں ہی بتاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے زری تم مجھے ٹال رہی ہو اور میں ٹل جاتی ہوں' لیکن اتنا یاد رکھنا کہ اگر تمہیں کچھ کہنا ہو تو مدحیہ حاضر ہے۔" مدحیہ نے بڑے سوبر سے لب و لہجہ اور انداز میں کہا تھا زری کو اس کے انداز پہ بے ساختہ پیار آگیا تھا۔

"تھینک یو سو مچ ڈیئر اینڈ آئی مس یو ویری مچ۔" زری نے کھل کے اظہار کیا تھا۔

"سیم ہیئر۔" وہ بھی جواباً آہستگی سے بولی۔

"تمہارے فرینڈز بھی تمہیں بہت مس کر رہے ہیں جیزی تمہارا پوچھنے آیا تھا میں نے اسے کہا کہ مدحیہ تم لوگوں سے خود کانٹیکٹ کر لے گی وہ تمہارے گھر کا لینڈ لائن نمبر مانگ رہا تھا لیکن تمہاری اجازت کے بغیر میں نے اسے نمبر نہیں دیا۔" زری اسے تفصیل سے بتا رہی تھی۔

"اوکے اچھا کیا ہے۔"

"اوکے۔" زری دھیمے سے بولی۔

"اچھا زری ہم ذرا مارکیٹ کی طرف نکل رہے ہیں تم سے بعد میں بات کروں گی دل آور بھائی میری باتوں کے ختم ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔" مدحیہ الوداعی کلمات ادا کرتے ہوئے بولی۔

"اوکے ایز یو وش' سب کو میرا سلام کہنا۔"

"ٹھیک ہے کہہ دوں گی لیکن یار جاتے جاتے ایک شعر تو سنا دو۔ بہت دنوں سے میں تمہارے اشعار کو مس کر رہی ہوں۔" مدحیہ تیزی سے بولی زری کا دل مدھم تال پہ دھڑکا!

تم سے کیا کہیں جاناں اس قدر جھمیلے میں
ہو سکے تو سن جاؤ ایک دن اکیلے میں

دھیمی بوجھل آواز میں کہہ کر اس نے فون بند کر دیا لیکن اسے یہ نہیں پتا تھا کہ مدحیہ کے پاس کھڑے دل آور نے بھی اس کا یہ شعر با آسانی سنا ہے کیونکہ فون کا والیوم بلند تھا اتنے شور ہنگامے میں مدھم والیوم سے بات بھی تو نہیں سنی جا سکتی تھی۔؟ لیکن جو کچھ بھی تھا آج وہ اس کی آواز کے ذرا سے امرت سے ہی جی اٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

"فاطمہ میری بات سنو۔" مریم نے پاس سے گزرتی فاطمہ کا ہاتھ پکڑ کر روک دیا تھا وہ اپنے مہمان اٹینڈ کرتی پھر رہی تھی اور مریم کونے والی کرسی پہ بیٹھی اس لڑکے کی نظروں سے بچنے کی کوششیں کر رہی تھی جو مسلسل اسے ہی

دیکھے جارہا تھا۔

"کیا بات ہے؟" فاطمہ ذرا ٹھہر کر متوجہ ہوئی۔

"میں نے عدیل بھائی کو فون کرنا تھا وہ مجھے پک کرنے آجاتے۔"

"اس کے پاس موبائل ہے؟"

"نہیں! کوثر باجی کے گھر فون کر کے پیغام دینا تھا۔"

"ان کو زحمت دینے کی کیا ضرورت ہے، تھوڑی دیر بعد مہمان کھانا کھالیں تو میں خود تمہیں ڈراپ کر آؤں گی۔"

"نہیں عدیل بھائی نے کہا تھا کہ وہ مجھے لینے کے لیے آجائیں گے۔"

"تو ٹھیک ہے پھر انتظار کرو، ان کے آنے کا۔"

"لیکن فاطمہ میں اکیلی بیٹھی کیا کروں گی؟ تم کیک کاٹ چکی ہو اس لیے مجھے اب گھر جانا چاہیے۔" مریم اسے کیا بتاتی کہ اس جودت نام کے لڑکے نے اسے دیکھ دیکھ کر اپنی نظروں سے ہی زچ کردیا ہے۔

"کھانا کھالیا تم نے؟"

"نہیں میں کھانا کھا کر آئی تھی۔"

"کیوں؟ میرے گھر کے کھانے میں زہر ملا ہوا تھا کہ تمہارا بھائی بھی بھاگ گیا اور تم بھی کھانا کھائے بغیر جارہی ہو۔" فاطمہ جب غصے میں ہوتی تو اسی طرح جو منہ میں آتا کہہ جاتی تھی۔

"پلیز فاطمہ! کیوں ذرا ذرا سی بات پہ اتنی بدگمان ہو جاتی ہو؟" مریم خفگی سے بولی۔

"تم جب غیریت برتتی ہو تبھی مجھے بدگمانی ہوتی ہے۔" فاطمہ کا غصہ عروج پہ تھا۔

"دیکھو فاطمہ میں اگر غیریت برتتی تو تمہارے بلانے پہ اس وقت تمہارے گھر نہ آتی حالانکہ تم جانتی ہو کہ میں کہیں بھی آتی جاتی نہیں ہوں خصوصاً رات کے وقت تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا لیکن پھر بھی تمہاری خاطر آگئی اور تم ہو کہ ابھی بھی بدگمان ہو رہی ہو؟" مریم نے افسوس سے کہا تھا فاطمہ کچھ دیر کے لیے چپ ہو گئی تھی۔ مریم اگر اس کے لیے اس وقت یہاں تک آگئی تھی تو بڑی بات تھی۔

"ہیلو ڈیئر! کیا ہو رہا ہے؟" فاطمہ کی ایک اور فرینڈ پاس آگئی تھی۔

"نتھنگ اسپیشل، تم سناؤ کھانا کھالیا؟"

"آف کورس کھانا کھا کر ہی تمہارے پاس آئی ہوں۔" اور ذرا فاصلے پہ کھڑا جودت اپنے دھیان میں آگے بڑھا تھا کہ ویٹر سے ٹکرا گیا اور کولڈ ڈرنک کے گلاسوں سے بھی ٹرے جودت پہ ہی الٹ گئی تھی اس کی شرٹ رنگ برنگے مشروب الٹنے سے رنگین ہو گئی تھی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟ تم دیکھ کر نہیں چل سکتے؟" جودت نے اپنی غلطی ویٹر کے سر ڈال دی۔

"جودت کول ڈاؤن یار سارے مہمان دیکھ رہے ہیں۔" صائم لپک کے پاس آیا تھا اور اسے مزید غصہ نکالنے سے روکا۔

"میری ساری شرٹ خراب ہو گئی ہے اور تم۔۔۔"

"یار پلیز! کیوں تماشا بنا رہے ہو؟ تم میرے بیڈ روم میں جا کر میری شرٹ پہن لو، آؤ میرے ساتھ۔" صائم نے بمشکل اسے ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کی۔

"غلطی تمہاری تھی، تمہاری نظریں کہیں اور لگی ہوئی ہیں، اس کا بھلا کیا قصور ہے؟" صائم نے جودت کو مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی روک دیا تھا۔ اور پھر اپنے ساتھ بیڈ روم میں لے گیا۔

"بی بی جی! باہر کوئی عدیل صاحب آئے ہیں۔" ملازمہ نے اندر آکر فاطمہ کو اطلاع دی۔
"ان سے کہو اندر آجائیں۔"
"کہا تھا بی بی جی، لیکن وہ کہتے ہیں کہ وہ جلدی میں ہیں۔ مریم بی بی کو باہر بھیجو۔" ملازمہ نے عدیل کا جواب ایڈوانس میں ہی پوچھ لیا تھا۔
"میں چلتی ہوں فاطمہ۔" مریم نے جانے کے لیے پر تولے۔
"چلو۔" فاطمہ اسے اشارہ کرتی اس کے ساتھ باہر نکل آئی تھی۔
"السلام علیکم۔" مریم کے ساتھ فاطمہ کو آتے دیکھ کر عدیل سیدھا کھڑا ہو گیا۔
"وعلیکم السلام مجھے دراصل آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا اس لیے یہاں تک آئی ہوں۔" فاطمہ کا انداز طنزیہ تھا۔
"شکریہ کس بات کا؟"
"مریم کو لے کر آنے کا۔"
"اس میں شکریے کی کیا بات ہے؟ آپ دونوں فرینڈز ہیں ایک دوسرے سے ملنے کا حق بنتا ہے۔" عدیل نے نارمل سے لہجے میں کہا۔
"کیا انسانوں کے حقوق بھی جانتے ہیں آپ؟"
"فاطمہ کافی ٹائم ہو چکا ہے، ہمیں اب چلنا چاہیے۔" مریم نے بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش کی۔
"واقعی چلنا چاہیے، اوکے گڈ بائے۔" فاطمہ پلٹ گئی۔
"سنیے۔" عدیل نے پکارا۔
"وش یو ہیپی برتھ ڈے۔" جاتے جاتے وہ اس کا شکوہ دور کر گیا تھا فاطمہ پیچھے دیکھتی رہ گئی وہ بائیک کو کک لگاتے ہوئے چند سیکنڈز بعد نظروں سے اوجھل ہو گیا وہ ابھی وہیں کھڑی تھی کہ اتنے میں جودت عجلت میں تقریباً بھاگتا ہوا باہر آیا تھا لیکن باہر فاطمہ اکیلی کھڑی تھی... گویا وہ جا چکی تھی جودت اپنی گاڑی کے بونٹ پہ مکا رسید کر کے رہ گیا اور دوسری ٹھوکر ٹائر کو دے ماری تھی اس کا چانس مس ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

سبز گھاس پہ شبنم کے قطرے رات بھر رونے کی نشانی تھی اور وہ رات کے آنسوؤں میں پاؤں بھگوتی پورے لان کی گھاس کو اپنے سفید کبوتر سے پاؤں کا نرم لمس بخشتے ہوئے مسلسل چہل قدمی میں مصروف تھی۔ سبز گھاس کا قالین اس کے پیروں تلے دب رہا تھا اور پھولوں کی دلفریب خوشبو اس کے پیروں کی پازیب بنی جا رہی تھی جس طرف قدم اٹھ رہے تھے اسی طرف مہک کے جھونکے چل رہے تھے۔
"کوئی کانٹا لگ جائے گا علیزے۔" آذر اسے منع کیے بغیر نہ رہ سکا۔
"یہاں کوئی کانٹا نہیں ہے آذر بھائی۔" علیزے اس کی آواز پہ مسکرا کر پلٹی تھی۔
"تمہیں کیسے پتا کہ یہاں کوئی کانٹا نہیں ہے؟"
"میں کافی دیر سے یہیں ٹہل رہی ہوں۔"
"لیکن ننگے پیر ٹہلنے کی کیا ضرورت ہے؟"
"آپ بھی ایک بار جوتے اتار کے دیکھیں پھر آپ کو پتا چلے گا کہ ننگے پیر ٹہلنے کی کیا ضرورت ہے۔" علیزے نے مسکراتے ہوئے اسے مشورہ دیا۔

"میں جوتے اتار کے دیکھوں؟" آذر دلچسپی سے ہنسا۔
"آف کورس آپ سے ہی کہہ رہی ہوں۔" علیزے نے اصرار کیا تھا اور آذر نے بھی دلچسپی سے مسکراتے ہوئے اپنے جاگرز اتارے اور اس کے ساتھ گھاس پہ ننگے پیر ٹہلنے لگا۔
ٹھنڈی شبنم کے قطرے پیروں میں گدگدی کرنے لگے دھیمی مسکراہٹ آپ ہی آپ لبوں کا احاطہ کرنے لگی تھی اور اسے دیکھ کر علیزے ہنس پڑی۔
"کیسا لگ رہا ہے؟"
"بہت اچھا۔"
"کبھی کبھی میرا موڈ اچھا ہو تو میں یونہی ننگے پیر چہل قدمی کرتے ہوئے بہت انجوائے کرتی ہوں۔"
"اوہ تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ آج تمہارا موڈ اچھا ہے؟"
"ہوں۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
"وجہ؟"
"نہیں ایسے ہی۔"
"حیرت ہے بغیر وجہ کے موڈ فریش ہے؟"
"بس کبھی کبھی انسان کی کیفیت ایسی ہو ہی جاتی ہے۔ نہ اپنی اداسی کا سبب پتا چلتا ہے اور نہ ہی خوشی کا۔" اس نے کندھے اچکائے۔
"لگتا ہے تم کالج جانے کے لیے خوش ہو؟" آذر نے اس کے دلکش چہرے کو اک نظر دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"لیکن ابھی تو میرے کالج جانے کا کوئی انتظام ہی نہیں ہوا۔ نہ گاڑی نہ ڈرائیور اور دو روز سے آپ بھی گھر پہ نہیں تھے۔"
"آج گاڑی کا انتظام بھی ہو جائے گا، ڈرائیور کے لیے تو ڈیڈ نے کسی کو کہہ دیا ہے، ہو سکتا ہے کہ آج ڈرائیور بھی آجائے، اس نے شام کو آنے کا کہا ہے۔" آذر نے اسے تسلی دی۔
علیزے چلتے چلتے ٹھہر گئی تھی اور آذر اسے دیکھ کر ٹھہر گیا تھا۔
"کیا ہوا؟" آذر اس کے چہرے پہ پریشانی کی پرچھائی دیکھ چکا تھا۔
"ایک بات پوچھوں آذر بھائی؟" اس کا لہجہ سنجیدہ تھا۔
"ہاں ہاں ضرور پوچھو۔" آذر ہمہ تن گوش ہوا۔
"آپ کو ابھی تک اس آدمی کا پتا نہیں چلا نا، جس نے فائرنگ کروائی تھی؟" علیزے بغور آذر کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی آذر ایک پل کے لیے تذبذب کا شکار ہو گیا تھا لیکن اس وقت اگر وہ علیزے کے سامنے اپنی ناکامی اور مایوسی ظاہر کرتا تو یقیناً وہ اندر سے پریشان اور ہراساں ہو جاتی اور آذر اسے ہراساں نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ کمزور دل کی لڑکی تھی، دوسرے لفظوں میں ڈرپوک اور بزدل بھی کہا جا سکتا تھا۔
"آذر بھائی۔؟" اس کی آواز آذر کو ہوش کی دنیا میں لے آئی۔
"ہوں؟"
"میں نے جو پوچھا ہے اس کا جواب دیں۔"
"دیکھو علیزے ایسی باتیں سب کے سامنے شو کرنے والی نہیں ہوتیں، ایسے معاملوں میں بہت احتیاط لازمی ہے۔ عورتوں کو بات بتانے سے بات پھیل جاتی ہے اسی لیے میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔" آذر کا انداز تسلی دینے والا تھا۔

"مطلب کہ آپ کو دشمن کا پتا چل چکا ہے؟"
"بالکل۔" آذر کو علیزے کی خاطر جھوٹ بولنا پڑا تھا۔
"کون ہے وہ؟"
"ایم سوری میری جان یہ نہیں بتا سکتا۔"
"آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ آپ کو خود بھی پتا نہیں ہے؟" علیزے بلا جھجک کہہ گئی آذر چونک گیا تھا۔
"یعنی تمہارے خیال میں، میں جھوٹ بول رہا ہوں؟" وہ الٹا اس پہ خفا ہونے لگا تھا۔
"نن نہیں میں یہ تو نہیں کہہ رہی۔" علیزے کو اپنی بے ساختگی اور بے یقینی پہ ندامت ہوئی تھی۔
"بہر حال تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بہت جلد وہ آدمی سامنے آجائے گا۔ بس کوشش یہی ہے کہ سارے ثبوت ہاتھ آجائیں۔" وہ بار بار علیزے کو تسلی دیتے ہوئے سمجھا رہا تھا۔
"اوکے دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے؟" اس نے کندھے اچکا دیے۔
"ہوں! چلو اندر چلتے ہیں' کافی ٹائم ہو رہا ہے میں نے ابھی آفس کے لیے تیار بھی ہونا ہے۔" آذر اسے کہتے ہوئے واپسی کے لیے پلٹا لیکن سامنے کومل کو دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا۔
"کومل۔"
"جی وہ میں آپ کو بلانے آئی تھی' آنی بلا رہی ہیں ناشتا تیار ہے۔" کومل نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا اس کی نظریں جھکیں تو ان دونوں کے پیروں پہ جا کر ٹھہر گئیں وہ دونوں گھاس پہ ننگے پیر کھڑے تھے علیزے کو تو نہیں البتہ آذر کو کومل کی نظریں بہت محسوس ہوئی تھیں۔ وہ آذر کے جواب سے پہلے ہی پلٹ کر اندر چلی گئی تھی جبکہ علیزے اس کے ساتھ ہی اندر آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

نبیل ابھی ناشتا کر کے فارغ ہوا ہی تھا کہ گیٹ پہ دل آور کی گاڑی کا ہارن سنائی دینے لگا وہ جلدی جلدی چائے کا کپ خالی کر کے کھڑا ہو گیا۔
"آپ کو اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے ابھی بتا دیجیے۔ آتے ہوئے لے آؤں گا۔" نبیل جاتے جاتے ٹھہر گیا۔
"نہیں بیٹا مجھے بھلا کس چیز کی ضرورت ہو گی؟ بس اپنے گھر کی ضرورت تھی اور گھر مل گیا۔" فائزہ بیگم گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولیں۔
"پلیز مام اداس نہ ہوا کریں۔" نبیل ان کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔
"جس ماں کا تم جیسا سمجھ دار محبت کرنے والا اور لائق فائق بیٹا ہو اسے بھلا اداس ہونے کی کیا ضرورت ہے؟" وہ اس کا ہاتھ تھپکتے ہوئے بولیں۔
"مجھے پتا ہے آپ کس لیے اداس ہوتی ہیں' لیکن مام آپ کو کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ اس اداسی اور اس انتظار کا کوئی فائدہ نہیں ہے' کچھ حاصل نہیں ہوتا ایسے انتظار اور اداسی سے۔" وہ ماں کی کیفیت کو کافی گہرائی سے سمجھتا تھا وہ جانتا تھا کہ وہ ممتاز حیات کی بے گانگی کا غم دل میں دھڑکن کی طرح لیے پھرتی ہیں جب جب دل دھڑکتا ہے تب تب غم بڑھتا ہے۔
"ایسی کوئی بات نہیں ہے بیٹا جاؤ تم' دل آور تمہارا انتظار کر رہا ہو گا۔" انہوں نے نبیل کو یاد دلایا۔
"او ہاں! اب تو وہ مجھے گالیاں بھی دے رہا ہو گا۔" نبیل سر پہ ہاتھ مارتے ہوئے پلٹا اور کرسی پہ رکھا اپنا نیوی بلیو

اس کا بریف کیس اٹھا کر باہر کی سمت لپکا تھا لیکن سامنے سے اس کا چوکیدار کوریڈور عبور کرتے ہوئے اندر آرہا تھا۔
"صاحب وہ دل آور صاحب کہہ رہے ہیں کہ کیا آپ زندہ ہیں؟" چوکیدار نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا تھا جس پہ نبیل بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا اور چوکیدار کے ساتھ ہی باہر نکل آیا تھا گیٹ کے سامنے ہی وہ اپنی طرف لیے کھڑا تھا چہرے پہ غصہ تھا۔
"دل آور صاحب سے کہو نبیل صاحب زندہ ہیں' اور آگئے ہیں۔" نبیل نے چوکیدار کو اشارہ کیا اور ذرا اونچی آواز سے کہا تھا تاکہ گاڑی میں بیٹھا دل آور بھی سن لے۔
"اب اور کتنا لیٹ کرو گے؟" وہ بالآخر رہ نہ سکا اور غصے سے بول پڑا۔
"یار تم تو ہر وقت جلدی میں ہی رہتے ہو' میں سوچتا ہوں اپنی بیوی کے ساتھ نجانے کیا کرو گے؟ نہ پیار کرو گے' نہ اظہار کرو گے' نہ ہی اس کا انتظار کرو گے' بے چاری روئے گی اپنے نصیب پہ۔" نبیل فرنٹ سیٹ پہ بیٹھا دل آور کی ہونے والی بیوی پہ افسوس کر رہا تھا۔
"اور بڑی خوش نصیب ہو گی تمہاری بیوی' ہر وقت اس کے گھٹنے سے لگ کے بیٹھے رہو گے' کبھی گھر سے ہی نہیں نکلو گے۔"
"اللہ معافی دے یار' اب ڈھکے چھپے لفظوں میں مجھے زن مرید تو نہ کہو' اللہ ایسی نوبت نہ لائے۔"
نبیل نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا اب ہنسنے کی باری دل آور کی تھی اور یونہی باتوں باتوں میں وہ کرنسی چینج کروانے کرنسی ایکسچینج پہنچ گئے' وہاں سے بینک کا رخ کیا اپنا اکاؤنٹ اوپن کروایا اور اے ٹی ایم کارڈ اپلائی کروادیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بینک سے بھی فارغ ہو گئے تھے پھر ایک موبائل کمپنی کی فرنچائز گئے اور مدیحہ اور فائزہ بیگم کے اپنی پسند کے نمبر ایشو کروائے تھے۔
دو روز پہلے نبیل گلاب خان کے ساتھ آکر اپنے لیے نمبر لے چکا تھا۔ لیکن مدیحہ وغیرہ کے ابھی باقی تھے سارے

کام کرنے کے بعد ان کا رخ شوروم کی طرف تھا جہاں سے نبیل نے بیک وقت تین گاڑیاں نکلوانی تھیں دل آور اسے اس شوروم میں لے کر آیا جہاں اس کی پرانی جان پہچان تھی شوروم کے مالک اکرام مجید کچھ عرصہ پہلے کسی الزام کی زد میں آگئے تھے اور ساتھ ہی انہیں گاڑیوں کے جعلی لین دین کے کیس میں ملوث کردیا گیا تھا تب اکرام مجید ہر طرف سے ناکام اور مایوس ہو کر دل آور شاہ کے پاس پہنچے تھے اور اس نے محض تین ماہ میں انہیں اس کیس سے باعزت بری کروادیا تھا جس کی خوشی میں انہوں نے دل آور کو ایک گاڑی تحفے میں بھجوائی تھی لیکن اس نے یہ تحفہ لینے سے انکار کردیا تھا وہ اپنے کلائنٹس سے صرف اپنی فیس لیتا تھا "چائے پانی" کے نام پہ اضافی پیسے لینا حرام سمجھتا تھا یہ اور بات تھی کہ کوئی عام شہری اس کی فیس افورڈ نہیں کرسکتا تھا اسے بس بڑی بڑی آسامیاں ہی ہائر کرسکتی تھیں جیسے اکرام مجید!

"واؤ کیسا شاندار شوروم ہے۔" نبیل شوروم کے احاطے میں داخل ہوتے ہی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا کیونکہ شوروم کی سجاوٹ پارکنگ تک نظر آرہی تھی۔

"اندر چلو' اندر سے اور بھی شاندار لگے گا۔" دل آور گاڑی لاک کرکے اس کے ساتھ اندر آگیا تھا۔ لیکن اندر داخل ہوتے ہی اس کی نظر دوسرے گلاس ڈور سے باہر نکلتے آدمی پہ ٹھہر گئی۔ دل آور اس آدمی کو دیکھ بھی چکا تھا اور پہچان بھی چکا تھا لیکن وہ آدمی اتنی عجلت میں تھا کہ دل آور شاہ کو نہ دیکھ سکا البتہ اکرم مجید گلاس وال سے دل آور شاہ کو دیکھ کر خود ہی گلاس ڈور کے پاس آگئے۔

"السلام علیکم شاہ جی' باہر کیوں رک گئے؟ اندر آیئے۔ نا؟" اکرم مجید بچھے جارہے تھے۔ لیکن دل آور اس آدمی کو دیکھے جارہا تھا اس کی نظروں نے پارکنگ تک اس آدمی کا پیچھا کیا تھا۔

"کس کو دیکھ رہے ہو؟" نبیل نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا لیکن اسے کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ "کسی کو نہیں۔" اس نے نفی میں سرہلایا اور پھر اکرم مجید سے ہاتھ ملا کر اندر آگیا۔

"کیا لیں گے شاہ جی ٹھنڈا یا گرم؟" وہ انہیں اپنے آفس روم میں لے آئے۔

"ٹھنڈا۔" وہ مختصر بولا۔

"اتنا ٹھنڈا کہ سینے کو کچھ دیر کے لیے ٹھنڈا کردے۔"

"جیسے آپ کی مرضی شاہ جی' آج ہمارے غریب خانے کو رونق کیسے بخشی؟"

"بس میرے دوست کا کچھ خریدنے کا موڈ تھا سوچا آپ کی دکان ہی اچھی رہے گی۔" اس نے وسیع و عریض کشادہ اور جگمگاتے شوروم کو بیٹھے بیٹھے دکان کا نام دے دیا تھا یہی تو اس کا شاہانہ پن تھا۔

"اچھا تو یہ آپ کے دوست ہیں؟ کیسے ہیں سر؟" اکرام مجید نے نبیل حیات سے دوبارہ ہاتھ ملایا۔ اور چند اور باتیں کرنے کے بعد وہ لوگ اٹھ کر گاڑیاں پسند کرنے لگے ایک ساتھ تین گاڑیاں' اکرام مجید سن کر ہی مرعوب ہوگئے تھے۔ نبیل اپنے لیے گاڑی پسند کررہا تھا لیکن دل آور کی نظریں بلیک چمچماتی مرسڈیز پہ تھیں۔

"یہ گاڑی سیل ہوچکی ہے۔" مینیجر نے آگے بڑھ کے اطلاع دی۔

"اندازہ ہے مجھے۔" دل آور نے سر جھٹکتے ہوئے کہا اور پلٹ کر نبیل کے برابر آکھڑا ہوا جس کی نظر انتخاب پراڈو پہ ٹھہری ہوئی تھی۔

"یہ کیسی رہے گی؟"

"ہوں اچھی ہے۔" اس نے اثبات میں سرہلا کر رائے دی اور نبیل نے وہی اوکے کردی۔ مدیحہ کے لیے سلور کرولا پسند کی تھی اس نے دل آور کو تاکید کی ہوئی تھی کہ اس کی گاڑی سلور کلر میں ہی ہونی چاہیے۔ سو اس کی

گاڑی دل آور نے ہی پسند کی تھی اور پھر نبیل کے تمام کام نبٹانے کے بعد وہ اپنے کام نبٹانے کے لیے چل دیا تھا وہ جس کیس پہ کام کررہا تھا وہ بہت اہم تھا۔

☼ ☼ ☼

"اندر چلا جاؤں چوکیدار صاحب؟" منصور حسین کی آواز عقب سے ابھری تو چوکیدار بدک کے پیچھے پلٹا تھا وہ کندھے پہ بیگ ڈالے بڑے دل جلانے والے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"تم آبھی گئے منصور حسین؟" عارف اس کا بیگ دیکھ کر بولا۔

"آگیا ہوں جناب... آگیا ہوں دروازے کھول دو گھر کے بھی' دل کے بھی۔" منصور حسین کو جب سے نوکری ملی تھی خوش باش نظر آنے لگا تھا۔ "مجھے تو لگتا ہے بڑے صاحب نے ڈرائیور نہیں رکھا بلکہ عذاب رکھا ہے۔" عارف نے اپنا ماتھا پیٹتے ہوئے کہا۔

"کیوں دل جلاتے ہو بادشاہو' صحت پہ اثر پڑتا ہے۔" منصور حسین نے عارف کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"تم اندر ہی چلے جاؤ تو اچھا ہے۔" عارف نے جھنجلا کر چھوٹا گیٹ کھول دیا تھا اور منصور حسین مسکراتے ہوئے اندر آگیا تھا۔

مغرب کا وقت تھا شام کا اندھیرا گہرا ہوچکا تھا۔ حویلی کے لیمپ پوسٹ روشن ہوچکے تھے گیٹ' ڈرائیو وے اور کوریڈور تک روشنیاں ہی روشنیاں تھیں رات میں دن کا سماں تھا۔ منصور حسین ہمیشہ کی طرح ایک ہی جگہ کھڑا حویلی کی خوب صورتی دیکھ رہا تھا۔

"منصور حسین۔" مبارک خان اسے دور سے ہی دیکھ چکا تھا اسی لیے آواز دی تھی۔

"یار کھڑے کھڑے کیا دیکھنے لگتے ہو؟"

"اللہ کے رنگ۔" وہ آہستگی سے بولا۔

"اللہ کے رنگ؟"

"ہاں یار' دیکھتا ہوں کہ اللہ نے اگر کسی کو نوازا ہے تو بے بہا نوازا ہے اور جس کو نہیں نوازا اسے حسرت سے نواز دیا ہے تاکہ وہ دوسروں کو حسرت سے دیکھتا رہے۔" منصور حسین آہ بھر کے بولا اس کا موڈ اداس ہوچکا تھا۔

"اللہ نوازے گا یار سب کو نوازے گا دل چھوٹا نہیں کرتے۔ تم آؤ میرے ساتھ میں تمہیں تمہارا کوارٹر دکھا دوں۔" مبارک خان اسے تسلی دیتے ہوئے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ مبارک خان کے ساتھ والا کوارٹر منصور حسین کے لیے صاف کروادیا گیا تھا۔ مبارک خان نے آگے بڑھ کے کوارٹر کی کنڈی کھول دی۔

منصور حسین اندر آگیا اس کمرے میں ایک چارپائی' دو کرسیاں' ایک ٹیبل' اور ایک الماری تھی پنکھے اور بجلی کا انتظام بھی اچھا تھا کمرے کا فرش اور دیواریں صاف ستھری اور چمک دار تھیں گویا ملازموں کا بھی کافی خیال رکھا گیا تھا منصور حسین کو یہ بات بڑی پسند آئی تھی۔ وہ ٹیبل پہ بیگ رکھ کر چارپائی پہ بیٹھ گیا چارپائی کڑکڑا کے رہ گئی۔

"یار یہ تو ابھی سے احتجاج کرنے لگی ہے۔ میرا وزن سہہ بھی پائے گی یا نہیں؟" منصور حسین پیچھے کی طرف چارپائی پہ ہاتھ جماتے ہوئے اس پہ دباؤ ڈال کر چارپائی کی مضبوطی چیک کررہا تھا کہ کہیں وہ ٹوٹ ہی نہ جائے۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☼ ☼

فائزہ جمال

زرینہ کے پاؤں آج خوشی سے زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کی دعائیں قبولیت کا درجہ پاچکی ہیں۔ من کی مراد اتنی جلدی پوری ہو چکی ہے۔

بات بات پہ لبوں سے پھوٹتی ہنسی کمزور سانولے چہرے پر بڑی بھلی اور انوکھی معلوم ہو رہی تھی۔ بچوں کے لیے اپنی ماں کا یہ روپ بہت حیران کن اور خوب صورت تھا۔ ورنہ تو وہ ہر وقت تیوریاں چڑھائے بلاوجہ ڈانٹتی، جھڑکتی ماں کو دیکھنے کے اس قدر عادی ہو چکے تھے کہ اب زرینہ کی پیار بھری باتیں اور نرم و مہربان رویہ سمجھ سے بالاتر تھا۔

لیکن چھوٹے بچوں کو کیا معلوم کہ آج اس کا کتنا بڑا بوجھ سر سے ہٹ گیا تھا۔ اس کی بڑی بیٹی صفیہ کو آج رشتے والے دیکھنے آئے تھے۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ یہ سلسلہ تو پچھلے سات، آٹھ سالوں سے جاری تھا۔

عورتیں آتیں، گھر کی خستہ حالت، بیوہ اور لوگوں کے گھروں میں کام کرنے والی زرینہ سے لمبا چوڑا جہیز نہ ملنے کی امید اور کچھ سانولی اور معمولی نقوش کی حامل میٹرک پاس صفیہ کو دیکھ کر مایوس لوٹ جاتیں۔ مایوس تو زرینہ بھی ہو چکی تھی، لیکن ہمت نہیں ہاری تھی۔ وچولن ماسی شادو کو اچھے رشتے لانے کا کہتے ہوئے وہ حسب وعدہ ہزار، پانچ سو اس کی ہتھیلی پہ رکھ دیتی۔

ماسی شادو کے لائے ہوئے رشتے دیکھ کر زرینہ کو اپنی دعائیں رائیگاں جاتی محسوس ہوتیں۔ رنڈوے، بال بچوں والے اور کوئی نرینہ اولاد کی خواہش میں اس کی شریف اور نیک طبیعت بیٹی کا خواستگار ہوتا۔ اگر جو کوئی برسر روزگار، خاندانی لڑکے کو ڈھونڈ ماسی شادو اسے لا کر دیتی تو دل کو سکون سا مل جاتا۔ پھر اسی نیک، کھاتے پیتے خاندان کی عورتیں آکر گھر کی حالت کو دیکھتے ہوئے کافی ناک بھوں چڑھاتیں، ڈھیر سارا، چرنے کے بعد کوئی نہ کوئی وجہ اعتراض ماسی شادو کے ہاتھ میں تھما کر اسے کسی اچھے گھر کی لڑکی دکھانے کا کہتیں۔

"اماں! اب بس کریں، کب تک میری یوں بولی لگواتی رہیں گی۔ میں جیتی جاگتی جذبات و احساسات رکھنے والی ایک لڑکی ہوں، ناکہ کوئی بھیڑ بکری جسے قربانی سے پہلے خوب جانچ کر خریدا جاتا ہے۔" صفیہ بلک بلک کر رو پڑتی۔ بار بار رد کیے جانے کے بعد اس کی نسوانی انا اور پندار کو خاصی ٹھیس پہنچی تھی۔ احساس کمتری اس حد تک اس کی شخصیت پہ حاوی ہو گیا تھا کہ اب تو ماں، بہنوں کے ساتھ بیٹھنے سے بھی کترانے لگی تھی۔

"بند کر اپنا یہ رونا دھونا، جیسے جانتی نہ ہو کہ ماں کے سینے پہ ایک دو نہیں پوری چار سلوں کا بوجھ دھرا ہے۔ تجھے اپنے گھر کا کروں گی تو دوسری تیار کھڑی ہے، چاروں تو ایک برابر ہو، بڑی چھوٹی کا تو امتیاز کرنا ہی دشوار ہے۔ میری تو ساری حیاتی چاروں کے ہاتھ پیلے کرتے کرتے گزر جائے گی۔ ہاں اگر آج منظور ہوتا تو یوں بے بس و لاچار میں نہ ہوتی، سر کا سائیں رب نے جلدی لے لیا کہ زندگی کی کڑی دھوپ نے سر کو وقت سے پہلے سفید کر دیا ہے۔" بولتے ہوئے زرینہ کی

آنکھیں جھلملا اٹھیں اور لہجہ رندھ گیا تھا۔

زندگی ان کے لیے ہمیشہ سے یوں ہی کٹھن اور پردرد نہ تھی۔ منظور ایک مستری تھا۔ جو دیہاڑی کے خاصے پیسے لیتا تھا۔ گھر میں تنگی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چاروں بچیاں عمدہ کپڑے پہنتیں اور بہترین اسکول میں زیر تعلیم تھیں۔ چار بیٹیوں کے بعد سلیم کی پیدائش نے تو گویا ان کی خواہشیں تمام کر دی تھیں۔ ان کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا تھا۔ پھر نہ جانے ان خوشیوں کو کس کی نظر لگ گئی۔ زیر تعمیر عمارت کی دوسری منزل پہ کھڑے پلستر کرتے منظور کا پاؤں بے دھیانی میں پیچھے ہوا اور وہ دھڑام سے نیچے جا گرا۔

بد قسمتی سے اس کا سر زمین پہ رکھے گاڈر سے جا ٹکرایا تھا۔ جس سے کھوپڑی چیخ گئی تھی اور موقع پر ہی اس نے دم توڑ دیا۔ زرینہ کی تو جیسے دنیا ہی اندھیر ہو گئی۔

ایک منظور اس کی زندگی سے کیا گیا، اس کے پیچھے خوش حالی، خوشیاں اور بے فکری و طمانیت بھی دبے قدموں نکل گئی تھیں۔ اب پیچھے صرف غربت، تنگ دستی، محتاجی اور فکریں رہ گئی تھیں۔ آمدنی کا واحد سہارا قدرت نے کیا چھینا کہ سب عزیز رشتہ دار اندھیرے میں سائے کی طرح ساتھ چھوڑ گئے۔ گھر میں دانت کریدنے کا تنکا تک نہ رہا۔ بھوک اور فاقوں سے تنگ آ کر زرینہ خود ایک دن کام کے لیے نکل کھڑی ہوئی۔ مڈل پاس عورت کو سوائے گھروں میں برتن دھونے اور پوچھا لگانے کے۔۔۔ اور کیا کام مل سکتا تھا۔ وہ تین کوٹھیوں میں تین، تین گھنٹے کام کرنے کے بعد وہ جب شام ڈھلے گھر لوٹتی تو اس کے پاس کوٹھیوں کا بچا ہوا کافی کھانا ہوتا جو وہ مل کر کھا لیتے۔ تنخواہ کے علاوہ مالکن اپنے پرانے کپڑے بھی اسے دے دیتی جس کی تراش خراش کر کے وہ بیٹیوں کو پہننے کے لیے دے دیتی۔ گھر کی گاڑی کسی طور چلنے لگی تھی۔

صفیہ نے میٹرک کے بعد پڑھائی کو خیرباد کہتے ہوئے گھر میں کڑھائی کا کام شروع کر دیا تھا۔ زرینہ صاحب ثروت بیگمات کے جوڑے کشیدے کے لیے لے آتی۔ جن پر صفیہ انتہائی محنت اور توجہ سے اتنے نفیس اور خوب صورت ڈیزائن کشیدہ کرتی کہ بیگمات بے ساختہ اس کی مہارت کو سراہتے ہوئے اچھی خاصی سلائی کی رقم زرینہ کو دے دیتیں۔ جس سے زرینہ صفیہ کے جہیز کی کئی چھوٹی موٹی چیزیں خرید لیتی۔ جہیز تو کافی کچھ تیار ہو چکا تھا۔ لیکن رشتے کے لیے کہیں بات نہیں بن پا رہی تھی۔ ماسی شادو کے علاوہ اس نے اپنی جاننے والیوں سے بھی صفیہ کے بر کے لیے کہہ سن رکھا تھا۔ لیکن جو رشتے صفیہ کو پسند کرتے وہ زرینہ کو اچھے نہ لگتے، بھلا کسی بھٹے پہ کام کرنے والے، کسی نششی کارخانے کے مالک یا دولت مند تین بچوں کے باپ کو وہ اپنی بیٹی کیسے سونپ دیتی اور جو زرینہ کو پسند آتے ان کے معیار پہ صفیہ نہ پوری اترتی۔

اس دن بھی ماسی شادو کچھ عورتوں کو ان کے گھر لے آئی۔ بقول اس کے کہ اس رشتے میں ڈھونڈنے سے بھی انہیں کوئی کمی نظر نہ آئے گی۔ زرینہ کے تو مانو سوکھے دھانوں پر ابر برس گیا تھا۔ وہ دل جمعی سے مہمانوں کی خاطر داری کے انتظامات کرنے لگی۔ لیکن صفیہ پہ ماں کے جوش و خروش کا مطلق اثر نہ پڑا۔

"اٹھ صفو! جلدی سے تیار ہو جا، مہمان آ چکے ہیں۔ نہا دھو کر وہ گلابی کاٹن کا سوٹ پہن لے۔ بہت جچتا ہے تجھ پر۔ بہت بختاور ہے میری دھی۔" زرینہ پیار سے بولتے ہوئے اس کے گرد بکھرے دھاگے اور موتی و ستارے سمیٹ کر شاپر میں ڈالنے لگی۔

"اماں! میں کہیں نہیں جا رہی، فضول کا خرچہ کیا ہے تو نے، دیکھنا اس ساری تگ و دو کا وہ ہی سابقہ نتیجہ نکلے گا۔" ٹانکا لگاتے ہوئے وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"زیادہ پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے مجھے۔ چل اٹھ ان سے مل۔ اگر تو ایک ہوتی تو کاہے کی اتنی فکر کرتی، لیکن تین جو ان تکنیں اور بھی تو میری جان کو چمٹی ہوئی ہیں، تجھے وہ نظر نہیں آ رہیں۔" زرینہ کو اسے یوں ہی جیسے دیکھ کر غصہ آ گیا تھا۔ فریم اس کے ہاتھ سے چھین کر دوپٹے میں لپیٹتے ہوئے شاپر میں ڈالا اور زبردستی اس کا بازو پکڑ کر اسے کھڑا کیا۔

"اماں! کیوں میرا تماشا لگوا رہی ہو۔ آٹھ سال کیا کم نہیں ہیں اس "پاسنگ پریڈ" کے لیے مت کرو مجھے ذلیل کہ میں خود سے نظر ملانے کے بھی قابل نہ رہوں۔" وہ گڑگڑاتے ہوئے بازو چھڑانے لگی۔ کب سے رکے آنسو ضبط کے باوجود گالوں پہ بہہ نکلے تھے۔

"ماں کی جان، تو خوامخواہ وہم پال رہی ہے۔ تو مل کے تو دیکھ کتنی اچھی عورتیں ہیں۔" زرینہ پیار سے اس کے آنسو پونچھنے لگی۔

"ہونہہ! پہلے جو آتی رہی ہیں وہ بھی سب اچھی ہی تھیں۔ میں سلام ضرور کر آتی ہوں، مگر ابھی اور اسی حلیے میں، اگر پسند کرنا ہے تو ٹھیک، ورنہ یوں ہی سہی۔" مضبوط لہجے میں بولتے ہوئے وہ زرینہ سے پہلے کمرے سے نکل گئی۔ سب کچھ وہ ہی تھا۔ وہ ہی ماحول، وہ ہی سوالات، جن کا بے تاثر انداز میں وہ جواب دیتی رہی۔ لیکن محفل کا رنگ اس وقت بدل گیا جب لڑکے کی ماں نے اسے سند قبولیت بخشتے ہوئے اس کے ماتھے پہ بوسہ دے کر ہزار روپے اس کے ہاتھ پہ رکھ دیے تھے۔

شکر گزاری کے احساس سے زرینہ کے آنسو بہہ نکلے تھے۔ ان کے جانے کے بعد فوراً" شکرانے کے نوافل ادا کرنے کھڑی ہو گئی۔

صفیہ کے لیے اپنے احساسات خود اس کے لیے اجنبی تھے۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس قسم کا ردعمل ظاہر کرے۔ کافی دیر تک وہ مٹھی میں دبے پیسوں کو بے دھیانی سے دیکھتی رہ گئی۔ اس رات ان کے گھر میں جشن کا سا سماں تھا۔ زرینہ نے آج کام کی چھٹی کی تھی اور گھر پہ کافی مدت کے بعد اپنا چولہا جلایا تھا۔ صفیہ کے علاوہ باقی بہنیں شادی پہ پہننے کے لیے کپڑے ڈسکس کرنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

"ارے ماسی شادو! تو اتنی سویرے، خیر تو ہے نا؟"

زرینہ معمول کے مطابق ناشتے کے بعد کام کے لیے نکل ہی رہی تھی کہ ماسی شادو کی آمد ہوئی۔

"رقیہ تو سارے کام چھوڑ ماسی کے لیے ذرا کڑک سی چائے بنا، ساتھ میں رس بھی لیتی آ۔" زرینہ نے جھاڑو دیتی رقیہ کو کہا تو وہ فوراً" جھاڑو چھوڑ کر کچے کمرے سے متصل چھوٹے سے چھپر میں چلی گئی۔ جس کے اندر انہوں نے کچن کا سامان سیٹ کیا ہوا تھا۔

"نہیں زرینہ، تو چا پانی کو رہن دے، میں ابھی ناشتا کر کے گھر سے نکلی ہوں۔" بان کی چارپائی پہ ٹکتے ہوئے ماسی شادو نے منع کر دیا۔

"ارے ماسی! تو میرے گھر غیریت نہ برتا کر۔ ایک چسکی اگر لگا لے گی تو مجھ غریب کا دل خوش ہو جائے گا۔" زرینہ کے لہجے میں شادو کے لیے محبت اور احترام دونوں موجود تھے۔ زرینہ، ماسی شادو کی ویسے بھی بہت عزت کرتی تھی۔ بااخلاق اور ملنسار شادو کو سارے محلے میں عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ کیونکہ محلے کے بیشتر رشتے ماسی شادو کی وساطت سے طے پائے تھے۔

زرینہ تو ماسی شادو کو اپنا محسن گردانتی۔ وہ اس کی جتنی بھی ممنون و مشکور ہوتی کم تھا، کیونکہ ماسی ہی کے لائے ہوئے اتنے اچھے گھر میں اس کی بیٹی کا نصیب جڑ گیا تھا۔

وہ اٹھتے بیٹھتے اللہ کا شکر کرتی کہ صفیہ کی اگلی زندگی اس زندگی سے یکسر مختلف ہو گی، وہاں اسے نہ معاشی مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ نہ ہی کوئی فکر و فاقہ ہو گا۔ لڑکے کا اپنا جما جمایا کاروبار تھا۔ دو بیاہی نندوں کے علاوہ ایک کنوارہ دیور اور بیوہ ماں تھی۔ صفیہ کے تو بھاگ کھل گئے تھے۔ کڑھائی کرتے کرتے اس کی انگلیاں فگار ہو چکی تھیں اور نظر بھی کافی متاثر ہوئی تھی، لیکن یہ ساری بیگار صرف ایک ماہ تک ہی تھی۔ کیونکہ نئے چاند کی تین تاریخ کو اس کی رخصتی قرار پائی تھی۔

"مجھے تیری سمدھن جمیلہ نے بھیجا ہے جہیز کے بارے میں پوچھنے کے لیے۔"

"کیا پوچھنا ہے جہیز کے متعلق، نصیب کا سارا کچھ تو

جوڑ چکی ہوں۔" زرینہ پہلے تو ٹکر ٹکر ماسی شادو کی صورت دیکھتی رہی' پھر کچھ توقف کے بعد بدقت تمام چند لفظ اس کے منہ سے نکلے۔

"وہ تو ٹھیک کہہ رہی ہے' پر جمیلہ کہتی ہے کہ برتن بھانڈے ہر لڑکی اپنے جہیز میں لے جاتی ہے۔ کان' ناک کا زیور بھی ماں' باپ دے دیتے ہیں۔ لیکن سلامی میں میرے بیٹے کو روپے نہیں بلکہ نئی موٹر سائیکل ہی دینی ہے اور کھانا بھی تم لوگوں کی طرف سے تین سو بندوں کا ہو' ذرا ٹاٹ قسم کا کسی اچھے سے ہوٹل میں' صرف سالن اور زردے پہ نہیں ٹرخانا بلکہ چار' پانچ آئٹم سالن کے ساتھ ساتھ میٹھے میں بھی ہوں۔" ماسی شادو ایک ایک کرکے زرینہ کے حواسوں پہ بم گراتی جارہی تھی۔ زرینہ کے تو کاٹو بدن میں لہو نہیں والا حال تھا۔ ذہن بالکل ماؤف اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑتے جارہے تھے۔

"ہاں تو پھر انتظام کرلے گی نا؟ مجھے جواب آج ہی پہنچانا ہے۔" اسے مسلسل بے حس و حرکت پاکر ماسی شادو نے استفسار کیا۔

"ماسی! تو جانتی تو ہے میں بیوہ اتنا کچھ کیسے کرسکتی ہوں۔ میرے گھر کی روٹی ہی بمشکل چل رہی ہے۔ اس دن تو کہہ رہی تھیں کہ ہمیں صفیہ کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہیے اور اب..." آنکھوں میں تیزی سے پانی جمع ہونے لگا تھا۔

"لے جھلی! کی ناپاگلوں والی بات۔ ارے یہ تو زمانے کی ریت بنتی جارہی ہے۔ ان کی باتوں پہ نہ جاؤ۔ ان کی نیت اور ارادوں کا حال مجھ سے زیادہ بھلا کون جانتا ہے۔ ارے ان کا بس چلے تو بیٹے کی مائیں' بیٹی کے گھر والوں کو چھت کی کڑیاں بیچ کر بھی اپنا مطلوبہ جہیز وصول کریں۔ بات کرتی ہو منہ کی باتوں کی۔" ماسی شادو نے یوں سر جھٹکا کہ گویا زرینہ کے منہ سے کوئی بچکانہ سی بات سن لی ہو۔

"اچھا تو پھر میں چلتی ہوں۔ دو' تین دن تک میں ان کو ٹھہرا لیتی ہوں۔ ہاں اگر تو نہیں کرسکتی تو مجبوراً مجھے انہیں کوئی اور گھر دکھانا پڑے گا۔ آخر کو برادری میں ناک اونچی رکھنی ہے۔" چارپائی سے اٹھتے ہوئے اس نے صم بکم بیٹھی زرینہ کے کندھے پہ ہمدردی سے اپنا ہاتھ رکھا۔ ماسی شادو کا لہجہ جتنا نرم اور ہمدردانہ تھا الفاظ اتنے ہی سفاک اور بے رحم تھے۔ صفیہ کو یوں لگا جیسے ان چند الفاظ نے اس کے جسم سے اس کی روح تک کھینچ لی ہو۔ چارپائی پہ چائے کی پیالیاں یوں ہی ان چھوئی پڑی رہ گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

بیٹی کو ماں' باپ اپنی محبت و شفقت کے سائے تلے رخصت کرتے وقت جو کچھ دیتے ہیں وہ ایک امر مستحسن اور انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ مگر آج ہمارا معاشرہ مادیت پرستی کی کچھ ایسی لپیٹ میں آیا ہوا ہے کہ جہیز کی رسم جبری مطالبہ کی صورت اختیار کرچکی ہے۔

ایک طرح کی مہذب بھیک جسے رسم و رواج کے نام پر فراخدلی سے قبول کرلیا گیا ہے۔ صاحب حیثیت والدین اپنی وسعت و بساط کے مطابق بیٹی کو وداع کرتے سامان ساتھ کردیتے ہیں۔ بلکہ زرینہ جیسے لوگ جو بمشکل تین وقت کی روٹی پوری کرنے سے ہلکان ہوں وہ بھلا بیٹی کے سسرال کا مطالبہ کیسے پورا کرسکتے ہیں جو سراسر زر اندوزی' تفاخر' دکھاوا یا حصول آسائش و غنا کے لیے کیا گیا تھا۔ جب سے ماسی شادو گئی تھی۔ اس کی راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔ سوچ سوچ کر دماغ پھٹنے کو آگیا تھا' مگر کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی۔

"کہاں جاؤں آخر سوال کرنے' کون ہے جو اس بے بضاعتی کے عالم میں مدد کرے۔" چارپائی پہ مسلسل کروٹیں لینے کے بعد وہ اٹھ بیٹھی۔ سال خوردہ پیڈسٹل فین ہوا کی بجائے شور کررہا تھا۔ اس نے تکیے کے طور پر استعمال ہونے والے لان کے دوپٹے سے گردن پہ بہتے پسینے کو رگڑتے ہوئے صاف کیا۔

"رشتہ داروں میں بھی ایسا کوئی نہیں ہے جو مشکل کی اس گھڑی میں میرے کام آسکے۔ سب میرے ہی جیسی مزدور دیہاڑی دار ہیں بھلا ان سے سوال کروں۔" قمیص کے بازو اوپر چڑھاتے ہوئے اس نے بازو کو کھجاتے ہوئے مایوسی سے سوچا۔

صحن میں لگے کم واٹ کے بلب کی زرد روشنی میں صفیہ۔ ابٹن کا پیالہ گھولے دھیرے دھیرے چہرے اور گردن پہ مل رہی تھی۔ ہونٹوں پہ شرمیلی مسکان بھی تھی۔ چھوٹی بہنیں اس کے منگیتر کا نام لے کر اس سے چھیڑ چھاڑ کررہی تھیں۔ وہ کبھی تادیباً انہیں آنکھیں نکال کر گھور لیتی تو کبھی کسی جملے پہ دبی دبی سی ہنسی ہونٹوں سے نکل کر بجنے آنگن میں گھنگھروؤں کی طرح بکھر جاتی۔

زرینہ نے صفیہ کو زندگی میں پہلی بار اتنا خوش دیکھا تھا۔ جب سے بات پکی ہوئی تھی صفیہ خود پہ توجہ دینے لگی تھی۔ چہرے پہ ہمہ وقت ایک اطمینان بھری دھیمی سی مسکراہٹ بھی رہنے لگی تھی۔

"اگر میں ان کا مطالبہ پورا نہ کرپائی تو میری بیٹی کا نصیب تیرہ و تار ہوجائے گا۔ کیا خدانخواستہ اس رشتے کے ٹوٹنے کے بعد صفیہ یوں ہی خوش رہ پائے گی؟ نہیں' ہرگز نہیں۔" دل میں اٹھتے وہموں نے اس کے دل کی دھڑکن گویا لمحہ بھر کے لیے روک دی تھی۔ سانس لینا دشوار ہوگیا تھا۔

"نہیں میں اس کی آنکھوں میں چمکتے امید کے جگنو یوں ہی ٹمٹماتے دیکھنا چاہتی ہوں۔ ورنہ بے وقعتی اور بے مائیگی کے حبس میں اس کے لیے سانس لینا محال ہوجائے گا۔" وہ چت چارپائی پہ لیٹی تاریک آسمان کے دامن پہ ٹنگے لاتعداد ستاروں کو دیکھنے لگی۔ کافی دیر یوں ہی پڑے رہتے ہوئے اسے لگا کہ ایک ستارہ' باقی تمام ستاروں کی نسبت کہیں زیادہ روشن اور تاباں ہے۔ اب اس کی نظر صرف اس چمک دار اور زیادہ ضیا والے ستارے پر تھی۔

☼ ☼ ☼

تراشیدہ لبوں کو مزید نمایاں کرنے کے لیے میرون لپ اسٹک لگانے کے بعد ثمینہ وسیال نے قد آدم آئینے میں اپنا تنقیدی جائزہ لیا۔

آئینے نے ہمیشہ کی طرح انہیں مایوس نہیں کیا تھا۔ رائل بلیو قیمتی ساڑھی میں ملبوس اینٹیک جیولری پہنے' میک اپ کرنے کے بعد خود کو پرفیوم کی پھوار میں بھگونے کے بعد وہ مطمئن سی آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی تھیں۔ اسی دم ان کا موبائل گنگنا اٹھا۔ وہ اسے کانوں سے لگائے ٹی وی لاؤنج میں چلی آئیں۔ دوسری طرف ان کی بہن سطوت تھی۔

"ارے نہیں سوئٹی! آج تو بالکل نہیں۔ یو نو آج فرسٹ مئی ہے' یعنی لیبر ڈے۔ یو کین انڈر اسٹینڈ کہ آج میں کتنی بزی ہوں گی۔" دھیمی و دلکش آواز میں بولتے ہوئے وہ صوفے پہ ٹک گئیں۔ ایک ہاتھ سے امپورٹڈ ٹی وی کو آن کرتے ہوئے والیوم کم کردیا۔ چینل سرچنگ کے بعد ایک نیوز چینل لگا کر وہ بڑے غور سے لیبر ڈے کے حوالے سے نکالی گئی ریلی کا احوال سننے لگیں۔ بیش قیمت امپورٹڈ کرسٹل کے واز کو انتہائی توجہ سے صاف کرتے ہوئے زرینہ نے ایک نظر اٹھا کر ثمینہ کو دیکھا۔ وہ دل ہی دل میں اپنا مدعا پیش کرنے کے لیے الفاظ ترتیب دینے لگی تھی۔ زرینہ فطرتاً ایک خوددار اور جفاکش عورت تھی۔

اس سے پہلے اس نے کبھی ثمینہ کے آگے دست سوال دراز نہیں کیا تھا۔ ثمینہ تنخواہ کے علاوہ پرانے کپڑے' روز کے بچے ہوئے کھانے کے علاوہ ہر عید' بقر عید پر تھوڑی بہت رقم اس کے ہاتھ پہ رکھ دیا کرتی جسے وہ شکریہ کے ساتھ قبول کرلیتی مگر اب معاملہ اس کی بیٹی کے خوش حال مستقبل کا تھا۔ جسے پانے کے لیے اس نے سوچ لیا تھا کہ ثمینہ کا سوالی بننے کے ساتھ ساتھ اسے اگر بھیک بھی مانگنی پڑ جائے وہ انکار نہیں کرے گی۔ بس اتنا اچھا رشتہ ہاتھوں سے نکلنے نہ پائے۔

"کلب میں میٹنگ کے بعد مجھے ایک' دو سیمینارز میں شرکت کرنی ہے' پھر شام کو ٹی وی کے ایک ٹاک شو میں انوائیٹڈ ہوں' بس یوں سمجھ لو آج میرے پاس اپنے بچوں کے لیے بھی ایک منٹ نہیں ہے۔ تم اپنی

محبت آور

روشنی بخاری

ناولٹ

یہ کٹی پارٹی کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھواو کے دین بائے۔" کال ڈس کنکٹ کرنے کے بعد موبائل انہوں نے گلاس ٹیبل پہ رکھ دیا۔

"بی بی جی! وہ آپ سے ایک بات کرنی ہے۔" زرینہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی قریب آئی۔

"ہاں ذرا جلدی کہو' میں آل ریڈی لیٹ ہو چکی ہوں۔" مرمریں کلائی پہ بندھی اسٹائلش سی ریسٹ واچ پہ ٹائم دیکھتے ہوئے ثمینہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"وہ مجھے کچھ روپوں کی ضرورت ہے' میری بڑی لڑکی کی شادی ہے' میرا داماد سلامی میں موٹر سائیکل مانگ رہا ہے اور کھانے کا خرچہ بھی مجھ سے کم پڑ رہا ہے۔" زرینہ نے اٹک اٹک کر اپنے مطلب کی بات کہہ ہی دی' لیکن ان چند الفاظ کی ادائیگی میں ہی اس کی ہتھیلیاں بھیگ گئی تھیں۔ ثمینہ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"دیکھو زرینہ! میں نے تمہیں پہلے دن ہی جتا دیا تھا کہ مجھے یہ بہانے بہانے پیسے مانگنے کی عادت بہت بری لگتی ہے۔ تم چھوٹے لوگوں کو تو بس موقع ملنا چاہیے کہ ادھر سے انگلی کیا تھمائی پورا پنجہ پکڑ لیں۔" ثمینہ کا لہجہ سخت اور الفاظ ناگواری لیے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے بہن سے بات کرتے ہوئے زبان کی لطافت و شیرینی نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔

"یقین کریں بی بی جی! آپ سے یوں منہ پھاڑ کر مانگنا مجھے خود بھی اچھا نہیں لگ رہا۔ پر ادھر سے اتنا زور ہے کہ اس کے سوا کوئی اور چارا میرے پاس نہ تھا۔" ہاتھ ملتے ہوئے وہ انتہائی لجاجت سے کہہ رہی تھی۔

"آپ مجھے قرض دے دیں' میں ان شاء اللہ سال کے اندر آپ کا سارا حساب چکتا کر دوں گی' بس میری بیٹی کے ہاتھ پیلے ہو جائیں۔" زرینہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ثمینہ کے پیروں میں پڑ جائے اور اس وقت اٹھے جب ثمینہ اس کی مدد پہ آمادہ ہو چکی ہو۔

"کیسے اتارو گی یہ قرض؟ کسی اور سے قرض مانگ کر۔" ثمینہ نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"سوری میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ بائیک اور کھانے کا خرچہ کل ملا کر تقریباً" ڈیڑھ دو لاکھ تو بنتے ہیں۔ میں اتنا مینیج نہیں کر سکتی۔ ویسے بھی آج کلب کے سارے مدعوین کے لیے ریفرشمنٹ میری طرف سے ہوگا۔ لائٹ' کوریج اور ریسپشن پہ اتنا خرچ اٹھ چکا ہے اب ایک دھیلے کی بھی گنجائش نہیں نکلتی۔" ثمینہ قطعی انداز میں کہتے ہوئے ٹیبل سے موبائل اٹھا کر اپنے پی اے کا نمبر ملانے لگی۔

"ذرا فاروقی سے پتا کروں کہ آج سیمینار میں جو تقریر میں نے کرنی ہے اس کو کتنا تیار کر لیا ہے۔"

زرینہ نڈھال انداز میں تقریباً" صوفے کے قریب گر سی گئی تھی۔ بے جان نظریں پلازمہ ٹی وی کی چوڑی اسکرین پہ ریلی کے مزدور شرکاء پہ جمی تھیں جو اپنے حقوق منوانے کے لیے نعرے لگا رہے تھے۔

"ملکی معیشت کا پہیہ مزدوروں کے ہاتھوں ہی رواں دواں ہے۔ یہ محنتی ہاتھ اس وقت بے جان پڑ جاتے ہیں جب ان کی خون پسینے کی کمائی صرف چند روپوں کی صورت میں ان سخت جان ہاتھوں پہ رکھ دی جاتی ہے جو ان کے پیٹ کی ضروریات پوری کرتی ہے تو تن ڈھانپنا دشوار ہو جاتا ہے۔

آج یکم مئی یوم مزدور ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آج ہمیشہ کی طرح حکومتی عہدیداران اور باحیثیت افراد مزدوروں کے حقوق مانتے ہوئے ان کی محنت کا مناسب معاوضہ ادا کرنے کے زبانی اقدامات کرتے ہیں یا محض زبانی جمع خرچ کرتے ہوئے لمبی چوڑی تقریریں کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔"

دور ہوتی ثمینہ کی ہیل کی ٹک ٹک پہ ٹی وی رپورٹر کی آواز غالب آ گئی تھی۔ صوفے کی ہتھی پہ سر ٹکاتے ہوئے زرینہ نے آنکھیں موند لی تھیں۔ آنسو بے آواز اس کی آنکھوں سے نکل کر بہتے جا رہے تھے۔

تو قادر مطلق ہے' مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

بہت دنوں کے بعد آج بختاور کے چہرے پر سچی خوشیوں کے دھنک رنگ بکھرے تھے۔

سینکڑوں کہانیوں کے مرکز و محور "تھل" کے ایک دور افتادہ گاؤں میں بختاور رہتی تھی۔ تھل! جہاں غربت تھی۔ بھوک تھی' جہاں آندھیوں کے جھکڑ چلتے تھے تو چاروں طرف ریت کی دیوار سی کھڑی ہو جاتی تھی۔ راتوں میں چمکتی ہوئی چاندنی' جھلملاتے ستارے ٹھنڈی ہوائیں' صحرا پر پرواز کرتے صحرائی جہاز جن کے گلے میں بندھی کھنکھناتی ہوئی گھنٹیاں' کانوں کو بہت بھلی لگتی تھیں۔ وہ تھل! جس نے سسی کو جنم دیا' جس نے پنوں کی دیوانگی کے مناظر دیکھے' جہاں کی فضاؤں میں آج بھی روایتی لوک گیتوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

لگی والیاں نوں نیند نئیں اوندی۔
تیری کیویں نی اکھ لگ گئی۔
رات چانی تے اڈدا چکور سی۔
روندا پیار وچ پیلاں پاندا مور سی۔
ڈاروں وچھڑ کے کونج کرلاؤندی۔
تیری کیویں نی اکھ لگ گئی؟
(محبت کرنے والوں کو نیند نہیں آتی۔
تمہاری آنکھ کیسے لگ گئی۔
چاندنی رات تھی اور چکور اڑ رہا تھا۔
اور پیار میں ایک ناچتا ہوا مور رو رہا تھا۔
جس طرح اپنی قطار' اپنی ہمجولیوں سے بچھڑ کر کونج کرلاتی ہے۔)

وہی تھل آج بچشم حیراں بختاور کے معصوم چہرے پر کھلتی ہوئی خوشیوں کے رنگ دیکھ رہا تھا۔ بختاور کا باپ مٹی کے برتن اونٹ پر لاد کر گاؤں گاؤں بیچنے جاتا تھا اور بختاور جب مٹی سے جنگ لڑتی تھی تو اس کے جسم سے بہتا مشقت کا پسینہ مٹی کی سوندھی خوشبو میں مدغم ہو جاتا اور وہ مٹی انمول ہو جاتی لیکن وہی مٹی بختاور کا باپ بخشو پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے انتہائی معمولی قیمت پر بیچ آتا۔

سسی کی وہی سرزمین تھی اور آج بختاور کے چہرے پر کھلتے ہوئے رنگ کسی اور سسی کے ظہور کی پیش گوئی کر رہے تھے۔ کسی اور کہانی' کسی اور المیے کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ تھل کے چھوٹے بڑے دیہاتوں میں گونجتی سسی کی لافانی داستان اور اس کا انجام بارہا بختاور کی سماعتوں نے بھی سنا لیکن پھر بھی وہ اپنے معصوم دل سے پھوٹتے جذبوں کے آگے کوئی بند نہ باندھ سکی' کوئی دیوار کھڑی نہ کر سکی اور غلام حسین سومرو کے گھر آنے والے مہمان' اس شہری نوجوان صارم کو اپنے من مندر کا دیوتا بنا بیٹھی۔

وہ تھا ہی ایسا! اونچا' لمبا' مکمل' مضبوط کڑیل جوان جو چلتا تو لگتا کائنات تسخیر کرلے گا پھر بھلا اس کا دل کیوں نہ تسخیر کر لیتا اس کے معصوم دل کی بساط ہی کیا تھی؟ گاؤں کی گلیوں میں آتے جاتے' گھومتے پھرتے جب بھی اس کی نظر بختاور پر پڑتی تو اسے خود پر اس کی نظروں کی گرمی کا احساس ہوتا اور وہ خود میں سمٹ کر رہ جاتی۔ اگر صارم کی نظریں اس کا تعاقب کرتی تھیں تو اس میں اس کا قصور بھی نہ تھا پورے گاؤں میں بختاور جیسی کوئی دوسری لڑکی بھی تو نہیں؟

نرم و نازک' تیکھے نقوش کی مالک بختاور ہرنی جیسی آنکھوں میں کبھی کاجل لگا لیتی تو صارم کو اپنی دنیا ان آنکھوں میں ڈوبتی محسوس ہوتی۔ اس کی صرف آنکھیں ہی ہرنی جیسی نہ تھیں! وہ خود بھی ایک معصوم ہرنی ہی لگتی تھی' اپنے غول سے بچھڑی ہوئی ہرنی۔ سہمی ہوئی' خوف زدہ سی' اپنی ڈار سے بچھڑی ہوئی کوئی کونج..... محبت جب دلوں سے پھوٹتی ہے تو کسی چشمے' کسی آبشار کی مانند انسان کو اپنے ساتھ بہاتی ہوئی لے جاتی ہے۔ سرد و گرم' اونچ نیچ' پورب پچھم' زمین آسمان' امیری غریبی' ہر چیز سے بے نیاز آگے ہی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اور انسان اس کے زور کے آگے بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔

پھر بختاور کیسے بچ پاتی' پانی کا ایک قطرہ مسلسل اگر کسی پتھر یا پہاڑ پر بھی گرتا رہے تو اس میں سوراخ کر دیتا ہے وہ تو ایک نرم نازک دل رکھنے والی جیتی جاگتی لڑکی تھی۔ صارم کی نظروں کی حدت نے اسے آخر پگھلا

دیا اور اس کی دھڑکنیں نئے راستوں کے سفر سے آشنا ہونے لگیں' ان راستوں پر جن کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔

صحرا کی ایک خاموش' پرسکون اور سحر انگیز رات' جب ریت کے سر جوڑ کر بیٹھے دو ایسے ٹیلوں کے درمیان بختاور اور صارم پہلی بار ملے' ٹیلے آپس میں یوں مدغم تھے جیسے ان کی چھاؤں میں بیٹھے ہوئے دو محبت بھرے وجود..... وہ لمحے یاد کر کے اب بھی بختاور کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں جب اپنی سکھی مومل کے گھر جاتے ہوئے گلی کے کونے میں صارم نے اس کا آنچل پکڑ کر روکا تھا اور کہا تھا۔

"بختاور میں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن اس کا موقع نہیں مل پا رہا' اگر تم مجھ پر اعتبار کر سکو تو مجھے آج رات گاؤں کے باہر ان دو ٹیلوں کے سنگم پر ملو جو اس طرف آتے ہوئے میلوں دور سے نظر آنے لگتے ہیں۔" بختاور کا دل اچھل کر حلق میں آگیا تھا۔ اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا اور آنچل کھینچ کر صارم کی گرفت سے آزاد کروالیا۔ وہ تیز رفتاری سے اپنے راستے پر چلی اور صارم کی آواز نے اس کا تعاقب کیا۔

"چاند نکلنے پر میں انتظار کروں گا' اگر تم نہیں آئیں تو ساری رات وہیں بیٹھا رہوں گا۔" بختاور کا دل دھک سے رہ گیا لیکن وہ رکی نہیں۔ گھر آنے کے بعد بھی چاند نکلنے تک وسوسے' واہمے' خدشات اور محبت کے سندر جذبوں کے درمیان ایک جنگ جاری رہی۔ یہ فیصلہ اس کے لیے پل صراط پر چلنے کے برابر تھا۔ عقل کہتی تھی۔

"نہیں! مت جاؤ۔" دل کہتا تھا۔

"مل لینے میں کیا حرج ہے؟ سن تو لو وہ کیا کہتا ہے؟"

دل اور عقل کی اس جنگ میں دماغ کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ عقل پسپا ہو گئی اور وہ انوکھا جذبہ جیت گیا جس کی بختاور کو ابھی تک خود سمجھ نہیں آئی تھی کہ یہ کون سا جذبہ ہے جو اندر ہی اندر اس کے وجود کو تسخیر کیا جا رہا ہے نتیجتاً" وہ اس وقت صارم کے ساتھ بیٹھی تھی اور صارم وارفتگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی دلی مراد جو بر آئی تھی۔ اسے بختاور کے یوں چلے آنے کا یقین تو نہیں تھا۔ پھر بھی وہ اپنے کہنے کے مطابق اس کا انتظار کرنے پر مجبور تھا اور بختاور کا آجانا اس کی جیت ہی تو تھی۔ وہ جذبات سے مرتعش آواز میں بولا۔

"بختاور! یہ سچ ہے کہ ہم دونوں دو الگ الگ دنیاؤں کے انسان ہیں شہر کا رہن سہن اور گاؤں کے رسم و رواج۔ دو متضاد چیزیں ہیں لیکن دنیا میں اس سے بڑا سچ کوئی نہیں ہو گا کہ میرے پاس میری سچائیوں کا ثبوت اس ایک جملے کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ "مجھے تم سے محبت ہے۔" اور یہ وہ جملہ ہے جس کے آگے سوچوں کی اڑان ہانپ جاتی ہے۔ لفظ بے اثر ہو جاتے ہیں کیونکہ اس کے بعد آنکھیں باتیں کرتی ہیں' دھڑکنیں سماعت بن جاتی ہیں اور ہوائیں گیت گاتی ہیں' نظریں اٹھا کر دیکھو یہ آسمان۔۔۔

یہ چمکتا ہوا چاند' یہ جھلملاتے ستارے میری محبت کے گواہ ہیں اور میں ان سب کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں زندگی کی آخری سانس تک صرف تم سے محبت کروں گا۔ تمہارے بغیر جینا میرے لیے یوں ہے جیسے پانی کے بغیر مچھلی' جیسے پھول کے بنا خوشبو..... جو کچھ میں آج تم سے کہہ رہا ہوں شاید دوبارہ نہ کہہ پاؤں اور میں سمجھتا ہوں دوبارہ اس کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی کیونکہ جو کہا ہے وہ آج کے بعد کر کے دکھاؤں گا۔ تمہیں پانے کے لیے میں ہر قربانی دے سکتا ہوں' کیا میں امید رکھوں کہ تم میری محبت کا جواب محبت سے دو گی؟" بختاور کے ہونٹ تھرتھرا کر رہ گئے۔ اس نے بولنے کی کوشش کی لیکن الفاظ اس کا ساتھ نہ دے پائے۔ اتنی سحر انگیز۔ گفتگو کا جواب بھلا وہ دے بھی کیا پاتی؟ وہ اس کے الفاظ کے جادو میں ڈوبتی چلی گئی۔

"بولو بختاور' جواب دو؟ کیا تم میرے دامن میں اپنی محبت کی خیرات نہیں ڈال سکتیں؟" بختاور نے بے اختیار تڑپ کر اس کے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ دیا اور جذبات سے مغلوب آواز میں بولی۔

"نہیں صارم! ایسے تو نہ کہیں۔ محبت تو مان ہوتی ہے' خیرات نہیں۔" اور صارم کا دل خوشی سے ناچ اٹھا۔ اس نے بے اختیار ہو کر بختاور کو کندھوں سے تھام کر کہا۔

"تو کیا تمہارا جواب ہاں میں ہے؟" اور بختاور کی لمبی گھنی پلکوں کے ریشمی غلاف شرمگیں انداز میں جھکتے چلے گئے۔ تھل کی ہوائیں نغمہ سرا تھیں۔ ستارے مسکرا رہے تھے اور ٹھنڈی یخ بستہ ریت ان کے قدموں تلے بچھی جا رہی تھی لیکن اس سے بڑی تلخ حقیقت اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہی ریت جب اپنی آنکھیں بدلتی ہے تو چاند کے ساتھ اپنی وفاداریاں بھی تبدیل کر لیتی ہے۔

اس وقت صرف اور صرف آگ برساتے سورج کی کنیز بن کر رہ جاتی ہے۔ عشق' محبت' پیار' وفا سب جذبوں کو جھلسا کر رکھ دیتی ہے۔ جلا کر خاک کر دیتی ہے۔ یہ ریت۔ بڑی طوطا چشم ہے! یہ تھل بڑا ظالم ہے۔ لیکن معصوم بختاور اس بات سے یکسر بے خبر تھی۔

بھلا ریگستانوں سے بھی چشمے پھوٹ سکتے ہیں؟ وہ پگلی یہ نہیں جانتی تھی کہ صحرا میں چشمے تلاش کرنے والوں کے حصے میں سراب کے علاوہ کچھ نہیں آتا۔ لیکن جو بھی تھا اس وقت تھل کے خاموش صحرا سے محبت کا چشمہ پھوٹ نکلا تھا اور وہ اس میں نہا کر رہ گئی تھی۔ آج اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کے اندر ہی اندر جو جذبہ پروان چڑھ رہا تھا۔ وہ کچھ اور نہیں تھا۔ وہ محبت تھی! اور اس کی محبت کوئی معمولی محبت نہیں تھی۔ اس کی محبت تھل کا پیاسا صحرا تھی اور صارم اس کے لیے ٹھنڈا' میٹھا چشمہ۔ وہ اس سے گریز کر ہی نہیں سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

سن چرخے دی مٹھی مٹھی کوک
ماہیا میتوں یاد آندا
میرے دل وچوں اٹھدی اے ہوک
ماہیا میتوں یاد آندا

(چرخہ چلنے کی میٹھی میٹھی آواز سن کر مجھے ماہی یاد آتا ہے تو میرے دل سے ایک ہوک سی اٹھتی ہے)۔

بخشو کے ہاتھ ماہرانہ انداز میں چاک پر حرکت کر رہے تھے اور مٹی اپنی شکل لمحہ بہ لمحہ تبدیل کرتی چلی جا رہی تھی اور بختاور گیلی مٹی اٹھا اٹھا کر بخشو کے سامنے ڈھیر کرتی جا رہی تھی' لیکن اس کی پوری توجہ نصرت فتح علی خان کی آواز پر لگی ہوئی تھی جو پاس ہی رکھے اسٹول پر پڑے ریڈیو میں سے بلند ہو رہی تھی۔

میری عید والا چن کدوں چڑھے گا
اللہ جانے ماہی کدوں ویڑھے وڑے گا
دکھ ڈاہڈے نے تے جندڑی ملوک
ماہیا میتوں یاد آندا
سن چرخے دی مٹھی مٹھی کوک

(میری عید کا چاند کب چڑھے گا؟ اللہ جانے ماہی کب گھر آئے گا دکھ بہت ظالم اور جان کمزور ہے)۔

"بختاورے کدھر گم ہو گئی؟ مٹی رکھ نا۔" بخشو کی آواز پر بختاور نے چونک کر باپ کی طرف دیکھا اور جلدی جلدی مٹی کا تسلہ بخشو کے پاس پلٹ دیا۔ تصور کے پردوں پر گزری رات کے مناظر' صارم کا مسکراتا چہرہ' اور کان ریڈیو سے ابھرنے والی آواز پر لگے ہوئے تھے۔

ماہی آوے گا تے خوشیاں مناواں گی
اوہدے راہواں وچ اکھیاں وچھاواں گی
جان چھڈی اے وچھوڑیاں نے پھوک
سن چرخے دی مٹھی مٹھی کوک

(ماہی آئے گا تو خوشیاں مناؤں گی' اس کے راستے میں آنکھیں بچھاؤں گی جان کو تو جدائیوں نے راکھ کر ڈالا ہے۔)

بختاور نے مٹی کا ایک اور تسلہ بھرا اور لے جا کر بخشو کے سامنے پلٹ دیا۔ بخشو کے ہاتھ انتہائی چابک دستی سے چاک پر اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے اور وہ پوری تندہی سے اپنے کام میں مصروف تھا اس نے ایک نظر بختاور کی طرف دیکھا جو مٹی سے لتھڑے ہاتھ

اپنی ٹھوڑی پر ٹکائے دور کہیں خلاؤں میں تک رہی تھی اور فضا میں آواز بلند ہو رہی تھی۔

طعنے مار دے نے اپنے شریک وے
لکھ چھٹی وچ اوہن دی تاریک وے
کالی رات والی ڈنگے میتوں شوک
ماہیا میتوں یاد آندا!
سن چرخے دے مٹھی مٹھی کوک

(شریک طعنے دیتے ہیں' اپنے آنے کی تاریخ چٹھی میں لکھ بھیجو' اب تو کالی رات بھی ڈنک مار رہی ہے۔)

"بختاورے.......! کہاں دھیان ہے تیرا؟ کب سے آوازیں دے رہا ہوں مگر تو سنتی ہی نہیں۔ کام کی طرف تو دھیان ہی نہیں ہے تیرا' سارا سارا دن خلاؤں میں نہ جانے کیا دیکھتی رہتی ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نہ تیری؟ دماغ کو بخار تو نہیں چڑھ گیا؟ اگر ایسی کوئی بات ہے تو حکیم جی سے دوائی لے آ۔ چل جا! میں خود کام کر لوں گا تو جا کر آرام کر۔"

"نن۔ نہیں بابا! ایسی تو کوئی بات نہیں' لا رہی ہوں نا میں مٹی۔" بختاور نے گڑبڑا کر کہا اور جلدی سے تسلے میں مٹی بھرنے لگی۔

کتاں پونیاں تے ہنجو میرے وگدے
ہن ہاسے وی نئیں میتوں چنگے لگدے
کیویں بھل جاواں اوہدے میں سلوک
سن چرخے دی مٹھی مٹھی کوک
ماہیا میتوں یاد آندا۔

(چرخہ کاتتے ہوئے میرے آنسو بہتے ہیں' اب تو ہنسنا مسکرانا بھی اچھا نہیں لگتا' اس کی محبت' اس کا سلوک' کیسے بھول جاؤں؟"

☼ ☼ ☼

"بچاؤ' بچاؤ" کی آواز ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی جب شکیل کے کانوں سے ٹکرائی تو شکیل کے بڑھتے ہوئے قدم بے اختیار رک گئے۔ چھ فٹ قد کا مالک اونچا لمبا شکیل ایک مضبوط اور کسرتی جسم کا مالک تھا اور کیوں نہ ہوتا؟ شکیل کراٹے چیمپئن تھا۔ بہت سے مقابلے جیت چکا تھا۔ آج تک پورے ملک میں کہیں بھی جوڈو کراٹے کے مقابلے ہوئے تھے تو شکیل ان مقابلوں میں شریک تھا اور جیت ہمیشہ اس کی جیب میں پڑی ہوتی تھی۔

دن رات کی پریکٹس سخت ورزشوں اور مشقوں کی مدد سے اس نے اپنے آپ کو ناقابل تسخیر بنا لیا تھا' اس کا بدن کسی پتھر کی طرح سخت اور ارادے چٹان کی طرح مضبوط تھے' اپنی انتھک محنت ہی کی بدولت اس نے آج تک ہر مقابلہ جیتا تھا ہارنا تو جیسے اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔

لیکن جہاں اس نے ہر جگہ جیت کے جھنڈے گاڑے تھے وہیں وہ ایک احساس محرومی کا شکار بھی تھا لیکن وہ احساس' وہ محرومی' قدرت کا فیصلہ تھی اور ہر مقابلہ جیتنے کے باوجود وہ قدرت کے سامنے بے بس تھا' یہاں جیتنا اس کے بس میں نہیں تھا۔

مضبوط سڈول اور خوبصورت جسم رکھنے کے باوجود شکل و صورت کے معاملے میں اس کے یکسر الٹ معاملہ تھا۔ گہری سیاہ رات جیسی تاریک رنگت' چھوٹی چھوٹی آنکھیں' موٹے موٹے ہونٹ گھونگریالے بال اور پکوڑے جیسی ناک کے ساتھ وہ اس ملک کا باسی تو ہرگز لگتا ہی نہیں تھا بلکہ افریقہ کے کسی قبائلی علاقے کا باشندہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کے باوجود اسے اپنے ملک سے گہری محبت تھی' اس کا دل ایک درد مند دل تھا' وہ اپنے ملک کی دن بدن بگڑتی ہوئی صورت حال اور حکمرانوں کی بے حسی پر ہمیشہ کڑھتا رہتا تھا لیکن کروڑوں عوام کی طرح وہ بھی بے بس تھا' کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہاں جو بھی حکمران آتا ہے وہ سوائے اپنی جیبیں بھرنے کے اور کچھ نہیں کرتا' ہر حکمران اس ملک کے ساتھ سوتیلی ماں کا سا سلوک کرنے پر مجبور ہے کہ ہم خود انہیں ایوانوں تک پہنچاتے ہیں' یہ اختیار یہ طاقت ہم عام لوگ ہی تو انہیں بھیک میں دیتے ہیں۔ اپنی سخاوت' اپنی فیاضی کا اس قدر مظاہرہ کرتے ہیں کہ ووٹ دیتے وقت یہ تک نہیں سوچتے کہ کیا یہ لوگ اس کے اہل بھی ہیں یا

نہیں ہے؟"

بچاؤ بچاؤ کی فریادی آواز ایک مرتبہ پھر سنائی دی تو شکیل نے چوکنا انداز میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں لیکن کچھ نظر نہ آیا ہاں آواز کی سمت کا کسی حد تک اندازہ اسے ضرور ہو گیا تھا۔ آواز اس کے بائیں سمت کچھ فاصلے پر موجود ایک نیم تاریک گلی سے بلند ہو رہی تھی کوئی لڑکی انتہائی خوفزدہ انداز میں چلائی تھی اور شکیل اب اس معاملے میں ٹانگ اڑائے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا' آواز میں خوف تھا' کرب تھا' بیچارگی تھی' التجا تھی اور صاف ظاہر تھا کہ لڑکی کسی مصیبت میں ہے اور دوسروں کو مصیبت میں دیکھ کر آنکھیں بند کر لینا شکیل کی سرشت میں شامل ہی نہیں تھا کیونکہ وہ حکمران نہیں تھا وہ ایک عام آدمی تھا۔ لیکن اب اتنا عام بھی نہیں تھا کہ کسی مجبور اور لاچار کی مدد نہ کر سکتا سو اس کے قدم آپوں آپ ہی نیم تاریک گلی کی جانب اٹھتے چلے گئے۔

جونہی وہ گلی میں داخل ہوا بے اختیار لڑکھڑا کر رہ گیا' اس کے منہ پر پڑنے والا مکہ تو اتنا زوردار نہیں تھا کہ وہ لڑکھڑا جاتا ہاں بے خیالی کی وجہ سے وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ پایا تھا اور لہرا کر رہ گیا تھا کیونکہ اسے اپنے اس محبت بھرے استقبال کی ہرگز بھی توقع نہیں تھی۔ اس لیے وہ بے پرواہ سے انداز میں گلی کے اندر داخل ہوا تھا نتیجتاً" ایک شاندار مکہ اسے اپنے جبڑے پر برداشت کرنا پڑا تھا۔

حملہ آور سنبھل کر ایک مرتبہ پھر جھپٹا لیکن اس مرتبہ اس کا مکہ شکیل کے چہرے پر صدقے واری ہونا ممکن نہیں تھا' کیونکہ اب شکیل سنبھل چکا تھا اور اس کی ساری حسیات بیدار ہو چکی تھیں' حملہ آور کے جس مکے نے شکیل کا چہرہ چوما تھا وہی مکہ شکیل کی تمام تر حسیات کی بیداری کا باعث بن چکا تھا اور اب شکیل کو زیر کرنا اتنا آسان نہیں تھا! حملہ آور جو شائید شکیل سے پوری طرح واقف نہیں تھا اس کا داہنا ہاتھ شکیل کے ہاتھ میں آچکا تھا اور شکیل سے ناواقفیت اسے بہت مہنگی پڑی تھی۔ شکیل نے نہ صرف بائیں ہاتھ سے اس کا مکہ روکا تھا بلکہ اس کا ہاتھ بھی شکیل کی گرفت میں تھا اس کے ساتھ ہی شکیل کا چچا تلا رائٹ ہک حملہ آور کی ناک پر پڑا اور اس کی ناک سے بھل بھل خون بہنے لگا شاید اس کی ناک کا بانسہ چیخ گیا تھا۔

حملہ آور بلبلا کر رہ گیا لیکن شکیل نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا تھا اس نے اپنے ہاتھ میں موجود حملہ آور کے ہاتھ کو پوری قوت سے اپنی جانب کھینچا جس کے نتیجے میں شکیل اور حملہ آور کا فاصلہ انتہائی تیزی سے ختم ہوا اور وہ پوری قوت سے شکیل کی طرف کھٹا لیکن اس وقت تک شکیل اپنا گھٹنا مناسب انداز میں موڑ چکا تھا اس کے گھٹنے کی وہ زوردار ضرب حملہ آور کو اپنی ناف پر سہنا پڑی اور وہ ڈکراتا ہوا الٹ کر گرا۔

ٹھیک اسی لمحے شکیل کو انتہائی تیزی سے نیچے جھکنا پڑا اگر اسے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو لوہے کی وہ سلاخ اس کے سر کا بھرکس بنا دیتی جو شکیل کو غافل جانتے ہوئے حملہ آور کے ایک اور ساتھی کی طرف سے شکیل سے اپنی بے پایاں محبت کا عملی مظاہرہ تھی۔ سلاخ کو اپنا مطلوبہ ہدف نہ ملا تو حملہ آور اپنی ہی جھونک میں آگے بڑھتا چلا گیا۔

شکیل تیزی سے کھڑا ہوتے ہوئے ایک ٹانگ پر گھوم گیا جبکہ اس کی دوسری ٹانگ ایک دائرے میں گھومتی ہوئی حملہ آور کے پہلو پر پڑی اور وہ تقریباً" تین فٹ اونچا اچھل کر اڑتا ہوا دور جا گرا۔ ٹھیک اسی لمحے کڑکڑاہٹ کی خوفناک آواز بلند ہوئی جسے سن کر شکیل کے بدن میں لہو کی گردش تیز ہو گئی وہ اس آواز کو پہچان چکا تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو سامنے ہی ایک انتہائی خوبصورت لڑکی نظر آئی جسے ایک شخص نے بری طرح دبوچ رکھا تھا جبکہ دوسرا شخص گراری دار چاقو کھولنے کے بعد تیز رفتاری کے ساتھ اسے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے قدم قدم شکیل کی طرف بڑھ رہا تھا۔

اس کی شکاری نظریں شکیل پر جمی ہوئی تھیں۔ چاقو کھلنے کی مخصوص آواز شکیل پہلے ہی شناخت کر چکا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ نمودار

ہو گئی کیونکہ ایسے کھیل تماشے اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ حملہ آور کا انداز یہ ثابت کرنے کے لیے کافی تھا کہ وہ ایک ماہر چاقو زن ہے۔ شکیل تیزی سے گردش کرتے ہوئے چاقو پر نظریں جمائے اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا۔

جیسے جیسے چاقو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہو رہا تھا ویسے ویسے شکیل کی نظریں ادھر سے ادھر گردش کر رہی تھیں۔ اور پھر جوں ہی چاقو زن اس کے مطلوبہ فاصلے تک پہنچا شکیل کی ٹانگ انتہائی تیز رفتاری سے حرکت میں آئی۔ اوغ۔ کی تیز آواز کے ساتھ حملہ آور اپنا ہاتھ پکڑ کر دوہرا ہو گیا۔ چاقو اس کے ہاتھ سے نکل کر اڑتا ہوا کہیں دور جا گرا تھا۔ کسی ماہر ایتھلیٹ کی طرح بھاگتے ہوئے شکیل نے ایک زوردار ٹکر حملہ آور کے سینے پر رسید کی اور وہ چاروں شانے چت زمین بوس ہو گیا پھر شکیل نپے تلے انداز میں اس شخص کی طرف بڑھا جو لڑکی کو قابو کیے کھڑا تھا۔

اس شخص نے شکیل کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو لڑکی کو ایک زوردار دھکا دیا' لڑکی منہ کے بل زمین پر گری تو اس کے منہ سے ایک بے ساختہ چیخ بلند ہوئی اس کی ٹھوڑی زمین سے ٹکرا گئی تھی' لڑکی نے جلدی سے سنبھلنے کی کوشش کی تو شکیل نے ایک لمحے کے لیے لڑکی کی طرف دیکھا۔ لڑکی کی ٹھوڑی سے خون رس رہا تھا' دوسرے ہی لمحے شکیل غیض و غضب کے عالم میں حملہ آور کی طرف بڑھا۔ حملہ آور نے بلا کی پھرتی سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ریوالور نکال لیا لیکن اس کو چلانے کی حسرت اس کے دل میں ہی رہ گئی کیونکہ شکیل لانگ جمپ کا مظاہرہ کرتے ہوئے جیسے اڑتا ہوا سا حملہ آور پر جا پڑا تھا۔ ریوالور حملہ آور کے ہاتھ سے نکل گیا اور وہ دونوں ایک ساتھ زمین پر آرہے۔

شکیل نے اس کے چہرے پر گھونسوں کی بارش کر دی۔ چند ہی لمحوں میں اس کے چہرے پر اچھے خاصے بیل بوٹے نمودار ہو گئے لیکن پھر اس کا داؤ چل گیا۔ اس کے داہنے ہاتھ کی زوردار ضرب شکیل کی کنپٹی پر پڑی تھی' شکیل کی آنکھوں میں نیلے پیلے ستارے سے ناچ اٹھے اور وہ لڑھک کر ایک طرف جا گرا لیکن اس نے سنبھلنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی سر جھٹکتے ہوئے جونہی وہ کھڑا ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس سے بھڑنے والا شخص بھاگتا ہوا گلی کے موڑ پر غائب ہو رہا تھا۔

شکیل نے کھڑے ہو کر چاروں طرف نظریں دوڑائیں تو اس کے باقی ساتھی بھی کہیں نظر نہ آئے وہ شاید پہلے ہی نو دو گیارہ ہو چکے تھے۔ میدان صاف دیکھ کر شکیل لڑکی کی طرف متوجہ ہوا جو سہمی ہوئی سی دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی اور اب خوفزدہ نظروں سے شکیل کی طرف دیکھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

حیرت انگیز طور پر آج شام ہی سے مطلع ابر آلود تھا آسمان پر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے ہلکے بادل جیسے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ سنسناتی ہواؤں کے گیت ماحول پر ایک سحر طاری کر رہے تھے بادلوں کی اوٹ سے کبھی کبھی نمودار ہوتا مسکراتا ہوا چاند آنکھوں کو بہت بھلا لگ رہا تھا' تھل اپنی روایتی خوبصورتی کے ساتھ حسب معمول گہری چپ کی چادر اوڑھے ہوئے تھا جیسے بزبان خموشی کہہ رہا ہو۔

تو بھی اپنی خواہشوں پر چپ کی چادر اوڑھ لے
میں بھی اپنے پیار کا قصہ سنا سکتا نہیں

ایسے عالم میں صارم اور بختاور آپس میں مدغم ہوتے ہوئے ان دو ٹیلوں کی آغوش میں ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے خاموش بیٹھے تھے وقت جیسے تھم چکا تھا اور چاروں طرف بہتی اس گہری خاموشی میں صرف آنکھیں بول رہی تھیں اور یہ گفتگو ان دونوں کو بہت بھلی لگ رہی تھی۔ کبھی کبھی خاموشی کی زبان میں کی گئی باتیں گھنٹوں تقریر کرنے سے زیادہ اثر انگیز ہوتی ہیں اور یہ بات ان دونوں سے زیادہ اور کون جانتا تھا۔

”بختاور میں اس گاؤں میں صرف دس دن کے لیے آیا تھا لیکن آج مجھے یہاں آتے ہوئے پورے چالیس دن ہو گئے ہیں۔ تمہارے بغیر میرا یہاں سے جانا تو کیا سانس لینا بھی ناممکن ہو کر رہ گیا ہے کیا کوئی ایسی صورت نہیں ہو سکتی کہ ہم دونوں ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں۔؟“ صارم نے سوالیہ نظروں سے بختاور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو بختاور جیسے گہری نیند سے بے دار ہوئی اور پھر نظریں جھکاتے ہوئے بولی۔

”میرے بابا سے بات کرنا۔“

”دیکھو بختاور ہم دونوں دو الگ الگ دنیاؤں کے رہنے والے ہیں ہمارے درمیان فاصلہ بھی بالکل اسی طرح ہے جس طرح زمین اور آسمان۔۔۔ میں شہر کا رہنے والا اور تم گاؤں کی باسی۔ میرے خاندان اور تمہارے گھر والوں کے رہن سہن میں بہت فرق ہے۔ تمہارے بابا تو شاید مان جائیں مگر میری فیملی اس رشتے کے لیے کبھی راضی نہیں ہوگی۔ ہاں یہ علیحدہ بات ہے کہ اگر ہمارے ایک ہو جانے کے بعد ان کو پتا چلے تو رفتہ رفتہ شاید وہ ہمارے اس رشتے کی حقیقت کو تسلیم کر ہی لیں!“ صارم کی بات سن کر بختاور پریشان ہو گئی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

”تو پھر کیا ہوگا؟ کیا ہم نہیں مل پائیں گے۔؟“

”میں نے یہ کب کہا؟ تمہارے لیے اپنا خاندان تو کیا میں دنیا تک چھوڑنے کے لیے تیار ہوں۔ بس تمہارا ساتھ ہونا چاہیے۔“ صارم نے جذباتی انداز میں کہا۔

”اللہ نہ کرے صارم! کہ آپ کو کچھ ہو اللہ آپ کو زندگی دے آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ اور ہاں کیا آپ کو میری محبت پر شک ہے؟ اگر آپ میرے لیے اپنا خاندان چھوڑ سکتے ہیں تو کیا میں اتنی کمزور ہوں کہ آپ کے لیے کچھ نہ کر سکوں؟ آپ بابا سے بات تو کر کے دیکھیں مجھے پورا یقین ہے کہ وہ مان جائیں گے۔“ بختاور نے جیسے صارم کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ لیکن میں نے بتایا نا کہ میرے گھر والے کبھی نہیں مانیں گے۔“ صارم نے دو ٹوک انداز میں کہا اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔

”آپ ایک بار کوشش تو کریں کیا خبر وہ مان جائیں؟“ بختاور نے امید و بیم کی کیفیت میں کہا۔ صارم نے ایک طویل سانس لی اور پھر گویا ہوا۔

”ٹھیک ہے تم کہتی ہو تو میں کوشش کرتا ہوں، لیکن ایک بات ذہن میں رکھو کہ اس کے لیے مجھے شہر جانا پڑے گا اور میرے اندازے کے مطابق اگر وہ نہیں مانے تو پھر شاید وہ مجھے اس گاؤں میں دوبارہ کبھی نہیں آنے دیں گے۔“

”آخر کوئی تو حل ہوگا؟ کسی صورت تو انہیں منایا جا سکتا ہوگا۔ اور آپ کے کہنے کے مطابق اگر وہ نہیں مانے تو پھر ہمارا کیا ہوگا؟ کیا آپ میرے بغیر رہ سکیں گے؟“ بختاور پریشان ہو کر بولی۔ جواب میں صارم نے جو کچھ کہا اسے سن کر بختاور دھک سے رہ گئی۔ دوڑتے بھاگتے ہوئے بادل جیسے اپنی جگہ ساکت ہو گئے، ہواؤں کے گیت ان کے گلے میں ہی گھٹ کر رہ گئے اور چاند بادلوں کی اوٹ سے منہ نکالے حیران نظروں سے ان دونوں کو تکتا رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

بخشو حسب معمول اپنے کام میں جتا ہوا تھا چاک تیزی سے گھوم رہا تھا اور اسی رفتار سے بخشو کے ہاتھ اور انگلیاں گیلی مٹی پر حرکت کرتی جا رہی تھیں اور گونگی مٹی کو زبان مل رہی تھی۔ بے نقش مٹی نئی سے نئی شکل میں ڈھلتی چلی جا رہی تھی۔ بختاور بھی ہمیشہ کی طرح اپنے فرائض خوش اسلوبی سے ادا کر رہی تھی اور بخشو کے سامنے گیلی مٹی کا ذخیرہ جمع ہوتا چلا جا رہا تھا کہ اتنے میں بیرونی دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی ٹھک ٹھک۔

”بختاورے! ذرا دیکھ تو باہر کون ہے؟“ بخشو نے مٹی کو چاک پر رکھتے ہوئے کہا۔

”کیا خبر کون ہو بابا! تم خود دیکھو نا؟“ بختاور نے کہا اور بھاگ کر اندرونی کمرے میں داخل ہو گئی۔ بخشو نے چند لمحوں تک حیرت زدہ انداز میں اس کی اس حرکت پر

غور کیا پھر ایک طویل سانس لیتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔

”اسلام علیکم چاچا جی! دروازہ کھلتے ہی خوش شکل صارم کا چہرہ نظر آیا۔ ”وعلیکم السلام پتر! خیریت تو ہے؟“ بخشو نے تعجب بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”چاچا! آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ اگر آپ تھوڑا وقت دے سکیں تو؟“

”بسم اللہ، پتر! اندر آجا۔ ہم غریبوں سے کیا کام پڑ گیا شہری بابو کو۔؟“ بخشو واپس مڑتے اور صارم کو اندر آنے کا کہتے ہوئے بولا، لہجہ بدستور سوالیہ تھا۔ پھر کچھ ہی دیر کے بعد بخشو چاک کے عقب میں اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھا تھا اور سوالیہ نظروں سے صارم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جبکہ صارم ایک اسٹول پر بیٹھا پر سوچ انداز میں سر کھجاتے ہوئے شاید مناسب الفاظ اور حوصلہ مجتمع کر رہا تھا۔ پھر شاید وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گیا اور بولا۔

”برا مت ماننا چاچا! میں جانتا ہوں کہ گاؤں، دیہات کے ماحول میں ان باتوں کو بہت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ لیکن کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں کیے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں ہوتا اور یہ بات بھی کچھ ایسی ہی ہے جو ہر حال میں مجھے آپ سے کرنی ہی ہے۔ صارم نے لحظہ بھر رک کر بخشو کے چہرے پر نظریں دوڑائیں لیکن اس کا چہرہ سپاٹ تھا اور وہ خاموشی سے صارم کی طرف دیکھ رہا تھا۔

صارم نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں بختاور اسے کہیں نظر نہ آئی لیکن وہ جانتا تھا کہ بختاور اس کی آمد سے باخبر بھی ہے اور اس وقت یہاں ہونے والی گفتگو بھی سن رہی ہے۔ چند لمحے توقف کے بعد صارم نے کھنکھار کر جیسے گلا صاف کیا اور پھر سلسلہ کلام کو جوڑتے ہوئے بولا۔

”چاچا جی! بات دراصل یہ ہے کہ میں آپ کی بیٹی بختاور کو پسند کرتا ہوں اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ میں۔۔۔ آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ ہمیشہ خوش رہے گی۔“ یہ بات کہہ کر صارم کے سر سے جیسے بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔ بخشو کے انداز میں کوئی تبدیلی نمودار نہیں ہوئی، وہ بدستور خالی خالی نظروں سے صارم کی صورت دیکھے جا رہا تھا۔ لیکن جب وہ بولا تو اس کی باتیں کسی بھی طرح نظر انداز کی جانے والی نہیں تھیں۔

”دیکھو پتر جی! میں بوڑھا آدمی ہوں، زمانے کا سرد و گرم دیکھے ہوئے ہوں اس لیے تمہاری بات تسلی سے سن لی ہے میں نے، لیکن ضروری نہیں کہ اس کا جواب بھی تمہاری توقع کے مطابق ہو۔ ابھی پچھلے دنوں میں منڈی مویشیاں گیا تھا تو وہاں ایک بھینس مجھے بہت پسند آئی جسے غلام حسین سومرو نے خرید لیا اور گاؤں لے آیا آتے جاتے اب بھی میں روز اسے دیکھتا ہوں اور وہ بھینس آج بھی مجھے اتنی ہی پسند ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں لا کر اسے اپنے کھونٹے پر باندھ لوں۔“ بخشو سیدھے سادے دیہاتی انداز میں گفتگو کر رہا تھا لیکن اس کی اس دیہاتی انداز کی گفتگو سے گہرا فلسفہ جھلک رہا تھا۔ اس کی عمر کا تجربہ جھانک رہا تھا۔ وہ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔

”پسند آجانے والی چیز کو ملکیت تو نہیں بنایا جا سکتا نا؟ تم شہر میں رہنے والے ضرور ہو لیکن کچھ روایات ابھی تک قصبوں میں بھی زندہ ہیں۔ تم زمیندار غلام حسین سومرو کے گھر رکے ہوئے ہو جس کا بیٹا تمہارا دوست ہے، جو شہر سے پڑھ کر تو ضرور آیا ہے لیکن اس کی حرکتوں اور عادات و اطوار سے میں ہی کیا؟ پورا گاؤں بلکہ ارد گرد کے تمام گاؤں والے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔ اور تم اس کے دوست ہو۔ کچھ ہی دن پہلے شہر سے آئے ہو کیا کرتے ہو کہاں رہتے ہو کون سے خاندان سے تعلق رکھتے ہو، میں کچھ نہیں جانتا پھر میں یہ کیسے یقین کر لوں کہ تم ایک اچھے انسان ہو؟ تمہارے شہر کا تو مجھے پتہ نہیں، لیکن ہمارے یہاں رشتے ناتے لڑکے خود جا کر طے نہیں کرتے بلکہ خاندان کے بڑے، بزرگ بات کرتے ہیں۔ اگر تمہاری جگہ تمہارے والدین آکر یہ بات کرتے تو شاید

میں کچھ سوچ بھی لیتا۔ لیکن تمہاری یہ بات یہ حرکت دیکھتے ہوئے تو میں اس بارے میں اس فیصلے کے علاوہ تمہیں اور کوئی جواب نہیں دے سکتا کہ "مجھے یہ رشتہ منظور نہیں۔ اب تم جاسکتے ہو۔" صارم کو شاید ایسے جواب کی توقع نہ تھی وہ چند لمحوں تک بخشو کے چہرے کو دیکھتا رہا پھر ایک گہری سانس لیتے ہوئے اٹھا اور سست قدمی سے چلتا ہوا بخشو کے گھر سے باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

آج بھی آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ چاند منہ چھپائے گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا ہوائیں اپنا شریر انداز ترک کرکے انتہائی سستی سے جیسے صرف اپنا فرض ادا کرنے کی غرض سے چل رہی تھیں۔ ماحول پر خنکی چھائی ہوئی تھی اور چاند کے نہ نکلنے کی وجہ سے اردگرد کے تمام مناظر کو تاریکی نے ڈھانپ رکھا تھا۔ صارم آج بھی ٹیلوں کے سنگم پر بیٹھا بختاور کا منتظر تھا لیکن بختاور اب تک نہیں پہنچی تھی۔

وقت دھیرے دھیرے آگے سرک رہا تھا اور صارم بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے اس گھڑی کا انتظار کررہا تھا جب بختاور اس کے سامنے آئے اور وہ کسی نتیجے پر پہنچ سکے عموماً" ایسا ہوتا تھا کہ صارم اور بختاور تقریباً" ایک ساتھ یا کچھ لمحوں کے فرق سے آگے پیچھے ہی یہاں پہنچ جاتے تھے لیکن آج کافی دیر گزر جانے کے بعد بھی بختاور نہیں پہنچ پائی تھی۔

انتظار طویل ہوتا جارہا تھا' صارم کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے لیکن انتظار تو بہر حال اسے کرنا ہی تھا۔ آخر کار اس کا انتظار رنگ لایا اور معمول سے تقریباً" دو گھنٹے کی تاخیر کے بعد اندھیرے کی اوٹ سے بختاور کا نرم و نازک وجود نمودار ہوا تو صارم نے سکون کی سانس لی۔

"اتنی دیر کیوں کردی؟" صارم نے بے قراری سے پوچھا۔

"بابا نے تمہارے جانے کے بعد مجھے بہت ڈانٹ ڈپٹ کی تھی اور آج سوئے بھی بہت دیر سے۔ مجھے ان سے اس رویے کی امید نہیں تھی' کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کروں؟" بختاور نے پریشان کن انداز میں جواب دیا تو صارم بولا۔

"سمجھ میں نہ آنے والی تو کوئی بات ہے نہیں' میں تو پہلے ہی تمہیں بتاچکا ہوں کہ یہ اتنا آسان نہیں۔ اور اس کا حل کیا نکل سکتا ہے وہ بھی میں نے تمہیں بتادیا تھا! تمہاری ہی ضد سے مجبور ہوکر میں نے تمہارے بابا سے بات کی' لیکن ان کا جواب میری توقع کے خلاف نہیں تھا' اور پھر یہ تو ایک طرف کی صورت حال ہے' میرا خاندان تو اس سے بھی زیادہ سخت رویہ اپنائے گا۔ میری نظر میں صرف اور صرف ایک وہی حل ہے جس سے ہمارا ملنا ممکن ہوسکتا ہے۔ جو میں تمہیں بتاچکا ہوں اس کے علاوہ اور کوئی دوسرا راستہ ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔"

"تو اگر تمہارے کہنے کے مطابق ہم خود سے شادی کرلیں تو... تو میرے بابا کا کیا ہوگا؟ کیا گاؤں میں ان کی عزت ختم ہوکر نہیں رہ جائے گی؟ اور اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ بعد میں تمہارے گھر والے ہمارے اس رشتے کو تسلیم کرلیں گے۔" بختاور نے آزردگی سے کہا۔

"دیکھو بختاور وقت بذات خود ہر زخم کا مرہم ہوتا ہے۔ اور جب ایک رشتہ قائم کرہی لیا جائے گا تو پھر سوائے اس رشتے کو تسلیم کرنے کے۔ نہ تو میرے گھر والوں کے پاس کوئی دوسرا راستہ ہوگا اور نہ ہی تمہارے بابا کے پاس۔

جب ہم ایک ہوجائیں گے تو پھر انہیں اس رشتہ کو ماننا ہی پڑے گا! میری نیت صاف ہے' ہم کوئی گناہ تو نہیں کررہے نا؟ میں باقاعدہ تم سے نکاح کررہا ہوں اور تم میری بیوی بن کر رہو گی۔ اگر تم کہو گی تو کچھ عرصے کے بعد ہم دونوں تمہارے بابا سے ملنے آئیں گے۔ تب وہ ضرور مان جائیں گے والدین زیادہ دیر اپنی اولاد سے ناراض رہ ہی نہیں سکتے۔" صارم نے سمجھانے والے انداز میں بختاور سے کہا۔ بختاور ایک عجیب دوراہے پر آن کھڑی ہوئی تھی وہ کشمکش کے عالم میں صارم

کو دور ہوتے دیکھتی رہ گئی۔

ایک طرف اس کا محبت کرنے والا بابا تھا جس نے بچپن سے لے کر اب تک بساط بھر اس کی ہر خواہش پوری کی تھی تو دوسری طرف وہ جادوگر تھا جس کی دھڑکنوں پر حکومت تھی' یہ فیصلہ اس طرح ایک لمحے میں کرلینا بختاور کے بس کی بات نہیں تھی۔ ادھر صارم سوالیہ انداز میں اس سے مخاطب تھا۔

"بولو بختاور جواب دو؟ کیا تم میرا ساتھ دوگی؟ یا ہماری محبت کے انجام پر جدائی لکھ دیا جائے گا؟ بولو۔ جواب دو؟"

"ص... ص... صارم۔ اتنا بڑا فیصلہ اتنی جلدی کیسے کرلوں؟ اپنا گاؤں' اپنی سکھیاں اور سب سے بڑھ کر اپنے بابا کو چھوڑ کر۔ تمہارے ساتھ ایک ان دیکھی دنیا بسانے کیسے چلی جاؤں؟ تم نے مجھے سخت امتحان میں ڈال دیا ہے' کیا کروں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا!" بختاور نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔

"بس تو پھر تمہیں تمہارا گاؤں' تمہاری سکھیاں اور تمہارے بابا کی محبت مبارک ہو' میں واپس شہر جارہا ہوں اگر یہ ہی تمہاری محبت ہے تو اسے ایک داغ کی صورت اپنے دل پر سجائے ساتھ لے جاؤں گا۔ اگر تمہیں میری ضرورت ہے تو کل رات اسی وقت فیصلے کے ساتھ یہاں آنا ورنہ اگلے دن کے بعد تم دوبارہ کبھی میری شکل نہیں دیکھ پاؤ گی۔" صارم نے غصیلے انداز میں کہا اور پاؤں پٹختے ہوئے گاؤں کی سمت روانہ ہوگیا جبکہ بختاور وہیں کھڑی اپنی اشک بار آنکھوں سے صارم کو دور ہوتے دیکھتی رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

اگلی رات بدستور ایک تاریک رات تھی گہرے بادل چاند کی کرنوں کا راستہ روکے کھڑے تھے سر سے پاؤں تک ایک چادر میں لپٹا وجود جس کے ایک ہاتھ میں چھوٹا سا بیگ تھا ریت کے ٹیلوں کی جانب محو سفر تھا۔ ٹیلوں کے قریب پہنچ کر اس نے بیگ ایک جگہ آڑ میں رکھا اور ٹیلوں کے اردگرد گھوم کر دور تک نظریں دوڑائیں لیکن وہاں اور کوئی ذی روح موجود نہ تھا۔ اس نے چہرے سے چادر ہٹائی اور پھر نیچے بیٹھ کر ٹیلے کے ساتھ ٹیک لگادی۔ وہ بختاور تھی۔

اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا کیونکہ کچھ ہی دیر کے بعد ایک جانب سے صارم نمودار ہوا اور اس کے قریب آکر دھپ سے زمین پر بیٹھ گیا۔

"مجھے خوشی ہے کہ تم نے درست فیصلہ کیا' ہمارے پاس اس کے علاوہ اور کوئی حل نہیں تھا لیکن مجھے یقین ہے کہ تم میرے ساتھ ہمیشہ خوش رہو گی۔" صارم نے پرجوش انداز میں کہا تو بختاور اپنی ڈبڈبائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئی اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور غم ہی غم لہریں لیتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اور پھر دو آنسو ٹپک ہی پڑے۔ صارم نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے ایک انگلی کی مدد سے اس کے دونوں آنسو پونچھ ڈالے اور اس کا سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے بولا۔

"پگلی! لڑکیاں ایک نہ ایک دن تو اپنے بابل کا گھر چھوڑ ہی دیتی ہیں' تھوڑا سا طریقے کا فرق ضرور ہے لیکن جا تو تم بھی پیا گھر ہی رہی ہو! حوصلے سے کام لو' اگر فیصلہ کرہی لیا ہے تو اب میرے ساتھ ساتھ قدم ملا کر چلو' خوشیوں کا ایک نیا جہاں ہمارا انتظار کررہا ہے۔"

جواباً" دور کہیں کسی کتے نے غرا کر جیسے صارم کی اس بات کا برا منایا لیکن وہ دونوں اس بات سے بے پرواہ ہوچکے تھے کہ ان کا یہ اقدام کسے اچھا لگتا ہے' اور کسے برا۔

وہ فیصلہ کرچکے تھے اور اب ہر حال میں اس پر عمل کرنا چاہتے تھے۔ بختاور نے آخری مرتبہ الوداعی انداز میں ریت کے ٹیلوں کو دیکھا' دور تک لہریں لیتے ہوئے تھل پر نظریں دوڑائیں' تھل...! جس کے سینے میں سینکڑوں راز دفن تھے آج ایک نئی کہانی نئے راز سے آشنا ہورہا تھا اور اس راز کو بھی راز ہی رکھنے پر آمادہ نظر آرہا تھا۔

بختاور نے نگاہوں ہی نگاہوں میں جیسے اپنے گاؤں کی بلائیں لیں' دل ہی دل میں اپنے بوڑھے بابا سے

معافی مانگی اور پھر اپنا چھوٹا سا بیگ اٹھا کر صارم کے ساتھ گاؤں سے باہر جانے والے راستے پر گامزن ہو گئی۔ ہوا کے دوش پر لہریں لیتے ہوئے کہیں دور سے آتی ہوئی ایک گیت کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

نی میں جاناں جوگی دے نال
کنیں مندراں پا کے
نی میں جاناں جوگی دے نال

(میں اپنے کانوں میں بالیاں ڈال کر اپنے جوگی کے ساتھ جاؤں گی)

بختاور بھی اپنے جوگی کے ساتھ چل نکلی تھی۔

گاؤں سے تھوڑی دور آنے کے بعد دونوں کے قدموں کی رفتار خود بخود تیز ہو گئی اور وہ لحہ بہ لحہ گاؤں سے دور ہوتے چلے گئے۔ تاریک رات، ویران صحرا اور دو ہیولے، جو کچھ ہی دیر کے بعد تاریکی کا حصہ بن کر رہ گئے۔

☼ ☼ ☼

سانولی رنگت کا مالک بڑی بڑی مونچھوں والا یہ شخص جو صوفے پر نیم دراز تھا تغلق خان تھا۔

تغلق خان کہاں سے آیا تھا۔ کس شہر کا باسی تھا، کوئی نہیں جانتا تھا، لیکن یہ سب جانتے تھے کہ جرائم کی دنیا میں اس نے تیزی سے اپنا نام اور مقام بنا لیا تھا چوری جیسے معمولی جرم سے لے کر اغوا، ڈکیتی، قتل، اسمگلنگ، منشیات کا کاروبار، اسلحے کی خرید و فروخت اور بردہ فروشی جیسے مکروہ جرائم اس کی چھتر چھایا تلے نہائیت خوش اسلوبی سے سرانجام پاتے تھے بڑے بڑے سرکاری آفیسر، سیاستدان، وڈیرے اور وزیر مشیر اکثر اس کی خدمات حاصل کر کے اپنے ایسے مسائل حل کرواتے تھے جن کا حل انہیں اور کہیں نہیں ملتا تھا یوں دن بدن تغلق خان کے اثر و رسوخ میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا اور اس کی جڑیں گہری سے گہری ہوتی چلی جا رہی تھیں۔

تغلق فطرتاً ایک سفاک شخص تھا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ لومڑی کی طرح عیار اور چالاک بھی اس نے اپنے آپ کو اس خوبصورتی سے کیموفلاج کیا تھا کہ اس کے رہن سہن اور اس کی سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے کوئی آدمی آسانی سے اس کی شخصیت کے اس گھناؤنے روپ کو نہیں پہچان سکتا تھا۔

بظاہر وہ ایک مالدار سیٹھ تھا جو بڑھ چڑھ کر فلاحی کاموں میں بھی حصہ لیتا تھا کبھی کسی یتیم خانے کو چندہ دے رہا ہوتا تو کبھی دارالامان میں خواتین کی اشک شوئی کرتا نظر آتا بہت سے فلاحی ادارے مستقل اس سے بڑی بڑی رقوم حاصل کر رہے تھے اور یوں تغلق خان اپنی دوہری شخصیت کو برقرار رکھے ہوئے تھا۔ جہاں تغلق خان کی ساری خوبیاں بیان کی جا رہی ہیں وہیں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ تغلق خان ایک خطرناک فائٹر بھی تھا اس کا ذاتی خیال یہی تھا کہ دوبدو لڑائی میں اسے ہرانے والا کم از کم اس ملک کی زمین پر کوئی شخص موجود نہیں ہے لیکن اس کا یہ خیال اس وقت غلط ثابت ہو گیا جب ماضی میں ایک مرتبہ وہ چند لڑکیوں کو ایک عرب شیخ کے پاس پہنچانے جا رہا تھا۔ بدقسمتی سے ایک لڑکی نے چیخ و پکار شروع کر دی تو ایک موٹر سائیکل سوار اس کی گاڑی کا پیچھا کرنے لگا تغلق نے اسپیڈ بڑھا دی لیکن بے سود۔

موٹر سائیکل سوار اس کے پیچھے کسی جونک کی طرح چمٹ کر رہ گیا تھا راستے میں ایک ویران سڑک پر پہنچتے ہی تغلق نے گاڑی ایک سائیڈ پر کر کے روک دی اور دروازہ کھولتا ہوا نیچے اتر آیا۔ موٹر سائیکل سوار نے قریب پہنچ کر اسے للکارا تو تغلق کے ہونٹوں پر زہر خند مسکراہٹ دوڑ گئی وہ اپنی فائٹنگ پاور سے بخوبی واقف تھا اور جانتا تھا کہ اکلوتے موٹر سائیکل سوار کو تو وہ چٹکیوں میں مسل کر رکھ دے گا لیکن اس کا اندازہ یکسر غلط ثابت ہوا تھا! کالے کلوٹے لیکن مضبوط جسم والے اس نوجوان نے تغلق کو ناکوں چنے چبوا دیے اور اسے دھنک کر رکھ دیا تھا۔

جب تغلق کا جوڑ جوڑ احتجاج کرنے لگا تو اس نے گھبرا کر چاقو نکال لیا لیکن افسوس کہ وہ چاقو پر ایک منٹ سے زیادہ گرفت قائم نہ رکھ سکا اور چاقو اس نوجوان کے ہاتھوں میں پہنچ گیا تغلق نے کراہ کر ایک ہاتھ اپنے دائیں گال پر رکھ لیا۔ اس کے گال پر لمبے اور گہرے زخم کا نشان اسی نوجوان کی دین تھا۔ آج بھی جب اسے یہ واقعہ یاد آتا تھا تو وہ ایک جھرجھری سی لے کر رہ جاتا تھا۔ اگر اس وقت تغلق کی قسمت یاوری نہ کرتی اور اس کے ہاتھ بے دھیانی میں وہ پتھر نہ آجاتا، جس نے اس شخص کو ہوش و خرد سے بے گانہ کر دیا تھا اور تغلق کو بچ نکلنے کا موقع مل گیا تھا تو شاید تغلق کی کہانی برسوں پہلے اسی دن ختم ہو چکی ہوتی۔

اسی ملک، اسی شہر میں اس کی ٹکر کا بلکہ اس پر حاوی آجانے والا ایک شخص موجود تھا لیکن تغلق کا سامنا دوبارہ اس شخص سے کبھی نہیں ہوا۔ جب جب تغلق کو ماضی کا یہ تلخ واقعہ یاد آتا تھا اس کی مٹھیاں غصے سے بھنچ جاتی تھیں اور ایسا روز ہوتا تھا اس وقت جب کوئی شخص بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھتا تو لاشعوری طور پر اس کا ہاتھ اپنے گال پر بنے لمبے اور گہرے زخم کو سہلانے لگتا یا پھر اس وقت جب وہ آئینہ دیکھتا۔ لیکن وہ شخص دوبارہ کبھی اس کے سامنے نہیں آیا تھا۔

اس وقت بھی وہ ماضی کی اسی تلخ یاد میں گم تھا جب فون کی گھنٹی سنائی دی اس نے چونک کر فون کی طرف دیکھا اور بدستور صوفے پر نیم دراز حالت میں ہاتھ بڑھاتے ہوئے ریسیور اٹھا لیا۔

"تغلق اسپیکنگ" اور پھر دوسری طرف سے سنائی دینے والی آواز پر تغلق کی باچھیں کھل گئیں اور وہ اپنی ساری پریشانی اور غم و غصہ جیسے یکسر بھول گیا۔ وہ کتنی ہی ترقی کر لیتا، کتنا ہی مالدار کیوں نہ ہو جاتا۔ بنیادی طور پر وہ ایک حریص اور لالچی انسان تھا اور فطرت تبدیل نہیں ہوتی۔

"اوئے شہزادے! کہاں گم ہو گئے تھے؟ بہت عرصے کے بعد یاد کیا تغلق خان کو۔"

کچھ دیر خاموش رہ کر اس نے دوسری طرف سے اپنی بات کا جواب سنا تو اس کی پہلے سے کھلی ہوئی باچھیں پھیل کر کانوں تک پہنچ گئیں۔ "یقیناً" دوسری طرف سے کوئی ایسی ہی بات کی گئی تھی جو اس کے لیے بہت زیادہ دلچسپی کی حامل تھی۔

"ہاں تو پھر جلدی سے آجاؤ۔ تمہاری صلاحیتوں کا تو پہلے ہی معتقد ہوں، فنکار آدمی ہو یار۔ ہاں ہاں وہیں۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔" اس نے ریسیور کریڈل پر رکھا اور دھیمے سروں میں سیٹی بجانے لگا اس کا موڈ یکلخت ہی خوشگوار ہو گیا تھا۔ پھر تقریباً" ڈیڑھ گھنٹے کے بعد دروازے پر دستک سنائی دی تو تغلق پرجوش انداز میں بولا۔

"آؤ آؤ شہزادے! تمہارا ہی انتظار کر رہا ہوں۔؟"

دروازہ کھلا اور ایک خوش شکل نوجوان کمرے میں داخل ہوا تب دنوں آپس میں بغلگیر ہو گئے۔ تقریباً" آدھے گھنٹے تک دونوں میں زور و شور سے گفتگو ہوتی رہی دونوں ہی بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ پھر تغلق خان نے انٹر کام اٹھا کر چند لمحوں کے لیے کسی سے کچھ بات چیت کی۔ کچھ ہی دیر کے بعد جینز اور جیکٹ میں ملبوس لمبے لمبے بازوؤں والا ایک ریچھ نما انسان کمرے میں داخل ہوا جس کے ہاتھ میں ہزار ہزار کے نوٹوں کی دو گڈیاں تھیں۔

"حشمت خان یہ رقم صارم بابو کو دے دو۔ اور جگی اور نورے کو ساتھ لے کر اس کے گھر پہنچ جاؤ اور "تنگ" اٹھا لاؤ۔ حشمت نے ادب سے سر جھکایا اور نوٹوں کی دونوں گڈیاں اس خوش شکل نوجوان کی طرف بڑھا دیں جسے تغلق نے صارم کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ پھر کمرے میں حشمت کی کھرکھراتی ہوئی سی آواز بلند ہوئی۔

"باس ابھی جانا ہے کیا؟"

"ہاں ابھی چلے جاؤ۔ اور سنو! وریام کو بھی ساتھ لے جاؤ، اور دیکھو "تنگ" بڑا قیمتی ہے۔ احتیاط سے لانا۔" تغلق کی بات ختم ہونے پر ایک مرتبہ پھر حشمت کی وہی مخصوص کھرکھراتی ہوئی آواز بلند ہوئی۔

"جو حکم باس! ایسا ہی ہو گا۔" حشمت نے ایک مرتبہ پھر تغلق کو تعظیم دی اور پلٹ کر کمرے سے باہر

نکل گیا۔ اس کے بعد خوش شکل نوجوان صارم نے بھی اٹھ کر تغلق سے مصافحہ کیا اور وہ بھی روانہ ہو گیا۔ اب کمرے میں صوفے پر نیم دراز تغلق کے علاوہ اور کوئی نہ تھا، جس کے ہونٹوں پر ایک مکروہ مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

فرش پر بچھا ہوا قالین، ایک ٹی وی ٹرالی جس پر سجا ہوا ایک چھوٹا سا کلر ٹیلی ویژن ایک طرف چھوٹی سی ٹیبل پر سجا ہوا خوبصورت ڈیک، کھڑکیوں پر بھاری پردے اور ایک کونے میں بجی ہوئی دیوار گیر الماری اس چھوٹے سے کمرے کا کل اثاثہ تھا۔ اس وقت کمرے میں ایک حسین و جمیل لڑکی کے علاوہ اور کوئی ذی روح موجود نہ تھا۔

لڑکی نے بیڈ سے اتر کر چپل پہنی اور ایک ادا کے ساتھ اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو اکٹھا کر کے جوڑے کی شکل میں لپیٹ دیا، یہ بختاور تھی۔ جب سے صارم نے اسے اس مکان میں لا کر ٹھہرایا تھا اس کا اعتماد صارم پر مزید بڑھ گیا تھا۔ کیونکہ مکمل تنہائی میسر ہونے کے باوجود صارم نے کسی قسم کا کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی اور جب صارم نے بختاور سے یہ کہا تھا۔

"بختاور میں تمہیں یہاں لے تو آیا ہوں لیکن تب تک میں تمہارے قریب نہیں آؤں گا جب تک میرا اور تمہارا نکاح نہیں ہو جاتا۔" تو بختاور کا دل اس کے یہ جملے سن کر ناچ اٹھا تھا۔ بے اختیار اس کا دل چاہا کہ وہ صارم کا منہ چوم لے۔ لیکن اب وہ اتنی بے باک بھی نہیں تھی کہ اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنا دیتی۔ گھر میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی، بختاور نے پہلی مرتبہ اس گھر میں کھانا پکایا جسے دونوں نے مل کر بڑے مزے سے کھایا۔ اس کے بعد صارم اس سے یہ کہہ کر رخصت ہوا تھا کہ

"بختاور میں اب زیادہ دیر تمہاری دوری برداشت نہیں کر سکتا لیکن نکاح کے بغیر تمہاری قربت کو بھی گناہ سمجھتا ہوں لہٰذا میں نکاح خواں اور اپنے کچھ دوستوں کو لینے جا رہا ہوں تاکہ تم آج ہی میری زندگی میں شامل ہو جاؤ۔ مجھے تھوڑی دیر ہو جائے گی لیکن تم پریشان مت ہونا، اس گھر کو اور اس گھر کی ہر چیز کو اپنی ملکیت سمجھو، میں اب جاتا ہوں اور اب تمام انتظامات کر کے ہی واپس آؤں گا۔"

یہ کہہ کر صارم اس سے رخصت ہو گیا تھا اور تقریباً" دو گھنٹے گزر جانے کے بعد بھی ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ لیکن بختاور کے دل میں کسی قسم کا کوئی وسوسہ نہیں تھا، کسی پریشانی کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ مطمئن انداز میں بیڈ پر لیٹی آرام کرتی رہی تھی اور اس وقت بال لپیٹنے کے بعد اس کا رخ اس چھوٹی سی خوبصورت ٹیبل کی طرف تھا جس پر ڈیک سجا ہوا تھا۔ اس نے ڈیک آن کیا تو کمرے میں ایک دلکش گیت گونجنے لگا۔

رفتہ رفتہ اک نئی صورت بنا لیتے ہیں لوگ
ایک چہرے پر کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ

ٹھیک اسی وقت کمرے کا دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور چار خطرناک صورت آدمی ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ بختاور جو دھماکے کی آواز سنتے ہی اچھل پڑی تھی گھبرا کر پلٹی تو ان خطرناک لوگوں کے چہرے پر نظر پڑتے ہی بے اختیار اس کے منہ سے ایک چیخ بلند ہوئی!

"کک کک، کون ہو تم۔" کیوں گھس آئے ہو یہاں پر؟" اور کمرہ حشمت کے منحوس قہقہے سے گونج اٹھا، وہ چاروں ایک ساتھ بختاور کی طرف بڑھے تو بختاور بے اختیار پیچھے ہٹنے لگی۔

"د۔ د۔ دیکھو۔ اگر صارم یہاں آ گئے تو تم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ یہاں سے چپ چاپ باہر نکل جاؤ۔" بختاور نے خوفزدہ انداز میں پیچھے ہٹتے ہوئے انہیں دھمکانے کی کوشش کی۔ لیکن جواب میں سنائی دینے والا حشمت کا قہقہہ پہلے سے زیادہ بلند تھا۔

"بی بی! کسی غلط فہمی میں نہ رہنا، صارم بابو تم جیسی کئی تتلیوں کو پہلے بھی یہاں لا چکے ہیں۔ اور یہ بھی سن لو تمہاری قیمت پورے "دو لاکھ" روپے میں اپنے ہاتھوں سے صارم کو دے کر آ رہا ہوں، اب تم باس تغلق کی ملکیت ہو اور اب اچھے بچوں کی طرح چپ چاپ باہر چلو ورنہ حشر خراب کر دوں گا۔"

بختاور کے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے اور اس بدمعاش کے منہ سے نکلنے والا ایک ایک لفظ کسی کھولتے ہوئے لاوے کی طرح اس کی رگ و پے میں سرائیت کرتا جا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ شخص ایسا کیوں کہہ رہا ہے؟ صارم تو اس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا! وہ تو اس سے محبت کرتا ہے۔

"جھوٹ بول رہے ہو تم۔ میرا صارم ایسا کبھی نہیں کر سکتا۔" بختاور نے چیختے ہوئے جیسے خود کو یقین دلانے کی کوشش کی۔

"ایسا ہو چکا ہے۔ اور یہ اس نے پہلی مرتبہ نہیں کیا۔ تم سے پہلے بھی کئی بے وقوف لڑکیاں اسی غلط فہمی کا شکار ہو چکی ہیں۔ وہ کسی سے محبت نہیں کرتا۔ وہ صرف ایک بزنس مین ہے، جو صرف سودا کرتا ہے۔ اور اب تم میرا دماغ خراب مت کرو اور شرافت سے باہر چلو۔" حشمت نے غراتے ہوئے کہا۔

لیکن جب اس کی تقریر دلپذیر کے کوئی اثرات بختاور پر ظاہر نہیں ہوئے تو اس نے جھپٹ کر بختاور کے بال مٹھی میں جکڑ لیے اور پھر اسے گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا۔ بختاور بری طرح مچل رہی تھی اور حشمت کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کو اس اچھل کود سے کس طرح روکے؟ جب وہ گلی میں پہنچے تو بختاور زور زور سے بچاؤ بچاؤ کی آواز لگاتے ہوئے چیخنے لگی۔ یہ دیکھ کر حشمت کا ساتھی جگی حشمت کی مدد کرنے کے لیے آگے بڑھ آیا لیکن وہ نرم و نازک لڑکی اس وقت کسی بھڑ والا مکھی کی طرح غضب ناک ہو رہی تھی جب وہ کسی صورت پر سکون نہ ہوئی تو حشمت نے اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا۔

اس کے نتیجے میں بختاور کے حلق سے پہلے سے کہیں زیادہ زوردار چیخ بلند ہوئی اور وہ جنونی انداز میں

چلانے لگی۔

بچاؤ۔ بچاؤ اس دوران حشمت کے دو ساتھی گلی کی نکڑ تک پہنچ چکے تھے۔ حشمت نے ایک ہاتھ سے بختاور کا منہ بند کرنے کی کوشش کی تو بختاور نے اس کے ہاتھ پر زور سے کاٹ لیا۔ حشمت نے الٹے ہاتھ سے بختاور کو ایک اور تھپڑ رسید کیا۔ ٹھیک اسی لمحے دھپ کی آواز سن کر ان تینوں کی نظریں ایک ساتھ اٹھیں۔ سامنے ایک عجیب و غریب منظر نظر آیا۔ ان کا ایک ساتھی زمین پر گرا بری طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اور دوسرا اسلاح اٹھائے ایک شخص پر حملہ آور ہوتا دکھائی دیا۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد وہ بھی زمین چاٹ رہا تھا۔

حملہ آور جوں ہی ان کی طرف بڑھا جگی نے چاقو نکال لیا۔ لیکن بے سود پھر حشمت نے بختاور کو دھکا دے کر زمین پر گرا دیا اور ریوالور نکال لیا لیکن حشمت کا انجام بھی اپنے تینوں ساتھیوں سے مختلف نہ رہا۔ نووارد نے ان چاروں کو دھنک کر رکھ دیا تھا۔ اور پھر وہ چاروں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

☆ ☆ ☆

تغلق اس وقت کسی زخمی شیر کی طرح دھاڑ رہا تھا اور وہ چاروں کے چاروں سر جھکائے شرمندہ شرمندہ، اس کے سامنے کھڑے تھے۔

"مفت کی کھا کھا کر تم لوگوں پر چربی چڑھ گئی ہے۔۔۔ ایک ذرا سا کام نہیں کر سکے تم لوگ؟ چار ہٹے کٹے مرد ایک نرم و نازک سی لڑکی کو یہاں تک نہیں لا سکے، تم لوگوں کو تو تمغہ امتیاز ملنا چاہیے۔"

تغلق دھاڑ رہا تھا۔ جواب میں حشمت کی وہی منحوس کھرکھراتی ہوئی آواز بلند ہوئی جو شرم سے بھیگ کر اس وقت ایک عجیب تاثر دے رہی تھی۔

"باس لڑکی کو تو ہم لے ہی آتے لیکن وہ حبشی نما انسان پتا نہیں اچانک کہاں سے آن پہنچا، جس نے سارا نقشہ ہی بدل کے رکھ دیا۔ ہم چاروں کوشش کے باوجود اس کا مقابلہ نہیں کر سکے ہم شرمندہ ہیں باس!"

حبشی نما انسان کا ذکر سنتے ہی تغلق کو جیسے کرنٹ سا لگا اور اس کا ہاتھ بے اختیار اپنا گال سہلانے لگا۔

"کیا کہا؟ حبشی نما انسان؟ ذرا اس کا پورا حلیہ تو بتاؤ؟" تغلق نے چونکتے ہوئے کہا۔ اب اس کے لہجے میں وہ پہلے سی گھن گرج موجود نہیں تھی۔ جب حشمت نے اس کا پورا حلیہ بیان کیا تو تغلق کے حلق سے ایک طویل سانس خارج ہوئی اور اس کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

اس کی نظروں کے سامنے ماضی کا وہی واقعہ کسی فلم کی طرح چلنے لگا تھا۔۔۔ ٹھیک ہے، اس کا مقابلہ تمہارے بس کی بات بھی نہیں تھی۔

"تم لوگ جاؤ۔" اور وہ چاروں ایک ایک کر کے کمرے سے باہر نکلتے چلے گئے۔ تغلق چند لمحوں تک پرخیال انداز میں کھڑا رہا پھر ایک سائیڈ پر موجود بار کیبنٹ میں سے وہسکی کی بوتل نکال کر صوفے پر آ بیٹھا۔ شغل مے نوشی میں وقت کے گزرنے کا احساس جیسے ختم ہو کر رہ گیا۔ پتہ نہیں کتنی ہی دیر تک وہ وہاں بیٹھا اپنا غم غلط کرتا رہا اور پھر اٹھ کر لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ عقبی سمت موجود ایک دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

یہ تغلق کی خواب گاہ تھی۔ وہ سیدھا اپنے بیڈ کی جانب بڑھا اور جوتوں سمیت بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ نیند کی آغوش میں کب پہنچا اسے اس کا قطعی اندازہ نہ ہو سکا پھر اس کی آنکھ چہرے پر لگنے والی اس زوردار ضرب ہی سے کھلی تھی۔ جو نہی اس نے آنکھیں کھولیں اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ جو چہرہ اس کی نظروں کے سامنے موجود تھا اسے اس کے یہاں پائے جانے کی توقع خواب میں بھی نہ تھی۔

گھونگریالے بال، سیاہ کالی رنگت، موٹے موٹے ہونٹ اور موٹی ناک والا یہ خطرناک شخص وہی تھا جسے کوشش کے باوجود تغلق آج تک دوبارہ نہیں دیکھ سکا تھا۔

آج وہی شخص اس کے گھر اس کی خواب گاہ میں یوں موجود تھا کہ اس کا ایک گھٹنا تغلق کے سینے پر رکھا

ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں موجود سائلنسر لگے خوفناک ریوالور کی نال تغلق کی پیشانی کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ تغلق کی سانس اس کے سینے میں اٹک رہی تھی اور نگاہیں ریوالور کے ٹرائیگر پر جمی ہوئی اس خوفناک شخص کی انگلیوں پر تھیں۔ تغلق نے کچھ بولنے کی کوشش کی مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ خوفناک شخص کی انگلی حرکت میں آئی۔ کھٹک کی ہلکی سی آواز بلند ہوئی اور تغلق کے دماغ میں آگ کی ایک آبشار سی بہہ نکلی۔ تکلیف اور کرب کی ایک شدید کیفیت کے ساتھ رنگ برنگی روشنیوں کا ایک بے ہنگم رقص تھا مگر صرف چند لمحوں کے لیے اس کے بعد تغلق کے دماغ پر اندھیرے چھا گئے۔ تغلق کی کہانی ختم ہو چکی تھی! وہ اپنی تمام تر خباثتوں کے ساتھ نیست و نابود ہو چکا تھا۔ اور برائی کا یہ انجام کوئی نیا نہ تھا! ایسے لوگ آخر کار اسی انجام کو پہنچتے ہیں۔۔۔!

☆ ☆ ☆

سکڑی سمٹی بختاور نظریں جھکائے اس سیاہ پہاڑ کے سامنے بیٹھی تھی جو شاید سیاہی کا نہیں۔ عظمت کا پہاڑ تھا! اگر یہ شخص اس وقت وہاں نہ پہنچتا تو۔۔۔ بختاور لرز کر رہ گئی۔ اس سے آگے سوچنے کی اس میں ہمت ہی نہ تھی۔ تھل۔۔۔ اپنا گاؤں۔۔۔ اپنی سکھیاں۔ اور بابا۔۔۔ بختاور کو سب یاد آ رہا تھا اور۔ اور صارم۔ بختاور کے پورے وجود میں جیسے ایک آگ سی جل اٹھی! نفرت کی ایک لہر تھی جو اس کی پور پور کو جلائے دے رہی تھی۔ کتنا معصوم، کتنا خوش شکل لٹیرا تھا؟ بالکل کسی خوشنما سانپ کی مانند۔

جس کا جسم تو خوبصورت نقش و نگار سے مزین ہوتا ہے۔ لیکن اس خوبصورتی کے پیچھے چھپے زہر کا ایک قطرہ بھی انسان کو تڑپ تڑپ کر مرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اور دوسری طرف بظاہر بدصورت نظر آنے والا شخص جس کا دل کتنا خوب صورت تھا؟ کتنا تضاد تھا ان دو انسانوں میں؟ اور سچ بھی تو ہے۔ بعض اوقات بظاہر خوشنما نظر آنے والی چیزیں اندر سے بہت بدنما ہوتی ہیں اتنی کہ ان کی اصلیت دیکھ کر گھن آنے لگے۔ اور کبھی کبھی بدصورت نظر آنے والی چیزیں در حقیقت اپنے اندر بے حد خوبصورتی لیے ہوئے ہوتی ہیں لیکن ان کو شناخت کرنے والی آنکھ ہر کسی کے پاس نہیں ہوتی۔

بختاور اپنے خیالات سے اس وقت چونکی جب عظمت کے اس پہاڑ میں جنبش پیدا ہوئی اور اس کے منہ سے نکلنے والی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"میرا نام شکیل ہے۔" اور پھر وہ تمسخرانہ انداز میں ہنس پڑا۔ جیسے خود اپنا مذاق اڑا رہا ہو۔

"کبھی کبھی والدین بھی معصومیت اور بے دھیانی میں کتنی بڑی بڑی غلطیاں کر جاتے ہیں۔ اب مجھے ہی دیکھ لو کہیں سے شکیل نظر آتا ہوں؟ چوہے سے ڈر جانے والا آدمی ہوتا ہے اور نام ہوتا ہے شیر خان! خیر چھوڑو تم یہ بتاؤ کہ کہاں کی رہنے والی ہو؟ اور تمہیں کہاں پہنچایا جائے؟" شکیل نے سوالیہ نظروں سے بختاور کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

بختاور نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن اس کے ہونٹ صرف کپکپا کر رہ گئے۔ شکیل چند لمحے پر خیال نظروں سے اس کی جانب دیکھتا رہا لیکن وہ کچھ بھی نہ کہہ پائی۔

"او کے۔ او کے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری پوری کہانی میں سمجھ چکا ہوں کیونکہ ان لوگوں میں سے ایک شخص کو میں پہچان گیا تھا۔ ٹھیک ہے تم بے فکر ہو کر آرام کرو امید ہے صبح تک سنبھل جاؤ گی۔ یہاں تمہیں بالکل کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں اب صبح ہی تم سے ملوں گا۔ اور صبح جہاں تم کہو گی تمہیں باحفاظت پہنچا دیا جائے گا۔" یہ کہہ کر شکیل وہاں سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

جو کچھ اس نے لڑکی سے کہا تھا نہ جانے کیوں اس کا دل و دماغ اس کے لفظوں کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ پہلی نظر اس لڑکی کو دیکھتے ہی ایک عجیب سا احساس اس کے اندر پرورش پانے لگا تھا' لیکن وہ اپنی ان سوچوں کی حوصلہ افزائی نہیں کر سکتا تھا۔ لڑکی انتہائی خوبصورت تھی اور اسے اپنی کم روئی کا بخوبی احساس تھا۔

اس نے اپنے آپ کو سرزنش کی اور موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتے ہوئے گھر سے باہر نکل آیا۔ لیکن چلنے سے پہلے اپنی جیب کو تھپتھپا کر کسی چیز کی موجودگی کا احساس کرنا نہیں بھولا تھا۔ دوسری صبح جب شکیل کمرے میں داخل ہوا تو ششدر رہ گیا۔ جو کچھ اسے نظر آیا وہ اس کی توقع کے بالکل برعکس تھا۔

جوں ہی وہ کمرے میں داخل ہوا لڑکی نے بھاگ کر اس کے پیر پکڑ لیے تھے۔ چند لمحے تک تو شکیل صورت حال کو سمجھ ہی نہیں پایا اور حیران پریشان کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ پھر دھیرے دھیرے وہ نیچے جھکا اور لڑکی کے کندھوں کو مضبوطی سے پکڑ کر اسے کھڑا کر دیا۔ پھر وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

"اس حرکت کا مطلب؟" اور اس کی آنکھوں سے مینہ برسنے لگا۔

"کم از کم اپنا نام تو بتا دو؟" شکیل نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ اور جب اس نے اشک بار آنکھیں اٹھا کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"بختاور" تو شکیل اس منظر میں کھو کر رہ گیا اس نے ایک جھرجھری سی لی اور پھر اسے دھیرے دھیرے چلاتے ہوئے لے جا کر بیڈ پر بٹھا دیا۔

"کیا کہنا چاہتی ہو؟" شکیل نے سوال کیا۔ جواباً" بختاور نے روتے بلکتے ہوئے اپنی پوری داستان کہہ سنائی۔ سب کچھ سننے کے بعد شکیل نے دریافت کیا۔

"تو کیا اب تم اپنے بابا کے پاس جاؤ گی؟" اور بختاور کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی لیکن جواب دیئے بنا چارہ بھی نہ تھا۔ تمام رات بستر پر کروٹیں بدلنے کے بعد بختاور ایک نتیجے پر پہنچ چکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اب شاید وہ کبھی اپنے بابا کا منہ نہیں دیکھ پائے گی۔ وہ گاؤں' وہ کھیت' وہ سکھیاں' اب ان کو بھول جانے میں ہی اس کی بہتری تھی۔

اور اب بھلا وہ وہاں جاتی بھی تو کس منہ سے؟ اس نے کہنا شروع کیا۔ "آپ ایک خوبصورت دل کے مالک ہیں۔ آپ نے جو احسان مجھ پر کیا اس کا قرض تو شاید میں مر کر بھی نہ چکا پاؤں۔ میں بھی کتنی خود غرض ہوں کہ پھر بھی۔ آپ سے کچھ مانگ رہی ہوں! اگر میں کچھ مانگوں تو کیا آپ دے پائیں گے۔؟"

"اگر میرے بس میں ہوا تو شاید ضرور۔" شکیل نے مختصراً" کہا۔

"میری یہ زندگی آپ کی دی ہوئی ہے اور میں اپنی ساری زندگی آپ کی خدمت کرتے ہوئے گزارنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ اس گھر کے کسی کونے میں مجھے تھوڑی سی جگہ عطا کر دیں تو بخت آور کہلاؤں گی۔"

شکیل کہنا چاہتا تھا۔

"بخت تم میرا بخت ہو' تمہاری جگہ اس گھر کے کسی کونے میں نہیں۔ بلکہ اس دل میں ہے۔" لیکن وہ ایسا کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ بس اس کے ہاتھ میکانکی انداز میں حرکت میں آئے اور بختاور کے کندھوں پر جم گئے اور پھر بختاور اس کے مضبوط بازوؤں کے حصار میں سمٹی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

ایک پرانی کہانی

صباء علی احمد

اس محل نما کوٹھی میں آکر عائشہ گھبرا گئی۔ اس نے اب تک امارت کی صرف شہرت سنی تھی یا ایسی شاندار کوٹھیاں فلموں میں دیکھی تھیں۔ اس نے تو کبھی بھول کر بھی ایسا کوئی خواب نہیں دیکھا تھا۔ جہاں قدموں تلے مخملیں فرش بچھے ہوئے ہیں اور خواب گاہیں شہزادوں کے کمروں کی طرح آراستہ ہوتی ہیں۔

کبھی کبھی وہ محسوس کرتی کہ وہ واقعی بے داری کے عالم میں نہیں' لیکن ابھی اس کے دلہناپے کے دن ختم نہیں ہوئے تھے اور خوابیدگی کا یہ عالم اسے بہت بھلا لگ رہا تھا۔ اگر یہ خواب تھا تو وہ چاہتی تھی کہ وہ اس خواب سے کبھی نہ جاگے۔ لیکن وقت کو کبھی قرار نہیں ہوتا۔ وہ کبھی تھم کر نہیں رہ سکتا اور اس کے دلہناپے کا وقت بھی گزر گیا۔ تب اس نے دھیرے دھیرے گھر کے کاموں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔

ارم بیگم یہی چاہتی تھیں نوکروں کی چاہے ایک فوج ہی کیوں نہ ہو لیکن گھر والی کی توجہ سے بغیر گھر گھر کے بجائے مسافر خانے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

دولت کی فراوانی کے باوجود ارم بیگم کی سرگرمیاں گھر کی چار دیواری تک محدود تھیں۔ ان کے نزدیک صحیح معنوں میں سوشل ورک یہی تھا کہ عورتوں میں اپنی ذات کو سمجھنے اور پہچاننے کا شعور بے دار ہو جائے اس کے بعد عورت چاہے کسی سڑک کی پتھریلی زمین پر بیٹھ کر روزگار حاصل کرے یا اسکرین کے جگمگاتے پردے پر اپنے فن کا مظاہرہ کرے۔

اس کی شخصیت میں ایک وقار ہو گا۔ وہ وقار جو دیکھنے والی نگاہوں میں ہوس کی چنگاریوں کو پیدا کرنے کے بجائے احترام کے دھیمے مدھم چراغ روشن کر دیتا ہے۔

عائشہ بے پناہ حسین نہ تھی۔ نہ ہی قدرت نے اسے بادامی آنکھیں عطا کی تھیں لیکن چال میں ایک ذمہ دار عورت کا سا وقار موجود تھا۔ پلکیں بھی اتنی لمبی نہ تھیں کہ وہ وقتاً" فوقتاً" بار حیا سے جھک جاتیں۔ لیکن وہی پلکیں اپنے سے بڑے کو سامنے دیکھ کر احتراماً" جھک جاتیں تاکہ نگاہوں کو بے باکی سے اٹھنے کا موقع نہ ملے۔ خودداری اس کے کردار کا سرمایہ تھی۔ لیکن خود سری کی حد تک نہیں یہی ماں کی تربیت تھی وہ جانتی تھی کہ شادی کے بعد کی زندگی کیسی آزمائش کی زندگی ہوتی ہے۔ ایسے لمحے بھی آتے ہیں کہ عورت کو دنیا میں ہی پل صراط کی دھار پر چلنے کی لذت سے آشنا ہونا پڑتا ہے اور ثابت قدم رہنے پر یہ دنیا ہی جنت نظر آنے لگتی ہے۔ نوید اس کا محبوب تھا لیکن شوہر پہلے تھا اور شوہر کے مزاج کو سمجھنا اتنا آسان بھی نہیں ہوتا۔

نوید کو اپنے کاروبار کے مسائل سے بہت کم فرصت ملتی۔ لیکن جو وقت بھی ملتا وہ اسے عائشہ کی محبت میں گزارتا اور ارم بیگم کے لیے یہ لمحے بڑے صبر آزما ہوتے۔ اب بیٹے کے قرب کی ایک اور حصہ دار بھی تھی جو ان کی خدمت گزار اور اطاعت شعار بھی تھی۔ لیکن یہ سب ہوتے ہوئے بھی وہ ان کے بیٹے کی محبت کی تقسیم کار بھی تھی۔

جس کے وجود نے ان کے بیٹے کی محبت کا بٹوارہ کر دیا تھا اور یہی چیز ارم بیگم کے دل میں غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر عاشی کے لیے ایک جذبہ حسد و رقابت پیدا کر رہی تھی لیکن وہ بڑی مدبر خاتون تھیں۔ اپنے ان جذبات و احساسات کو قابو کیے رہتیں۔

نوید کی مصروفیات کچھ ایسی تھیں کہ کبھی وہ سر شام گھر آجاتا اور کبھی رات گئے پھر کاروباری سلسلے میں اسے اکثر شہر اور ملک سے بھی باہر رہنا پڑتا۔

وہ محسوس کر رہی تھی کہ ارم بیگم اس سے کچھ کھنچی کھنچی سی تھیں۔ کیونکہ اس تناؤ میں بھی ان کا رویہ شکایتی نہ تھا۔ بس اک خاموشی سی تھی۔ جس پر خود انہیں بھی اختیار نہ تھا۔ ساس کے سرد رویے سے اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ ایک گھٹن سی محسوس کر رہی تھی۔ وہ ایک بڑے گھر کی بہو تھی گھر کی دیکھ بھال' مہمانوں کی دعوتوں کے اہتمام کے باوجود بھی اس کے پاس اتنا وقت بچ جاتا کہ وہ بری طرح تنہائی کا شکار رہنے لگی اور یہ تنہائی اس کے اندر کی تنہائی تھی۔ تب اسے ماحول کو تبدیل کرنے کی سوجھی۔

بازار جا کر اپنی پسند کی چیزیں خرید لائی۔ دیواروں پر آویزاں تصویروں کو بدلا۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے پردے تبدیل کیے۔ میزوں سے پرانی طرز کے گلدان ہٹائے اور نئے گلدانوں میں پھول سجا رہی تھی کہ وہ چونک پڑی۔ دروازے پر ارم بیگم کھڑی تھیں۔

"اماں بیگم۔" وہ ایک دم سے بوکھلا گئی۔

"آپ کو پسند آئی یہ ترتیب۔"

اس نے سجا ہوا گلدان ان کی طرف کیا اور داد طلب نگاہوں سے دیکھا۔

"میں نے وہ پرانا گلدان مہمان خانے کی میز پر رکھوا دیا ہے۔"

"ہاں اچھی ترتیب ہے۔" ارم بیگم نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

"لیکن کبھی کبھی یہ ترتیب دوسروں کی زندگی کو بے ترتیب کر دیتی ہے۔" انہوں نے سلگتی آنکھوں سے عاشی کی طرف دیکھا اور پھر تند و تیز ہوا کے جھونکے کی طرح دروازے سے نکل گئیں۔

وہ وہیں صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔ ارم بیگم کے کہے ہوئے جملے اس کی دماغ میں ہتھوڑے برساتے رہے۔ وہ ان کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھی۔

وہ کچھ کہہ گئی تھیں اس کے پس منظر میں کیا تھا؟

لیکن پھر رات کے کھانے پر اس نے دیکھا۔ وہ ارم بیگم اس شخصیت سے مختلف تھیں جو اس نے شام دیکھی تھی۔ بھوک ہی کب تھی اور ارم بیگم بڑی شفقت سے ایک ایک ڈش اس کے آگے رکھ کر اسے پیٹ بھر کھانے پر اصرار کرتی رہیں رات گئے تک وہ اس متضاد طرز عمل کا تجزیہ کرتی رہی۔ الجھتی رہی لیکن اس کے اعصاب کا تناؤ بڑھتا ہی گیا۔

دوسرے دن ارم بیگم اس سے پھر دور تھیں۔ فاصلے بڑھ گئے تھے لیکن عاشی نے ان فاصلوں کو کم کرنے کا ارادہ کر لیا۔

اس نے ایک رسک لے کر ارم بیگم کی لاعلمی میں ان کی دو یا تین سہیلیوں کو مدعو کر لیا اور دعوت دیتے وقت ان سے ان کے پسندیدہ کھانوں کے نام معلوم کر کے وہ سب خود اپنے ہاتھوں سے پکائے۔

اور سب کو اچانک وارد ہوتے دیکھ کر ارم بیگم متعجب بھی ہوئیں۔ لیکن باتوں کا جو سلسلہ چلا تو ان کی ساری وحشت دور ہو گئی کھانے کی میز پر ان کی شگفتگی دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اپنے بچھڑے ہوئے دنوں کی گرفت میں ہوں۔ وہ بچھڑے ہوئے دن جب کوئی غم پاس نہیں بھٹکتا۔ جب پہلوں میں وقت آوارہ پرندے کی مانند اڑتا چلا جاتا ہے۔

دوسرے دن نوید دورے سے لوٹا تو ارم بیگم کی تنہائیوں کے پھول پھر سے شاداب ہو گئے اور عاشی نے محسوس کیا جیسے ان کے چہرے کی جھریاں شادمانی کے ہاتھوں اپنی شکست خوردگی کی شرمساری کا احساس لیے رات ہی رات میں غائب ہو گئی ہوں۔ اور ان کی عمر کے طویل دور میں سے اچانک ہی کئی سال کم ہو گئے ہیں۔ اب زندگی کے وہی معمولات تھے لیکن یہ معمولات زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکے۔ عاشی نے اپنے اور ان کے درمیان فاصلوں کی جو طنابیں کاٹ دی تھیں۔

اب وہ ایک ایک کڑی کی صورت میں جڑ کر ایک مضبوط زنجیر بنتی جا رہی تھی۔

کیسی بے چارگی تھی کہ سب کچھ میسر ہوتے ہوئے بھی ایک خلا سا محسوس ہوتا جو کسی طرح پر ہونے میں نہیں آتا تھا۔ بعض اوقات وہ ارم بیگم کے وجود کو یکسر نظر انداز کر کے مکمل طور پر نوید کے وجود میں ڈوب جانا چاہتی۔

لیکن ان ہی لمحوں میں اسے جیسے ارم بیگم کی نظریں کچھ کہتی ہوئی محسوس ہوتیں اور وہ سب بھول کر ارم بیگم کے آس پاس ان کے حکم کی منتظر نظر آنے لگتی۔ لیکن ان کی خاموشی اور کبھی ان کی دو اور دو چار والی گفتگو اس کے حوصلے پست کر دیتی۔

اور آج جب وہ اس صورت حال سے بہت گھبرا گئی تو اپنے کمرے سے باہر نکل کر باغ کی طرف جانے لگی۔ برآمدے سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھا ارم بیگم وضو کر رہی تھیں وہ مغرب کی نماز ادا کرنے کی تیاری کر رہی تھیں۔

عاشی دھیمے قدموں سے چلتے ہوئے باغ کے ایک گوشے میں آگئی اور ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس پر پیر پھیلا کر بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں افق کے پار ڈوبتے ہوئے سورج کے منظر میں کھوئی ہوئی تھیں کہ ارم بیگم کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"دلہن اندر آجاؤ' یہ وقت یہاں بیٹھنے کا نہیں۔ خنکی شروع ہو گئی ہے۔" انہوں نے بالائی منزل کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہا۔

عاشی دھیمے قدموں سے چلتی ہوئی برآمدے تک پہنچی تو بالائی منزل کی سیڑھیوں کے قریب اس کے قدم آپ ہی آپ رک گئے۔ بالکل اچانک غیر ارادی طور پر اس کی نظریں اوپر اٹھ گئیں۔ اوپری منزل پر جیسے سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔

"یہ آج امی جان کے کمرے میں اندھیرا کیوں ہے؟" اس نے اپنے آپ سے پوچھا اور اس کا دل دھڑکنے لگا۔ ارم بیگم کے کمرے تک وہ بے آواز قدموں سے پہنچی اور چوکھٹ سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔

"اوہ میرے خدا۔" اس کے جسم میں لرزش ہونے لگی اس نے دیکھا ارم بیگم اپنی مسہری پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کی بڑی بڑی روشنی آنکھیں اس وقت آنسوؤں سے دھندلائی ہوئی تھیں اور ان کے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے کھلے لیکن آواز گھٹ کر رہ گئی۔

"امی جان آپ مجھ سے کچھ خفا ہیں؟ آپ کو مجھ سے کیا شکایت ہے۔ خدا کے لیے کہہ دیجیے ورنہ میں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گی۔ مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو معاف کر دیجیے۔ امی جان آپ کو اللہ کا واسطہ آپ ــــ"

"پگلی' میں تجھ سے ناراض تو نہیں تو نے مجھے کون سا دکھ دیا ہے۔" ان کے ہونٹوں پر ایک پھیکی مسکراہٹ رینگ گئی۔

"میں تو ـــ میں تو اپنے دکھ کے بوجھ سے تھک گئی ہوں۔" وہ دھیمے دھیمے بول رہی تھیں اور وہ ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے سن رہی تھی۔

"دس سال ہو گئے ہیں اس بوجھ کو اٹھاتے ہوئے۔ نوید اس وقت سترہ سال کا تھا جب میری ویران دنوں اور راتوں کی ابتدا ہوئی تھی۔ وہ جو زندگی کی آخری سانسوں تک نبھانے کا وعدہ کیے ہوئے تھے۔ وہ ایسے چپ چاپ چل دیے کہ مجھ خبر تک نہ کی۔ وہ جو شکست کے لفظ کو بے معنی قرار دیتے تھے موت سے شکست کھا گئے اور مجھے یادوں کے کھنڈرات میں بھٹکنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا۔

میں تھکنا نہیں چاہتی تھی اس لیے کہ ان کی روح ان کا وجود نوید کے روپ میں مجھ سے ہم آہنگ تھا۔ چنانچہ میں نے ان کھنڈرات میں ان کی محبت کی یادوں کے چراغ روشن کرنا شروع کر دیے۔ میں ہر شب ایک چراغ جلاتی تھی اور تنہائی کے اس کھنڈر کو روشن کرتی تھی۔ ایسی ہی شامیں ہوتی تھیں جب وہ دروازے ہی سے مجھے آواز دیتے ہوئے اندر داخل ہوتے تھے اور منہ دھونے اور کپڑے بدلنے تک وہ اپنے روز کے معمولات سناتے تھے۔

ہاں ایسی ہی شامیں ہوتی تھیں۔ جب وہ اکثر میرے لیے کوئی نہ کوئی تحفہ لاتے' چاہے وہ چند پھول ہوں یا میری مخصوص پسندیدہ مٹھائی اور وہ یہ چیزیں سامنے والے مینٹل پیس کے اس گوشے میں چپکے سے رکھ دیتے وہ وہاں۔"

انہوں نے مینٹل پیس کے اس مخصوص گوشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میری نظر اچانک اس چیز پر پڑتی میں ان سے پوچھتی اور وہ بڑی خوب صورتی سے اس سے اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے۔ محبت کا یہ انداز کیسے بھلایا جاسکتا ہے۔ بیٹے یادوں کے یہ روشن چراغ کیسے بجھائے جا سکتے ہیں تمہیں یاد ہے وہ گلدان جو تم نے مہمان خانے میں رکھوا دیا تھا۔ وہ انہی کی یادگار تھی۔" پھر وہ ایک لمبی آہ بھر کر چپ ہو گئیں۔

اسی لمحے نیچے سے نوید کی آواز آئی۔

"عاشی پلیز کہاں ہو تم ـــ؟"

"جاؤ دلہن نوید آگیا ہے۔" ارم بیگم نے اپنے ہاتھ آہستگی سے اس کے ہاتھوں سے چھڑائے۔ علیحدہ ہوتے ہوئے ان ہاتھوں میں اب ایک ہلکی سی کپکپاہٹ تھی پالنا جھلانے والے یہ ہاتھ گویا اپنی شکستگی اور تہی دامنی کے خاموش شاکی ہوں اور اگر انہیں زبان مل جاتی تو یہ کہہ اٹھتے۔

"جاؤ دلہن نوید آگیا ہے۔ اب اسے تمہاری ضرورت ہے۔"

عاشی چپ چاپ نیچے اتر آئی۔

"بھئی حد کر دی تم نے۔" نوید اسے کمرے میں لے جانے لگا۔

"شش ـــ" عاشی نے اس کی بے تابی کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر باغ میں گھسیٹ لے گئی۔

"بھئی یہ سب کیا ہے۔" نوید کچھ نہ سمجھتے ہوئے جھنجلا گیا۔

"نوید ایک منٹ۔" عاشی نے جلدی جلدی گلاب کے چند پھول توڑتے ہوئے آہستہ سے کہا پھر اس نے رات کی رانی کے پھولوں کا ایک گچھا توڑا اور نوید کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولی۔

"امی جان بہت تنہا ہیں نوید۔ یہ تنہائی آپ ہی دور کر سکتے ہیں۔ یہ پھول لے جائیے اور ان کے کمرے میں مینٹل پیس کے دائیں گوشے میں رکھ دیجیے گا اور پھر آج کے دن کی ساری روداد بھی انہیں سنائیے گا یہ بہت ضروری ہے صرف آج ہی نہیں روزانہ۔ جب بھی ممکن ہو۔"

"لیکن کیوں ـــ؟" نوید نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

"ابو! آپ کے ابو بھی یہی کیا کرتے تھے۔" عاشی نے اس کی طرف بہت پیار سے دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

"تم عاشی۔" وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا اور چھلانگیں لگاتا ہوا سیڑھیاں چڑھ گیا۔ عائشہ وہیں زینے پر ٹک گئی اوپر سے امی جان اور نوید کی باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

وہ آپ ہی آپ مسکرا دی جیسے اس کے کاندھے کا بوجھ اتر گیا ہو اور وہ ہلکی پھلکی ہو۔

✡ ✡

نبیلہ عزیز

گوری کرت سنگھار

"گوری...... او...... گوری! اٹھ جا پتر، نماز کا وقت ہو گیا ہے۔" اماں وضو کر کے غسل خانے سے باہر نکلیں تو گوری کو جگانے کے لیے تان لگائی۔ لیکن اماں کی پہلی دو تین آوازیں تو بس دیواریں ہی سنتی تھیں اس کے بعد کہیں جا کر گوری پہ اثر ہوتا تھا اور یہ تو ان کی ابھی پہلی آواز تھی۔

"گوری اٹھ جا، پھر وقت کم رہ جائے گا، قرآن پاک بھی پڑھنا ہوتا ہے تم نے۔" اماں برآمدے میں آ کر شیلف پہ رکھی جائے نماز اٹھا کر بچھانے لگیں اور ساتھ ساتھ اسے آواز دینے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔

مکمل ناول

"ارے سویرے سویرے کیوں میرے منہ سے کچھ الٹا سیدھا سننا چاہتی ہے؟ اب اٹھ جا، رات رات بھر جاگ کر کہانیاں پڑھتی رہتی ہے اور فجر ویلے خبر بھی نہیں ہوتی کہ اللہ کا ذکر بھی کرنا ہے۔" وہ اب جائے نماز پہ کھڑی ہو چکی تھیں۔

"اف اماں! کچھ تو خدا کا خوف کریں، کب اللہ کا ذکر نہیں کرتی؟ رات کو بھی عشاء کی نماز پڑھ کر سوتی ہوں، صبح اٹھ کے بھی فجر کی نماز پڑھتی ہوں۔" وہ چہرے سے چادر ہٹا کر خفگی سے بولی تھی۔ آنکھیں آدھی کھلی تھیں اور آدھی بند تھیں۔

"اور بیچ کی تین نمازیں تیرا فیشن کھا جاتا ہے، ان کے لیے تجھ سے وضو نہیں ہوتا، تجھے اپنے کجلے، سرمے، خراب ہونے کا ڈر ہوتا ہے اور تین نمازیں بددعائیں دیتی رہ جاتی ہیں۔" اماں نے غصے سے تلملا کے کہا تھا اور وہ دہل گئی تھی۔

"خدا کے لیے اماں! اب ڈرائیں تو مت میں تو باقی تینوں بھی پڑھتی ہوں۔" اس نے کھسیانے سے انداز میں کہا۔

"ڈریں تمہارے دشمن، تمہیں بھلا کیا ضرورت ہے ڈرنے کی؟......"

"اماں! تمہیں تو مجھ سے اللہ واسطے کا بیر ہے، تمہیں تو بس بہانا چاہیے ہوتا ہے۔" وہ چادر پرے پھینک کر بڑبڑاتی ہوئی چارپائی سے اٹھ گئی اور اماں کو جب اطمینان ہو گیا کہ وہ نماز کے لیے وضو کرنے جا رہی ہے تو انہوں نے پلٹ کر اپنی چادر درست کی اور نماز کی نیت باندھ لی تھوڑی دیر بعد وہ بھی وضو کر کے جائے نماز پہ آ کھڑی ہوئی تھی نماز کے بعد قرآن پاک کھول کے بیٹھ گئی اور تقریباً ایک گھنٹہ وہ تلاوت کرتی رہی اور اماں وظیفہ پڑھتے ہوئے اس کی تلاوت کی آواز سنتی رہیں پورا ایک سیپارہ ختم کیا تو بڑی عقیدت کے ساتھ قرآن پاک کو چومتے ہوئے جزدان میں لپیٹ کر اندر الماری میں رکھ آئی اس کے بعد اس کا اپنا ٹائم شروع ہو گیا تھا سب سے پہلے اپنی چوٹی کھول کر بالوں میں کنگھی کی اور اچھی طرح کنگھی کرنے کے بعد دوبارہ سے چوٹی گوندھ لی تھی پھر ہمیشہ کی طرح آنکھوں میں بھر بھر کے کالا سیاہ کاجل ڈالا اور اپنے آپ کو ہر زاویے سے دیکھ پرکھ کے باہر نکل آئی تھی کیونکہ نماز اور اپنے کاموں کے بعد گھر کے کاموں کی باری ہوتی تھی۔

"وے گامی، اوئے بالی، اٹھ جاؤ مسجد جانے کا ٹائم ہو گیا ہے، مولوی صاحب جماعت پڑھا چکے ہیں، اٹھ وضو کرو اور مسجد جاؤ۔" اب گوری کی ڈیوٹی چھوٹے

دونوں بھائیوں کو مسجد بھیجنے کی تھی اس نے ان دونوں کے اوپر سے چادریں کھینچ لی تھیں۔

"اس گھر میں بھی ایک سے بڑھ کے ایک نمونہ ہے' اماں تجھ پہ نازل ہوتی ہیں اور تو ہم پہ نازل ہو جاتی ہے۔" بالی خفگی اور بے زاری سے کہتا بڑبڑاتا ہوا اٹھ گیا تھا اور اس کے پیچھے دوسرے کو بھی اٹھنا پڑا جب ایک کو معافی نہیں تھی تو پھر دوسرے کو کیسے ملتی؟

"اور تم دونوں جا کر مولوی صاحب پہ نازل ہو جاتے ہو' مولوی صاحب تمہیں پڑھا پڑھا کر بوڑھے ہو گئے اور تم دونوں پڑھ پڑھ کے بوڑھے ہو گئے لیکن قرآن پاک ابھی تک ختم نہیں کیا' کچھ شرم کرو دونوں' داڑھی مونچھ نکلنے کو ہے تمہاری اور تم ابھی سیپارہ پڑھنے جاتے ہو؟" گوری صحن سے بستر اور چارپائیاں سمیٹتے چھوٹے دونوں کو جھاڑ رہی تھی۔

"بوڑھی ہو گی تو' میں تو ابھی دس سال کا ہوں' بے شک اماں سے میری تاریخ پیدائش نکلوا کے دیکھ لے۔" بالی اس کی اس قدر مبالغہ آرائی سے چڑ گیا تھا اس نے بچوں کو بوڑھا بنا دیا تھا۔

"اماں کہاں کی ایڈووکیٹ ہیں جن کے پاس ساری تاریخیں لکھی ہوں گی؟ اس سے پوچھ کہ بالی کب پیدا ہوا تھا تو بتائے گی "جدوں واڈی پئی سی" (جب گندم کی کٹائی ہوئی تھی)۔" گوری نے بالی کا مذاق اڑایا اور وہ منہ بنا کے رہ گیا کیونکہ اس بار وہ واقعی سچ کہہ رہی تھی۔

وہ جب بھی اماں سے تاریخ پیدائش پوچھتے وہ ایسے ہی جواب دیتی تھیں' کامی کی پیدائش کی یہ نشانی تھی کہ جب وہ پیدا ہوا تب ساون کا مہینہ تھا اور گوری ہاڑ جیٹھ کے مہینے میں پیدا ہوئی تھی جب سورج بھی ہر طرف آگ اگلتا تھا اور وہ بھی اس آگ میں اضافہ کرنے کے لیے آگئی تھی' البتہ ان تینوں کی تاریخ پیدائش صرف ابا کو پتا تھی جنھوں نے کاغذ پہ لکھوا کے اپنے لوہے کے بکسے میں رکھی ہوئی تھیں۔

"گوری! لسی بن گئی؟" ابا بھینسوں کا دودھ باورچی خانے میں رکھ کر شیدے کی ہٹی پہ تھوڑی دیر اخبار پڑھنے چلے گئے تھے اب واپس آئے تو لسی کی طلب ہوئی تھی جو عام دیہاتی لوگوں کی طرح ان کی غذا کا حصہ تھی۔

"ابھی بنانے لگی ہوں ابا۔" وہ برآمدے کے ستون کے پاس رکھی مدھانی کے سامنے پیڑھی ڈال کے بیٹھ گئی اور دودھ بلونے لگی' دودھ بلونا ایک محنت طلب کام تھا اس لیے صبح اماں روٹیاں پکانے بیٹھ جاتی تھیں اور وہ دودھ بلونے' سب کو تازہ مکھن اور لسی کی عادت تھی ان دونوں چیزوں کے بغیر ان کا ناشتا ادھورا ہوتا تھا۔

"آج داور نہیں آیا؟" ابے نے چارپائی پہ بیٹھتے ہوئے پوچھا اور گوری ٹھٹک گئی۔

"وہ تو شہر گیا ہوا ہے مہینہ ہو گیا ہے۔" اسے جو معلوم تھا اس نے وہی کہا۔

"وہ آیا ہوا ہے۔" انھوں نے سرسری سا کہا' گوری کے ہاتھ تھم گئے مدھانی کے چمڑے کے پٹے اس کے ہاتھوں میں دبے ہوئے تھے۔

"آپ کو کس نے کہا؟"

"خاور نے بتایا تھا کہ وہ رات سے آیا ہوا ہے۔" ابا کی اطلاع پہ گوری کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی کیونکہ اسے حیرت اور اچنبھا ہوا تھا کہ داور آیا ہوا ہے اور اسے پتا ہی نہیں؟ اور وہ بھی تو ان کی طرف نہیں آیا تھا؟ آج تو اس نے پراٹھے کے لیے مکھن بھی نہیں مانگا تھا۔ حیرت سی حیرت تھی اس کے لیے۔

"پتر! کام چھوڑ کے کیوں بیٹھ گئی ہے' لسی بنا کے دے۔ بڑی پیاس لگی ہے۔" ابا صبح سویرے اٹھ کر نماز کے بعد بھینسوں کی کافی دیکھ بھال کرتے تھے اس لیے ناشتے کے وقت تک خاصا تھک جاتے تھے اور بھوک بھی لگ رہی ہوتی تھی۔

"جی ابا! بس بن گئی ہے لسی۔" وہ اپنے کسی دھیان سے چونکی اور لسی نکال کے ابا کو دینے لگی۔ ابا ناشتا کرکے گھر سے نکل گئے اور گوری چند ضروری کام نبٹا کے خالہ زہرہ کے گھر آگئی اس کے دل کو بے چینی

لگی ہوئی تھی کہ وہ ان کے گھر کیوں نہیں آیا؟ وہ ٹھیک تو ہے؟ اس کو کھد بد ہو رہی تھی لیکن پہلا سامنا خاور سے ہوا تھا۔

"السلام علیکم!" اس نے سر پہ دوپٹہ ڈالتے ہوئے کہا' خاور نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔

"وعلیکم السلام کیسی ہو؟"

"میں ٹھیک ہوں' آپ کب آئے؟" اس نے خاور سے ہی پوچھ لیا وہ بھی کافی دنوں سے شہر گیا ہوا تھا۔

"رات کو میں اور داور اکٹھے ہی آئے تھے۔" خاور کو پتا تھا کہ وہ کیا جاننا چاہ رہی ہے۔

وہ اپنی مسکراہٹ دبا گیا لیکن اس کی مسکراہٹ گوری کی نظروں سے مخفی نہیں رہ سکی تھی۔

"خالہ کہاں ہے؟" وہ بات بدل گئی۔

"وہ اندر رسوئی میں ہیں۔" خاور نے اشارہ کیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا اتنے میں داور نہا کر بالوں میں تولیہ رگڑتا ہوا غسل خانے سے باہر نکل آیا تھا۔ اور برآمدے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے بھی گوری کو دیکھ لیا تھا۔

"کیسی ہو۔" وہ اسے دیکھ کر ٹھہر گیا۔ لیکن وہ شان بے نیازی سے سنی ان سنی کرتی ہوئی پلٹ کر باورچی خانے میں داخل ہو گئی اور داور اس کی پشت کو دیکھ کے رہ گیا۔

اس کے تیور خاصے خطرناک تھے لیکن اب تو وہ پوچھ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہوا کیا ہے؟ اتنی بے رخی اور ناراضی کس لیے...؟ کیونکہ وہ اماں کے پاس جا بیٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم خالہ۔" اس نے ان کے صحن میں داخل ہوتے ہوئے ذرا بلند اور اونچی آواز میں سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام' میں صدقے' میں بسم اللہ' میرا پتر بڑے دنوں بعد آیا ہے۔" اماں داور کو دیکھتے ہی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے کھڑی ہو گئیں اور دوپٹے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے اس کے کندھے پہ شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

"کیسا ہے میرا بچہ؟"

"اللہ کا شکر ہے خالہ! ٹھیک ٹھاک ہوں' صبح سے آپ کو کہیں دیکھا نہیں تو میں نے سوچا کہ میں خود جا کر آپ سے مل لوں' کیسی ہیں آپ؟" اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہائے ماں صدقے' ماسی کو یاد تو رکھتا ہے نا' پتر میں ٹھیک ہی ہوں بس یہ سر کا درد کھا گیا ہے جس روز شروع ہوتا ہے آگے پیچھے کا ہوش نہیں رہتا' مت ماری جاتی ہے۔" خالہ نے اپنا دکھڑا رو دیا۔

"ڈاکٹر کو نہیں دکھایا آپ نے؟" داور چارپائی گھسیٹ کر خود ہی بیٹھ گیا تھا۔

"پتر! ڈاکٹر کے پاس جاتی ہوں تو درجن درجن گولیاں ڈال کے دے دیتے ہیں' حکیم صاحب کے پاس جاتی ہوں تو موٹی پڑیاں بنا بنا کر تھما دیتے ہیں اور مولوی صاحب کے پاس جاؤ تو وہ کہتے ہیں دن رات دم

کرواتی رہو۔ کسی نے تعویذ ڈال رکھے ہیں اب تم بتاؤ کہ کس کے کہے پہ عمل کروں؟" اماں نے داور سے رائے لی۔

"داور مسکرا دیا' آپ اکیلی کیوں بیٹھی ہیں' باقی سب کہاں ہیں؟" وہ بالآخر پوچھ ہی بیٹھا تھا۔

"کامی اور بالی گلی ڈنڈا کھیلنے کے لیے واڑے کی طرف گئے ہوئے ہیں' تیرا چاچا شیدے کی ہٹی پہ ہوگا' اور گوری اوپر چھت پہ ہے' چھنو کے ساتھ باتوں میں لگی ہوگی۔" اماں نے اوپر چھت کے طرف اشارہ کیا تو داور کی نظر بلا ارادہ ہی چھت کی سمت اٹھ گئی گوری سیمنٹ سے بنے جنگلے کے قریب کھڑی صحن کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ داور کی نظر سے نظر ملتے ہی خفگی سے پیچھے ہٹ گئی۔

"گوری' او گوری نیچے آ' داور آیا ہے' کچھ چائے پانی ہی بنا لے۔" اماں نے خاصی اونچی آواز سے پکارا تھا۔

"آپ ٹھہریں میں دیکھتا ہوں۔" داور کو بہانا ہاتھ آگیا اور فوراً کہہ کہ سیڑھیاں چڑھ آیا تھا' چھنو گوری اور داور کے گھر ساتھ ساتھ ہی تھے گھروں کی دیواریں اور چھتیں جڑی ہوئی تھیں اس لیے چھت پہ باآسانی کھڑے ہو کر باتیں بھی ہو جاتی تھیں اور آس پڑوس کا نظارہ بھی' گوری کا گھر چھنو اور داور کے درمیان تھا۔ ایک طرف داور کا گھر تھا اور ایک طرف چھنو کا۔ اس وقت بھی وہ دونوں باتیں کر رہی تھیں جب وہ اوپر آیا۔

"السلام علیکم۔" اس نے اخلاقاً سلام کیا۔

"وعلیکم السلام داور بھائی کیسے ہیں آپ؟" چھنو نے بھی اخلاق نبھایا۔

"ٹھیک ہوں' آپ لوگوں کی گفتگو ختم ہوئی یا نہیں؟" اس نے نپے تلے انداز سے کہا۔

"آپ آگئے ہیں تو سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ گفتگو بھی اور ناراضی بھی۔" چھنو گوری کو دیکھتے ہوئے شرارت سے بولی۔

"اپنا منہ بند رکھو۔" گوری نے گھورا تھا اسے۔

"دکھ دو تو آنکھیں بھی بند کر لیتی ہوں؟"

چھنو جاتے جاتے بھی چھیڑنے سے باز نہیں آئی تھی اور گوری ضبط کر کے رہ گئی داور اس کے برابر آکھڑا ہوا اور دونوں ہاتھ چھوٹی سی دیوار پہ جما دیے تھے گوری نے نظر جھکا لی۔ ایک ماہ بعد آیا تھا' خاصا صحت مند اور نکھرا نکھرا سا لگ رہا تھا

"ناراض کیوں ہو؟" اس نے آہستگی سے پرسکون ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا لیکن گوری جواب دینے کے بجائے پلٹ کر جانے لگی تو داور نے بے ساختہ اس کے دوپٹے کا پلو تھام لیا۔

"رکو" یہ اس کے روکنے کی پرانی عادت تھی بچپن میں اس کا ہاتھ تھام کے روک لیتا تھا لیکن جب سے ہوش سنبھالا تھا اور ہاتھوں کا لمس لو دینے لگا تھا' اس نے ہاتھ پکڑ کر روکنا چھوڑ دیا تھا۔ ہاتھوں میں ہاتھ آتے تو جذبے پگھلنے لگتے تھے اس لیے احتیاط ہی بھلی تھی۔

"کیوں؟" وہ تیکھے پن سے بولی۔

"پہلے میری بات کا جواب دو۔" وہ اس کا پلو چھوڑے بغیر بولا۔

"کیسا جواب؟"

"تم ناراض کیوں ہو؟" داور نے سوال دہرایا۔

"کیا تم نہیں جانتے؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"پھر فائدہ کیا ہے پوچھنے کا؟ چھوڑو اس بات کو۔" اس نے اس کے ہاتھ سے پلو کھینچ لیا۔

"لیکن یار! میں تمہیں کیسے بتاتا' رات کا اتنا ٹائم ہو رہا تھا۔ پچھلا پہر لگ چکا تھا۔؟" داور نے خفگی سے کہا۔

"دیوار سے بالی کو آواز دے لیتے۔" اس کی اپنی منطق تھی۔

"ہاں رات کے بارہ بجے سوئے ہوئے بالی کو آواز دے کر کہتا کہ میں آگیا ہوں گوری کو بتا دو۔" اس نے جھنجلا کے کہا۔

"تو اس میں کیا حرج تھا؟" وہ اپنی بات پہ اڑی ہوئی تھی اور داور چپ ہو گیا۔

"تم مجھے زچ کرنے کے لیے ایسا کرتی ہو نا؟"

"ہاں۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ایک مہینے آئے ہو' کیا مہینے بھر کی کسر بھی پوری نہ کروں؟" وہ چلا کے بولی اور داور کے چہرے پہ نہ چاہتے ہوئے مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"اسی طرح کسر پوری کرنی تھی؟ میرا پورا دن ٹینشن میں گزر گیا کہ نہ جانے کیا خطا کر بیٹھا ہوں۔" اس نے خوشگواریت سے کہا۔

"خطا تو تم واقعی کر بیٹھے ہو۔" گوری کا لہجہ اور انداز معنی خیز تھے۔

"محبت خطا نہیں ہوتی۔" داور نے تردید کی۔

"تو کیا ہوتی ہے؟"

"کبھی فرصت میں بتاؤں گا۔" اس نے ٹالا۔

"کب فرصت ملے گی تمہیں؟ کب پیچھا چھوڑو گے اس پڑھائی کا؟" گوری خفا خفا سی بولی۔

"بس چند مہینے رہ گئے ہیں' تمہارا انتظار ختم ہو جائے گا۔" داور تسلی دے رہا تھا۔

"کبھی کبھی انتظار کر کے بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا۔" وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

"پانے کی لگن سچی ہو تو سب کچھ حاصل ہوتا ہے' حاصل اور لاحاصل کا فیصلہ نیت کے ترازو پہ ہوتا ہے۔" داور نے دلیل دے کر سمجھایا۔

"خیر چھوڑو یہ بتاؤ کہ تم میرے ڈائجسٹ لائے ہو؟" وہ زیادہ دیر سنجیدہ نہیں رہ سکتی تھی اس لیے اپنے اصلی رنگ میں لوٹ آئی۔

"ہاں یار! اتنوں لایا ہوں جو تم نے لکھ کر دیے تھے۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اور؟" وہ اور کچھ پوچھ رہی تھی۔

"اور تو تم نے کچھ نہیں کہا تھا یار؟" وہ انجان بنتے ہوئے بولا۔

"یاد کر لو' شاید میں نے کچھ کہا ہو؟" وہ دھمکی دینے والے انداز میں بولی۔

"ہاں ہاں یاد آیا' تم نے سرخ چوڑیاں کہی تھیں۔" اس نے یاد کرنے والے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"اور؟" وہ پھر پوچھ رہی تھی۔

"اور کالا پراندہ سرخ پھندوں والا۔" داور نے اور یاد کیا۔

"اور؟"

"اور سرخ نیل پالش اور لپ اسٹک۔" وہ بھی یاد کرتا جارہا تھا۔ گوری نے اسے اپنی چیزوں کی پوری لسٹ دے کر بھیجی تھی۔

"اور؟"

"بس یار! یہی چیزیں تم نے منگوائی تھیں بمشکل ختم ہوگئی۔"

"یہ ساری چیزیں تو میں نے خود منگوائی تھیں۔ تم بتاؤ تم میرے لیے کیا لے کر آئے ہو؟" وہ گھور کے بولی۔

"میں خود آگیا ہوں یہ کافی نہیں ہے؟" داور مسکراتے ہوئے بولا۔ گوری کے چہرے پہ رنگ بکھر گئے تھے۔

"مجھے تمہارے آنے نہ آنے سے کیا مطلب؟ مجھے تو اپنی چیزوں کی فکر ہوتی ہے۔" اس نے کندھے اچکا کے کہا۔

"او کے۔ آئندہ چیزیں بھیج دیا کروں گا اور خود ویک اینڈ پہ بھی وہیں رک جایا کروں گا۔" وہ بھی اسی کے سے انداز میں بولا تھا۔

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ شہر کو چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا رنگ برنگی فیشن ایبل لڑکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں' بلکہ میں تو کہتی ہوں کہ دو چار تو پھانس بھی رکھی ہوں گی' آخر یونیورسٹی میں پڑھتے ہو۔" اس نے کھڑے کھڑے اس پہ الزام بھی داغ دیا تھا۔

"دو چار نہیں صرف ایک۔" اس نے گوری کے جملے کی تصحیح کی۔

"کیا کہا؟" وہ یکدم اس کی طرف پلٹی اور داور کے چہرے پہ مسکراہٹ دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"وہ ایک بھی آفت ہے۔" وہ اسے سر تاپا دیکھتے ہوئے بولا۔

"اچھا تو میں تمہیں آفت نظر آتی ہوں؟"

"تم تو مجھے نہ جانے کیا کیا نظر آتی ہو؟" وہ شرارت سے بولا۔ اور گوری خود ہی کھلکھلا کے ہنس پڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

"زبیدہ سے ملنے گئے تھے تم؟" خاور ناشتا کر رہا تھا جب ابا جی نے سوال کیا۔

"نہیں۔"

"کیوں؟ میں نے تمہیں کہا بھی تھا؟" ابا کے ماتھے پہ بل پڑ گئے تھے۔

"روز' روز جانا اچھا نہیں لگتا۔"

"کیوں اچھا نہیں لگتا؟ تیری پھوپھی ہے وہ۔" انہوں نے غصے سے کہا۔

"میری ہونے والی ساس بھی ہیں وہ۔" خاور نے دوسرا رشتہ جتایا۔

"ابھی ساس نہیں بنی ابھی پھوپھی ہی ہے۔"

"یعنی آپ کا مطلب ہے کہ نورین میری منگیتر نہیں ہے؟" خاور پراٹھا ختم کرکے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے بولا۔

"تو آخر کہنا کیا چاہتا ہے؟" ابا جی کو تاؤ آگیا۔

"جو آپ سمجھ ہی نہیں رہے۔" خاور کا لہجہ پہلے جیسا ضدی اور ہٹ دھرم محسوس ہو رہا تھا۔

"میری کھوپڑی تتی نہ کر' نہ ہی میرے ساتھ الٹی سیدھی باتیں کیا کر۔" ابا جی کو خاور سے اور خاور کو ابا جی ہمیشہ اختلاف رہتا تھا۔

"اسی طرح' بالکل اسی طرح جب میں پھوپھی زبیدہ کے گھر جاتا ہوں تو میری کھوپڑی بھی تتی ہو جاتی ہے۔ (گرم ہو جاتی ہے)۔" وہ چائے ختم کرکے دونوں ہاتھ رگڑتا ہوا کھڑا ہو گیا تھا۔

"تجھے آخر اس سے تکلیف کیا ہے؟" ابا جی کا غصہ بڑھ گیا تھا۔

"منگنی سے پہلے پوچھتے تو بتاتا آپ کو۔"

"نہ تو اب بتا دے۔ کیا تکلیف ہے تجھے میری بھانجی سے؟" ابا جی حقہ گڑگڑانا چھوڑ چکے تھے۔

"وقت نہیں رہا جتانے کا' خیر آپ اپنا خون نہ جلائیں' کل چلا جاؤں گا زبیدہ پھوپھی کے گھر۔" خاور شہر میں جاب کرتا تھا' اس لیے اس کی رہائش بھی شہر میں ہی تھی۔ وہ بھی ویک اینڈ پہ ہی گھر آتا تھا۔

"تو بے شک نہ جا۔ میں دیکھ لیتا ہوں کہ تو کیا کرتا ہے؟" ابا نے وارننگ دی۔

"میں نے کیا کرنا ہے؟ جو بھی کرنا ہے اللہ نے کرنا ہے۔" اس نے عاجزی و انکساری سے کہا۔

"لیکن دیکھیں ابا! اپنی بہن کو سمجھا دیں کہ وہ اپنی بٹی کو سمجھا کے رکھیں میں ان کے گھر جاؤں تو مجھ سے الٹی سیدھی باتیں نہ کیا کرے' وہ بد زبان ہے تو میں خود بڑا بدلحاظ ہوں' میرے منہ نہ لگا کرے۔" اس نے بھی ابا جی کو وارننگ دی تھی۔

"ارے یہ کیا تم دونوں باپ بیٹا اک دوسرے کو دھمکیاں دے رہے ہو۔ آرام سکون سے ٹھہر ٹھہر کے بات کرو' اتنے غصے میں کیوں ہو؟" اماں بالا خر باورچی خانے سے نکل آئی تھیں۔

"اماں! آپ سمجھائیں ابا کو —— آج کل بہن کا بھوت سوار ہے ان پہ۔" خاور ماں کو کہتا خود باہر نکل گیا تھا اور ابا جی پیچھے اسے نجانے کیا کیا گالیاں بکتے رہ گئے۔

"خیر تو ہے؟ یہاں کیا ہو رہا ہے؟" داور ابھی ابھی گھر میں داخل ہوا تھا وہ صبح صبح تازہ ہوا سے لطف اندوز ہونے کے لیے باہر زمینوں کی طرف نکلا ہوا تھا۔

"وہ خبیث دماغ خراب کر گیا ہے میرا۔" ابا جی کا غصہ کم نہیں ہو رہا تھا اور داور کو پتا چل گیا تھا کہ یہ لقب کس کے لیے ہے حالانکہ خاور اس سے بڑا تھا لیکن ابا جی اسے بڑے بیٹوں جیسا پروٹوکول نہیں دیتے تھے۔

"کیا ہوا ہے؟ پھر کچھ کہہ دیا ہے انہوں نے؟" وہ ان کے قریب ہی چارپائی پہ بیٹھ گیا۔

"وہ کیا کہے گا بھلا؟ میں کہوں گا' عاق کروں گا اسے۔" ابا جی بھڑک رہے تھے اور داور مسکرا دیا کیونکہ اسے پتا تھا کہ یہ ان کا تھوڑی دیر کا غصہ ہے' تھوڑی دیر بعد وہ اپنے سارے قول بھول جائیں گے۔

"چھوڑیں ابا جی! اس عمر میں اتنا غصہ نہ کیا کریں۔" داور ان کے پاؤں دباتے ہوئے بولا۔

"اسے باپ سے بات کرنے کا چج ہی نہیں ہے۔"

"آپ بھی تو چج کی بات کیا کریں نا؟" اچانک خاور گھر میں داخل ہوا تھا شاید گلی سے ہی گھوم پھر کے آگیا تھا۔

"دیکھ خاور باز آجا' تو نے ابھی میرا غصہ نہیں دیکھا۔"

ابا جی پھر اٹھ کے بیٹھ گئے تھے لیکن اس بار داور نے بیچ بچاؤ کروا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم پھر جا رہے ہو؟" وہ آہستگی سے بولی۔ اس کے لہجے میں اداسی گھلی تھی لیکن وہ اپنی اداسی چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"جانا تو ہے۔" وہ اپنے کپڑے بیگ میں رکھتے ہوئے بولا۔

"آؤ گے کب؟" اس نے دوسرا سوال کیا۔

"اگلے مہینے۔" وہ اپنی پینٹ اور شرٹ تہ کرکے رکھ رہا تھا۔

"اگلے ہفتے کیوں نہیں؟" اس کی اداسی خفگی میں بدل گئی داور نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"اگلے ہفتے ہی آجاؤں گا۔" اس کے لہجے میں مسکراہٹ تھی۔

"تو پھر میں اپنی لسٹ لے آؤں؟"

"ہیں؟ پھر لسٹ؟" داور بدک گیا۔

"چیزیں بھی بھلا کبھی ختم ہوئی ہیں؟"

"لیکن گوری روز روز اتنے پیسوں کا سامان منگواتی ہو' کچھ تو......"

"اپنے پیسوں سے منگواتی ہوں' تم سے نہیں لیتی' جس روز تمہارے پیسوں سے چیزیں لوں تب منع کرنا۔" اس نے داور کی بات کاٹ دی۔

"اف! تم خالہ کو تباہ کرو گی۔" وہ دائیں بائیں

سہلاتے ہوئے بولا۔
"کون سی خالہ کو؟ اپنی خالہ کو یا تمہاری خالہ کو؟" گوری کے انداز میں معنی خیزی تھی۔
"باری باری دونوں کو۔" داور ہنسا۔
"اور تمہیں بھی۔"
"مجھے تو تم نے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی کر دیا ہے۔ اب کسی اور کی طرف دیکھنے کی کوشش بھی کروں تو لگتا ہے کہ بے ایمانی کر رہا ہوں۔" داور نے آہ بھری۔
"تم کسی اور کی طرف دیکھو تو سہی، ٹانگیں نہ توڑ دوں تمہاری۔" وہ کہاں لحاظ کرنے والی تھی۔
"میری ٹانگیں توڑو گی تو چیزیں کون لائے گا؟"
"خود لے آؤں گی، لیکن تمہاری ٹانگیں توڑ کے چارپائی پہ بٹھا دوں گی۔"
"اف توبہ! اتنی خطرناک محبت؟" اس نے حیرانی سے کہا۔
"میں خود بھی بڑی خطرناک ہوں۔"
"یہ مجھ سے بہتر اور کون جان سکتا ہے بھلا؟" داور برجستہ بولا۔
"گوری چلی گئی؟" باہر سے خالہ زہرا کی آواز سنائی دی۔
"نہیں خالہ! ابھی یہیں ہوں۔" گوری باہر آگئی۔
"داور سے کہو، خاور بلا رہا ہے۔ گاڑی تیار ہے۔" انہوں نے آواز دی۔
"میں تیار ہوں اماں۔" وہ اپنا بیگ لے کر باہر نکل آیا تھا۔
"تمہاری لسٹ؟" داور نے اس کے پاس ٹھہرتے ہوئے پوچھا۔
"پھر دے دوں گی ابھی تم جاؤ۔" وہ لاپروائی سے بولی۔
"کیا پیسے نہیں ہیں؟"
"ایسی بات نہیں ہے۔ میں نے ابھی کل ہی چھ سو کی تین دیسی مرغیاں بیچی ہیں اور دو درجن انڈے بھی کافی پیسے ہیں لیکن ارادہ نہیں ہے۔" اس نے وجہ بتائی۔

"او کے پھر ٹھیک ہے، تھوڑی بچت بھی ہو جائے گی۔" وہ مسکرا کے شرارت سے کہتا اماں کی طرف جھکا اور ان سے دعائیں سمیٹ کر گاڑی کی طرف آ گیا۔ اباجی پہلے ہی ڈیوڑھی میں کھڑے تھے ان سے گلے مل کر جانے کے لیے رخصت ہوا اور پلٹ کر گوری کو دیکھا وہ اماں کے کندھے سے لگی بیٹھی تھی اور اسے ہی دیکھ رہی تھی۔
"خیر سے جاؤ۔" انہوں نے دعا کی اور خاور ہاتھ ہلاتے ہوئے گاڑی نکال لے گیا تھا۔ یہ گاڑی خاور کی تھی کچھ اس نے اپنی تنخواہ سے پیسے جمع کیے تھے اور کچھ دو تین مرلہ زمین بیچی تھی کیونکہ اسے گاڑی کا شوق تھا البتہ داور کے پاس بائیک تھی جو اس نے شہر میں یونیورسٹی آنے جانے کے لیے رکھی ہوئی تھی۔ کبھی کبھار اسے گاؤں بھی لے آتا تھا اور تب گوری کی ضد ہوتی کہ مجھے ساتھ بٹھا کر پورے گاؤں کی سیر کرواؤ یا پھر تھوڑی دیر کے لیے ٹھنڈی نہر کے کنارے لے چلو، ان کے گاؤں سے نہر گزرتی تھی جو ان کے گاؤں کی سب سے بڑی خوبصورتی تھی۔ ایک طرف نہر تھی اور ایک طرف درختوں کی قطاریں اور درمیان سے سڑک گزرتی تھی گرمیوں کا موسم ہوتا تو وہ سڑک بہت ٹھنڈی لگتی تھی گھنے درختوں کی چھاؤں سے ڈھکی ہوئی اسی نہر میں کئی لوگ ڈوب کے مر بھی چکے تھے کوئی محبت میں ہارا ہوا اور کوئی حالات کا مارا ہوا۔

☼ ☼ ☼

خاور بالآخر اباجی کی خاطر زبیدہ پھوپھی کے گھر آ ہی گیا تھا اور پچھلے دس منٹ سے چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں بیٹھا کسی میزبان کا انتظار کر رہا تھا زبیدہ پھوپھو کی چھوٹی بیٹی اقرا اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر بھول گئی تھی کہ وہ ان کے گھر مہمان آیا ہے۔
"ارے خاور بھائی آئے ہیں؟ کیسے ہیں آپ؟" نورین سے چھوٹی رامین شاید ابھی ابھی کالج سے لوٹی تھی گزرتے گزرتے اسے دیکھ کر ٹھہر گئی۔
"ٹھیک ہوں۔"

"امی کہاں ہیں؟" وہ الٹا خاور سے پوچھ رہی تھی۔
"ابھی تو انتظار کر رہا ہوں، پھر پوچھوں گا کہ وہ کہاں ہیں؟"
"اچھا! میں دیکھتی ہوں یا پھر نورین باجی کو بھیجتی ہوں۔" وہ کہہ کے باہر نکل گئی۔ خاور خون کے گھونٹ پی رہا تھا، وہ جانتا تھا کہ نورین کو پتا ہے لیکن پھر بھی وہ اپنے کمرے سے ڈرائنگ روم تک نہیں آئی۔ اسی انتظار میں مزید دس منٹ گزر گئے، وہ بار بار گھڑی کی سمت دیکھ رہا تھا اور اپنی ہتک کے احساس سے بار بار ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔ اس وقت اگر اباجی سامنے ہوتے تو وہ ایسا فساد اٹھاتا کہ اباجی زندگی میں کبھی بھی نورین کا نام لینے کی غلطی نہ کرتے۔
"خاور؟" زبیدہ پھوپھو کی ہانپتی ہوئی آواز سنائی دی تھی وہ بازار گئی ہوئی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں شاپنگ بیگ تھے سودا سلف لے کر آئی تھیں۔
"السلام علیکم۔" وہ انہیں دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔
"وعلیکم السلام، تم کب آئے؟" وہ سارے بیگ صوفے پہ ڈال کے اپنی سانس ہموار کرتے ہوئے اس کی طرف بڑھیں۔
"آدھا گھنٹہ تو ہو گیا ہے۔" اس نے گھڑی پہ نظر ڈال کے کہا۔
"آدھا گھنٹہ؟" وہ چونک گئیں کیونکہ ڈرائنگ روم خالی پڑا تھا یہاں تک کہ ٹیبل بھی خالی تھی نہ چائے کا کوئی کپ رکھا تھا نہ پانی کا گلاس۔
"جی۔" اس نے آہستگی سے کہا۔
"نورین، رامین اور اقرا وغیرہ کہاں ہیں؟" انہوں نے آگے پیچھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"وہ پوچھ رہی ہیں کہ امی کہاں ہیں؟ اور امی جی پوچھ رہی ہیں کہ بیٹیاں کہاں ہیں؟ گویا اس گھر میں کسی کو بھی کسی دوسرے کا نہیں پتا؟" خاور نے پرسوچ انداز میں کہا۔
"تم بیٹھو میں دیکھتی ہوں ان کو۔" وہ کہہ کے باہر نکل گئیں۔ خاور دوبارہ بیٹھ گیا ایک، دو بار پھوپھو کی اندر سے اونچی آواز بھی سنائی دی پھر خاموشی چھا گئی۔

"بیٹا کیا لو گے تم؟" وہ واپس ڈرائنگ روم میں آگئیں۔
"کچھ نہیں۔ میں کافی لیٹ ہو چکا ہوں، آپ سے ملنے کے لیے آیا تھا، سوچا ملے بغیر چلا گیا تو پھر چکر لگانا پڑے گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ مل کر ہی چلا جاؤں۔" اس نے اٹھنے کے لیے پر تولتے ہوئے کہا۔
"ارے ایسے کیسے چلے جاؤ گے، آج کا کھانا تو تمہیں ہمارے ساتھ ہی کھانا پڑے گا۔" زبیدہ پھوپھو نے بڑی محبت سے کہا تھا۔
"ان شاء اللہ آپ کے ساتھ کھانا ضرور کھاؤں گا لیکن پھر کبھی، آج وقت نہیں ہے مجھے کسی کام سے کہیں اور بھی جانا ہے۔" اس نے انکار کر دیا۔ "السلام علیکم!" ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے سے کافی اکھڑا سا سلام سنائی دیا تھا۔
"وعلیکم السلام نورین! آؤ بیٹھو، دیکھو کون آیا ہے؟" زبیدہ پھوپھو نے اس کے سلام کا جواب خود ہی دیا تھا۔
"میری نزدیک کی نظر کمزور نہیں ہے امی، میں دیکھ رہی ہوں کہ کون آیا ہے؟" نورین نے ماں کی بولتی ہی بند کر ڈالی تھی اور آگے بڑھ کے صوفے پہ بیٹھ گئی۔ خاور نے اسے نگاہ بھر کے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔
"کیسے ہیں آپ؟" اس کا وہی اکھڑ اور لٹھ مار قسم کا انداز تھا حالانکہ خاور حد سے زیادہ اکھڑ مزاج تھا۔
"ٹھیک ہوں، آپ سنائیں، پھوپھو نے خوامخواہ آپ کو جا کر ڈسٹرب کر دیا۔" خاور نے سچ کہا تھا زبیدہ پھوپھو ٹھٹک گئیں جبکہ نورین پہلو بدلتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگی تھی۔
"ارے نہیں بیٹا! اس میں ڈسٹرب کرنے کی کیا بات ہے؟ وہ ویسے بھی تمہاری طرف ہی آ رہی تھی۔" پھوپھو نے معاملہ سنبھالنے کی کوشش کی۔ "لیکن اب میں کسی اور طرف جا رہا ہوں، آپ سے پھر ملاقات ہو گی، اپنا خیال رکھیے گا اللہ حافظ۔" وہ الوداعی کلمات ادا کرتا اللہ حافظ کہہ کر چلا گیا تھا اور نورین کا رخ ماں کی

طرف ہو گیا۔

"دیکھا آپ نے؟ اس طرح اکڑ دکھاتا ہے وہ؟"

"دیکھ چکی ہوں' اچھی طرح دیکھ چکی ہوں' آدھے گھنٹے سے آیا بیٹھا تھا لیکن تم لوگوں کو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ اس سے چائے پانی کا ہی پوچھ لو' وہ اقرا بی بی تو اسے بٹھا کر چلی گئیں' تمہیں بھی خیال نہیں آیا؟ منگیتر ہے تمہارا اور سب سے بڑی بات کہ میرے بھائی کا بیٹا ہے میرا بھتیجا ہے' میں خود گاؤں چلی جاؤں تو دونوں بھائی خدمت کرتے نہیں تھکتے اور تم لوگ۔۔۔؟" امی کا غصہ عروج اور وہ چاروں اب صرف سن رہی تھیں۔

"تو بول کلموہی! تو کہاں چلی گئی تھی؟" اب امی کے عتاب کا نشانہ اقرا تھی۔

"وہ میری سہیلی کا فون آ گیا تھا۔ وہی سننے کے لیے چھت پہ چلی گئی تھی اور خاور بھائی کا یاد نہیں رہا۔" اس نے منمنا کے جواب دیا۔

"اور تو؟" انہوں نے رامین کو دیکھا۔

"میں کھانا کھانے بیٹھ گئی تھی۔" اس کی آواز بھی دھیمی تھی۔

"اب یہ تفتیش کس لیے ہو رہی ہے؟ وہ آیا اور آ کر چلا گیا' بس بات ختم۔" نورین نے کندھے اچکائے۔

"نورین! باز آجا' کیوں اپنے نصیب کے پیچھے پڑی ہے' کیا کمی ہے خاور میں؟" امی نے جھنجھلا کر کہا۔

"کوئی کمی نہیں ہے۔ بس اسے یہ بتاتی ہوں کہ میں تمہارے رعب میں آنے والی نہیں ہوں وہ اگر عام دیہاتی مردوں کی طرح یہ سوچے کہ میں اس سے ڈر کے اور دب کے رہوں گی تو یہ اس کی بھول ہے' میں شہر کی پڑھی لکھی ڈگری ہولڈر لڑکی ہوں' عقل مند اور باشعور ہوں بلکہ اسے چاہیے کہ مجھ سے دب کے رہے۔" اس نے تو حد کر ڈالی تھی اور امی اس کے خیالات پہ اسے دیکھ کے رہ گئیں۔ اپنے اسی مزاج کی وجہ سے تو وہ پانچ جگہوں سے جاب کے دوران نکالی گئی تھی' کمپنی والے اسے نکال باہر کرتے تھے اور وہ ہر بار ایم اے انگلش ہونے کا فخر سینے پہ سجا کر گھر آ جاتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"یہ خواتین کے ڈائجسٹ پڑھنا کب شروع کر دیے تم نے؟" داور دو' تین ڈائجسٹ لے کر بک اسٹال سے باہر نکلا تو اس کا دوست ٹکرا گیا۔

"یہ میرے لیے نہیں کسی اور کے لیے ہیں۔" داور نے آہستگی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کسی اور کے لیے؟ کیا مطلب؟"

"یار گاؤں لے کر جانے ہیں' کسی نے منگوائے تھے۔"

"لو وہ اچھا۔" اس کا دوست معنی خیزی سے ہنسا۔

"تم سناؤ تم کہاں؟"

"یار! میں بھی کسی کے لیے پوٹری بکس لینے آیا ہوں' گفٹ کرنی ہیں۔" اس کا دوست سر کھجاتے ہوئے بولا۔

"یعنی سب کو اپنی اپنی پڑی ہے؟" داور ہنس دیا تھا۔

"ہاں یار! فرمائشیں پوری کرنے کے علاوہ بھی تو کوئی چارہ نہیں' ہم دل کے ماروں کے پاس؟" اس کا دوست دہائی دے رہا تھا۔

"بس صبر کرو' اللہ صبر کا پھل میٹھا دیتا ہے۔" داور نے کندھا تھپکا اور بک شاپ سے جیولری شاپ میں آ گیا' اس بار گوری نے کوئی چیز نہیں منگوائی تھی' اس لیے اسے خالی ہاتھ گاؤں جاتے ہوئے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے سوچا' خود ہی اس کے لیے کچھ خرید لے۔

اس کے لیے تھوڑی بہت چیزیں خرید کر وہ واپس ہاسٹل پہنچا تو خاور اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے بھی گاؤں جانا تھا' داور کو پک کرنے کے لیے آیا ہوا تھا۔ داور جلدی جلدی اپنے کمرے سے بیگ وغیرہ لے کر گاڑی میں آن بیٹھا۔

"کہاں گئے ہوئے تھے' کتنی دیر سے انتظار کر رہا ہوں؟" خاور نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"بازار تک گیا تھا' کچھ چیزیں لینی تھیں۔"

"گوری کے لیے؟" خاور نے بے ساختہ پوچھا' داور جھینپ گیا تھا' خفت سے چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔

"ارے اچھی بات ہے یار! ایسا کرو اس کے لیے' وہ اتنی محبت کرتی ہے تم سے' تم اس کی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کا خیال نہیں رکھو گے تو اور کون رکھے گا؟" خاور اسے سمجھا رہا تھا۔

"آپ زبیدہ پھوپھو کے گھر گئے تھے؟"

"ہاں گیا تھا۔" خاور نے سنجیدگی سے جواب دیتے ہوئے لب بھینچ لیے تھے۔

"نورین بھابھی سے ملاقات ہوئی؟"

"ملاقات؟" خاور تمسخرانہ قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔

"کیوں کیا ہوا؟" داور کو اس کا ہنسنا عجیب لگا تھا۔

"پہلے کیا ہوتا تھا؟" الٹا وہ داور سے سوال کر رہا تھا۔

"انہوں نے پھر کچھ کہا ہے؟"

"چھوڑو اس بات کو' کوئی اور بات کرو۔" خاور نے سر جھٹک کر کہا۔

"کیوں' کیا مسئلہ ہے؟" داور کو پریشانی ہوئی تھی۔

"کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"کچھ بتائیں تو؟" وہ اس کو اکسا رہا تھا اور اس کے اصرار سے مجبور ہو کے خاور نے ساری بات بتا دی اور داور کچھ دیر کے لیے چپ ہو گیا تھا۔

"وہ ایسا کیوں کرتی ہیں؟ کیا پرابلم ہے انہیں؟" داور کو بھی نورین کے مزاج کا تھوڑا بہت اندازہ تھا' لیکن زیادہ واقف خاور ہی تھا' جس کو ابا جی کی وجہ سے ان کے گھر زیادہ آنا جانا پڑتا تھا' ورنہ اس کے بس میں ہوتا تو وہ سالوں ان کے گھر کا رخ نہ کرتا۔

"یہ تو وہ ہی بتا سکتی ہے۔" خاور نے کندھے اچکائے۔

"منگنی کے وقت تو وہ ایسی نہیں تھیں؟"

"وہ کیسی تھی اور کیسی ہے' یہ میں نہیں جانتا' میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ اپنے حق میں برا اور میرے حق میں اچھا کر رہی ہے' میرے راستے کی رکاوٹیں وہ اپنے ہاتھوں سے دور کر رہی ہے' جس بات کو میں نے پس پشت ڈال دیا تھا وہی بات اس نے اپنے رویے سے میرے سر پہ سوار کر دی ہے' میں پھر پرانے راستوں کی طرف لوٹ رہا ہوں۔" خاور ہلکے پھلکے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟ کن راستوں پہ لوٹ رہے ہیں آپ؟" داور ٹھٹک گیا۔

"جو راستے ماموں کے گھر کی طرف جاتے ہیں۔" خاور مسکرایا۔

"ماموں کے گھر کی طرف؟" داور دہرا کے بولا اور آنکھوں کے سامنے زونیرا کی شبیہہ لہرائی تھی۔ زونیرا ان کے ماموں وحید صادق کی بڑی بیٹی تھی' خاور سے دو سال چھوٹی تھی' دونوں میں بہت زیادہ ذہنی ہم آہنگی تھی' لیکن خاور کے ابا جی کی خواہش تھی کہ وہ اپنے بڑے بیٹے کی شادی اپنی بہن کی بیٹی سے کریں۔ سو انہوں نے خاور کی مخالفت کے باوجود رشتہ طے کر دیا تھا۔ پہلے پہل خاور بدگمان اور خفا خفا سا رہا' پھر اس نے اپنے آپ کو نورین کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی' لیکن نورین کے مزاج تو آسمان پہ پہنچے ہوئے تھے' وہ خاور کو پینڈو کہہ کے عزت و احترام کے دائرے سے ہی نکال دیتی تھی' وہ اپنے رشتے سے خوش نہیں تھی' وہ شہر میں کسی امیر کبیر فیملی میں شادی کرنا چاہتی تھی' لیکن بدقسمتی سے اب تک کوئی امیر اسے نہیں ملا تھا' البتہ ایک پینڈو' ایک دیہاتی گلے پڑ گیا تھا۔ اور زیادہ کوفت کی بات یہ تھی کہ وہ خاور سے ایک سال بڑی تھی' اور یہ ہی ساری باتیں مل کر اس کی بے زاری اور اکتاہٹ کا باعث بن چکی تھیں' اور خاور جو بڑوں کی خاطر اپنے دل کو مارنے کی کوششیں کر رہا تھا' نورین کے رویے سے دل برداشتہ ہو کر واپسی کی راہ پہ چل نکلا تھا۔ داور کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" اس کی حیرت اس کی آواز سے نمایاں تھی۔

"تم سمجھ چکے ہو یار! میں کیا کہہ رہا ہوں۔" وہ اسپیڈ سلو کرتے ہوئے موڑ کاٹتے ہوئے بولا۔

"ابا جی کا پتا ہے نا آپ کو؟" اس نے اسے باور

کروایا۔

"مجھے اباجی کا پتا ہے' لیکن اباجی کو اپنی بھانجی کا نہیں پتا کہ وہ کیسی ہے؟ لیکن ان شاء اللہ ایک روز انہیں بھی پتا چل ہی جائے گا۔" خاور کو نورین پہ یقین تھا کہ وہ ایک نہ ایک دن اپنا اصل روپ ضرور دکھائے گی۔

"اباجی گھر میں ہنگامہ کھڑا کردیں گے۔"

"تم دیکھو تو سہی کہ ہنگامہ کون کھڑا کرتا ہے؟" خاور نے اسے تسلی دی اور گاڑی کو گاؤں کی سڑک پہ ڈال دیا۔ داور پریشان ہوچکا تھا کہ کیا ہوگا؟

☼ ☼ ☼

داور کے آتے ہی گوری تیار ہوکر باہر نکلی تھی۔

"کہاں جارہی ہو؟" اماں نے آواز دی۔

"خالہ زہرا کی طرف۔" وہ اپنی چوٹی پیچھے اچھالتے ہوئے بولی اور دوپٹہ اوڑھ کر باہر نکل آئی۔ ساتھ والا گھر خالہ زہرا کا تھا۔ اسے کون سا اور جانا پڑتا تھا۔

"السلام علیکم۔" وہ گھر میں داخل ہوئی تو وہ سب ہی صحن میں بیٹھے نظر آئے تھے۔

"کیسی ہو گوری؟" خاور نے اسے مخاطب کیا تھا۔

"ٹھیک ہوں لالہ۔ آپ کیسے ہیں؟" اس نے کن انکھیوں سے داور کو دیکھتے ہوئے خاور سے پوچھا تھا۔

"اللہ کا شکر ہے' بیٹھو نا' کھڑی کیوں ہو؟" خاور نے بے تکلفی سے کہا اور وہ خالہ زہرا کے پاس چارپائی کے کنارے پہ ٹک گئی۔

"کب آئے ہیں آپ؟" اس کا ہمیشہ سے ایک ہی سوال ہوتا تھا۔

"دو' تین گھنٹے تو ہو ہی گئے ہیں۔" خاور نے بے نیازی سے کہا اور گوری نے چونک کر داور کی طرف دیکھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھا تھا' لیکن دو' تین گھنٹے کی مبالغہ آرائی پہ اس نے بھی چونک کر سر اٹھایا تھا' جس پہ خاور دلچسپی اور شرارت سے یک دم قہقہہ لگا کے ہنسا اور وہ دونوں اس کی شرارت سمجھ گئے تھے۔

"پگلی ایک منٹ بھی صبر نہیں کرتی۔" اس نے گوری کے سر پہ چپت لگائی' وہ بھی مسکرا رہی تھی۔

"کیوں ستاتے ہو میری بیٹی کو؟ ہمارے دونوں گھروں کی یہ ہی تو ایک رونق ہے۔" خالہ زہرا نے محبت سے کہتے ہوئے بازو پھیلا کر گوری کو اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

"حالانکہ آپ کی اس رونق نے پورے محلے کو ستا رکھا ہے' بچہ بچہ ڈرتا ہے۔" داور نے مداخلت کی اور گوری نے تیوری پہ بل ڈال کے اسے دیکھا' لیکن سب کے سامنے اپنی زبان بند رکھی تھی۔

"اچھی بات ہے نا' آس پاس کے علاقے میں بندے کا اپنا کوئی "ٹھکا" بھی تو ہونا چاہیے؟" خاور نے اسے سراہا۔

"بڑا "ٹھکا" ہے۔" داور نے چھیڑتے ہوئے مذاق اڑایا۔

"ہاں تو ہے نا' کیا تم پہ نہیں ہے؟" خاور نے اچانک توپ کا رخ اس کی طرف موڑ دیا اور گوری اپنی ہنسی چھپا گئی۔

"آپ پہ بھی تو نورین بھابھی کا بڑا ٹھکا ہے؟" داور نے چھیڑا۔

"اب تم نورین صاحبہ پہ میرا ٹھکا دیکھنا۔" خاور چیلنج کرنے والے انداز میں کہتا اٹھ کر اندر چلا گیا تھا۔

"اسے کیا ہوا ہے؟" خالہ زہرا نے خاور کو جاتے ہوئے دیکھا۔

"ہوا نہیں ہے اماں' ہونے والا ہے۔" داور نے باخبر کیا۔

"کیا ہونے والا ہے؟"

"یہ آپ کو بھائی اور اباجی بتادیں گے فی الحال آپ ٹھنڈا شربت پلوادیں' بہت پیاس لگی ہے۔" وہ گوری کو دیکھ کے بولا۔

"تجھے پہلے ہی کہا تھا کہ پانی پینا ہے تو بتا۔" اماں نے بیٹے کو خفگی سے دیکھا۔

"پہلے طلب نہیں تھی' اب ہے۔" اس نے توجہ جتائی۔

"اچھا ابھی بنا کے لاتی ہوں۔" اماں اٹھنے لگیں۔

"نہیں خالہ! آپ رہنے دیں میں بنا کے لاتی ہوں۔" گوری انہیں منع کرکے خود اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے پتا تھا کہ وہ اسے دیکھ کر ہی شربت کی فرمائش کررہا تھا۔

"میٹھا کم اور برف زیادہ ڈالنا۔" داور نے باورچی خانے کے دروازے میں آکر تاکید کی۔

"اور کچھ؟" گوری نے پلٹ کر گھورتے ہوئے کہا۔

"بہت کچھ ہے یار' مگر بیان نہیں کرسکتا۔"

"ایسا کیا ہے' جو تم بیان نہیں کرسکتے؟" وہ شربت بنانے کے لیے پیڑھی پہ بیٹھ گئی۔

"بے قراری' بے تابی' بے چینی اور شدتیں' یہ سب کیسے بیان کروں یار؟" وہ دروازے کی چوکھٹ پہ بازو ٹکا کے کھڑا ہوگیا۔

"تو مشکل کیا ہے؟" وہ چینی مکس کرتے ہوئے بولی۔

"تمہارے اور اپنے درمیان کی دوری۔"

"تو یہ دوری کب ختم ہوگی؟"

"جب میں اپنے پیروں پہ کھڑا ہوجاؤں گا' جب مجھے اچھی سی نوکری مل جائے گی۔"

"مطلب یہ ہوا کہ دوری ابھی بڑی لمبی ہے۔" وہ اسے چھیڑنے والے انداز میں ہنسی۔

"بس یار! چند مہینے اور....."

"پھر کیا کروگے؟"

"پھر جو کروں گا تمہیں بھی پتا چل جائے گا۔" معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا وہ آج بہت پیاری لگ رہی تھی اور ہمیشہ نظر کے معاملے میں پرہیز کرنے والا داور بھی اسے نگاہ بھر کے دیکھنے پہ مجبور ہورہا تھا' کالے رنگ کے پھول دار سوٹ میں نکھری ستھری بجی سنوری الھڑ مٹیار سی سیدھی دل پہ وار کررہی تھی' وہ نظر بچا نہیں پارہا تھا۔

"داور صاحب! شربت تیار ہے۔" وہ شربت کا گلاس سامنے کرتے ہوئے اس کی نظروں کی محویت توڑ چکی تھی۔

وہ شربت کا گلاس پی کر باقی کا جگ خاور کو دے آیا تھا اور خود نہانے چلا گیا۔ آج گوری کا رنگ و روپ اسے حقیقتاً" بے تاب کرگیا تھا' بڑی مشکل سے دل کو بہلا پھسلا کے ٹھنڈا کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

بلے بلے نی ٹور پنجابن دی
بلے بلے نے ٹور پنجابن دی

جوتی کھل دی موڑ نئی جھل دی
ٹور پنجابن دی

"سنو بالی۔" داور نے بالی کو آواز دے کر قریب بلایا۔

"جی داور لالہ؟"

"گوری کہاں ہے؟" اس نے اپنی چھت پہ کھڑے کھڑے پورا صحن دیکھ ڈالا تھا' لیکن گوری کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔

"چھنو کے گھر' آج شمو کے بیاہ کے لیے ڈھولکی رکھی ہے نا' انہوں نے' ساری وہیں ہیں۔" بالی نے سارے محلے کا اشارہ دیا۔

"جاؤ اسے بلا کر لاؤ۔"

"وہ نہیں آئے گی۔" بالی نے نفی میں سر ہلایا۔

"کیوں؟" داور کو اچنبھا ہوا۔

"یہ دن تو اسے منتوں' مرادوں سے ملا ہے' وہ کیسے چھوڑ کے آسکتی ہے؟" بالی بھی اسی کا بھائی تھا' داور کو اس کی بات پہ ہنسی آگئی تھی۔

"تو جاکر میرا پیغام تو دے۔"

"آج کوئی پیغام نہیں داور لالہ۔" بالی نے مایوسی سے سر ہلایا۔

"تم اسے جاکر کہو کہ داور لالہ شہر جارہا ہے' پھر دیکھنا وہ ضرور آئے گی۔" اس نے آئیڈیا دیا۔

"داور لالہ تو شہر تو کیا دوسری دنیا بھی چلا جائے تو وہ نہیں آنے والی' اگر یقین نہیں آتا تو خود چھنو کے گھر جھانک کے دیکھ لے۔"

"نہیں یار! مناسب نہیں لگتا تم جاؤ' وہ بعد میں آجائے گی۔" اس نے بالی کو بھیج دیا' اسے بھی گلی میں جاکر کھیلنے کی جلدی تھی' فوراً" اپنی چھت کی سیڑھیاں اتر کر چلا گیا تھا اور داور اپنے گھر کی چھت پہ ٹہلنے لگا' ڈھولک پہ پڑنے والی تھاپ کی آواز اور سب لڑکیوں کے مل کر گانے کی پرجوش اور شرارتی آوازیں یہاں تک باآسانی سنائی دے رہی تھیں۔ ان کی آواز میں بھی خاصا سر تھا۔

بلے بلے نی ماں دیے موم بتیے
بلے بلے نی ماں دیے موم بتیے

سارے پنڈ وچ چانن تیرا
ماں دیے موم بتیے

داور سے آخر رہا نہ گیا اور اپنی چھت سے گوری کی چھت پہ آگیا' گوری اور چھنو کے گھر آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ وہ گوری کے گھر کی چھت کے کونے پہ آ رکا اور چھنو کے صحن میں جھانک کر گوری کو دیکھنے کی کوشش کی جو بغیر کوشش کے ہی نظر آگئی تھی۔ ساری لڑکیاں اور عورتیں صحن میں بڑی سی دریاں بچھائے درمیان میں ڈھولک رکھے بیٹھی تھیں' چھنو اور تاجی وغیرہ گا رہی تھیں' جبکہ اپنی ماں کی "موم بتی" گوری صاحبہ ڈھولک کی تھاپ اور گانے کی آواز پہ بھنگڑا ڈال رہی تھیں' اس کے اس ڈانس سے تو یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے اچھی خاصی پریکٹس کی ہوئی تھی جھوم جھوم کے ناچ رہی تھی اور داور کے لبوں پہ بے ساختہ مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

بلے بلے نی کوٹھے تے لاوا لی چھتری
بلے بلے نی کوٹھے تے لاوا لی چھتری

منڈا ویکھ کے کبوتر ورگا
کوٹھے تے لاوالی چھتری

اس بول پہ مسکراتے ہوئے بھنگڑا ڈالتے ہوئے گوری کی نظر چھت کی سمت اٹھی اور داور کو دیکھ پاکر ایک دم سے شرم سے لال ہوگئی وہ بغیر دوپٹے کے ناچ رہی تھی اور وہ نہ جانے کب سے اسے دیکھ رہا تھا' گوری پلک جھپکتے ہی چھنو کے برآمدے میں کھسک گئی اور داور مسکراتا ہوا وہاں سے ہٹ گیا تھا۔ اسے پتا تھا اب تو گوری ہرگز بھی نہیں آئے گی' بلکہ اپنی خفت مٹا رہی ہوگی' بلکہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ الٹا داور پہ ہی غصہ کرنا شروع کردے اور اگلی صبح ایسا ہی ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ نماز اور قرآن پاک پڑھنے کے بعد صحن میں جھاڑو لگانے لگی' بالی اور کامی کو ابھی ابھی مسجد بھیجا تھا' اتنے میں پچھواڑے سے ابا دودھ کی بالٹی لے آیا۔ جھاڑو لگا کر وہ دودھ بلونے کے لیے بیٹھ گئی جو اس کی ڈیوٹی تھی۔

"السلام علیکم چاچا۔" وہ دودھ بلونے میں اتنی مگن تھی کہ داور کی آمد کا پتا ہی نہ چلا' جب اس نے ابا کو سلام کیا تب وہ چونکی تھی۔

"وعلیکم السلام پتر' آبیٹھ۔" ابا اسے دیکھ کر اٹھ کے بیٹھ گیا تھا۔ وہ اور ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

"گوری کے ابا! روٹی بن گئی ہے تیری' رسوئی میں ہی آجا۔" اماں نے باورچی خانے سے آواز دی۔

"پتر تو بھی ناشتا ادھر ہی کرلے۔" انہوں نے داور سے کہا۔

"مہربانی چاچا! مجھے اماں نے بھیجا ہے لسی اور مکھن کے لیے۔"

"اچھا! چل گوری جلدی کر مکھن اور لسی ڈال دے۔" ابا چارپائی سے اٹھتے ہوئے بولے اور باورچی خانے میں چلے گئے' اب داور کی نظروں کا مرکز وہ ہی تھی' وہ مدھانی سے مکھن نکال نکال کر ایک پیالے میں رکھتی جارہی تھی اور داور مکھن میں لتھڑی اس کی مخروطی انگلیاں دیکھتا رہ گیا' اس کی انگلیوں کا ذائقہ تو مکھن میں رچا ہوا تھا' اس نے پیالہ مکھن سے بھر کے اور جگ میں لسی ڈال کر اس کے سامنے رکھ دیا' وہ ہر بار ہر روپ میں انوکھی اور دلکش نظر آتی تھی' داور اسے فرصت سے اور گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"رات کو کافی اچھی لگ رہی تھیں تم۔" اس نے اس کے ہاتھوں سے جگ تھامتے ہوئے کہا۔

"جانتی ہوں۔" وہ چڑ کر کہتے ہوئے پلٹ گئی۔

"کیا آج پھر ڈھولک رکھنی ہے تم لوگوں نے؟" داور کے لہجے میں شرارت تھی۔

"تمہارا سر پھاڑ دوں گی آج۔" وہ کاٹ کھانے کو دوڑی تھی۔

"اس میں اتنا غصہ کرنے والی کیا بات ہے؟ جہاں اتنی زیادہ عورتیں تمہیں دیکھ رہی تھیں' ایک لڑکے نے دیکھ لیا تو کون سی قیامت آگئی؟"

"تم آج دیکھنا پھر میں تمہیں بتاؤں گی کہ کیا قیامت آتی ہے؟" گوری نے دھمکی دی۔

"ٹھیک ہے ضرور دیکھوں گا۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

☼ ☼ ☼

خاور کو پچھلے دو روز سے بخار تھا اور جس فلیٹ میں وہ رہتا تھا وہ خاصا الگ تھلگ سا فلیٹ تھا' اس کے ساتھ دو اور لڑکے بھی رہتے تھے' لیکن وہ دونوں لڑکے بھی کسی گاؤں کے رہنے والے تھے' تین چار روز سے اپنے اپنے گاؤں گئے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ دو دن سے اکیلا ہی بخار سے نبرد آزما تھا' آج بڑی ہمت کرکے فلیٹ سے نکل آیا' اس کا ارادہ ڈاکٹر سے چیک اپ کروانے کا تھا' اس نے پچھلے دو دن سے کوئی دوائی بھی تو نہیں لی تھی اور یہ بخار میڈیسن اور انجکشن وغیرہ کے بغیر جانے والا بھی نہیں تھا۔ لہٰذا ڈاکٹر کے کلینک چلا گیا۔ لیکن اس کی حالت اتنی خراب تھی کہ ڈاکٹر نے اس کی توانائی کے لیے اسے ڈرپ لگادی' بخار کچھ کم تھا' لیکن نقاہت زیادہ ہورہی تھی' ڈرپ اور انجکشن لگنے کے تین گھنٹے کے بعد ڈاکٹر نے اسے جانے کی اجازت دی' لیکن اسے ڈرائیونگ سے سخت منع کیا تھا' کیونکہ جو انجکشن اسے لگے تھے' ان کے بعد غنودگی طاری ہونے کا امکان تھا' سو جب وہ کلینک سے باہر نکلا تو دائیں بائیں دیکھنے لگا کہ کیا کرے اور ساتھ ہی ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ زبیدہ پھوپھو کا گھر قریب ہی ہے' کچھ دیر کے لیے ان کے گھر چلا جاتا ہوں' لیکن پھر خود ہی اپنے خیال کو رد کردیا' مگر جب وہ چلتے ہوئے گاڑی کی طرف آیا تو دماغ چکرا گیا تھا' ذہن بوجھل اور سویا سویا سا لگنے لگا' وہ واقعی ڈرائیونگ کے قابل نہیں تھا۔ لہٰذا ہر بات کو ذہن سے جھٹک کر وہ زبیدہ پھوپھو کے گھر کی طرف چل دیا۔

اسے اس وقت بھوک کے ساتھ ساتھ چائے کی طلب بھی ہورہی تھی' کل سے کچھ بھی نہیں کھایا تھا' اسی طرح منہ سر لپیٹے پڑا رہا' لیکن آج معدے کو خالی پن ستا رہا تھا اور یقیناً" فلیٹ میں ایسا کچھ نہیں تھا جس سے وہ پیٹ پوجا کرتا اور نہ ہی وہ خود کچھ پکانے کے قابل تھا۔ اس لیے برے وقت میں گزشتہ باتیں ذہن سے بھلانی پڑیں۔ ان کے گھر پہنچا تو پہلا ٹکراؤ نورین سے ہی ہوا تھا۔

"السلام علیکم۔" خاور کی آواز خاصی بھاری اور بوجھل ہورہی تھی' مگر وہ غور کرتی تب نا۔

"وعلیکم السلام۔" اس نے اپنے ازلی لب و لہجے میں جواب دیا تھا۔

"کیسی ہیں آپ؟" وہ صوفے پہ بیٹھ گیا' اس میں کھڑا ہونے کی سکت نہیں تھی۔

"ٹھیک ہوں۔" اس نے اتنی زحمت بھی نہ کی کہ جواباً" یہ ہی پوچھ لے کہ آپ کیسے ہیں؟

"پھوپھو کہاں ہیں؟" اس نے آگے پیچھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اباجی کی پنشن لینے گئی ہیں۔" نپے تلے سے جواب تھے۔

"اور باقی سب؟" خاور اپنی پیشانی مسلتے ہوئے بولا۔

"اقرا اور ثمرہ کالج گئی ہیں' رامین اندر سو رہی ہے' رہی میں تو میں آپ کے سامنے ہوں۔" اس نے باری باری سب کا بتایا اور آخر میں شانے اچکائے۔ وہ کافی نک سک سے تیار شاید کہیں جانے کے لیے کھڑی تھی۔

"ایک کپ چائے مل سکتی ہے؟" وہ آخر کہہ ہی بیٹھا' البتہ کھانے کی طلب کو دبا گیا تھا۔
"آئی ایم سوری خاور صاحب! میں ابھی ابھی اتنی محنت سے تیار ہو کر آئی ہوں' میری دوست مجھے پک کرنے کے لیے آرہی ہے' اور اتنی گرمی میں کچن میں جاکر میں اپنا حلیہ خراب نہیں کر سکتی' آپ کو اگر اتنی طلب ہو رہی ہے تو خود جاکر بنالیں' آپ کون سا پہلی بار یہاں آئے ہیں؟" نورین نے صاف ہری جھنڈی دکھادی تھی۔ خاور نے چونک کر دیکھا۔
"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے' اس لیے چائے کی طلب ہو رہی ہے' ورنہ مجھے آپ کے ہاتھ کی چائے پینے کا کوئی شوق نہیں ہے۔" وہ اپنا غصہ دبا نہیں سکا تھا۔
"طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو ڈاکٹر کے پاس جائیں' یہاں کیا کررہے ہیں؟ اور رہی بات شوق کی تو مجھ سے یہ امید نہ رکھیں کہ میں آپ کی فرمائش پوری کروں گی' یہ فرمائش آپ اپنے گاؤں کی کسی مٹیار سے کیجیے' جو گوبر بھی اٹھائے اور آپ کے یہ ناز نخرے بھی۔" اس نے پل میں خاور کو آگ لگاکے رکھ دی تھی۔ وہ جھٹکے سے صوفے سے کھڑا ہو گیا۔
"آپ جانتی ہیں آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" وہ اس کے مقابل آکھڑا ہوا۔
"ہاں۔ اچھی طرح جانتی ہوں کہ میں کیا کہہ رہی ہوں' آپ یہ خیال دل سے نکال دیں کہ میں آپ کی دیہاتی عورتوں کی طرح شوہر کے پاؤں دھو' دھو کر پیوں گی' دن رات خدمت میں جتی رہوں گی' آپ گرمی میں دن کے بارہ بجے بھی چائے مانگیں گے تو کچن میں گھس جاؤں گی' مجھ سے ایسی کوئی توقع مت رکھیے گا' مجھ سے شادی کرنی ہے تو صرف شوہر بن کے رہنا ہے' حکمران نہیں۔" اس نے آج اگلی پچھلی کسر پوری کر ڈالی تھی اور خاور لب بھینچ گیا۔
"محترمہ نورین نازلی صاحبہ! بہت جلد آپ کو بتاؤں گا کہ میرے ناز نخرے کون اٹھاتی ہے؟ اور کس کے ہاتھ میرے لیے چائے بنانے کے لیے ... ہیں' انتظار کیجیے گا۔" وہ سرد لہجے میں کہتا وہاں سے نکل گیا تھا اور نورین اونہہ کرکے رخ موڑ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

داور کو اس کی طبیعت خرابی کا پتا چلا تو فوراً" شہر آیا اور اسے اسی وقت اپنے ساتھ گاؤں لے گیا' جانے سے پہلے ڈاکٹر سے اچھی طرح چیک اپ بھی کروایا تھا' ڈاکٹر نے کافی تسلی دی تھی' اسی لیے وہ دونوں اطمینان سے گاؤں آگئے' لیکن اماں تو خاور کی حالت دیکھ کر تڑپ اٹھی تھیں۔
"ہائے میرا بچہ اتنے دن بیمار رہا اور ہمیں بتایا ہی نہیں۔" اماں نے اس کا ماتھا چومتے ہوئے سینے سے لگالیا تھا۔
"آپ کو خوامخواہ پریشان کرتا۔ معمولی سا بخار ہے' اتر جائے گا۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔
"ارے پتر' یہ بخار ہی تو سو بیماریوں کی جڑ ہے' یہیں سے تو بندے کی طبیعت بگڑتی ہے۔" اماں توبہ توبہ کررہی تھیں۔
"ارے خاور آگیا پتر؟ کیا حال ہے اب؟" ابا جی ڈیوڑھی سے اندر داخل ہوتے ہوئے بولے۔
"بہتر ہوں جی!"
"بخار کب سے ہو رہا ہے؟"
"چھ دن ہوگئے ہیں۔"
"تو زبیدہ کے گھر چلے جاتے' وہ تیرا خیال رکھتی۔"
"گیا تھا ان کے گھر۔" خاور نے آہستگی سے مگر سخت انداز میں کہا۔
"اچھا کیا کہتی ہے وہ؟" خاور کا زبیدہ کے گھر جانے کا سن کر وہ بہت خوش ہوئے تھے۔
"وہ تو کچھ نہیں کہتیں' البتہ ان کی چہیتی بیٹی اور آپ کی چہیتی بھانجی بہت کچھ کہتی ہے۔" اس کا لہجہ سخت اور دوٹوک ہو رہا تھا' ابا جی کے ساتھ ساتھ اماں اور داور بھی ٹھٹک گئے۔
"کیا بات ہے' کیا ہوا ہے؟"
"جو بھی ہوا ہے اچھا نہیں ہوا ابا جی۔" خاور کا

انداز بہت کچھ کہہ رہا تھا۔
"آخر بات کیا ہے؟"
"بات یہ ہے کہ میں نورین سے شادی نہیں کروں گا۔" اس نے دھماکہ ہی ڈالا تھا اور ابا جی تڑپ کے چارپائی سے کھڑے ہوگئے۔
"یہ کیا بکواس کررہے ہو؟" ان کا دماغ گھوم گیا تھا۔
"یہ بکواس نہیں' یہ میرا فیصلہ ہے اور اب دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے مجھے اپنے فیصلے سے کوئی نہیں ہٹا سکتا۔ نورین جہاں ہے وہیں اچھی لگے گی۔" خاور بھی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔
"میں تجھے عاق کردوں گا۔" ابا جی دھاڑ اٹھے۔
"شوق سے کیجیے ابا جی! ایسی بیوی کے ساتھ رہنے سے بہتر ہے کہ آپ مجھے عاق کردیں۔" اس نے کوئی بھی اثر لیے بغیر بے نیازی سے انہیں اجازت دی۔
"دیکھا' دیکھا تم نے' یہ کتنا بے دید ہو گیا ہے؟ اس نے اب آگے سے آنکھیں دکھانا شروع کردیا ہے' میں دیکھتا ہوں یہ نورین سے کیسے شادی نہیں کرتا؟ ایسی کی تیسی انکار کرنے والے کی۔" ابا جی بری طرح بھڑک رہے تھے اور خاور اطمینان سے سن رہا تھا۔
"میں نورین سے نہیں ماموں وحید کی بیٹی زونیرا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" خاور کا دوسرا دھماکہ بھی کچھ کم نہیں تھا' گھر میں وہ فساد برپا ہوا کہ کھانا پینا حرام ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

شمو کی شادی کا ہنگامہ سرد ہوا تو گوری کو کسی اور طرف دھیان دینے کا خیال آیا اور تب اسے پتا چلا کہ داور کچھ پریشان سا ہے' وہ پہلی فرصت میں اس کے پاس چلی آئی' وہ اپنے چھت پہ چارپائی ڈالے لیٹا تھا' شام کے سائے ڈھل چکے تھے۔
"خیر تو ہے منجھی پہ کیوں لیٹے ہو؟" وہ اپنی چھت سے اس کی چھت پہ آگئی۔ داور نے جواب نہیں دیا' گوری نے اس کے چہرے کے سامنے اپنی کلائی میں پہنی چوڑیاں کھنکائی تھیں' اسے متوجہ کرنے کے لیے۔
"ہو گئیں فارغ؟ آگیا خیال کہ اس محلے میں چھنو اور شمو کے علاوہ بھی کوئی رہتا ہے۔" داور نے آسمان سے نظریں ہٹا کر گوری کو دیکھا۔
"اتنے مجنوں کیوں لگ رہے ہو؟"
"لیلیٰ جو بے خبر پھر رہی ہے؟"
"صاف صاف بتاؤ نا۔ کیا بات ہے؟" گوری نے سنجیدگی سے پوچھا۔
"خاور بھائی نے نورین بھابھی سے شادی سے انکار کردیا ہے۔"
"خاور لالہ زندہ باد۔" گوری نے خوشی سے نعرہ لگایا۔
"یہ کیا کہہ رہی ہو؟" داور نے گھورا۔
"تو اور کیا کہوں؟ خاور لالہ نے اپنی زندگی کا سب سے اچھا کام کیا ہے۔" اس نے خاور کو سراہا۔
"یہ اچھا کام ہے؟"
"ہاں اچھا ہی تو ہے' اس نک چڑھی چڑیل سے تو بہتر ہے بندہ ویاہ ہی نہ کرے۔" نورین ایک' دو بار یہاں آئی تھی تو گوری نے بھی دیدار کیا تھا اور اس سے مل کر جو اندازہ گوری نے لگایا تھا' وہ یہی تھا کہ وہ خاور کے ساتھ نہیں چل سکتی۔ وہ گاؤں کی ایک ایک چیز پہ ناک بھوں چڑھاتی تھی۔
"یار! ابا جی ناراض ہیں' اتنا غصہ کررہے ہیں' کیا کیا جائے؟" داور کو خاور سے بھی زیادہ پریشانی ہو رہی تھی' وہ گھر میں بدمزگی نہیں دیکھ سکتا تھا۔
"چاچا جی کو کیا تکلیف ہے؟" گوری غصے سے بولی اور داور نے جن نظروں سے اسے دیکھا وہ دھیمی پڑ گئی۔
"کتنی بار کہا ہے کہ تمیز سے بات کیا کرو' بولنے سے پہلے سوچتی ہی نہیں ہو۔" داور نے اسے سرزنش کی۔
"میں کہہ رہی ہوں کہ اس میں چاچا جی کو کیا مسئلہ ہے؟" اس نے اپنی غلطی درست کی۔
"مسئلہ ہے نا یار' زبیدہ پھوپھو' ابا جی کی ایک ہی بہن ہیں اور وہ بھی بیوہ' چار جوان بیٹیاں ہیں ان کی' ایسے حالات میں ہم بھی انہیں چھوڑ دیں تو ان کا کیا

بنے گا؟" داور اباجی کے نظریہ سے سوچ رہا تھا۔

"تو زبیدہ پھوپھو کو بھی اپنی بیٹیوں کو سمجھانا چاہیے نا۔ وہ کیوں بار بار خاور بھائی سے پنگا لیتی تھی؟" گوری نے لاپروائی سے کہا۔

"تم نہیں جانتیں' یہ مذاق نہیں ہے۔ بہت بڑا مسئلہ ہے' زبیدہ پھوپھو اور اباجی ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے دور ہو جائیں گے۔" داور بڑی گہرائی سے سوچ رہا تھا۔

"اگر خاور بھائی اور نورین کی شادی ہو بھی جائے تو بھی زبیدہ پھوپھو اور اباجی دور ہو ہی جائیں گے۔" گوری نے نہ جانے کیا سوچ کر کہا تھا لیکن داور بری طرح چونک گیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"میرا مطلب ہے کہ شادی کے بعد ان دونوں کے آپس میں خوش رہنے کا کوئی امکان نہیں ہے' میاں بیوی آپس میں خوش نہیں ہوں گے تو ماں' باپ کیسے خوش رہ سکیں گے۔" گوری کی اتنی گہری بات پہ داور بھی سوچنے پہ مجبور ہو گیا تھا اور اسی سوچ میں ڈوب کر کافی دیر چپ رہا تھا۔

"یہ بات تو تم نے واقعی صحیح کہی ہے۔" اس نے پرسوچ انداز میں سر ہلایا۔

"میں ہمیشہ صحیح ہی کہتی ہوں' بس تمہیں ہی غلط لگتا ہے۔" وہ فخریہ بولی اور داور ہنس دیا۔

"بس تمہارے کہنے کا طریقہ غلط ہوتا ہے نا' اس لیے مجھے غلط لگتا ہے۔"

"تو صحیح طریقہ تم سکھا دو۔" وہ بڑی ادا سے بولی۔

"سکھا دوں گا' سب سکھا دوں گا' ایک بار سکھانے کا موقع تو ہاتھ آنے دو۔" اس نے جس لہجے میں کہا گوری خوب سمجھتی تھی۔

"گوری! اماں بلا رہی ہے۔" بالی سیڑھیوں سے پیغام دے کر چلا گیا تھا اور گوری اسے ہاتھ ہلا کر نیچے آ گئی۔

"جی اماں!" اس نے سعادت مندی سے پوچھا۔

"تندوری تپ گئی ہے' روٹیاں لگا لے' تیرا ابا آنے ہی والا ہو گا' اسے تو شام ہوتے ہی شام بھوک لگ جاتی ہے۔" اماں نے تندوری کی طرف اشارا کیا اور گوری اپنی دودھیا کلائیاں دیکھ کر رہ گئی۔

"کیا سوچ رہی ہے اب؟"

"اماں! کیا یہ کلائیاں تندوری میں جلانے کے لیے ہیں؟"

"ارے کم بخت جلانے کو کون کہہ رہا ہے' کام کرنے کو کہا ہے' ہماری عمر بھی تو اسی تندوری میں روٹیاں لگاتے ہوئے گزری ہے؟" اماں اسے لعن طعن کرنے لگی۔

"اماں تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔" وہ منہ بنا کے خفگی کا اظہار کرتی آٹے کی پرات اور چنگیر اٹھا کر تندوری کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"فضول ہی لگتی' کبھی کہتی ہے گوبر نہیں اٹھاؤں گی' ہاتھ اور ناخن خراب ہوتے ہیں' کبھی کہتی ہے کالے برتن نہیں مانجھنے' ہاتھوں کی لکیروں میں سیاہی بیٹھ جاتی ہے یہ بھی کوئی تک ہے بھلا؟ چھنو' تاجی' شمو سب ہی یہی کام تو کر رہی ہیں' اپنے اپنے گھروں میں' بس تیرے ہی نخرے ختم نہیں ہوتے۔" اماں اب اسے صلواتیں سنانا شروع ہو چکی تھیں۔

"کیا چھنو' تاجی اور شمو میرے جتنی سوہنی ہیں؟" اس نے بڑے فخر سے ادا سے پوچھا تھا اور پانی کے بھرے ڈونگے سے مٹھی میں پانی لے کر تندوری میں چھڑکاؤ کیا' تاکہ آگ تھوڑی دھیمی پڑ جائے۔

"جھلیے تو جتنی بھی سوہنی ہو جا' شادی تو اپنے جیسوں کے گھر ہی ہو گی نا؟ وہاں تو تجھے سارے ہی کام کرنے پڑیں گے۔" اماں نے اسے حقیقت سے آگاہ کیا۔

"ہو سکتا ہے اماں اپنے جیسا مجھے ایک کام والی رکھ دے۔" اس نے خواب آلود لہجے میں سرشاری سے کہا اور نظر داور کی سمت اٹھ گئی' وہ اپنے گھر کی سیڑھیاں اترتے ہوئے اسے ہی دیکھ رہا تھا اور ان دونوں ماں بیٹی کی باتوں پہ مسکرا رہا تھا۔

"اف اک تے اس نوں چپ چپیتے گلاں سنن دی

بڑی عادت اے۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے آٹے کا پیڑا بنا کر روٹی پکانے لگی' اتنے میں ابا بھی گھر میں داخل ہو چکے تھے۔

☼ ☼ ☼

"دیکھ پتر غصہ تھوک دے' ضد نہ کر' تیرا ابا سنے گا تو مرنے مارنے پہ تل جائے گا' اس بات کو یہیں ختم کر دے۔" اماں نے خاور کو سمجھانے کی کوشش کی تھی' لیکن وہ بھی تو اسی باپ کا بیٹا تھا۔

"اماں آپ میرا ساتھ دیں گی یا نہیں؟" خاور نے فیصلہ کن انداز میں پوچھا۔

"لیکن میں یہ کیسے کر سکتی ہوں؟ تیرے ابا کی بھانجی کو چھوڑ کر اپنی بھتیجی کو کیسے لا سکتی ہوں؟ اندر کی بات تو ہمیں پتا ہے نا' لوگ سنیں گے تو سو سو باتیں بنائیں گے' مجھے الزام دیں گے۔" اماں کو پتا تھا کہ لوگ کس طرح قیافے لڑاتے ہیں۔

"آپ کو لوگوں کی پروا ہے یا بیٹے کی؟" خاور نے فیصلہ ماں پہ چھوڑ دیا' وہ جز بز سی ہو گئیں' اور پھر گھر میں دوبارہ سے جنگ چھڑ گئی' خاور انہیں زونیرا کا ہاتھ مانگنے بھیج رہا تھا' لیکن اباجی راضی نہیں تھے۔ خاور نے انہیں منانے کی ہر ممکن کوشش کی' مگر ناکام رہا۔

یہاں تک کہ خاور' زونیرا کو بیاہ کر گھر بھی لے آیا' لیکن ان کی خفگی اور ناراضی ختم نہیں ہوئی تھی' بلکہ وہ سنجیدہ اور چپ چپ سے رہنے لگے تھے۔ داور ان کے قریب رہنے کی کوشش کرتا تھا' وہ اس عمر میں انہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا تھا اور وہ بھی چھوٹے بیٹے سے بہت خوش تھے' اسے دعائیں دیتے نہیں تھکتے تھے اور وہ ساتھ ساتھ انہیں نرم کرنے کی اور سمجھانے کی کوشش بھی کرتا رہتا تھا' وہ خاور اور اباجی کو قریب لانا چاہتا تھا۔ جب سے خاور' زونیرا کو رخصت کروا کے گھر لایا تھا۔ انہوں نے ایک بار بھی زونیرا کے سر پہ ہاتھ نہیں پھیرا تھا۔ حالانکہ وہ ان کی خدمت ۔۔۔ کوئی کم نہیں کرتی تھی۔

زونیرا نے اس گھر میں آ کر بیٹیوں والی ساری کمی پوری کر دی تھی' اماں کو کاموں سے بالکل الگ کر دیا تھا۔ سارے گھر کی ذمہ داری خود اٹھا لی تھی اور اس چیز پہ خاور بھی خوش تھا اور داور بھی' کیونکہ پہلے اماں اکیلی ان کے کام کرتی رہتی تھیں اور تھک جاتی تھیں' بس ایک گوری تھی جو صبح و شام آ کر ان کا ہاتھ بٹا دیتی تھی' گھر کی صفائی ستھرائی' کپڑے استری اور ایسے ہی کئی اور کام وہ ہی کر کے جاتی تھی۔ لیکن اب اسے اطمینان ہو گیا تھا کہ ان کا گھر سنبھالنے والی بھی کوئی آ گئی ہے۔ زونیرا اتنی اچھی اور ہنس مکھ تھی کہ بہت جلد گوری اور اس کی دوستی ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"زونیرا باجی۔۔۔ زونیرا باجی۔" گوری نے ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہی آوازیں دینا شروع کر دیا تھا۔

"کیا بات ہے گوری' اتنی اتاولی کیوں ہو رہی ہو؟" زونیرا باورچی خانے سے باہر نکل آئی۔

"کھیر لائی ہوں آپ کے لیے۔" اس نے کھیر کا ڈونگا سامنے کیا۔

"کھیر کس خوشی میں؟"

"بس دل چاہ رہا تھا اس لیے بنا لی' گھر کا خالص دودھ تھا' بڑی مزے دار ہے۔" اس نے چٹخارہ لیتے ہوئے کہا۔

"لیکن کھیر کھانے والا تو گھر پہ ہی نہیں ہے۔" زونیرا نے مسکراتے ہوئے گوری کو چھیڑا۔

"جانتی ہوں' میں یہ کھیر آپ کے لیے لائی ہوں۔"

"یہ اس کے لاسٹ سمسٹر کے ایگزامز ہیں' دعا کرو اللہ اسے کامیاب کرے' پھر لمبی چھٹیوں کے لیے گھر آئے گا۔" زونیرا نے اس کا دل بہلانے کے لیے اسے تسلی دی۔

"خاور بھائی کب آئیں گے؟"

"ہفتے کو آئیں گے۔"

"اوہ! آپ کی اداسی بھی پھر ہفتے کو ہی دور ہو گی؟" گوری نے زونیرا کو چھیڑا۔

"یار میری اداسی تو اس روز دور ہو گی جس روز اباجی

مجھے دل سے قبول کرلیں گے ورنہ اس گھر میں رہتے ہوئے بھی دل بجھا بجھا سا رہتا ہے۔" زونیرا اداس ہو گئی تھی۔

"ارے چھوڑیں زونیرا باجی' چاچا جی دل کے برے نہیں ہیں اور نہ ہی انہیں آپ سے کوئی دشمنی ہے' بس زبیدہ پھوپھو کی وجہ سے کچھ کھنچے کھنچے سے رہتے ہیں' آخر ایک ہی بہن ہے ان کی اور وہ بھی ان سے ناراض ہے۔" گوری نے زونیرا کو سمجھایا۔

"تو پھر زبیدہ پھوپھو کب ان سے راضی ہوں گی اور کب وہ مجھے قبول کریں گے؟" زونیرا کی شادی کو چار' پانچ مہینے ہو گئے تھے' لیکن ابا جی کی ناراضی اور بدگمانی ہنوز تھی' خاور کو گھر میں دیکھتے ہی گھر سے باہر نکل جاتے تھے' زونیرا کھانا بنا کے سامنے رکھتی تو منہ پھیر لیتے تھے۔ ان کا کوئی اور کام کرتی' تب بھی وہ ایسا ہی کرتے' البتہ داور اس کی بہت عزت کرتا تھا اور اماں جی بھی بہت خوش تھیں۔

"آپ کو خاور بھائی نے قبول کرلیا ہے' کیا یہ کافی نہیں ہے؟" گوری نے ہنس کر کہا۔

"نہیں۔ گوری بات تو تب بنتی ہے جب سارے گھر والے قبول کریں' اکیلی لڑکی کو تو کوئی بھی لڑکا قبول کرلیتا ہے' گھر والے شامل ہوں تو تب ہی عزت وقدر بڑھتی ہے۔ بیاہ صرف لڑکے لڑکی کا ہی نہیں ہوتا' سمجھو یہ رشتہ پورے خاندان سے جڑتا ہے۔" زونیرا سچ کہہ رہی تھی' گوری اس کی بات سن کر چپ ہو گئی' اب وہ بھلا زونیرا کو اور کتنی تسلیاں دیتی؟ تھوڑی دیر اس کے پاس بیٹھی رہی' پھر اٹھ کر گھر آ گئی' لیکن دھیان زونیرا کی باتوں کی طرف ہی تھا۔

☆ ☆ ☆

داور نے اپنا ایم بی اے کلیئر کیا ہی تھا کہ اسے ایک بینک کی طرف سے شاندار آفر بھی مل گئی اور اس آفر پہ وہ بے انتہا خوش تھا۔ ایم بی اے کی ڈگری اور اچھی جاب ہی اس کا خواب تھا جو اللہ نے پورا کر دیا تھا۔ اس بار وہ گاؤں آیا تو اس کی خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

"لگتا ہے اب منڈا بیاہ مانگتا ہے؟" زونیرا نے داور کی چوری پکڑ لی' وہ تھوڑی دیر پہلے ہی آیا تھا' لیکن دوبار سیڑھیاں چڑھ اور اتر چکا تھا اور نظر بچا کے ساتھ والے گھر میں دوبار جھانک بھی چکا تھا۔ مگر وہ کہیں بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

"نہیں ایسی بھی کوئی بات نہیں' بس وہ مجھے بالی سے کام تھا' اس لیے دیکھ رہا تھا۔"

"اب ہمیں کیا پتا کہ تمہیں بالی سے کام تھا یا پھر بالی کی بہن سے؟"

"بالی کی بہن سے مجھے کیا کام ہونے لگا بھلا؟" اس نے لاپروائی ظاہر کی۔

"لیکن بالی کی بہن کو تو تم سے بڑا کام ہے نا؟"

"تو پھر کہاں ہے وہ نظر تو نہیں آ رہی؟" داور کے منہ سے پھسل گیا اور جب احساس ہوا تب دیر ہو چکی تھی۔ زونیرا نے اسے مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھا وہ سر کھجا کے رہ گیا۔

"میں تو اسی لیے پوچھ رہا ہوں کہ اگر اسے کام تھا تو۔"

"اب اسے یہ تو نہیں پتا تھا کہ آج تم آ رہے ہو؟ آج وہ ذرا دیر سے ہی نظر آئے گی۔" زونیرا نے ہنڈیا اتار کے سائیڈ پہ رکھی اور چولہے میں جلتی لکڑیاں بجھانے لگی۔

"کہاں گئی ہے؟"

"تاجی کے گھر۔"

"داور۔" ڈیوڑھی سے اماں نے آواز دی۔

"جی اماں؟" وہ فوراً ان کی طرف لپکا۔

"یہ جلیبیاں اٹھا کے اندر رکھ' میں ذرا دم لے لوں' پھر سب کو تقسیم کرتی ہوں۔" اماں کو داور کی نوکری کی خوشی میں سارے محلے میں جلیبیاں بانٹنی تھیں اور داور کو پتا تھا اگر گوری کو اس بات کا دیر سے پتا چلا تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گی' جب ہی وہ اسے بتانے کی کوششوں میں تھا اور اپنی بے چینی میں گھر سے باہر نکل آیا تھا۔ گلی میں محلے کے بچے کھیل رہے تھے اور بالی کو دیکھ کر داور کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"دیکھ بالی! تجھے کتنی بار کہہ چکی ہوں' میں جب کسی کے گھر جاتی ہوں تو میرے پیچھے نہ آیا کر۔" گوری بالی کو تاجی کے گھر دیکھ کر غصے میں آ گئی۔

"مجھے کوئی شوق نہیں ہے تمہارے پیچھے آنے کا' جس دن گھر سے نکلتی ہو' پورے گھر میں سکون رہتا ہے' مجھے تو داور لالہ نے بھیجا ہے۔" اس نے بھی کوئی ادھار نہیں رکھا تھا۔ لیکن گوری کے کان کھڑے ہو گئے۔

"داور؟"

"ہاں انہوں نے بلانے بھیجا ہے۔"

"وہ اچانک کہاں سے آ گیا؟" اس نے بالی کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا اور اسے ڈانٹ کر واپس بھیج دیا۔

"کیا کہہ رہا تھا بالی؟" چھنو نے گوری سے پوچھا۔

"کہہ رہا تھا داور آیا ہے اور مجھے بلا رہا ہے۔" گوری سر جھٹک کر کہتی ہوئی ان سب کے درمیان آ کر بیٹھ گئی۔

"پھر تو نے کیا کہا؟"

"کہنا کیا ہے یار؟ بالی مذاق کر رہا تھا۔"

"ہو سکتا ہے وہ سچ مچ بلا رہا ہو؟"

"لیکن وہ تو شہر۔۔۔"

"شہر سے آ بھی تو سکتا ہے۔؟" چھنو کی دلیل پہ گوری ڈانوا ڈول سی ہو گئی تھی۔

"آج بھی تیری چیزیں آئی ہوں گی؟"

"چیزیں نہ بھی آئیں تو کیا ہے؟ وہ بھی تو آخر "میرا" ہی آیا ہے۔" اس نے فخر سے سر بلند کرتے ہوئے کہا تھا وہ دونوں اک دوسرے کو کتنا چاہتے تھے یہ تو ان کے آس پاس کے لوگ بھی جانتے تھے سب سہیلیوں کو پتا تھا' محلے کے بچوں کو پتا تھا' ماں باپ کو پتا تھا ان کے رب کو پتا تھا۔ گویا پورے جگ کو پتا تھا کہ گوری اور داور اک دوسرے سے کتنی محبت کرتے ہیں گوری ہنستے ہوئے اپنے گھر میں داخل ہوئی لیکن داور ان کے گھر سے باہر نکل رہا تھا دونوں کا تصادم بہت شدید ہوا تھا وہ دروازے کو نہ تھام لیتی تو یقیناً گر جاتی۔

"السلام علیکم۔" داور کا سلام لٹھ مار قسم کا تھا۔

"وعلیکم السلام۔" وہ اس کا سرد سا انداز دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"گھر کا خیال آ گیا؟"

"کیوں خیر تو ہے؟"

"جی میڈم گوہر آرا سب خیر ہے' اندر جلیبیاں رکھی ہیں وہ کھا لیجیے گا۔"

"جلیبیاں کس لیے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"اپنی اماں سے پوچھ لیجیے۔" وہ کہہ کے چلا گیا تھا اور گوری اماں کی طرف لپکی۔

"اماں! یہ جلیبیاں کس لیے آئی ہیں؟"

"داور کی شہر بینک میں نوکری لگ گئی ہے سب سے پہلے ہمارے گھر جلیبیاں دینے آیا ہے۔" انہوں نے خوشی خوشی بتایا۔

"نوکری؟" گوری خوشی سے چیخ اٹھی ان کی شادی میں تاخیر کی سب سے بڑی وجہ یہ نوکری ہی تو تھی اور آج۔ آج اللہ نے یہ خوشی بھی دے دی تھی گوری لپک کے چھنو کے گھر کی دیوار سے جا چپکی۔

"چھنو۔ چھنو اری چھنو بات سن۔" اس نے اسے جلدی جلدی آوازیں دیں۔

"کیا ہے؟" چھنو بھی دیوار سے نمودار ہوئی۔

"داور کی نوکری لگ گئی ہے' وہ بھی بینک میں۔" اس نے اپنی بے اختیاری پہ بمشکل قابو کر رکھا تھا ورنہ دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔

"اب تو تیری شادی بھی ہو جائے گی۔" چھنو کا خیال اس کی شادی کی طرف گیا تھا۔

"اتنا انتظار بھی تو کیا ہے ہم دونوں نے۔" وہ اپنا پراندہ جھلاتے ہوئے شوخی اور شرماہٹ سے بولی۔

"ہائے تو پھر اس گھر سے اس گھر چلی جائے گی۔"

"جانا تو ہے نا' اس کا گھر ہی تو میرا گھر ہے۔" گوری کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا وہ یہ بھی فراموش کر

گئی کہ داور خفا ہو کر گیا ہے۔
یا شاید اسے پتا تھا کہ وہ اس سے خفا نہیں ہو سکتا۔

☼ ☼ ☼

"داور کہاں ہے زونیرا باجی؟" گوری نے ان کے گھر میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔
"بیٹھک میں ہے۔" اس نے اشارہ کیا۔
"بیٹھک میں کیوں؟"
"اسی سے پوچھ لو۔" زونیرا اپنے کپڑے وغیرہ لے کر غسل خانے میں نہانے کے لیے گھس گئی اور گوری بیٹھک کی طرف آگئی بیٹھک کا دروازہ ادھ کھلا تھا وہ آہستگی سے دروازہ دھکیل کر اندر آگئی داور بیٹھک میں رکھے سنگل بیڈ پہ لیٹا میوزک سن رہا تھا اور بیٹھک کا گلی کی طرف کھلنے والا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا جس کی وجہ سے گلی کی ساری روشنی اندر آرہی تھی اور گلی میں کھیلتے بچے بار بار بیٹھک میں جھانک کر دیکھ رہے تھے گوری نے آگے بڑھ کے گلی والا دروازہ بند کر دیا اور پردہ برابر کر کے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔
"اتنے دکھی گانے کیوں سن رہے ہو کون بچھڑ گئی ہے؟" اس نے داور کا بازو اس کی آنکھوں سے ہٹاتے ہوئے پوچھا۔
"چھوڑو میرا بازو کیوں آئی ہو یہاں؟" وہ تو اب بھی ناراض تھا گوری خجل ہو گئی۔
"ناراض ہو؟" گوری نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
"تمہیں کیا ہے میری ناراضی سے؟ ناراضی کی فکر تو مجھے ہوتی ہے تم ناراض ہو جاؤ تو پورا دن منانے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا ہوں اور تمہیں۔ تمہیں تو کل سے پروا ہی نہیں ہے۔" وہ غصے اور ناراضی سے کہتا اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔
"معافی دے دو۔" گوری نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور داور اس کے دودھیا گداز ہاتھوں سے نظر چرا گیا تھا۔
"کل جب بلایا تھا تو آئی کیوں نہیں؟"
"میں سمجھی کہ یار مذاق کر رہا ہے۔"

"کل زونیرا بھابھی کہہ رہی تھیں کہ عاشق تو مذاق کو بھی سچ سمجھتے ہیں، تمہیں تو اس کے مذاق پہ بھی چلے آنا چاہیے تھا آخر اس نے میرا نام لیا تھا۔" داور نے زونیرا کی کل والی بات دہرائی۔
"دیکھو اب تم میری خوشی ختم کرنا چاہتے ہو؟" وہ خفگی سے گھورنے لگی اور اس کی اتنی بڑی بڑی آنکھوں کی گھوریوں پہ داور بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔
"جانتی ہو رات کو ہمارے گھر میں کیا باتیں ہو رہی تھیں؟" داور کا لب ولہجہ سرشار ہو رہا تھا۔
"ہاں جانتی ہوں۔" اس نے اپنی دھیمی مسکان چھپانے کے لیے رخ موڑ لیا۔
"کیا جانتی ہو؟ تمہیں کیسے پتا؟" وہ حیران ہوا۔
"کیونکہ رات کو میرے گھر میں بھی وہی باتیں ہو رہی تھیں جو تمہارے گھر میں ہو رہی تھیں۔" اس نے نظر جھکاتے ہوئے کہا۔
"شرماتی ہوئی کتنی اچھی لگتی ہو، آنکھیں سرور میں آجاتی ہیں۔"
"بس بس زیادہ پھیلو مت۔" گوری پیچھے ہٹ گئی۔
"پھر کب رکھیں شادی کی تاریخ؟" وہ شرارت سے کہتا اس کی سمت جھکا۔
"مجھ سے پوچھ کے رکھنی ہے؟"
"ہاں تم سے ہی تو پوچھ کے رکھنی ہے۔ آخر مہینہ پہلے تیاریاں بھی تو تم نے ہی کرنی ہیں؟ تم دوسروں کی شادیوں میں اتنے ٹشن کرتی ہو، یہ تو پھر تمہاری اپنی شادی ہے۔" وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔
"تمہیں کوئی تکلیف ہے؟" اس نے گھور کے دیکھا۔
"تکلیف تو ہے ناں، یہ چوڑیاں، یہ پراندے، یہ کاجل یہ سرخی پاؤڈر سب میں ہی تو خرید کے لاتا ہوں شادی کے لیے تم نے ابھی پتا نہیں کیا کیا چیزیں منگوانی ہیں؟ کیا کیا لسٹیں بنوانی ہیں۔" داور نے اپنی تکلیف کی وجہ بتائی لیکن گوری یکدم قہقہہ لگا کے دل کھول کے ہنسی تھی۔ اور وہ ہمیشہ کی طرح اس کی کھلکھلاہٹیں دیکھ کے رہ گیا۔

"یہ تو اب تمہیں عمر بھر کرنا ہے۔"
"ہاں مجبوری ہے یار۔" اس نے اداسی سے آہ بھری۔
"کیا کہا؟" گوری نے چیخ کے کہا اور داور دو قدم پیچھے ہٹ گیا کہ کہیں نوچ ہی نہ لے۔
"دعا کرو، اب ابا جی جلدی واپس آجائیں پھر تمہارے گھر بات طے کرنے کے لیے بھی جانا ہے انہوں نے۔" داور نے سنجیدگی سے کہا۔
"کیوں؟ کہاں گئے ہیں وہ؟"
"شہر گئے ہیں، زبیدہ پھوپھو کو میری نوکری کی خوش خبری سنانے کے لیے، وہ سوچ رہے تھے کہ شاید زبیدہ پھوپھو اس خوشی کے موقع پہ راضی ہو ہی جائیں اور پھر بعد میں میری شادی میں بھی شریک ہو جائیں گی۔"
وہ سنجیدگی سے بتا رہا تھا۔
"چلو اللہ ان کے دل میں رحم ڈالے۔" گوری دروازے کی سمت بڑھی۔
"اور تمہارے دل میں بھی۔" اس نے پیچھے سے لقمہ دیا۔
"میں نے کیا کیا ہے؟" وہ اس کی طرف پلٹی۔
"کیا تو نہیں ہے بس آئندہ کے لیے کہہ رہا ہوں۔"
"ڈرتے ہو مجھ سے؟"
"ڈر لگنا بھی چاہیے تم چیز ہی ایسی ہو۔" اس نے معنی خیزی سے کہا اور گوری ہنستی ہوئی باہر نکل گئی۔
"بڑے لڈو پھوٹ رہے ہیں جناب؟" زونیرا نہا کر نکل آئی تھی اور صحن میں کھڑی تولیے سے اپنے بال خشک کر رہی تھی۔
"بیٹھ نا گوری، کھڑی کیوں ہے؟" زونیرا نے چارپائی قریب کھینچی۔
"نہیں اب گھر چلتی ہوں۔"
"اب؟"
"ہاں اب تھوڑا پردہ بھی تو کرنا ہے۔" وہ زونیرا کے ساتھ مذاق کر رہی تھی اور تھوڑی دیر بعد گھر آگئی وہ کل سے واقعی بہت خوش تھی گھر آکر اس نے اماں کے بغیر کہے سارے کام کر ڈالے تھے وہ تتلیوں کی طرح اڑتی پھر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

دوسرے روز ابا جی تو بہن کو منا کر واپس آگئے لیکن گھر میں سب کو سانپ سونگھ گیا تھا اماں سینے پہ دوہتڑ مار کے رہ گئیں، خاور بھی چونک گیا، زونیرا چپ سی کھڑی تھی اور داور کی تو زبان ہی گنگ ہو گئی تھی وہ بھلا کیا کہتا؟ ابا جی سارا کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی ایسا کہہ رہے تھے کیا وہ نہیں جانتے تھے کہ گھر میں گوری کے رشتے کے لیے باتیں ہو رہی ہیں اور وہ نیا مسئلہ اٹھا لائے ہیں۔؟
"زبیدہ کو یہ بات کہتے ہوئے شرم نہیں آئی؟" اماں آخر پھٹ پڑی تھیں۔
"بندہ مجبور ہو تو شرم نہیں آتی، مجبوریاں سب کچھ کروا لیتی ہیں۔" ابا جی بہن کے حق میں بول رہے تھے۔
"خیر اب کیا مجبوری ہے اسے؟"
"بیٹی والوں کو ہزاروں مجبوریاں ہوتی ہیں داور کی اماں، تجھے کیا پتا تو نے تو صرف دو بیٹوں کو جنم دیا ہے بیٹی والوں کے گھروں میں دیکھ کتنی مجبوریاں ہوتی ہیں، جتنی بیٹیاں، اتنی مجبوریاں۔" ابا جی کافی دھیما بول رہے تھے۔
"تو اپنی مجبوریوں کو پہلے لگام ڈال کے رکھتی نا، پڑھا لکھا کے ڈگری تو اس کے ہاتھ میں تھما دی لیکن تمیز اور لحاظ نہ سکھایا اگر خاور اس کے ساتھ منگنی کے لیے مان ہی گیا تھا تو پھر کیوں اس کے ساتھ الٹی سیدھی باتیں کرتی رہی؟" اماں پہلی بار ابا جی کے ساتھ اس لہجے میں بات کر رہی تھیں۔
"وہ اپنی غلطی مانتی ہے، اسے احساس ہے کہ اس نے خاور کے ساتھ برا سلوک کیا تھا۔" ابا جی اعتراف کر رہے تھے۔
"اچھا جو خاور کے ساتھ برا سلوک کر سکتی ہے وہ داور کے ساتھ نہیں کر سکتی؟"

"نہیں اب نہیں کرے گی۔ اب وہ سمجھ گئی ہے۔" انہوں نے اماں کو تسلی دی۔

"نہیں۔ اب ہم بھی نہیں کریں گے' اب ہم بھی سمجھ گئے ہیں۔" خاور مداخلت کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"تم چپ رہو' یہ سارا گند تمہارا ہی پھیلایا ہوا تو ہے۔" ابا جی نے اسے جھڑک دیا۔

"میرا پھیلایا ہوا کیوں ہے' وہ خود ہی ایسی تھی۔ سارے تال کو گندہ کرنے والی مچھلی۔" خاور حقارت سے بولا۔

"زبان سنبھال کے بات کرو' وہ بھانجی ہے میری۔" وہ بھڑک اٹھے۔

"بڑی نیکو کار بھانجی ہے آپ کی۔" وہ طنزیہ بولا۔

"دیکھو اسے سمجھالے میرے منہ نہ لگے۔" انہوں نے اماں کو وارننگ دی۔

"مجھے سمجھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے بس آپ کے سمجھنے کی ضرورت ہے' آپ اچھی طرح جانتے ہو داور کا رشتہ گوری سے ہونے والا ہے۔" خاور کے منہ سے اپنا نام سن کر دیوار سے جھانکنے والی گوری وہیں کی وہیں تھم گئی۔

"ہونے والا ہے نا؟ ابھی ہوا تو نہیں نا؟" ابا جی کا لہجہ اور انداز بڑی اجنبیت لیے ہوئے تھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ بچپن سے گوری اور داور کی بات چلی آرہی ہے۔ پورے پنڈ کو پتا ہے کہ داور کی دلہن گوری نے ہی بننا ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ گوری کی جگہ نورین کو لاکر بٹھادیں؟ داور کے جوڑ کی بھی نہیں ہے وہ۔ چار سال بڑی ہے داور سے' اس کے سامنے بے بے لگتی ہے اس کی۔" اماں داور کے لیے تڑپ اٹھی تھیں اور تڑپ تو گوری بھی گئی تھی اس کا دل دیوار کے پار ساکت و صامت رہ گیا۔

"عورت مرد سے کبھی بڑی نہیں لگ سکتی۔"

"جو بھی ہے داور کے ابا' میں اسے بہو بنا کر نہیں لاسکتی۔" اماں جی نے انکار کردیا۔

"دیکھو زبیدہ' ہم سے ناراض ہے وہ اسی صورت ہم سے راضی ہوگی جب نورین داور کی دلہن بنے گی' اس کی باقی تینوں بیٹیاں بھی جوان ہیں ان کے رشتے آرہے ہیں' لیکن بڑی بیٹی کو گھر بٹھا کر وہ چھوٹی بیٹیوں کی شادی کیسے کرسکتی ہے' لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں کہ شاید بیٹی میں کوئی عیب ہے' اسے ہمارے ایک بیٹے نے ٹھکرایا ہے تو دوسرا اپنالے گا اس طرح گھر کی بات گھر میں ہی رہ جائے گی۔"

"مجھے گھر کی بات گھر میں نہیں رکھنی بس بات ختم۔" اماں جی بڑی سختی سے پیش آرہی تھیں۔

"ٹھیک ہے اگر نہیں رکھنی تو پھر میں بھی اس گھر میں نہیں رہوں گا یہ گھر تمہارا اور تمہارے بیٹوں کا ہے تم لوگ ہی یہاں رہو' میں چلا جاؤں گا' بھاڑ میں جاؤ تم سب' پہلے ایک بیٹے نے کیا فیض دیا تھا جو دوسرا دے گا؟ پہلا بھی اپنی پسند سے بیوی لایا' دوسرا بھی اپنی پسند سے لائے گا' ہمارا کیا ہے؟ ہم تو پالنے پوسنے اور پڑھانے لکھانے کے لیے تھے۔" ابا جی بکتے جھکتے اٹھ کر وہاں سے چلے گئے اور وہ لوگ ساکت بیٹھے رہ گئے گوری پیچھے ہٹ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

پچھلے کئی دنوں سے گوری ان کے گھر نہیں گئی تھی اور اپنی پریشانی میں داور کو بھی احساس نہ ہوا کہ وہ کیوں نہیں آئی لیکن آج شام کے وقت جب گوری چھنو کے ہاں چھت پہ گئی تو داور کو بھی اس سے ملنے کا خیال آگیا' وہ بھی اپنی چھت پہ چڑھ آیا تھا چھنو' داور کو آتے دیکھ کر فوراً" نیچے چلی گئی جبکہ گوری وہیں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی رہی۔

"گوری۔" داور نے شاید پہلی بار اسے اس طرح آواز دی تھی۔

"کیا بات ہے اس طرح کیوں کھڑی ہو؟"

"کام کر کرکے تھک گئی ہوں۔" اس نے ست سے لہجے میں کہا۔

"تم جانتی ہو آج کل ہمارے گھر میں کیا ہورہا ہے؟ کیا پریشانی چل رہی ہے؟" داور کا لہجہ سنجیدہ ہوچکا تھا۔

اور سنجیدہ تو وہ بھی ہوچکی تھی پچھلے کئی دنوں سے!

"ہاں جانتی ہوں۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور پھر خود ہی تمسخرانہ انداز میں ہنس پڑی۔

"پنڈ کی یہی بات تو بڑی ہوتی ہے ایک دوسرے کی بات نہیں چھپتی' گھر کی باتوں کو ہمسائے بھی سنتے ہیں۔ میں بھی تمہاری ہمسائی ہوں میں نے بھی سن لیا۔" اس کا انداز لاتعلق سا تھا۔

"یہ تم کس لہجے میں بات کررہی ہو؟"

"تم میرے لہجے کی فکر نہ کرو' تم ابا جی کے فیصلے کی فکر کرو' اگر تم نے ان کی بات نہ مانی تو وہ گھر چھوڑ جائیں گے' اور ماں باپ گھر چھوڑ کے چلے جائیں یہ عزت نہیں بے عزتی کا مقام ہے۔" اب کی بار گوری سنجیدگی سے بول رہی تھی بغیر کسی طنز و تمسخر کے۔

"کیا مطلب ہے تمہاری بات کا؟" داور کی پیشانی پہ بل پڑ گئے تھے۔

"کہ تم نورین سے شادی کرلو۔" گوری نے بم پھوڑ ہی دیا وہ تڑپ کے رہ گیا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟" داور نے اشتعال میں آکر گوری کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا تھا۔

"میں نے کچھ غلط نہیں کہا۔" اس نے نظر چرالی اور اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑانا چاہا لیکن وہ جو کبھی ہاتھ بھی نہیں پکڑتا تھا آج غصے میں اسے دبوچنے پہ آیا تو گرفت لوہے کے شکنجے کے مانند ہوگئی تھی۔

"تم نے غلط نہیں کہا تو ٹھیک کیا کہا ہے؟" وہ غصے سے چبا کے بولا تھا۔

"ہونہہ! اتنا غصہ نہ کرو بجن جی' کل کو جب ابا جی گھر چھوڑیں گے تو تمہیں میری ہی بات صحیح لگے گی۔" اس نے ہنس کے کہا۔

"گوری میرا دماغ پہلے ہی اتنے دنوں سے خراب ہے' اور خراب مت کرو۔" وہ چڑ گیا تھا۔

"دماغ اس لیے خراب ہے کہ تم غصے سے سوچ رہے ہو' ٹھنڈے دماغ سے سوچو گے تو تمہیں پتا چلے گا کہ کیا ٹھیک ہے اور کیا غلط؟ پہلے خاور بھائی کی وجہ سے اتنا فساد ہوا اور تمہاری وجہ سے پھر وہی مسئلہ؟ زونیرا باجی دن رات کام کرتی ہیں خدمت کرتی ہیں لیکن ابا جی پھر بھی سیدھے منہ بات نہیں کرتے' یعنی اب میں بیاہ کر جاؤں گی تو وہ میرے ساتھ بھی ایسا ہی کریں گے آخر اس بار بھی وہ نورین کو ہی لانا چاہتے ہیں' پچھلی بار بھی نورین کا ہی مسئلہ تھا۔ اور اگر چاچا جی کو دیکھا جائے تو وہ بھی اپنی جگہ پہ درست ہیں آخر زبیدہ پھوپھو ان کی ایک ہی بہن ہیں اور وہ اپنی اکلوتی بہن کو ہمیشہ کے لیے کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟ کیا خالہ زہرا شوہر کا سب کچھ چھوڑ کر چلے جانا برداشت کرلیں گی؟ لوگ سو سو باتیں کریں گے اور کیا تم لوگ خوش رہ پاؤ گے؟"

گوری نے آخر میں اس سے سوال کیا تھا اور داور ہمیشہ کی طرح اب بھی حیرانی اور تعجب سے اسے دیکھنے لگا تھا وہ کتنی لاپروا اور لاابالی نظر آتی تھی لیکن ہمیشہ کوئی ایسی گہری بات کہہ جاتی تھی کہ وہ خود بھی سوچنے پہ مجبور ہوجاتا تھا۔

"گوری تم نہیں جانتیں کہ تم کتنی بڑی بات کتنی آسانی سے کہہ رہی ہو؟"

"آسانی سے نہیں کہا' بہت سوچا ہے' بہت سمجھا ہے اور ہر بار تمہاری مجبوری ہی نظر آئی ہے' ہمارا کیا ہے؟ ہماری کون سی منگنی ہوئی تھی یا باقاعدہ کوئی رشتہ ہوا تھا' باتوں باتوں میں بات ہوئی تھی اور بات کا کیا ہے لوگ بھلا بھی دیتے ہیں ہم بھی یہی سمجھیں گے کہ ہم بھول گئے۔"

"گوری! یہ کوئی بات نہیں ہے' جس کو ہم بھلا دیں گے تو بھول جائے گی' یہ محبت ہے۔" اس نے پھر گوری کو جھنجھوڑ دیا۔

"تو یہی سوچ لو کہ ہماری محبت دل میں رہنے کے لیے ہے' دنیا میں رہنے کے لیے اور بھی رشتے نبھانے ضروری ہوتے ہیں۔" وہ پھر اس کی گرفت سے دور ہوگئی۔

"گوری۔!" داور نے اسے کھینچ کے اپنے سامنے کرلیا تھا۔

"کیوں اپنی اور میری زندگی سے کھیل رہی ہو؟"

داور کا لہجہ عجیب تھکاوٹ سی لیے ہوئے تھا۔
"کھیل تو قسمت کھیل رہی ہے اس میں میرا اور تمہارا کیا دوش؟" گوری نے پلکیں اٹھا کے اسے دیکھا تو داور کو اس کی آنکھوں میں نمی محسوس ہوئی گوری فوراً پلکیں جھکا گئی کہ وہ اس کے آنسو دیکھ کر جذباتی نہ ہو جائے۔

"قسمت کے لکھے کو قبول کرنا ہی پڑتا ہے تم بھی کر لو میں بھی کر لیتی ہوں' نہ بھی کریں گے تو بھی ہو گا وہی جو قسمت میں ہے۔" گوری نے دلیل دی اور قدم واپسی کے لیے موڑ لیے۔

"میری بات سنو گوری۔"

"گوری اپنے داور کے پاس ٹھہرتی تھی کسی دوسری کے داور کے پاس نہیں ٹھہر سکتی' آج سے تم غیر ہوئے' میرا اور تمہارا ملنا مناسب نہیں' گوری سے محبت کرتے ہو میں اچھی طرح جانتی ہوں لیکن اب اس محبت کو اس چھت کی کچی مٹی میں دفن کر دو تم اپنے گھر جاؤ اور میں اپنے گھر' رب راکھا۔" گوری کہہ کے تیز تیز قدم اٹھاتی سیڑھیاں اتر گئی اور خاور اسے بلانے کے لیے چھت پہ آیا تو وہ اکیلا کھڑا تھا لیکن اس کی حالت کافی شکستہ لگ رہی تھی۔

"داور! کیا بات ہے؟ کیا ہوا ہے؟" خاور نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا اور داور شکستگی سے ڈھے گیا تھا۔

قسمت واقعی چال چل گئی تھی' کہاں نورین خاور کی منگیتر اور کہاں داور گوری کا عاشق.....؟ قسمت کہاں سے گھما پھرا کے کہاں لے آئی تھی؟ خاور تو اپنی من مانی کر چکا تھا اب وہ من مانی کیسے کرتا؟ اس کی ساتھی تو خود با خود ہتھیار ڈال گئی تھی اس نے جنگ لڑنے کی بجائے ہاتھ اٹھا دیئے تھے اور داور وہ اکیلا جنگ کیسے لڑتا؟ خاور کا ساتھ تو بہت سے لوگوں نے دیا تھا لیکن اس کا ساتھ دینے کے لیے تو کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ گوری بھی نہیں!

☼ ☼ ☼

اور نیچے اپنے کمرے میں آکر جتنا گوری روئی تھی اگر داور کے ابا جی بھی دیکھ لیتے تو اس معصوم لڑکی کے دل پہ ہاتھ ڈالنے سے انکار کر دیتے لیکن وہ روئی بھی تو چھپ کے۔ جس شخص کے خواب اس نے سوئی آنکھوں سے بھی دیکھے تھے اور بند آنکھوں سے بھی آج اسی شخص کو کسی اور کا ہاتھ تھامنے کا مشورہ دے کر آئی تھی تو اپنا دل بھی کاٹ کے پھینک آئی تھی اب دل کی جگہ خلا رہ گیا تھا اور اسے اب اس خلا کو سب سے چھپانا تھا اپنے آپ کو مضبوط ظاہر کرنا تھا اتنا مضبوط کہ داور بھی ڈگمگا نہ سکتا اور اس نے ایسا کر کے دکھا دیا تھا ابا جی نے فیصلہ داور پہ چھوڑا تو سبھی کی نظریں داور پہ جم گئیں کہ ابھی انکار کرے گا لیکن اس نے نہ ابھی انکار کیا نہ تبھی۔ اس نے باپ کی ضد کے سامنے سر جھکا دیا تھا خاور اور اماں جی تڑپ کے رہ گئے لیکن وہ گھر سے باہر نکل گیا تھا زونیرا باجی گوری کی طرف لپکی تھیں لیکن جب گوری کو پتا چلا تو وہ انتہائی مطمئن اور پرسکون رہی تھی اس نے حیرانی اور دکھ کی بجائے خوشی کا اظہار کیا تھا اور گوری کے رویے سے زونیرا کو پتا چل گیا کہ داور کی رضامندی کے پیچھے کیا راز ہے؟ وہ چپ چاپ گھر لوٹ آئی تھی گھر میں شادی کی تیاریاں جاگ اٹھی تھیں اماں کا کلیجہ کٹ گیا تھا' وہ گوری کو چھوڑ کے داور کے لیے کسی اور کو کیسے لاتیں؟ کیسے خوش ہوتیں؟ انہوں نے تو ہمیشہ داور کی دلہن کے روپ میں گوری کو ہی دیکھا تھا لیکن اچانک نورین نے ٹانگ اڑا دی تھی وہ بھلا کس دل سے قبول کرتیں؟

ایک بہو سے ابا جی خوش نہیں تھے اور ایک بہو سے اماں جی۔ مقابلہ سخت تھا! لیکن اماں جی کا دل زیادہ دکھی تھا۔ گوری کی اماں حلیمہ اور داور کی اماں زہرا دونوں آپس میں چچا زاد بہنیں تھیں اور دونوں کی شادیاں بھی ایک ساتھ ہی ہوئی تھیں اور اتفاقاً دونوں ہمسائیاں تھیں اک دوسرے سے پیار محبت اور اپنائیت میں زندگی گزر گئی تھی یہی پیار محبت بچوں میں بھی منتقل ہو گیا تھا البتہ داور اور گوری ہی ایسے تھے جن کے پیار کی نوعیت بدل گئی تھی دونوں تقریباً ہم عمر تھے بچپن ایک ساتھ کھیلتے کودتے' لڑتے جھگڑتے ہی گزرا تھا اور پھر یہ لڑائی جھگڑے چاہتوں میں بدل گئے یہاں تک کہ ماں باپ بھی ان کے دلوں کے بھید سے آشنا تھے اس لیے خالہ زہرا گوری کو بہو بنانے کے لیے برملا اظہار کرنے لگی تھیں لیکن ان کے اس اظہار سے قسمت تو نہیں بدل سکتی تھی نا؟ گوری کے ماں باپ کو بھی دکھ ہوا تھا لیکن گوری نے ان کو بہلا پھسلا کر سمجھا لیا تھا اور وہ کیسے نہ سمجھتے؟ آخر گوری بالکل ہنسی خوشی ہشاش بشاش گھوم رہی تھی اس کے چہرے پہ تو غم کا شائبہ تک نہیں تھا اس نے دل کی باتوں کو دل میں دفن کرنا سیکھ لیا تھا یوں جیسے اس نے کبھی داور کو چاہا ہی نہیں تھا۔ اماں نے بارہا اس کے دل کو کریدنے کی' اسے ٹٹولنے کی کوشش کی تھی لیکن ہر بار انہیں ناکامی کا سامنا ہوا تھا وہ بس داور کی شادی تک اپنے آپ کو قائم رکھنا چاہتی تھی سو اس نے ایسا ہی کیا تھا یہاں تک چھنو تا جی اور شمو بھی دنگ رہ گئی تھیں گوری سے ایسی توقع تو نہیں تھی لیکن وہ سارے کام توقع کے خلاف کر گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

داور کی شادی تھی اور گوری نے سرخ جوڑا پہن رکھا تھا وہی سرخ جوڑا جو خود داور اس کے لیے لے کر آیا تھا اور گوری نے کسی خاص موقع پہ پہننے کے لیے سنبھال رکھا تھا اور آج کے خاص موقع سے زیادہ بھی کوئی خاص موقع ہو سکتا تھا بھلا؟ اس نے سوٹ پہنا' سرخ پراندہ اور سرخ چوڑیاں پہنیں' سب سنگھار کیے اور اس کی بارات کے ساتھ بھی گئی کوئی داور سے اس کے دل کا حال پوچھتا جو گوری کو دیکھ دیکھ کر کٹ رہا تھا وہ کتنی آسانی سے سب کے ساتھ سب کے جیسی ہی پھر رہی تھی اور وہ تھا کہ اندر ہی اندر کوئلہ ہو رہا تھا اور وہ سرخ جوڑا پہنے اس کے ارمانوں کو جلا رہی تھی۔

شام ڈھلے وہ دلہن لے کر گھر واپس آئے اور یہاں آکر گوری کے قدم رو پڑے تھے۔ داور کے گھر کے سامنے سب ہی نوری کا استقبال کر رہے تھے۔ رسمیں کر رہے تھے اور گوری اپنے گھر کی طرف بڑھ گئی۔

"گوری آؤ نا۔" زونیرا نے آواز دی۔

"میرے جانے کا وقت ہے زونیرا باجی' آنے کا نہیں۔" اس نے گھر کی سمت دیکھا۔ زونیرا چپ ہو گئی اور داور بھی اس کے تھکے تھکے قدموں کو دیکھتا رہ گیا اس نے گھر میں گھس کر اندر سے دروازہ بند کر لیا تھا۔

"داور چلو نا۔"

"اب اور کہاں جاؤں؟ جہاں جانا تھا وہاں تو جا نہیں سکا۔" وہ استہزائیہ انداز میں سوچتا ہوا اندر آگیا۔ اندر ابھی بھی رسمیں جاری تھیں۔ لیکن داور کا دل تو گوری کے تھکے تھکے قدموں کے ساتھ ہی اس کے گھر چلا گیا تھا یہاں تو داور بالکل خالی کھڑا تھا بغیر کسی دل کے اور بغیر کسی جذبات کے۔ اس وقت وہ نورین نازلی کا شوہر تھا بس دنیاوی تقاضے پورے کرنے کے لیے۔ دلی تقاضے تو کسی اور سے وابستہ تھے۔

☼ ☼ ☼

"آپ لوگوں نے ابھی تک گھر میں اٹیچڈ باتھ روم نہیں بنوائے؟" نورین نہانے کے لیے باہر غسل خانے میں جانے کا سن کر بدک گئی تھی۔

"یہ عام سا گھر ہے' کوٹھی یا بنگلہ نہیں کہ یہاں اٹیچڈ باتھ روم کی سہولت ہو' گاؤں میں ہر گھر میں ایک ہی باتھ روم ہوتا ہے۔" داور نے اندر داخل ہوتے ہوئے اسے جواب دیا تھا اور زونیرا جواب دینے کی زحمت سے بچ گئی تھی۔

"تو گاؤں میں ایک ہی بیڈ روم کیوں نہیں ہوتا؟ جہاں ماں باپ' بہن بھائی اور میاں بیوی ایک ساتھ ہی سوئیں۔"

"شٹ اپ یہ کیا بدتمیزی ہے؟"

"یہ بدتمیزی نہیں آپ لوگوں کی ذہنی مفلسی ہے' اتنا پڑھ لکھ گئے' نوکریاں لگ گئیں' شادیاں کر لیں لیکن گھر نہیں بنایا بس یہ دو کمروں کا کوٹھا ہی کافی ہے تم لوگوں کے لیے۔" اس نے حقارت سے کمرے میں نظر دوڑائی تھی۔

"تمہارے ماں باپ کے پاس تو یہ دو کمروں کا کوٹھا

بھی نہیں تھا ساری زندگی کرائے کے مکانوں میں گزاری۔" نہ جانے کیا بات تھی داور کتنا جلا بھنا بیٹھا تھا۔ وہ اسے دو بدو منہ توڑ جواب دینے سے باز نہیں آیا تھا۔ نورین بلبلا گئی تھی۔

"تم مجھے میرے میکے کا طعنہ دے رہے ہو؟"

"نہیں میں حقیقت سے آگاہ کر رہا ہوں۔"

"داور! کیوں الجھ رہے ہو؟ چلو تم باہر چلو تب تک میں نورین بھی نہا کر....."

"نہیں۔ میں نہیں نہاؤں گی۔" اس نے زونیرا کی بات کاٹتے ہوئے انکار کر دیا تھا' داور نے ٹھہر کر زونیرا بھابھی کو دیکھا پھر نورین کو.....!

"بھابھی! آپ ذرا باہر جائیے۔" اس نے احترام سے کہا۔

"جھگڑا مت کرنا۔" زونیرا کہہ کے باہر نکل گئی۔

"اپنی بات پہ قائم رہنا نہ تم غسل خانے میں جا کر نہاؤ گی' نہ منہ ہاتھ دھوؤ گی بلکہ کچھ بھی نہیں کرو گی جب تک تمہارے لیے اٹیچڈ باتھ روم نہیں بن جاتا۔" اس نے نورین کو اس کی اپنی بات میں ہی پھنسا دیا تھا آخر وہ باتھ روم سے کتنی دیر تک دور رہ سکتی تھی۔

"بلکہ میری مانو تو تم ایک ساتھ سب ہی چیزوں کی فرمائش کر دو' گیزر' اے سی' ٹیلی فون' ٹیلی ویژن' کمپیوٹر' روم فریج' اٹیچڈ باتھ روم' کارپٹ اور اس کے علاوہ بھی جو کچھ یاد آتا ہے وہ سب ایک لسٹ میں لکھ کر میرے ابا جی کو دے دو' وہ سب کچھ ایک ساتھ آرڈر کر دیں گے۔" داور کا لہجہ حد درجہ استہزائیہ اور طنزیہ ہو رہا تھا۔

"تم میرا مذاق اڑا رہے ہو؟ ایک رات کی دلہن کے ساتھ تم یہ سلوک کرو گے؟" اس نے سلگتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

"ایک رات کی دلہن یہ بھی تو دیکھے کہ اس کے کرتوت اور رویہ کیا ہے؟" داور کا دل بھی تو جلا ہوا تھا۔ اس نے بھی تو کہیں پھپھولے پھوڑنے ہی تھے اور صبح صبح ہی یہ موقع نورین نے خود دے دیا تھا۔

"تعمیر کا کام آج سے شروع کروا دو' پیسے میں دوں گا بس کام ابا جی کروائیں گے۔" اس نے غصہ دبا کر چبا کے کہا تھا۔

"تم سچ کہہ رہے ہو"

"نہیں تم سے جھوٹ کیوں بولوں گا؟ میرا اور تمہارا مذاق کا رشتہ نہیں ہے۔" اس نے زور دے کے کہا اور پھر باہر نکل گیا تھا' نورین نے خوشی خوشی شاور لیا۔ تیار ہوئی اتنے میں گاؤں کی عورتیں بھی آ گئیں لیکن دلہن کسی کو خاص پسند نہیں آئی تھی بلکہ اس کے مقابلے پہ لوگ زونیرا کی تعریف کر رہے تھے اور نورین ان سب عورتوں کی آنکھوں میں ناپسندیدگی دیکھ کر جل گئی تھی' اسے زونیرا کی خوبصورتی اور خوب سیرتی دونوں سے چڑ ہو گئی تھی اسے غصہ آنے لگا تھا اور اس کے مزاج کی پہلی پہلی خبر ابا جی تک بھی پہنچ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

لے کے دل پر تان نئی ہوندے
گوڑھے پیار پھلان نئی ہوندے
کچے گھڑے تے ترنا پیندا
سوکھے عشق کمان نئی ہوندے
غیراں دے سنگ ٹرنا تیرا
دیکھ کے مہرے کھان نئی ہوندے
کج گلاں سمجھ نئی آوندیاں
کج نقطے سمجھان نئی ہوندے

داور آج تیسری بار چھت پہ آیا لیکن پھر بھی گوری کہیں نظر نہیں آئی تھی البتہ بالی نظر آ گیا تھا جو گوری کے رسالے کا حشر نشر کر چکا تھا کاغذ کے جہاز بنا بنا کے اڑا رہا تھا اور ایک کاغذ کا جہاز اڑتے ہوئے داور کے چہرے سے آ ٹکرایا تھا اس نے وہ کاغذ پکڑ کے دیکھا تو اس پہ سرخ پنسل سے کچھ اشعار لکھے ہوئے نظر آئے جن کو پڑھ کر داور کو لگا گوری نے اپنے دل کا حال لکھا ہو وہ اس پنجابی غزل کے اشعار بار بار پڑھتا رہا اور ہر بار دل پہ اثر ہوتا رہا۔

"داور لالہ وہ میرا جہاز....." بالی اس کے قریب

آ گیا۔ داور نے چونک کر دیکھا تھا۔

"یہ کیا کر رہے ہو تم؟ گوری کے ڈائجسٹ کیوں خراب کر رہے ہو؟ وہ مارے گی تمہیں۔" داور نے اسے دھمکایا لیکن بالی جواباً ہنس دیا۔

"اب نہیں مارتی' بہت اچھی ہو گئی ہے' اب تو اس کا میک اپ بھی خراب کر دوں تو بالکل نہیں بولتی' یہ رسالہ اس کے سامنے ہی لے کر آیا ہوں' اس نے پھر بھی مجھے نہیں مارا' اب تو پیسے چوری کرنے پہ بھی کچھ نہیں کہتی۔ اللہ لوک ہو گئی ہے۔" بالی نے ہنستے ہوئے شرارت سے آنکھ دبا کے کہا تھا اور داور بری طرح ٹھٹک گیا تھا۔ گوری کی کیفیت سن کر اس کے دل کو کچھ ہوا تھا اس کے جسم و جاں میں بے چینی اور اضطراب اتر گیا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ وہ ٹھیک تو ہے؟" اسے پریشانی بھی ہوئی تھی۔

"مجھے تو لگتا ہے' اب ٹھیک ہے ہاں پہلے ٹھیک نہیں تھی۔" بالی کو وہ اس حال میں اچھی لگتی تھی لیکن جس حال میں داور کو اچھی لگتی تھی اس نے وہ حال چھوڑ دیا تھا داور چپ ہو گیا اور مزید کچھ بھی پوچھے بغیر نیچے اتر آیا۔ نیچے نورین کی چیخ چیخ جاری تھی' اس نے ہر بات میں نقص نکالنا اپنا فرض سمجھ رکھا تھا۔ ہر چیز اسے اپنے معیار سے نیچے نظر آتی تھی یہاں تک کہ اس نے زونیرا کو بھی ہتک و حقارت کا نشانہ بنا لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

داور کی چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں وہ دو دن میں واپس شہر جانے والا تھا لیکن جب نورین کو پتا چلا تو اس نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

"تم مجھے یہاں مچھر اور مکھیوں کے لیے بیاہ کر لائے تھے؟ خود شہر جا رہے ہو اور مجھے یہاں پھینک رہے ہو اس کوڑے دان میں۔؟" وہ اتنی بلند آواز سے بول رہی تھی کہ برآمدے میں بچھی چارپائی پہ بیٹھے ابا جی اس کی زبان کی گل افشانی با آسانی سن رہے تھے۔ اپنے گھر کے لیے کوڑے دان کا لقب سن کر ابا جی کو بھی

ناگوار گزرا تھا لیکن چپ چاپ بیٹھے رہے' ان پندرہ دنوں میں انہیں یہ تو احساس ہو ہی چکا تھا کہ ان کی بھانجی واقعی حد سے زیادہ زبان دراز ہے' جب بولنے پہ آتی ہے تو کسی بڑے چھوٹے کا بھی لحاظ نہیں کرتی۔

"اس طرح ہر بات پہ ہنگامہ کھڑا کر کے تم کیا ظاہر کرنا چاہتی ہو؟ کیا مقصد ہے تمہارا؟" داور دبے لہجے میں پوچھ رہا تھا تاکہ کوئی اور ان کی آواز نہ سنے۔

"میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ میرا دم گھٹتا ہے' مجھے گاؤں میں رہنے کی عادت نہیں ہے؟ مجھے اپنے ساتھ شہر لے چلو' میں شہر میں رہنا چاہتی ہوں۔" اس نے بالآخر اپنے اندر کے بات کہہ ہی دی اور داور چپ چاپ اس کا منہ دیکھتا رہا۔ وہ اب اسے کیا کہتا اگر کہتا تو بھی بات اور بڑھتی اسی لیے چپ چاپ کمرے سے باہر نکل آیا تھا یہاں تک کہ اس نے برآمدے میں بیٹھے ابا جی کو بھی نہ دیکھا اور کچھ دیر کے لیے گھر سے باہر نکل گیا داور کی پشت کو دیکھتے ہوئے۔ نا جانے کیوں ابا جی کو اپنی غلطی اور پچھتاوے کا احساس ہوا تھا وہ حقہ گڑگڑانا بھول گئے تھے۔

"ابا جی روٹی بنا دوں آپ کے لیے؟ صبح بھی آپ نے صرف لسی ہی لی تھی؟" زونیرا ہنڈیا بنا کے باورچی خانے سے باہر نکلی تو ابا جی کے کھانے کا خیال آ گیا اور وہ چپ چاپ گم سم سے زونیرا کی شکل دیکھنے لگے اسے ایک سال ہونے کو آیا تھا اس گھر میں بیاہ کر آئے ہوئے اور دن رات کام کاج میں لگی رہتی تھی۔ حالانکہ انہوں نے ابھی تک اس کو خود سے بہو کا درجہ نہیں دیا تھا لیکن پھر بھی وہ ماتھے پہ کوئی بھی شکن لائے بغیر ان کی خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی تھی اس نے انتہائی خوش اسلوبی سے پورے گھر کو سنبھال رکھا تھا کبھی اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی کبھی خاور کے ساتھ یا پھر ساس' سسر کے ساتھ جھگڑے نہیں کیے تھے وہ بہت صابر و شاکر لڑکی تھی لیکن نورین نے تو جیسے ضد باندھ لی تھی کوئی بھی دن خالی نہیں جانے دیتی تھی اور داور اکثر چپ چاپ گھر سے باہر نکل جاتا تھا اور ابا جی بھانجی کے کرتوت دیکھتے رہ جاتے تھے۔ وہ اس بات

کا ذکر بھی نہیں کر سکتے تھے کہ وہ پچھتا رہے ہیں۔

☼ ☼ ☼

"دیکھ گوری تاجی بیمار ہے ہم دونوں نہ گئیں تو خفا ہو گی ہم دونوں کی بیماری کا سنتے تو بھاگی چلی آتی ہے۔" چھنو اسے تاجی کے گھر جانے کے لیے بلانے آئی تھی لیکن گوری کاموں میں مصروف تھی اس نے انکار کر دیا تھا۔

"شام کو چلی جاؤں گی۔" گوری صحن سے چیزیں سمیٹتے ہوئے بولی۔

"شام کو سو کام ہوتے ہیں تو ابھی چل میرے ساتھ۔" چھنو نے اصرار کیا۔

"ضد نہ کر چھنو اماں بھی گھر پہ نہیں ہے۔" گوری نے نیا بہانا ڈھونڈا۔

"تو کیا ہوا؟ گلی میں بالی اور کامی دونوں کھیل رہے ہیں انہیں گھر بٹھا جاتے ہیں۔" چھنو آسان حل ڈھونڈ کے لائی تھی۔

"ہاں اور وہ دونوں ہمارے پیچھے گھر کو آگ لگا دیں وہ ہر چیز تباہ کرنے کے انتظار میں رہتے ہیں۔ جانتی تو ہو تم بھی۔؟" گوری نے استہزائیہ کہا۔

"چل پھر ماسی کے آنے کا انتظار کر لیتے ہیں۔" چھنو ٹلنے والی نہیں تھی اس نے آخر اسے ساتھ لے کر جانا تھا وہ موڑھا گھسیٹ کے اس پہ بیٹھ گئی تھی۔

"پتا نہیں اماں کب آئے گی؟" گوری نے کندھے اچکائے۔

"جب بھی آئے گی' آئے گی تو سہی نا۔" چھنو نے اطمینان سے کہا۔

اور گوری اپنے کام نبٹانے میں لگی رہی چھنو ادھر ادھر دیکھتی رہی اور یونہی بیٹھے بیٹھے دائیں دیوار پہ نظر جا پڑی اور خیال داور کی طرف چلا گیا شادی سے پہلے وہ اکثر کبھی سیڑھیوں پہ' کبھی چھت پہ' کبھی بیٹھک میں نظر آتا تھا لیکن اب تو اس کی شکل ہی کم ہو گئی تھی۔

"داور کو بھی دیکھا ہے؟" چھنو نے گوری کو مخاطب کیا۔

"دیکھنے سے کیا حاصل؟" گوری نے لاپروائی سے کہا۔

"اپنی بیوی کے ساتھ خوش تو ہو گا؟" اس نے گوری کے چہرے پہ کچھ کھوجا۔

"ہاں بڑا خوش ہے' روز سنتی ہوں اس کی خوشیوں کے قصے۔" گوری نے طنزیہ ہنستے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ کیا ہوا ہے؟" چھنو اس کے طنز کو پہچان گئی تھی۔

"کچھ نہیں ہوا۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"لو ماسی حلیمہ بھی آ گئی۔" چھنو کی نظر دروازے کی سمت اٹھی۔ گوری نے آگے بڑھ کے اماں کے ہاتھوں سے سودا سلف تھام لیا۔

"پانی لاؤں؟" اس نے اماں سے پوچھا۔

"ہاں لا دے' بڑی پیاس لگی ہے۔" وہ ہانپ رہی تھیں اور گوری لپک کے گلاس میں ان کے لیے پانی لے آئی۔

"تھک گئی ہیں؟" وہ ان کے کندھے دبانے کے لیے بیٹھ گئی۔

"پانچ کلو گھی اور پانچ کلو چینی لائی ہوں اٹھا کے' تھکنا تو تھا ہی۔" اماں نے اپنی تھکنے اور ہانپنے کی وجہ بتائی۔

"اماں کہا تو تھا کہ بالی یا کامی کو اپنے ساتھ لے جا' لیکن تو مانی ہی نہیں۔" گوری نے خفگی سے کہا۔

"ہاں وہاں جا کے میرے ساتھ ضد لگا لیتے کہ ہمیں بھی چیزیں لے کر دو۔" اماں کو بالی اور کامی کی حرکتوں کا پتا تھا اسی لیے ساتھ لے کر نہیں جاتی تھیں لیکن نتیجے میں خود تھک ہار جاتی تھیں۔

"تو سنا چھنو؟ تو آج کدھر؟" اماں کے حواس کچھ سنبھلے تو کسی اور طرف دھیان گیا تھا۔

"میں گوری کو لینے آئی تھی تاجی کو دو دن سے کس چڑھی ہے سوچا دونوں جا کے پتا کر آتی ہیں لیکن یہ جا ہی نہیں رہی بہانے پہ بہانے کیے جا رہی ہے۔" چھنو نے گوری کو گھور کے دیکھا تھا۔

"ارے بہانے کرنے کی کیا ضرورت ہے سارا دن

گھر میں پڑی رہتی ہے۔ جا چلی جا' تاجی بھی خوش ہو جائے گی۔" اماں نے بھی چھنو کی ہاں میں ہاں ملائی تھی اور گوری کو جانے کا کہا سو مجبوراً گوری کو اٹھنا ہی پڑا۔

"میں چادر لے آؤں۔" وہ اندر گئی اور اپنی بڑی سی کالے رنگ کی چادر لے آئی یہ چادر بھی اس کے لیے داور ہی لایا تھا کالی چادر کے چاروں اطراف چھوٹے چھوٹے سرخ پھول بنے ہوئے تھے کافی نفیس سی کڑھائی تھی۔

"چل۔" اس نے چادر اچھی طرح لپیٹ لی کسی کے گھر آنا جانا ہوتا تو وہ یہی چادر لے کر جاتی تھی۔

"اچھا اماں' ہم جا رہے ہیں رسوئی کا خیال رکھنا کاڑھنی میں دودھ رکھا ہے بلی نہ آ جائے۔" وہ جاتے جاتے اماں کو بتا کر جا رہی تھی اور پھر دونوں آگے پیچھے باہر نکل آئیں لیکن گلی میں نکلتے ہی گوری کے قدم تھم گئے تھے داور کی بیٹھک کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور داور باہر گلی میں بیٹھک کی کھڑکی پہ کھڑا تھا چہرے پہ پریشانی تھی لیکن گوری کو دیکھ کر جسم کا سارا لہو جیسے چہرے پہ سمٹ آیا۔ وہ شادی کے بعد پہلی بار گوری کو دیکھ رہا تھا گوری کے قدم بھی چند ثانیے کے لیے تھمے تھے لیکن اب اس کے پاس ٹھہرتی تو بدنامی کماتی اور اس سے بہتر تھا کہ انجان بن کے گزر جاتی اب وہ اس کا محبوب ہی نہیں کسی کا شوہر بھی تھا۔

"چل چھنو' رک کیوں گئی ہے؟" گوری نے چھنو کو دھکیلا اور خود بھی پاس سے گزر گئی۔

یہ گلی تھی سو لوگوں کے گزرنے کا امکان تھا' ورنہ داور اسے آواز دے کے یا پلو سے پکڑ کے روک لیتا مگر گلی کا خیال کر کے دل مسوس کے رہ گیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ گاؤں میں رہتے ہوئے بھی داور نے اسے اتنے دنوں بعد دیکھا تھا۔ وہ بھی غیروں کی طرح نہ سلام کیا' نہ حال پوچھا' نہ بات کی' بس غیروں کی طرح گزر گئی تھی۔ حالانکہ چھنو اسے دیکھ کر ٹھہر گئی تھی' لیکن وہ پھر بھی نہیں ٹھہری تھی۔

☼ ☼ ☼

"ادھر آ او پتر میرے پاس بیٹھو۔" ابا جی نے نورین کو اپنے پاس بلایا اور وہ خراب موڈ کے ساتھ ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"دیکھ پتر ہم پینڈو لوگ ہیں اور ہمارا رہن سہن بھی پینڈوؤں جیسا ہے جیسے پورا پنڈ رہتا ہے' ویسے ہم بھی رہتے ہیں اب ہم اس میں کیا تبدیلی لا سکتے ہیں؟ تو کیا تبدیلی چاہتی ہے آخر؟" ابا جی نے تحمل سے سمجھا کر پوچھا تھا۔ نورین اپنا غصہ اور اپنی زبان بمشکل روک پائی تھی۔ ورنہ جی چاہ رہا تھا کہ اپنے ماما جی کو کھری کھری سنا ڈالے۔

"بول نا پتر کیا بات ہے؟ تیرا اور داور کا جھگڑا کس بات پہ ہے؟" انہوں نے پھر اسے کریدا' حالانکہ وہ جانتے تھے کہ داور کی طرف سے تو کوئی جھگڑا نہیں ہے' بس وہ ہی پہل کرتی ہے اور خود ہی بات کو بڑھا دیتی ہے۔

"میں یہاں نہیں رہنا چاہتی' میں شہر میں الگ گھر لے کر رہنا چاہتی ہوں' میں کبھی بھی یہاں ایڈجسٹ نہیں کر سکتی۔"

"لیکن پتر الگ گھر میں کیسے؟"

"کیوں الگ گھر میں کیا حرج ہے؟ بینک میں کام کرتا ہے' مہینے کے مہینے اتنی تنخواہ ملتی ہے' کیا اپنا گھر نہیں لے سکتا؟ یا پھر اس میں بھی کوئی تکلیف ہے آپ لوگوں کو؟" اس نے تیکھے لہجے میں کہتے ہوئے ابا جی کو دیکھا' ابا جی کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا' ان کے کندھے جھک گئے تھے۔

"اگر شہر کے مکانوں جیسا مکان ہم تمہیں یہاں بنا دیں تو پھر؟" انہوں نے آخری حربہ آزمایا۔

"مکان بنانے سے کیا ہو گا؟ گاؤں تو پھر بھی گاؤں ہی رہے گا نا؟"

"یعنی تم یہاں نہیں رہو گی؟"

"نہیں۔" اس نے انکار کر دیا۔

"اور وہ تمہیں شہر لے کر نہیں جائے گا' اس کا تو مجھے بھی یقین ہے۔" وہ پُرسوچ سے لہجے میں بولے تھے۔

"تو پھر آپ یہ بھی یقین کرلیں کہ میں یہاں نہیں رہوں گی آج کل یا پرسوں چلی جاؤں گی۔" وہ بھی فیصلہ سنا کے کھڑی ہوگئی تھی اور ابا جی گہری سوچوں میں ڈوب گئے تھے۔ انہیں اور کوئی حل نہ ملا تو انہوں نے زبیدہ پھوپھو کو فون کرڈالا اور ساری صورت حال سے پہلے سے آگاہ کردیا تھا۔

☼ ☼ ☼

داور اپنی بیٹھک سے نکل رہا تھا جب اس کی نظر ساتھ والے گھر کی سیڑھیوں کی سمت اٹھی تھی گوری سیڑھیاں چڑھ کے چھت پہ جارہی تھی اور اسے دیکھ کر بے ساختہ ہی داور کے قدموں میں تیزی آگئی تھی اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا سیڑھیاں چڑھ آیا تھا۔

"گوری۔" اس نے بے تابی سے اسے پکارا تھا۔ گوری چونک کر اس کی طرف پلٹی۔

"تم یہاں؟" داور کو اپنے پیچھے چھت پہ دیکھ کر گوری کے تیور بدل گئے تھے۔ وہ اب اس سے ملنا ملانا پسند نہیں کرتی تھی۔

"کیوں تم نے ملنے کے سارے راستے بند کردیے ہیں؟"

"راستے کبھی بند نہیں ہوتے، بس قدموں کو روکنا پڑتا ہے اور میں نے قدم روک لیے ہیں۔" وہ سختی سے بولی۔

"لیکن میرے قدم تو تمہاری طرف بڑھتے ہوئے اب بھی نہیں رکتے۔" وہ اپنی چھت سے ان کی چھت پہ آگیا تھا۔

"تم شادی شدہ ہو داور! ایسی باتیں تمہیں زیب نہیں دیتیں، اپنی بیوی کے ساتھ رہا کرو، یوں آوارہ کیوں پھرتے ہو؟"

"ہونہہ! بیوی۔" اس نے نفرت سے سر جھٹکا۔

"کیوں اچھی نہیں ہے؟"

"اچھی ہوتی تو خاور بھائی اسے کیوں چھوڑتے؟" داور کے لہجے میں تمسخر تھا۔

"لیکن تم اسے اچھی بنا تو سکتے ہو نا۔"

"ضرور بنا سکتا تھا، اگر اسے پیار محبت یا پھر رشتوں کی قدر ہوتی، اسے پیسہ، گھر اور گاڑی چاہیے، جس کے بل بوتے پہ وہ عیش کرسکے، وہ گاؤں میں رہنے والی چڑیا نہیں ہے، وہ شہر کی فضاؤں میں اڑنا چاہتی ہے، مجھ سے شادی کرنے کا مقصد میری پرکشش جاب تھی، لیکن اب جب اسے یقین ہوگیا ہے کہ میں اس کی ایک بھی نہیں ماننے والا تو وہ کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے، اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ اپنی ماں سمیت سب کو نگل جائے، اس کے اندر صرف روپے، پیسے کی ہوس ہے، جو بہرحال میں پوری نہیں کرسکتا، مجھے میرے ماں، باپ نے اتنی محنتوں اور مشکلوں سے پالا پوسا، پڑھایا لکھایا اور آج میں انہیں چھوڑ کر چلا جاؤں اور بیوی کے اشاروں پر، ہونہہ! بھول ہے اس کی میں نے پہلے ہی جو زہر کا گھونٹ پیا ہے، وہی کافی ہے اب اور نہیں برداشت کرسکتا۔" اس نے زخمی لہجے میں کہتے ہوئے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"گھر بسانے ہوں تو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔" گوری مضبوط لہجے میں بولی اور داور چونک گیا۔

"جانتی بھی ہو، برداشت کرنا کیا ہوتا ہے؟"

"مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے؟" وہ طنزیہ ہنسی۔

"تو پھر کیوں کہہ رہی ہو مجھے برداشت کرنے کا؟"

"تاکہ تمہارا گھر بسا رہے۔"

"ہونہہ! بھاڑ میں گیا گھر اور بھاڑ میں گیا میں۔" وہ بری طرح تپ رہا تھا۔

"کیوں؟ بھاڑ میں کیوں گیا؟"

"مجھے نہیں بسانا ایسا گھر۔"

"تو پھر کیسا بسانا ہے؟" وہ سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"مجھے ایسا گھر بسانا ہے جس میں پیار ہو، محبت ہو، چاہتیں ہوں، جس میں گوری ہو، داور ہو اور رشتوں کی قدر ہو، جس میں نورین جیسی بد زبان اور بد دماغ عورت نہ ہو۔" وہ اک اک لفظ چبا چبا کے کہتا اس کی سمت بڑھا اور گوری دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی، وہ اپنے اور اس کے درمیان فاصلہ رکھنا چاہتی تھی۔

"ایسا ممکن نہیں ہے اب۔"

"ناممکن بھی نہیں ہے گوری۔" داور کی بات پہ گوری بدک گئی تھی۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں گوری، میں تمہارا تھا، تمہارے پاس سے کہیں اور گیا تھا، مجھے لوٹ کر تمہارے پاس ہی آنا ہے، کیونکہ میں تمہارا ہی ہوں۔" داور کا لہجہ بدل چکا تھا۔

"پاگل ہوگئے ہو تم؟" وہ اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

"گوری، میری بربادی میں سب سے بڑا ہاتھ تمہارا ہی ہے، میری بربادی کی ذمہ دار تم ہو اور مجھے آباد بھی تم ہی کروگی، ورنہ ساری زندگی تمہیں تباہ حال ہی نظر آؤں گا۔" وہ کہہ کے پلٹ گیا تھا اور گوری جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"خدا کے لیے نورین! میرے ہاتھوں کو دیکھو، میں تنگ آگئی ہوں تمہارے روز، روز کے مسائل سے گھر میں رامین کے رشتے کی بات چل رہی ہے، اگر تم داور سے لڑ جھگڑ کر آجاؤ گی تو اس کا رشتہ بھی ہوتے ہوتے رہ جائے گا۔ لوگ سو سو باتیں بناتے ہیں کہ بڑی بیٹی ایسی ہے تو چھوٹی کیسی ہوگی؟" زبیدہ بیگم نے بیٹی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

"چھوٹی بیٹیوں کی کتنی فکر ہے آپ کو؟ لیکن میرے لیے ہی کچھ نہ سوچا آپ نے۔ مجھے پکڑ کے اس ڈربے میں بند کردیا، کیا میرے لیے ہی یہ پینڈو ملے تھے آپ کو؟ یہاں آپ رامین یا اقرا کا رشتہ بھی تو کرسکتی تھیں؟"

زبیدہ بیگم آج گاؤں آئی ہوئی تھیں اور نورین کو سمجھانے کی کوشش کررہی تھیں اور اس کوشش میں دونوں ماں، بیٹی کی آوازیں باہر تک آرہی تھیں۔

"پہلے تمہارا کرتی یا ان کا؟"

"ہونہہ! بڑی اچھی جگہ کیا ہے۔"

"اس وقت تو تم بھی بڑی اتاؤلی ہورہی تھیں۔" زبیدہ بیگم نے کوئی ادھار نہ رکھا۔

"اس وقت تعریفیں بھی تو آپ ہی کرتی تھیں کہ اس کی جاب لگ گئی ہے، وہ ہزاروں کما رہا ہے، پڑھا لکھا ہے شریف ہے، منہ میں زبان ہی نہیں ہے جو کہوں گی وہ مانے گا، مٹی کا مادھو ہے، جی حضوری کرے گا، شہر میں کہوں تو شہر میں رکھے گا۔ خاور سے ہزار درجہ بہتر ہے، کہاں گیا ہزار درجہ بہتر؟ وہ تو پیچھے پہ ہاتھ ہی نہیں دھرنے دیتا، تنخواہ لاکر اپنی ماں کے ہاتھ پہ رکھتا ہے اور مجھے چند نوٹ خیرات سمجھ کے دے دیتا ہے ہونہہ! یہ خواب پورے کیے ہیں آپ نے میرے؟" نورین ماں پہ چڑھ دوڑی تھی۔

"اس کے ساتھ اچھے طریقے سے رہوگی تو وہ تمہاری مانے گا نا؟"

"میں اس کی بیوی ہوں ملازمہ نہیں کہ جی، جی کرتی رہوں۔"

"تو ٹھیک ہے پھر وہ بھی تمہارا شوہر ہے ملازم نہیں کہ تمہاری جی حضوری کرتا پھرے، ایک بات کان کھول کے سن لو۔ گاؤں کے مرد اگر سیدھے سادے اور اچھے ہوتے ہیں نا تو پھر بہت ٹیڑھے اور بد دماغ بھی ہوتے ہیں، بیوی مر بھی جائے تو اپنی مرضی کرتے ہیں، بیوی کی باتوں پہ کان نہیں دھرتے۔"

زبیدہ بیگم نے بیٹی کو سمجھانے کی پوری پوری کوشش کی تھی، لیکن وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ وہ بات سمجھنے والوں میں سے نہیں ہے، اگر سمجھنے والی ہوتی تو شادی کے دوسرے روز ہی اٹھ کر تقاضے شروع نہ کرتی۔ وہ اپنی بات منوانا چاہتی تھی تو پہلے داور کو اپنے پیار محبت اور توجہ سے رام کرتی، لیکن وہ تو گرم گرم کھانے پہ تلی ہوئی تھی، لیکن یہ نہیں جانتی تھی کہ گرم گرم کھانے سے منہ جل جایا کرتا ہے۔

"تو میں بھی اس کی باتوں پہ کان دھرنے والی نہیں ہوں، میں بھی وہ ہی کروں گی جو میرا دل چاہے گا۔" اس کی خودسری اور ہٹ دھرمی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

"دیکھ نورین! پہلے تمہاری بدزبانی کی وجہ سے خاور نے تجھے چھوڑ دیا اور اب تو چاہتی ہے کہ داور بھی تجھے چھوڑ دے؟ دیکھ خدا کے لیے مجھے باقیوں کے فرض سے فارغ ہونے دے۔ تو کیوں میرے سینے پہ مونگ دلنا چاہتی ہے؟" زبیدہ بیگم نے حقیقتاً" اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

"یعنی آپ کو باقیوں کی فکر ہے میری نہیں؟"

"تیری فکر کیوں کروں؟ تجھے اتنے جتن کرکے بیاہا ہے' اتنا پڑھا لکھا خوب صورت شوہر ہے' تیرے ماموں کا گھر ہے' تجھے کیا ڈر ہے جیسے چاہے رہے۔"

"ہاں۔ یہاں رہوں اور سب کی خدمتیں کروں اور وہ شہر جاکر آزاد پھرتا رہے' کیا مجھے یہاں قید کرنے کے لیے بیاہ کر لایا تھا۔"

"وہ زونیرا بھی تو اسی گھر میں رہ رہی ہے؟"

"وہ زونیرا ہے' میں نورین ہوں' نورین نازلی' ایم اے انگلش' کیا میرے جتنی خوب صورت اور پڑھی لکھی ہے وہ؟ اونہہ! پورا دن ہانڈی اور چولہے میں گھسی رہتی ہے۔"

"پورے گھر پہ اور شوہر کے دل پہ راج بھی تو وہی کر رہی ہے نا؟ خاور اس کا نام لے لے کے جیتا ہے' داور اس کی عزت کرتا ہے' بھائی صاحب اور بھرجائی اس بہو سے خوش اور مطمئن ہیں' وہ بھلا کیا کرتی ہے ان کے لیے؟ گھر کے کام اور ان کے ساتھ اچھے طریقے سے بات' بس یہ ہی کرتی ہے نا؟ اور وہ سب خوش ہو جاتے ہیں' پورا گھر سکون سے رہتا ہے اور تم... جب سے آئی ہو الٹا ان کے سکون برباد کرنے پہ تلی ہو؟"

انہوں نے اسے ہر طرح سے سمجھا دیکھا تھا' مگر نتیجہ وہ ہی... زبیدہ بیگم اسے اس کے حال پہ چھوڑ کر چلی گئی تھیں' جس پہ نورین ماں کی طرف سے بھی بدگمان ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ٹھیک ہے' میں تمہیں شہر لے جانے کے لیے تیار ہوں۔" اس نے رضامندی دے دی تھی اور نورین حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات سے دیکھنے لگی۔

"تم سچ کہہ رہے ہو؟"

"ہاں' لیکن ایک شرط پر۔" اس نے اپنا بیگ تیار کرتے ہوئے کہا شادی کو چھ ماہ ہو گئے تھے' لیکن وہ جب بھی شہر جاتا تھا اپنی پیکنگ خود کرتا تھا اسے کبھی اتنی توفیق نہیں ہوئی تھی کہ وہ شوہر کا کام خود کردے۔

"کیسی شرط؟"

"یہ ہی کہ تم دوبارہ کبھی گاؤں نہیں آؤ گی اور ہمیشہ شہر میں رہو گی' اس گھر میں جو میں لے کر دوں گا۔" داور نے اپنا تولیہ کھونٹی سے اتار کر طے کیا اور بیگ میں رکھ دیا' نورین اس کی شرط پہ ٹھٹکی' لیکن اپنی ضد اور اپنی بات پوری ہونے کا ایسا خمار تھا کہ اسے کسی بھی چیز کی پروا نہیں رہی تھی' اس کی تو شہر کا نام سن کے ہی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔

"مجھے منظور ہے۔" اس نے فوراً" ہامی بھرلی اور دروازہ کھلا ہونے کی وجہ سے اندر چلے آنے والے ابا جی اس کی بات سن کر واپس پلٹ گئے تھے۔ داور جانتا تھا کہ وہ کیوں واپس پلٹے ہیں' وہ اپنا بیگ تیار کرکے اس کی زپ بند کرکے باہر نکل آیا تھا۔

"ابا جی؟" وہ ابا جی کے پاس آ بیٹھا اور چند لمحے دونوں باپ' بیٹے کے درمیان یوں ہی خاموشی سے گزر گئے تھے۔

"کیوں کر رہا ہے ایسا؟" بات ابا جی نے ہی شروع کی تھی۔

"اور کوئی حل بھی تو نہیں ہے۔" داور کا لہجہ بھاری اور سنجیدہ تھا۔

"تو اس کی ضد کی خاطر ہمیں چھوڑ دے گا؟" ان کا لہجہ دکھی سا ہو رہا تھا۔

"آپ کی ضد کی خاطر گوری کو بھی تو چھوڑ دیا تھا۔" اس کا انداز تمسخر لیے ہوئے تھا۔ ابا جی شرمندہ ہو گئے' بیٹے کی بے سکونی کا سبب وہ ہی تھے' انہوں نے ہی یہ طوق اس کے گلے میں ڈالا تھا۔

"مجھے معاف کر دے داور! تیرا باپ تیرا مجرم ہے' اپنی بہن سے رشتہ نبھانے کے لیے میں خود غرض ہو گیا تھا' اپنی اولاد کی خوشیاں بھی روند ڈالیں' لیکن بدلے میں کیا ملا؟ پچھتاوا اور سب سے ندامت' خاور صحیح تھا' اس کی پہچان صحیح تھی' وہ نورین کے ارادے شروع سے ہی جان گیا تھا' وہ شادی نہیں کرنا چاہتی تھی' کسی کو اپنا غلام بنانا چاہتی تھی' دولت اور جائیداد پہ عیش کرنا چاہتی تھی' وہ گھر بسانے والی نہیں گھر اجاڑنے والی عورت ہے' میں اسے جان گیا ہوں' وہ پتا نہیں کیا کرنا چاہتی ہے اور کیا نہیں؟ تم اسے کہیں بھی لے کر چلے جاؤ' تمہیں سکون کی زندگی نہیں جینے دے گی' ابھی وقت ہاتھ سے نہیں نکلا' فیصلے کی ڈور تیرے ہاتھ میں ہے' جو چاہے کر' میرے لیے تیری خوشی تیرا سکون اہم ہے' میرے لیے تیری گوری اہم ہے۔"

ابا جی نے کہتے ہوئے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ دیا تھا اور داور دم بخود رہ گیا تھا۔ اسے اپنے کانوں پہ اپنی سماعتوں پہ شبہ ہوا تھا کہ ابا جی نے یہ سب کیا کہا ہے؟

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"ہاں پتر! ٹھیک کہہ رہا ہوں' عقل دیر سے بھی آجائے تو عقل کی مان لینی چاہیے' کیونکہ عقل آتی کبھی کبھی ہی ہے۔" انہوں نے داور کا کندھا تھپکا۔

"نہیں ابا جی! میں ایسا نہیں کر سکتا' ہو سکتا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ سب ٹھیک ہو جائے اور اسے بھی اپنے رویے کا احساس ہو جائے؟" داور نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ابا جی کا فیصلہ رد کر دیا تھا۔

"اسے کبھی اپنے رویے کا احساس نہیں ہوگا' اگر ہونا ہوتا تو اسی وقت ہو جاتا' جب اس نے خاور کے ساتھ برا سلوک کیا تھا' خاور کے بعد تم اس کی زندگی میں آئے تھے' اسے تمہاری قدر کرنی چاہیے تھی۔ اور اب تم ہی دیکھ لو' تم نے اسے ہمیشہ کے لیے شہر چلنے کا کہا اور وہ فوراً" مان گئی ہے' اس نے کبھی گاؤں نہ آنے کا فیصلہ کیا ہے' کتنی آسانی سے وہ سب کو چھوڑ کے جانے پہ تیار ہو گئی ہے؟ ایسا ہی اگر خاور' زونیرا سے کہے تو کیا وہ مان جائے گی؟ چلی جائے گی؟" ابا جی تلخ ہو رہے تھے' داور چپ ہو گیا تھا۔ پھر ذرا توقف سے دوبارہ بات شروع کی۔

"میں نے نورین کو شہر لے جانے کا فیصلہ بھی آپ سب کے لیے کیا ہے' تاکہ گھر میں روز ہونے والی چیخ چیخ تو ختم ہو' جب بھی گاؤں آئے گی تو آپ سب کو پریشان کرے گی' اس لیے بہتر ہے کہ وہ کبھی یہاں آئے ہی نہ۔" داور نے سر جھٹکا اور کھڑا ہو گیا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"بالی کا پتا کرنے' سنا ہے کل سے بیمار ہے وہ۔" داور کہہ کے باہر نکل گیا تھا اور ابا جی سرہانے سے ٹیک لگائے گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم۔" گوری بالی کے سرہانے بیٹھی اسے دوائی پلا رہی تھی' جب داور نے اندر داخل ہوتے ہوئے سلام کیا تھا وہ دونوں ہی چونک گئے تھے۔

"داور لالہ۔" بالی اسے دیکھ کر خوش ہوا تھا۔

"کیسے ہو یار؟ کیا ہوا ہے؟" داور نے بالی سے ہاتھ ملایا اور کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا تھا۔ گوری چمچہ ٹیبل پہ رکھ کے دوائی کی شیشی کا ڈھکن بند کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"کل سے بخار ہے' اتر ہی نہیں رہا۔" بالی نے منہ بنا کے کہا۔

"دوائی باقاعدگی سے کھا رہے ہو؟"

"ہاں' گوری ساری دوائیاں پورے ٹیم (ٹائم) پہ دیتی ہے۔"

"صرف دوائی دینے سے کچھ نہیں ہوتا' ہاتھ میں شفا بھی ہونی چاہیے کسی دوسرے کو افاقہ تو ہو۔" اس نے کن انکھیوں سے گوری کو دیکھا۔

"شفا دینے والا تو اوپر والا ہے' اس میں کسی بندے کا کیا ہاتھ ہے بھلا؟"

"بندوں کے ہاتھ میں شفا بھی اوپر والا ہی دیتا ہے' لیکن بندے ایسے سرد اور سفاک ہو گئے ہیں کہ کسی دوسرے کو شفا سے فیض یاب کرنے کا حوصلہ نہیں

رکھتے۔" وہ گوری پہ چوٹ کر رہا تھا، لیکن وہ اس کی بات سنی ان سنی کرتی بالی سے مخاطب ہوئی۔

"تمہیں نیند آئے تو تم سو جانا، میں تمہارے لیے ابھی کھچڑی بنانے لگی ہوں۔" وہ کہہ کر باہر نکل گئی اور داور بالی کے ساتھ چھوٹی چھوٹی باتیں کرنے بیٹھ گیا تھا۔

"خالہ جی اور چاچا کہاں ہیں؟"

"وہ کھیتوں سے پٹھے (چارا) لینے گئے ہیں، کامی بھی ان ہی کے ساتھ گیا ہوا ہے۔"

"کب آئیں گے؟"

"تھوڑی دیر لگ جائے گی، پہلے پٹھے وڈنے (کاٹنے) ہیں، پھر لے کر آنے ہیں۔" بالی اسے آہستہ آہستہ جواب دے رہا تھا، رفتہ رفتہ اس کی زبان لڑکھڑانے لگی تھی، وہ غنودگی میں اتر رہا تھا اور اس سے بات نہیں ہو رہی تھی، جب وہ بالکل چپ ہو گیا اور گہری نیند سو گیا، داور چادر اس کے اوپر اوڑھا کر باہر آگیا، رسوئی سے لکڑیاں جلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں، وہ رسوئی میں ہی چلا آیا۔

"اب کیوں بھاگ رہی ہو مجھ سے؟ اب تو تمہیں خوش ہونا چاہیے، میں نورین کو لے کر شہر جا رہا ہوں۔" وہ یہ ہی اطلاع دینے آیا تھا شاید، لہجہ کافی تلخ اور زخمی تھا۔

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔" گوری نے خوشی کا اظہار کیا تھا۔

"تمہارے لیے اچھی ہی ہے، اب تو تم آزادی سے رہ سکو گی نا، کوئی دیکھنے والا ہو گا نہ کوئی چاہنے والا۔"

"میں تمہیں پہلے بھی کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ میرے ساتھ ایسی باتیں نہ کیا کرو۔ تمہاری بیوی ہے نا، اس کے ساتھ ایسی باتیں کیا کرو۔" گوری نے اسے ٹوک دیا۔

"اب اسی کے ساتھ کروں گا۔" جواباً وہ بھی تلخی سے بولا۔

"بس پھر ٹھیک ہے۔" گوری نے تسلی سے کہا اور رسوئی سے باہر نکلنے لگی، اسے داور کے ساتھ اکیلے کھڑے ہونا مناسب نہیں لگ رہا تھا۔

"کہاں جا رہی ہو؟" داور نے بے ساختگی میں پھر اس کا دوپٹہ پکڑ لیا تھا، لیکن اتنے میں رسوئی کے سامنے نورین آ کھڑی ہوئی تھی، نورین نے یک دم آنکھیں پھیلا کر ان کے اس انداز کو دیکھا تھا، گوری گھبرا گئی تھی اور داور نے گہری سانس کھینچتے ہوئے اس کا پلو چھوڑ دیا تھا۔

"اوہ! تو یہاں یہ سین چل رہا ہے؟ واہ واہ کیا عیاشیاں ہو رہی ہیں یہاں؟" نورین تمسخرانہ اور کاٹ دار لہجے میں تالی بجاتے ہوئے بول رہی تھی۔

"نورین! کچھ غلط مت کہنا، ورنہ بہت برا ہو گا۔" داور نے اس کے تیور دیکھ لیے تھے، اسی لیے اسے ٹوکا تھا۔

"کیا ابھی بھی برا ہونے کی کسر باقی ہے؟ کیا ابھی بھی میں ہی غلط ہی ہوں؟ میری ناک کے نیچے یہ کھیل کھیلتے رہے تم دونوں اور مجھے پتا ہی نہ چلا؟ اسی لیے... اسی لیے تو تم شہر نہیں جاتے تھے، اسی لیے تو تم نے مجھ پہ گاؤں نہ آنے کی پابندی لگائی ہے، اسی لیے تو اب تم مجھے راستے سے ہٹانا چاہتے ہو، ذلیل کمینی تو میرے حق پہ ڈاکا ڈالتی رہی ہے، میرے شوہر کے ساتھ گلچھرے اڑا رہی ہے؟ میں تیرا خون پی جاؤں گی۔"

وہ یک دم گوری پہ جھپٹی، لیکن گوری کوئی دھان پان قسم کی کمزوری سی لڑکی نہیں تھی، اس نے اپنی طرف بڑھنے والی نورین کو اک دھکے سے پرے دھکیل دیا تھا۔

"دور رہ کے بات کر، اور سنبھال اپنا شوہر، جب سے تیرا شوہر بنا ہے آنکھیں جل جائیں جو کبھی اس نظر سے دیکھا بھی ہو، لگتا ہے تیری منحوس شکل کا سایہ پڑ گیا ہے، پہلے دیکھتی تھی تو رج رج کے دیکھتی تھی، اب دیکھتی ہوں تو دیکھنے کو دل ہی نہیں چاہتا، اس کی شکل میں تیری شکل نظر آتی ہے، اور میں نے آگ لگانی ہے تیری شکل کو؟" گوری بھی سیر کو سوا سیر ثابت ہوئی تھی۔

"عیاشی کرے تو اور تیری ماں، بہنیں، میرے بارے میں ایسی بات کی تو منہ توڑ کے رکھ دوں گی اور نہ ہی اپنی ٹانگوں پہ واپس جائے گی۔" گوری نے اگلی پچھلی کسر پوری کر ڈالی تھی، داور کا دل خوش ہو گیا تھا۔

"جی اوئے میری شیرنی۔" اس نے دل ہی دل میں نعرہ لگایا تھا۔ لیکن نورین جیسا خبیث بھی اس دنیا میں دوسرا کوئی نہیں تھا، اس نے کھڑے کھڑے بدلہ لیا تھا، بلند آواز سے شور مچانے لگی۔

"نورین! بس کرو یہ، یہ سب کیا کر رہی ہو، لوگ کیا سوچیں گے؟ نورین خدا کے لیے۔" داور اسے منع کرتا رہ گیا، لیکن وہ باز نہ آئی، وہ اسے کھینچتا ہوا گھر لے آیا تھا۔

"کیوں میری زبان بند کرنا چاہتے ہو، کیوں چھپانا چاہتے ہو؟ مجھے بتانے دو سب کو، میں چیخ چیخ کر بتاؤں گی کہ گوری میرے شوہر کے ساتھ اکیلے گھر میں رنگے ہاتھوں رنگ رلیاں مناتے..."

"نورین اپنی زبان بند رکھو، ورنہ میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔" داور پوری قوت سے دھاڑا تھا، محلے میں شور سن کر بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے اور نورین کے ساتھ ساتھ داور کی آواز بھی سن رہے تھے۔

"تم اس کے لیے مجھے طلاق دو گے؟" نورین چیخی۔

"اس کے لیے تم سے شادی کر سکتا ہوں تو تمہیں طلاق بھی دے سکتا ہوں۔" اس کا لہجہ برف کی مانند سرد تھا۔ نورین اور زیادہ بھڑک اٹھی تھی۔

"کیا کہا، تم نے اس کی خاطر مجھ سے شادی کی تھی۔"

"ہاں..." اس نے کوئی بھی لگی لپٹی رکھے بغیر سر ہلایا۔

"دیکھا ماما جی! دیکھا آپ نے؟ وہ مان رہا ہے کہ وہ گوری کے ساتھ..."

"ہم جانتے ہیں کہ وہ گوری سے محبت کرتا ہے اور کرنی بھی چاہیے، وہ اس کی منگیتر تھی، بچپن کی منگیتر، لیکن عقل مر گئی تھی میری، ان کی بچپن کی منگنی توڑ ڈالی، مجھے سزا تو ملنی ہی تھی، وہ بھی تمہاری صورت میں، میرے گھر کی کبھی کسی نے اونچی آواز نہیں سنی تھی اور آج پورا محلہ سن رہا ہے۔" انہوں نے شکستگی سے کہتے

ہوئے دروازے میں نظر آنے والے لوگوں کو دیکھا جو طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے اور ان کی باتوں سے اور نورین کی باتوں سے داور نے بس ایک فیصلہ ہی کیا تھا اور کھڑے کھڑے وہ فیصلہ سنا بھی دیا تھا اس نے سب کے سامنے نورین نازلی کو اس کی اوقات دکھا دی تھی' سب ہی لوگ دم بخود رہ گئے تھے اور داور اپنا بیگ اٹھا کر چلا گیا تھا' اس نے شہر جانا تھا آج۔۔۔!

شادی کی ساری تیاریاں ہو چکی تھیں' لیکن پھر بھی گوری شادی کے لیے نہیں مان رہی تھی' نورین کو طلاق دیے آٹھ مہینے ہو گئے تھے اور آٹھ مہینوں سے سب ہی گوری کو راضی کر رہے تھے' لیکن وہ مسلسل انکاری تھی اور آخر کار اس محاذ پہ خود داور کو کھڑا ہونا پڑا تھا' وہ سیدھا گوری کے گھر آ گیا تھا' اتفاقاً آج بھی گھر پہ کوئی نہیں تھا۔

"کیا ارادہ ہے تمہارا؟" گوری نہا کر نکلی تھی' سیاہ گھنے لمبے بال آج چوٹی کی قید سے آزاد اس کی پوری کمر پہ پھیلے ہوئے تھے اور بالوں سے نچڑنے والا پانی اس کی قمیص کو جسم کے ساتھ چپکا گیا تھا' داور کو نظر چرانی پڑی تھی۔

"میرے ارادے آٹھ مہینے سے تم سن تو رہے ہو۔" وہ اس کی اچانک آمد پہ چونکی نہیں تھی۔

"وہ تو میں لوگوں کے منہ سے سنتا رہا ہوں' اب تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔" داور اس کے روبرو آ کھڑا ہوا۔

"کیا سننا چاہتے ہو؟" اس نے داور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا' وہ نہا کر نکلی تھی' آنکھیں بھی کاجل کے بوجھ سے آزاد تھیں' آج تو وہ نکھری ستھری دھلی دھلائی بہت دلکش لگ رہی تھی' نہ چوٹی' نہ پراندہ' نہ کاجل' نہ چوڑیاں' داور کا دل چاہا اسے دل میں اتار لے۔

"کہ تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتیں۔" وہ دھیمے سے لہجے میں بولا۔

"ہاں۔ میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی' لیکن تم اگر دل سے مناؤ گے تو مان بھی سکتی ہوں۔" اس نے کہتے ہوئے اپنی مسکراہٹ روک لی تھی اور داور شادی مرگ کی سی کیفیت سے اسے دیکھنے لگا تھا۔

"تم سچ کہہ رہی ہو گوری؟ میں تمہیں مناؤں اور تم مان جاؤ گی؟" وہ دیوانہ ہو اٹھا۔

"ظاہر ہے۔ تمہارے کہنے سے نہیں مانوں گی تو اور کس کے کہنے سے مانوں گی؟ تم نے بھی تو میری بات مانی تھی' آج میں مان لوں گی تو کیا ہوگا؟" وہ ادا سے اترا کر بولی تھی۔

"یاہو۔۔۔" داور کا نعرہ بے ساختہ تھا۔ گوری یک دم ہنستے ہوئے پلٹ گئی' لیکن اس کے پلٹنے کی وجہ سے اس کے بھیگے بال داور کے چہرے کو چھو کر نم آلود کر گئے تھے۔

"کہاں جا رہی ہو؟" وہ پلو تھامتے ہوئے بولا۔

"اندر سنگھار کرنے۔"

"سنگھار؟" داور کچھ نہ سمجھا۔

"اتنے دن ہو گئے' نہ پراندہ پہنا ہے' نہ کاجل لگایا ہے' نہ چوڑیاں پہنی ہیں' لیکن آج تمہیں دیکھا ہے تو سنگھار کرنے کو دل چاہنے لگا ہے۔" وہ پلو چھڑاتے ہوئے بولی۔

"اب اس سنگھار کی کیا ضرورت ہے' اب ایک ہی بار شادی کے روز کرنا' پورے سولہ سنگھار۔" داور نے مشورہ دیا۔

"اس سنگھار کے لیے تو ابھی سامان لانا ہے اور وہ بھی تم لے کر آؤ گے' لسٹ لکھوا دوں گی' درجن سونے کی چوڑیاں' بڑے بڑے جھمکے' سونے کی چین اور۔۔۔" اور یہ کہہ کر وہ تھم گئی۔

"اور؟" داور نے اکسایا۔

"اپنا پیار۔" وہ آہستگی سے کہہ کے اندر کی طرف لپکی اور داور یک دم قہقہہ لگا کے ہنسا اور یوں ہی ہنستے ہوئے سرشار سا گھر لوٹ آیا' سب کو رضامندی کی نوید بھی تو سنانی تھی اور گوری اس کے قہقہوں کی آواز اپنے گھر میں کھڑی سن رہی تھی' جس پہ اس کے اپنے لب بھی مسکرا رہے تھے' شاید اس لیے کہ اللہ نے انہیں آزمائش میں سرخرو کر دیا تھا۔

الماس یاسین

مشعال

میری شادی ہونے والی تھی اس وقت میری عمر صرف بیس سال تھی۔ ویسے تو پچھلے زمانے میں بیس سال صرف نہیں ہوتے مگر آج کے دور میں "صرف" ہی ہیں۔ دراصل میں نے بیس سال کی عمر میں ہی بی۔اے کر لیا تھا اس لیے اماں کو زیادہ فکر تھی۔ ان کی سوچ یہ تھی کہ بی۔اے کر لینے کے بعد لڑکیوں کی شادی کر دینی چاہیے۔

لڑکیوں کی قسمت بھی کتنی عجیب ہوتی ہے۔ اپنی پچھلی تمام زندگی بھلا کر ایک نئے پلیٹ فارم پر چلی جاتی ہیں۔ کاش یہ ممکن ہوتا کہ شروع ہی سے ہم یہ جان پاتے کہ پوری زندگی جن لوگوں کے ساتھ گزارنی ہے وہ کیسے ہوں گے۔ اسی کے مطابق ہماری پرورش کی جاتی۔

خیر اللہ کو جو منظور' میں شادی کے بعد رخصت ہو کر

لاہور آگئی۔ گھر سے کوسوں دور......

شروع کے دن تو حسب روایت اچھے ہی گزرے دعوتیں، آنا جانا اور لوگوں کا ہجوم مگر جیسے جیسے یہ ہجوم کم ہوتا گیا ویسے ویسے سب کی حقیقتیں سامنے آتی گئیں۔ سب کے الگ الگ مزاج اور وہ بھی گرم شوہر ملا تو وہ بھی لاپرواہ ہر بات جو میں کرتی اس میں بے زاری۔

ایک دوپہر کی بات ہے میں کچن میں کھڑی برتن دھو رہی تھی جب میری نند صاحبہ کمر پر ہاتھ رکھے میرے سر پر آکر کھڑی ہوگئیں۔

"بھابھی پلیز ذرا چائے تو بنادیں۔" میں نے برتن دھوتے دھوتے سوال کیا۔

"کیوں تم کیا کررہی ہو؟" اس پر بے پروا سا جواب ملا۔

"کچھ نہیں۔" اتنی بے فکری مجھے غصہ آگیا۔

"میں بہت تھک چکی ہوں ابھی کھانا بھی بنانا ہے تم خود بنالو، مجھے یہ برتن بھی دھونے ہیں۔"

"تو میرا ایک کام کردیں گی تو کیا قیامت آجائے گی؟" اس کی آواز تیز ہوگئی۔

"میرے پاس وقت نہیں ہے۔ اور زیادہ چلانے کی ضرورت نہیں ہے ویسے ہی میرا سر درد کررہا ہے۔"

میرا یہ کہنا تھا کہ اس نے رونا شروع کردیا۔ اس کے رونے سے ساس اور دیور بھی کچن میں آگئے۔

"ارے گڑیا کیا ہوا کیوں رو رہی ہو؟"

"امی بھابھی کہہ رہی ہیں کہ میری آواز سن کر ان کے سر میں درد ہوجاتا ہے اور یہ بہت تھکی ہوئی ہیں۔ اگر میرے لیے ناشتا بنادیں گی تو کیا ہوجائے گا؟"

"کس قدر جھوٹی ہے یہ۔" میں نے حیرت سے اس کی بات سن کر دل ہی دل میں سوچا۔

ساس بھڑک اٹھیں۔

"کیوں بیگم صاحبہ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے تم کو آئے ہوئے اور رلانا شروع کردیا بچی کو؟"

حالانکہ بچی مجھ سے ایک سال بڑی ہی ہوگی۔

"نہیں ایسی بات نہیں ہے عائشہ تم کیوں جھوٹ سچ لگارہی ہو میں تو صرف یہ کہہ رہی تھی کہ تم غصے کی وجہ سے الفاظ ہی نہیں نکل رہے تھے۔

"ہاں ہاں میں ہی تو جھوٹی ہوں آپ تو اس دنیا کی واحد سچی عورت ہیں۔" عائشہ نے بدتمیزی سے کہا۔

"امی عائشہ بات بڑھا رہی ہے۔"

اس پر امی چلائیں۔

"ہاں ہاں مشعال بیگم تم ہی تو نیک پروین ہو باقی ہم سب تو باتیں بڑھاتے ہیں، بتاؤ کتنا ظلم کردیا ہم نے تم پر؟ مت کرو۔ کوئی کام جاؤ یہاں سے۔" انہوں نے کچن سے میرا ہاتھ گھسیٹ کر مجھے باہر نکال دیا۔ میں چپ چاپ کمرے میں آگئی اور سوچنے لگی کیا یہی ہوتی ہے شادی؟ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ انسان شادی ہی نہ کرے۔

دو مہینے گزر گئے اور کس طرح گزرے میں ہی جانتی ہوں۔ اسی دوران وہ نند بھی آگئیں جو سب سے بڑی تھیں ان سے بھی باتیں سننے کو ملیں۔

کافی عرصے بعد کراچی آنے کا موقع ملا تو میں اپنی امی سے مل کر رو پڑی اور ساری کہانی سنادی۔

"اب میں کیا کروں یا تو سب کچھ چھوڑ کر واپس آجاؤں یا پھر اسی طرح گھٹ گھٹ کے مرجاؤں۔ امی آپ نے ہی تو کہا تھا کہ بیٹی کا اصلی گھر سسرال ہوتا ہے۔ یہی ہوتا ہے اصلی گھر؟ جہاں غلطی نہ ہونے پر بھی باتیں سننے کو ملتی ہیں۔ جہاں اپنی مرضی سے کوئی کام نہیں کرسکتی۔" میں نے دل کی بھڑاس نکالی۔

اس پر امی نے کہا۔ "یہی ہوتا ہے بیٹا۔ لوگوں کے مزاج ایک جیسے نہیں ہوتے ان کے مزاجوں کو بدلنا پڑتا ہے۔ یہ کام واقعی مشکل ہے مگر ناممکن نہیں۔ بیٹا مزاج بہتے پانی کی طرح ہوتے ہیں جس میں اگر پیر رکھو گی تو بہہ جاؤ گی لیکن اگر تم سوچو اور مشاہدہ کرو تو اس بہتے پانی پر بند باندھ سکتی ہو۔ اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے لوگوں کی زندگی میں اس طرح شامل ہونا پڑتا ہے کہ ان لوگوں کو احساس ہی نہ ہو۔"

امی نے رسان سے کہا۔

"امی آپ کی ساری باتیں ٹھیک ہیں مگر آپ خود سوچیں میں اس گھر میں کس طرح ایڈجسٹ کرسکوں گی کچھ سمجھ نہیں آتا کیا کروں جب تک ان کی ہاں میں ہاں ملاتی رہوں جو کہیں وہ مانتی رہوں تو ٹھیک ہے لیکن جہاں اپنی مرضی کے مطابق ایک لفظ بھی نکالا تو طوفان آجاتا ہے۔ میں خاموشی سے سب کچھ سہتی رہوں یہ تو کوئی زندگی نہ ہوئی نا امی؟"

"بیٹا گھر بسانا تو لڑکی کا ہی کام ہے نا اس لیے کچھ قربانیاں تو دینی ہی پڑتی ہیں۔ بس تم صبر و تحمل سے کام لو۔ سب کا رویہ دیکھو سمجھو اور پھر اسی کے مطابق ان کو ہینڈل کرو۔ مدد ہمیشہ اللہ سے مانگو اس کے بعد اپنی ذات سے۔ کیونکہ سسرال میں کوئی تمہارا دوست نہیں ہوتا سارے رشتے تو اپنوں کی طرح ہوتے ہیں لیکن ساس ہمیشہ ساس ہی رہتی ہے ماں نہیں بن سکتی اس لیے ان کے سامنے زبان کو قابو میں رکھو اگر کچھ کہتی ہیں تو سن لو۔ تم میری بھی تو باتیں سنتی ہو نا اسی طرح نند ہمیشہ نند ہی رہتی ہے۔ کبھی بہن نہیں بن سکتی تم اس کو بہنوں کی طرح جھڑک نہیں سکتیں نہ ڈانٹ سکتی ہو۔ اس لیے نند اگر کچھ کہتی ہے تو فسانے بنانے وہیں کھڑی نہ ہوجاؤ۔ اپنی صفائیاں پیش نہ کرو۔ بلکہ ان لوگوں کو ان کی طرح ہی ٹیکل کرو۔ بات ہمیشہ مختصر کرو تاکہ وہ لوگ کسی بات کو پکڑ نہ سکیں۔ باتیں اس طرح کرو جس کے دو معنی ہوں ایک طنزیہ ایک اچھا تاکہ کوئی بات کرو تو اس کو خوبصورتی کے ساتھ بدل سکو۔ چیخنے چلانے سے انسان کوئی مقام حاصل نہیں کرپاتا۔ دماغ کو ٹھنڈا رکھو تاکہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جاگی رہے۔ کبھی کسی کا برا نہ سوچو ہمیشہ اچھا سوچو کیونکہ اچھا کرنے سے تمہیں کبھی برائی نہیں ملے گی۔

میری امی کی باتوں نے مجھے اس قدر پرسکون کردیا کہ میں ایک نئی سوچ کے ساتھ گھر لوٹی احمد مجھے لینے آگئے میں نے سوچا اب میں عقلمندی سے سب کچھ ٹھیک کردوں گی۔ اور ویسے بھی میری ماں کی دعائیں تو میرے ساتھ تھیں۔ میرے شوہر احمد کی عادت تھی کہ وہ رات کا کھانا کھاتے ہی سوجاتے تھے اور آدھی رات کو جب ان کی نیند پوری ہوجاتی تو ان کی فرمائشیں شروع ہوجاتیں۔ کبھی کافی کی فرمائش کبھی چائے کی اور اتنے اصرار ہوتے کہ میں تھکی ہاری ہونے کے باوجود حکم پورا کرتی۔

صبح پتا چلا کہ ماسی صاحبہ چھٹی پر چلی گئی ہیں رہی سہی کسر بھی پوری ہوگئی امی کے گھٹنوں میں درد تھا وہ صبح سے چارپائی پر ہی لیٹی ہوئی تھیں۔ صفائی کے بعد میں نے امی کو ناشتا دیا اور کچن میں چلی گئی۔ گیارہ بج رہے تھے اور عائشہ رانی کی صبح ہوئی تھی۔ اٹھتے ہی حکم دینا شروع کردیا۔

"بھابھی ناشتا بنادیں۔" میں نے سنی ان سنی کردیا اور اپنا کام کرتی رہی۔

"سنا نہیں کیا کہا میں نے؟" پچھلے دن کے جھگڑے کے بعد وہ اسی طرح سے بات کرنے لگی تھی۔

"آج ماسی نہیں آئی ہے۔ دوپہر کا کھانا بھی بنانا ہے۔ پہلے ہی اتنی دیر ہوچکی ہے۔ تم جلدی اٹھ جاتیں تو صفائی کرلیتیں۔ امی کے گھٹنوں میں بھی درد ہے ان کے کام بھی کرنے ہیں۔" میرا یہ کہنا تھا کہ بس چنگاری شعلہ بن گئی۔ امی جو ہل نہیں پارہی تھیں اڑ کر کچن میں آگئیں۔

"ارے پھر شروع ہوگئیں تم۔ آخر کیا چاہتی ہو؟"

میں نے جلدی سے کہا۔

"ارے امی میں تو عائشہ سے یہ کہہ رہی تھی کہ امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ جلدی اٹھ جایا کرو۔ اپنی ماں کی خدمت کیا کرو۔ دعائیں دیں گی تو سسرال میں کام آئیں گی۔ اب آپ ہی بتائیں میری ماں کی دعائیں ہی تو ہیں کہ مجھے آپ جیسی ساس ملی۔"

امی ایک دم سے چپ ہوگئیں پھر بولیں۔

"صحیح تو کہہ رہی ہے ماں باپ کی خدمت کرنا ہی اولاد کا اولین فرض ہے۔"

اب مجھے ان لوگوں کی نفسیات سمجھ میں آگئی تھی میں نے اپنی امی کو غائبانہ دعائیں دیں۔

شام کا وقت تھا عائشہ کچن میں برتن دھو رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

"ارے عائشہ تم برتن کیوں دھونے لگیں؟ میں آکر دھوتی ہوں نا۔

میں تو امی جان سے یہ کہہ رہی تھی کہ ایک فل ٹائم ماسی رکھ لیتے ہیں پھر نند بھاوج عیش کریں گے۔ بازار جائیں گے۔ شاپنگ کریں گے۔" بازار کا نام سنتے ہی وہ خوش ہو گئی۔ اور میری بات سے اتفاق کرنے لگی۔

"ویسے بھی تمہارے منگیتر شاکر کے گھر والے تاریخ مانگ رہے ہیں تیاری تو کرنی ہے نا۔" منگیتر کا نام سن کر وہ خوشی سے نہال ہو گئی اور عائشہ نے برتن دھونے کے ساتھ ساتھ روٹیاں بھی پکالیں۔

دوسرے دن عائشہ اور میں کپڑوں کی خریداری وغیرہ کے لیے نکل گئے۔ اماں بھی ساتھ تھیں ہم نے لان کے سوٹ لیے اور ڈنر کر کے گھر کی طرف آگئے۔ گھر آئے تو پتا چلا کہ بڑی نند ہما اپنے شوہر اور تین بچوں کے ساتھ گھر پر موجود تھیں ظاہر ہے ان کے لیے کھانا بنانا تھا میں نے عائشہ سے کہا چلو جلدی کچن میں وہ باول ناخواستہ میرے ساتھ کچن میں آگئی۔ ویسے بھی اتنی تھکن ہو گئی تھی۔

میری بڑی نند ہما آپا کا یہی کام تھا وہ مہینے میں ایک دوبار نہیں بلکہ ہفتے میں تین چار بار آتی تھیں۔ اور اس بات کو گھر میں کوئی پسند نہیں کرتا تھا بلکہ میرا چھوٹا دیور اویس تو کہہ بھی دیتا تھا آپی کبھی اپنے گھر میں بھی کھانا بنالیا کرو مگر وہ لوگ چکنی مٹی سے بنے تھے کوئی اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔

دن کی مصروفیات میں وقت کیسے گزر جاتا پتا ہی نہ چلتا۔ رات کو تھک کر لیٹتی تو نیند کب آتی پتا ہی نہ چلتا۔ مگر حسب معمول احمد کی صبح ہو جاتی۔

"مشعال پلیز ایک کپ چائے بنا دو۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔"

نیند بہت شدید تھی مگر مجھے اٹھنا پڑا۔ چائے بنا کر لائی تو میری نیند اڑ چکی تھی۔ میں نے احمد سے کہا۔

"امی نے ساری زندگی کرائے کے گھر میں گزار دی۔ کیوں نہ ہم اپنا گھر لے لیں۔ کتنی پریشانی ہوتی ہے۔" میری اس بات پر احمد بھی سوچنے لگے اور اتفاق کیا۔ تیر صحیح نشانے پر لگا تھا میں اپنی اس چھوٹی سی کامیابی پر ہی خوش ہو گئی۔

دوسری صبح میں دھوپ میں بیٹھی امی کے پیروں میں تیل کی مالش کر رہی تھی۔ عائشہ بھی وہیں تھی میں نے کہا۔

"امی احمد کہہ رہے تھے امی کا بڑھاپا آگیا ہے۔ اور میں ان کو اپنا گھر نہ دے سکا اب ہم فوراً گھر لے لیں گے۔" امی یہ بات سنتے ہی اٹھ گئیں اور خوشی سے کہا۔

"میرے بچے کو میرا کتنا خیال ہے؟"

عائشہ بھی بولی۔ "بھابھی ہم کہاں لیں گے گھر؟" اس پر میں نے کہا۔

"میں تو یہاں کے علاقے جانتی نہیں ہوں۔ امی جہاں کہیں گی وہیں لیں گے۔ ویسے بھی امی کی پسند لاجواب ہے۔"

سب ٹھیک ہو رہا تھا۔ پانی جو کہ بہتا ہوا دریا تھا اس پر بند بندھ چکا تھا۔ اور جس دن میں نے نئے گھر میں قدم رکھا مجھے یقین ہی نہیں ہوا کہ میں ان لوگوں کی زندگیوں میں اس طرح شامل ہو چکی ہوں کہ ان کو پتا ہی نہ چلا۔ بظاہر تو یہ سب ان کی پسند ہے مگر یہ سب میری ہی مرضی سے تو ہو رہا ہے۔

نئے گھر میں سب بہت خوش تھے گھر سیٹ کرنے میں کافی ٹائم لگ گیا اور سب تھک کر سو گئے رات دیر سے سونے کی وجہ سے احمد بھی رات میں نہ اٹھ سکے۔ وہ کس قدر سکون کی رات تھی۔ میں نے سوچا کہ کاش ایسا ہو جائے کہ ہر رات ایسی ہی پر سکون ہو جائے۔ نہ کوئی کافی ہو نہ کوئی چائے۔ بہت سوچا مگر کوئی حل نظر نہ آیا ایک بار پھر اپنی امی سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔

میں امی کے گھر کراچی جا رہی تھی۔ ٹرین میں بیٹھ کر حساب لگایا تو معلوم ہوا پورے پانچ مہینے دس دن ہو چکے ہیں۔ اس دفعہ وقت گزرنے کا اندازہ ہی نہ ہوا کہ وقت کیسے گزر گیا۔ کراچی پہنچ کر امی سے مل کر میں بہت خوش ہوئی۔ امی بھی بہت خوش تھیں ماں باپ کی خوشی تو اولاد ہی کے دم سے ہوتی ہے۔

"اب تو خوش ہو نا مشعال۔"

"ہاں امی شادی کے بعد بہت کچھ بدل جاتا ہے مگر یہ بدلاؤ ضروری ہے۔ عورت تو مرد کے سہارے کی محتاج ہوتی ہے اور پھر جس کی آپ جیسی ماں ہو اسے کس چیز کی فکر؟"

اس دفعہ میں ایک ہفتہ رکی۔ سامان پیک کرتے وقت میں نے احمد کی عادت کے بارے میں امی کو بتایا۔ امی نے کہا۔

"مشعال بیٹا ایک بات ہمیشہ یاد رکھو کہ شادی اچھلتا سکہ ہے اور سکہ زمین پر گرتا ہے تو ایک ہی کروٹ لیتا ہے۔ دوسرے حصہ کو ہر حال میں دبنا ہوتا ہے۔ اب یہ عورت پر منحصر ہے کہ وہ اس سکے کو یوں اٹکا کر رکھے کہ وہ کھڑا رہے اور کسی بھی جانب نہ گر سکے۔ کامیاب زندگی اور کامیاب شادی کے لیے توازن بہت ضروری ہے۔ ہمیشہ یہ کوشش کرو کہ تمہاری ذات سے کسی کو کوئی دکھ نہ پہنچے۔"

میں لاہور کے لیے ٹرین میں سوار ہو گئی۔ امی نے مجھے سونے کی چوڑیاں پہنائیں اور گھر والوں کے لیے گفٹس بھی دیے گھر پہنچ کر میں نے سب کو گفٹس دیے امی اور عائشہ بہت خوش ہوئیں۔

"میں بھی عائشہ کی شادی میں اپنی بہو کو سونے کے کنگن بنا کر دوں گی۔" میں مسکرا کر اٹھ گئی۔ ان کی آفر پر نہیں ان کی محبت پر۔

رات کو عائشہ کے سسرال والے آرہے تھے۔ کھانا بنانے گھر سمیٹنے اور دوسرے کاموں میں کافی ٹائم لگ گیا رات کے دو بجے کمرے میں آئی تو احمد گہری نیند سو رہے تھے میں بھی سو گئی۔

"مشعال پلیز کافی بنا دو۔ شدید طلب ہو رہی ہے" میں نے آنکھ کھول کر دیکھا تو رات کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ میں نے کہا۔

"میں بہت تھک گئی ہوں۔" مگر احمد کے مسلسل اصرار پر میں مشکل سے اٹھی۔ کمرے سے باہر نکلی تو کچن میں گئی کافی بنا کر کپ میں ڈالی اور نکل کر کمرے میں آگئی۔ مگر نہ جانے کیسے چکر سا آگیا۔ کافی کی پیالی احمد پر گری اور میں زمین پر۔ مگر احمد کو بیڈ پر اچھلتا دیکھ کر میں بھرپور لطف محسوس کر رہی تھی۔ احمد کی چیخ سن کر امی گھبرا کر کمرے میں آگئیں۔

"ارے کیا ہوا؟ کیوں چیخ رہے ہو احمد۔؟" وہ پہلے تو احمد کی طرف متوجہ تھیں۔

مگر جب انہوں نے مجھے زمین پر گرا دیکھا تو ان کی بھی چیخ نکل گئی۔

"ارے میری بچی کیا ہوا؟ شاید بے ہوش ہو گئی ہے۔" امی میرے تلوے سہلانے لگیں۔ مجھے بڑی شرمندگی ہوئی مگر میں کرتی بھی کیا میں تو بے ہوش تھی نا؟

امی نے احمد سے پوچھا کہ کپڑوں پر کیا گرایا ہے اس پر احمد نے بتایا کہ مشعال کافی بنانے گئی تھی اور گر گئی۔

"واہ بیٹا سبحان اللہ! آدھی رات کو اٹھا کر کافی بنواؤ گے تو یہی حال ہو گا نا؟ سارا دن کی تھکی ہاری بچی دن بھر کام میں لگی رہتی ہے اور رات کو بھی تم اسے چین نہیں لینے دیتے۔

خبردار! جو آئندہ یہ سب کیا تو۔"

امی کے بروقت غصہ پر مجھے ٹوٹ کر پیار آیا اگر ہوش میں ہوتی تو ان کا منہ چوم لیتی کچھ دن تک میں نے احمد کے سدھر جانے کا انتظار کیا جب یقین آگیا تو اپنی امی کو فون لگا دیا۔

"امی آج مجھے پتا چلا کہ آپ نے اتنی کامیاب زندگی کیسے گزاری ہے۔"

امی نے کہا۔ "اچھا بتاؤ گھر میں سب کیسے ہیں؟ احمد کی طبیعت کیسی ہے۔"

میں نے کہا۔ "گھر میں سب ٹھیک ہیں اور احمد۔ خوفزدہ! مجھ سے نہیں گرم گرم کافی سے۔" میں زور سے ہنس دی امی بھی دوسری طرف ہنس رہی تھیں۔

میری سہیلی میری ہمراز میری امی ہیں اور ماں ہمیشہ بیٹی کا گھر بناتی ہے اور ساتھ ہی اس کے گھر کو جنت بنانے کے طریقے بھی بتاتی ہے۔ کیا آپ کی ماں بھی میری ماں کی طرح آپ کی ہمراز ہے یا پھر آپ نے کبھی اپنی ماں کو اپنا دوست جانا ہی نہیں؟؟

☆ ☆

سعدیہ راجپوت

عشق آتش

ساتویں اور آخری قسط

مکمل ناول

وہ رات بہت بھاری تھی نیند آنا تو دور وجدان کی پلک بھی نہ جھپکی وہ بے قرار سا لان میں ٹہلتا رہا پھر تھک کر لان سے چھت تک جاتی سیڑھیوں پر جا بیٹھا اور دور خلا میں دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"اپنی مرضی تھی تو دس سال میرا صبر آزمایا..... آج میں چاہ رہا ہوں کہ آجائیں تو آ کیوں نہیں جاتیں پھر دل کی جو حالت ہو گی دیکھا جائے گا کم از کم آنکھوں کو سکون مل جائے..... بس ایک بار ملیحہ..... بس ایک بار....." آج پھر ٹوٹنے کی رات تھی۔

کیا جھگڑا سود خسارے کا
یہ کام نہیں بنجارے کا
سب سونا روپا لے جائے
سب دنیا، دنیا لے جائے
تم ایک مجھے بہتیری ہو
اک بار کہو تم میری ہو

اور وہ ٹوٹتا چلا گیا۔

"یہ خواہش بھی تو آپ کی موت کے ساتھ نہیں مر سکی..... لگتا ہے میری موت کے ساتھ ہی ختم ہو گی۔" دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھکتے ہوئے وہ ہاتھوں کو بالوں میں سے گزار کر سر کے پیچھے لے گیا پھر انگلیوں کو آپس میں پھنسا کر سیڑھیوں پر لیٹ گیا۔

☆ ☆ ☆
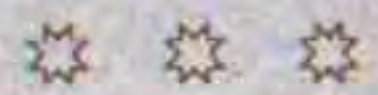
آفاق اور سمیرا اپنے دونوں بچوں کے ساتھ وجدان کے گھر کے لاؤنج میں آئے بیٹھے تھے وجدان اور اس کے امی ابو اس کے بھائی بھابھی کے ساتھ ہی لاؤنج میں موجود تھے سبھی بچے وہیں پاس ہی قالین پر دائرہ بنائے اپنا گروپ الگ کیے ہوئے تھے اور جب وجدان کو پتا چلا وہ ارم کی شادی کا دعوت نامہ لے کر آئے ہیں تو حیرت سے بولا۔

"ارم اتنی بڑی ہو گئی۔" سمیرا مسکرا دی۔

"ہاں ہو گئی ہے تبھی تو اس کی شادی کر رہے ہیں۔"

"مجھے تو نہیں لگتی ہاں قد کچھ لمبا ہو گیا ہے اور بال بھی بڑھا لیے ہیں مگر پھر بھی بچی سی لگتی ہے اور حرکتیں تو ذرا نہیں بدلیں بات بات پر چڑتی ہے۔"

"تم جو چڑانا نہیں چھوڑتے۔" آفاق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

آفاق نے خالی کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے وجدان کو اشارہ کیا اور دونوں اٹھ کر باہر آگئے۔

"تم ٹھیک ہو۔" پودے کے پتے کو نوچتے ہوئے آفاق نے بظاہر سرسری سا پوچھا تھا۔ وجدان اس کی بات پر ذرا سا مسکرایا اور کہا۔

"تمہیں میرے ٹھیک ہونے پر شک کیوں رہتا ہے پورے پانچ مہینے کا کورس کر چکا ہوں اور اب تو میرے پاس مینٹل ہیلتھ کا سرٹیفکیٹ بھی ہے۔"

"چلو یہ تو اچھی بات ہے کہ اب تم ٹھیک ہو ہم بھی چاہتے تھے کہ تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ۔" آفاق نے کہا پھر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"لیکن وجدان میں اکثر سوچتا ہوں کہ کاش تم ملیحہ کی اس ایک جھلک کو بھول جاتے تو شاید وہ سب نہ ہوتا جو ہوا..... ملیحہ مرتی نہ تمہارے حصے میں اتنی بربادیاں

آتیں۔ مجھے بتاؤ وجدان آخر تم نے محبت کر کے کیا پایا۔" وجدان خاموش ہی رہا۔

"کچھ بھی نہیں۔ لیکن اگر تم محبت نہ کرتے تو آج عمر کے اس حصے میں جب تمہارے ساتھ کے لوگ اپنے کیریئر کی اونچائی پر پہنچ چکے ہیں تمہیں صفر سے شروعات نہ کرنی پڑتی تم ان دس سالوں میں بہت کچھ پا سکتے تھے ـــ عزت، شہرت، دولت اور ان گنت کامیابیاں۔" وہ چپ ہوا تو وجدان نے بولنا شروع کیا۔

"ملیحہ کی اس ایک جھلک کو بھول جاتا تو اپنی تنہائیوں میں کس چہرے کو یاد کرتا ـــ محبت میں صرف پانا اور کھونا ہی نہیں ہے یہ انسان کو اپنی رمز بھی سکھاتی ہے جسے سیکھنے کی دو ہی شرطیں ہیں۔ ایک محبت کو پانے سے مشروط نہ کرو..... دو کھونے پر محبت کو ترک نہ کرو اور اگر کوئی سمجھے تو یہی دو شرطیں محبت کی رمز ہیں اور جو اس رمز کو سمجھ گیا اس کی محبت خالص ہو گئی اور خالص محبت سچے ایمان کی طرح ہے کیونکہ اس کی بھی یہی خاصیت ہے کہ پانے اور کھونے سے مشروط نہیں ہوتا اب جس کے دل میں سچا ایمان ہو محبت اس کی عادت بن جائے گی اور جس کے دل میں خالص محبت ہو ایمان اس کے دل میں گھر کر لے گا۔" وجدان نے خاموش ہو کر چند لمحے آفاق کا چہرہ دیکھا پھر مسکرا دیا۔

"آج میرے دل میں محبت بھی ہے اور ایمان بھی ـــ اب ذرا سوچ کر بتاؤ کیا واقعی میں نے محبت میں کچھ نہیں پایا۔" لیکن آفاق نے جواب نہیں دیا ایسا لگ رہا تھا اس کے پاس کوئی جواب ہے ہی نہیں۔ وجدان نے ذرا سا ہنسا سر کو جھٹکا اور کہا۔

"جانے دو تم جواب نہیں دے پاؤ گے کیونکہ زیادہ تر لوگوں کی طرح تمہارے لیے بھی اسی چیز کو پانا کہتے ہیں جس سے دنیاوی اور مادی فائدہ حاصل ہو سکے۔ تمہاری نظر بس عزت، دولت، شہرت اور کامیابیوں تک ہی جاتی ہے۔ تمہارے نزدیک میں جو نہیں پا سکا ایک دن اسے پالوں گا مگر میں جو کھو چکا ہوں اس کے افسوس کرنے کے لیے دس سال بہت کم ہیں۔ لیکن مجھے تمہارے خلوص پر بھی کوئی شک نہیں اس لیے تسلی رکھو میں اب کیریئر کو پوری توجہ دے رہا ہوں۔ شایان میری ذمہ داری ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس کے محفوظ مستقبل کے لیے میری کامیابیاں ضروری ہیں۔"

"یعنی یہ کریڈٹ بھی شایان کو جاتا ہے۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں بول کر مسکرایا پھر سنجیدہ ہو گیا۔

"لیکن وجدان تمہیں نہیں لگتا تم نے اس بچے کو اپنی کمزوری بنا لیا ہے۔"

"پتا نہیں آفاق اس بچے میں کیا ہے جو میرا دل اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے اپنے آپ ہی میں اس کے لیے باپ کی طرح سوچنے لگا ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے میں اسے دنیا کی ہر وہ خوشی دوں جو میرے اختیار میں ہے اور میں ایسا ہی کروں گا اور اگر ضرورت پڑی تو اس کی خوشی کی خاطر اپنے اختیار کی آخری حد سے بھی گزر جاؤں گا۔" اس کا لہجہ مضبوط تھا۔

"چلو چھوڑ یہ بتاؤ بابا جان کیسے ہیں؟"

"کون بابا جان؟" آفاق فوری طور پر سمجھا نہیں تو اس کی شکل دیکھنے لگا۔

"ملیحہ کے بابا جان۔" وجدان نے کہا۔

"اچھا وہ۔" آفاق نے لفظوں کو لمبا کھینچا۔

"تمہیں ان کا خیال کیسے آ گیا؟"

"وہ ملیحہ کے بابا ہیں تو میرے لیے بھی تو باپ کی جگہ ہوئے پھر کیا مجھے ان کا خیال نہیں آنا چاہیے بلکہ میں تو جب بھی ملیحہ کو سوچتا ہوں ساتھ ہی بابا جان اور ہادی بھائی کا خیال آ جاتا ہے پتا نہیں ملیحہ کے بعد وہ کس طرح جی پائے ہوں گے خاص طور پر ہادی بھائی..... وہ تو شروع سے ہی لاعلم تھے اور آخری وقت تک لاعلم رہے پتا نہیں سب جان کر ان کی کیا حالت ہوئی ہو گی۔ میرے بعد وہ دنیا کے دوسرے شخص ہیں جن کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ انہیں خود سے زیادہ ملیحہ کی پروا ہے۔"

"ان دونوں کا کیا پوچھتے ہو؟" آفاق سانس بھر کر بولا۔

"ملیحہ کے سوئم پر انہوں نے خود تایا جان اور پاپا کے سامنے تمہارے اور ملیحہ کے تعلق کے بارے میں انکشاف کیا تھا اور اعتراف کیا تھا کہ ملیحہ کی شادی زبردستی کرائی جا رہی تھی۔ ہم نے انہیں ہمیشہ سخت گیر انسان کے روپ میں دیکھا ہے مگر اس وقت تم ان کی حالت دیکھتے ملیحہ کی موت نے ان کی کمر توڑ دی تھی اوپر سے یہ پچھتاوا کہ ملیحہ کی موت کے ذمہ دار وہ خود ہیں ـــ ان کے پچھتاوے کا یہ عالم تھا خود کو ملیحہ کا قاتل کہہ رہے تھے پھر ہاتھ جوڑ کر تایا جان اور پاپا سے معافی بھی مانگی مگر جب ملیحہ ہی نہ رہی تو بھلا کیسی معافی.....

نور الہدی بھی کچھ کم برہم نہیں تھا مگر اس کی مجبوری یہ ہے کہ اسے پھوپھا جان سے بہت محبت ہے وہ کچھ بھی کر لے ان سے تعلق نہیں توڑ سکتا پھر بھی یہی وہاں سے اطلاع ملتی رہتی ہے کہ اس کے رویے میں پھوپھا جان کے لیے سرد مہری آ گئی ہے اور ملک انکل کی ڈیتھ کے بعد سے تو وہ بالکل گوشہ نشین ہو چکے ہیں ان کی حالت کا سن کر تو ہاتھ اپنے آپ کانوں کو چھونے لگتے ہیں۔" آفاق نے محسوس کیا کہ بابا جان کی حالت کا سن کر وجدان مضطرب ہو گیا تھا۔

"تو کیا تمہارا ان سے بالکل بھی تعلق نہیں رہا۔"

"نہیں ہماری ان سے آخری ملاقات ملیحہ کے سوئم پر ہی ہوئی تھی اس کے بعد ایک بار نور الہدی اپنی شادی کا انویٹیشن دینے آیا تھا تایا جان اور پاپا نے تو صاف منع کر دیا لیکن ہمیں اجازت دے دی تھی مگر کوئی نہیں گیا۔ قصر فاروقی نے دو ایسے بڑے صدمے دیے ہیں کہ اب اس کی طرف دیکھنے کو بھی دل نہیں کرتا پھر بھی نور الہدی کا نام سنائی دیتا رہتا ہے وہ ایک کامیاب بزنس مین ہے اور اگر تم بزنس میگزین پڑھو تو ان میں اکثر نور الہدی اور فاروقی گروپ آف انڈسٹریز کے بارے میں چھپتا رہتا ہے۔"

"چلو یار اندر چلتے ہیں یہاں دھوپ بہت تیز ہے۔" اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا لہجے میں بے زاری صاف جھلک رہی تھی۔

آفاق بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر آیا تو بچے سینٹرل ٹیبل پر البم کھول کر اس کے اردگرد قالین پر بیٹھے تھے اور تصویریں دیکھتے ہوئے تبصرے کر رہے تھے لیکن ان کے بچکانہ تبصرے اتنے مزے دار تھے کہ سب اپنی باتیں چھوڑ کر صوفوں پر آگے جھکے تصویروں کو دیکھتے ہوئے ان کی باتوں پر ہنس رہے تھے البم دیکھتے دیکھتے ایک تصویر کو دیکھ کر چھ سات سال کی فائزہ دونوں ہاتھ البم پر رکھ کر جھکتے ہوئے تصویر کو قریب سے دیکھ کر بولی۔

"واؤ مناہل تمہاری ممی کتنی اچھی لگ رہی ہیں۔"

"میری ممی تو ہیں ہی اچھی۔" وہ اتھلا کر بولی۔

"مگر میری ممی زیادہ اچھی ہیں۔" فائزہ کو جیسے اب اپنے بے ساختہ اظہار پر افسوس ہوا تھا۔ زوار کو اس کی بات بری لگی تھی تیز لہجے میں کہا۔

"جی نہیں میری ممی زیادہ اچھی ہیں۔" فائزہ اپنے سے بڑے زوار کے لہجے پر سہم گئی جواد نے جو اپنی بہن کو کمزور پڑتے دیکھا تو فوراً "میدان میں کود پڑا۔

"غلط میری ممی سے زیادہ اچھا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔" مناہل کافی صلح جو بچی تھی اس نے جو سب کے بگڑے تیور دیکھے تو فوراً" بولی۔

"ایک منٹ لڑنے کی کیا ضرورت ہے ہم شایان بھائی سے پوچھ لیتے ہیں کہ کس کی ممی زیادہ اچھی ہیں"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" سب کو یہ آئیڈیا پسند آیا تھا پھر جواد سب کی نمائندگی کرتے ہوئے شایان سے بولا۔

"بتاؤ شایان ہماری ممی زیادہ اچھی ہیں یا زوار اور مناہل کی۔" ننھے جج نے مدبرانہ انداز میں دونوں پارٹیوں پر نظر ڈالی پھر سب بڑوں کو دیکھا جن کے ہونٹوں میں مسکراہٹیں دبی تھیں اور آرام سے فیصلہ سنایا۔

"تم سب کی ممی اچھی ہیں مگر سب سے اچھی تو صرف میری امی ہیں۔" وجدان' آفاق اور سمیرا ہی اس کی بات سن کر اچنبھے میں گھر گئے تھے ورنہ باقی سب تو ہنستے ہنستے بے حال ہو گئے۔ لیکن بچے ایک نے حریف کو پاکر خاصے بددل ہو گئے تھے زوار تو تنک کر بولا۔

"جھوٹ مت بولو تمہاری تو کوئی امی ہیں ہی نہیں شایان جھٹ سے بولا۔

"میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں میری امی ہیں۔"

"ہیں تو دکھاؤ۔" جواد نے بڑھ کر چیلنج کیا تو شایان اداس سا ہو کر بولا۔

"وہ تو اللہ میاں کے پاس چلی گئی ہیں۔" مگر پھر جوش سے کہنے لگا۔

"لیکن میرے پاس ان کی تصویریں ہیں۔" فائزہ بولی۔

"تو تصویریں ہی دکھا دو۔"

"ابھی لایا۔" وہ اٹھا اور بھاگ گیا۔ وجدان الجھ گیا تھا کہ آخر شایان نے اپنی ماں کہاں سے دریافت کر لی آفاق اور سمیرا بھی حیران سے تھے تبھی وہ واپس آیا۔

"یہ رہیں میری امی کی تصویریں۔" اس نے کہتے ہوئے لفافہ ہاتھ میں پکڑ کر جھاڑ دیا اور ٹیبل پر پہلے سے کھلے البم کے اوپر ملیحہ کی تصویریں بکھر گئیں۔ وجدان کے تو ہوش اڑ گئے تھے آفاق اور سمیرا بھی سٹپٹا گئے۔ دونوں نے ایک ساتھ اس کی طرف وضاحتی نگاہوں سے اسے دیکھا پر اس کے متغیر چہرے کو دیکھ کر احساس ہوا کہ وہ بھی حیرت میں ہے۔ مناہل ملیحہ کی ایک تصویر ہاتھ میں لے کر مزمل سے کہہ رہی تھی۔

"دیکھیں پاپا شایان بھائی کی امی کتنی پیاری ہیں۔"

وہ سمجھانے لگا۔

"شایان بھائی کی امی نہیں انہیں چاچی کہو۔"

"چاچی سچ مچ بہت پیاری ہیں۔" زوار بولا بچے اختلاف بھلا کر تصویروں میں کھو گئے تھے اور شایان ان کے توصیفی جملوں کو سن کر فخر سے مسکرا رہا تھا۔ آفاق تو ملیحہ کے لیے چاچی کا خطاب سن کر بھی خود کو سنبھالے رہا پر سمیرا کے چہرے پر ناگواری جھلک آئی تھی لیکن وہ لوگ ہمیشہ ملیحہ سے لاتعلقی کا اظہار کرتے آئے تھے اس لیے کچھ بول نہ سکے اور وجدان تو کچھ بولنے کے لائق نہیں رہا تھا مگر چاچی کا لفظ سنتے ہی اس کے اعصاب جھنجھنا گئے۔

"یہ کیا لگا رکھا ہے؟" وہ سخت آواز میں بولا۔

"شایان یہ تصویریں تمہیں کہاں سے ملیں؟" شایان نے پہلے کبھی وجدان کو غصے میں نہیں دیکھا تھا وہ سہمے ہوئے انداز میں مصطفیٰ عظیم کے پیچھے جا چھپا تو انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے پاس کر لیا اور وجدان کو دیکھ کر ناراضی سے بولے۔

"بچے کو کیوں ڈانٹتے ہو جو کہنا ہے مجھ سے کہو ملیحہ کی تصویریں اسے میں نے ہی دی تھیں۔"

"آپ نے۔" وہ حیرت سے بولا۔

"ہاں حالانکہ یہ کام تمہیں کرنا چاہیے تھا۔ ایک تو اس معصوم نے اپنی ماں کو کھو دیا اوپر سے تم نے بھی اسے اس کی ماں سے انجان رکھا اس کا نام تک شایان کو نہیں بتایا۔ ماں کا حوالہ بچے کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے وجدان قدرت پیدائش کے وقت ہی ہر بچے کے دل میں ماں کے لیے محبت ڈال دیتی ہے اس محبت کو کنارہ ملنا ضروری ہے جو اگر نہ ملے تو بچے کے اندر خلا رہ جاتا ہے تم کیسے باپ ہو جو اپنے ہاتھوں اپنے بچے کو خلا میں دھکیلنا چاہتے ہو۔"

"ابو پلیز۔" وہ کوفت بھرے انداز میں ہاتھ اٹھا کر بولا تو وہ تاسف سے کہنے لگے۔

"مجھے تم پر افسوس ہو رہا ہے وجدان تمہارے لیے اپنا دکھ اپنی اولاد سے بڑھ کر ہے ذرا سوچو تم اس عمر میں بھی ماں کے آنچل کی چھاؤں تلاش کرتے ہو اور اس معصوم نے تو ماں کی گود دیکھی ہی نہیں وہ ماں کے لیے کتنا ترستا ہو گا۔ اس کی یہ محرومی تو ختم نہیں ہو سکتی پر کم از کم اس کے پاس اپنی ماں کی شناخت تو ہو۔"

"آپ کی ہر بات صحیح لیکن اس حوالے سے ملیحہ کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" وہ چڑ کر بولا تھا۔

"حد کرتے ہو وجدان۔" عائشہ ملامتی لہجے میں کہنے لگیں۔

"اگر ملیحہ کا ذکر نہ ہو تو کس کا ہو وہ صرف تمہاری بیوی ہی نہیں تھی ہمارے پوتے کی ماں بھی تھی بہو تھی ہماری۔" وجدان کے تو جیسے سر پر دھماکہ ہوا تھا اس نے ایک دم سے ہاتھ اٹھا کر انہیں چپ کرا دیا پھر انگلی دکھاتے ہوئے سخت لہجے میں بولا۔

"نہ تو شایان آپ کا پوتا ہے اور نہ ملیحہ آپ کی بہو تھی۔ ان دونوں سے آپ کا کوئی رشتہ نہیں۔ آئندہ یہ بات یاد رکھیے گا۔" وجدان کی ہمت جواب دے گئی تھی اپنی بات کہہ کر اس نے ٹیبل پر سے فوٹو گرافس اٹھائیں پھر شایان کی طرف ہاتھ بڑھایا جس کے ہاتھوں میں ملیحہ کی تصویر تھی اور کہا۔

"یہ تصویر مجھے دے دو۔" وہ ہاتھ پیچھے کر کے نفی میں سر ہلانے لگا تو وجدان نے ہاتھ بڑھا کر وہ تصویر اس کے ہاتھ سے نکالی پھر پلٹ کر دیکھا بھی نہیں وہ مچل کر روتا ہوا اس کے پیچھے آیا تھا مگر مزمل نے اس کا بازو تھام کر اسے اپنی گود میں لے لیا اور چپ کرانے لگا مگر وہ روتا ہی گیا۔ آفاق اور سمیرا اب پرسکون ہو گئے تھے آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارہ کر کے اٹھ گئے۔

"ہم چلتے ہیں۔" آفاق نے سسکتے میں گھری عائشہ سے کہا پر کسی نے جیسے سنا ہی نہیں اور وہ دونوں اپنے بچوں کے ساتھ باہر آ گئے۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی سمیرا

آفاق سے بولی۔

"یہ لوگ بھی عجیب ہیں نہ کسی سے پوچھا نہ سوال کیا اور سب کچھ خود ہی فرض کر کے بیٹھ گئے۔"

"مگر اب تو وجدان صاف صاف کہہ چکا ہے بس بات ختم ہو گئی لیکن گھر میں کسی سے ذکر نہ کرنا۔" ثمیرا کو ہدایت کرتے ہوئے آفاق نے انجن اسٹارٹ کر دیا۔

مگر بات ختم نہیں ہوئی تھی۔ عائشہ کی حالت خراب ہو گئی تھی انیقہ فٹافٹ جا کر گلوکوز بنا لائی جسے پی کر ان کے حواس کچھ واپس آئے۔

"آپ نے دیکھا مصطفیٰ صاحب وہ کیسے کہہ کر گیا ہے کہ شایان سے ہمارا کوئی رشتہ نہیں اس کا دل میری طرف سے صاف نہیں ہوا حالانکہ اس نے بھی تو ملیحہ سے شادی کر کے اپنی مرضی پوری کر لی تھی پھر اگر وہ نہ جی سکی تو میری کیا غلطی ہے۔" انیقہ ان کے پاس بیٹھ کر پیار سے ان کے بال سمیٹتے ہوئے بولی۔

"وہ جو بھی کہے مگر سچ تو یہی ہے نا کہ شایان آپ کا خون ہے پھر دل پہ چھوٹا کیوں کرتی ہیں۔" مزمل بھی بولا۔

"انیقہ ٹھیک کہہ رہی ہے امی شایان ہمارا خون ہے اور یہ رشتہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا اور ابو آپ بھی شایان کو ہمیشہ سمجھاتے رہے کہ وجدان کے سامنے ملیحہ کا نام نہ لے وہ ڈسٹرب ہو جائے گا اور خود ہی غلطی کر دی۔"

"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس طرح سے ری ایکٹ کرے گا۔" وہ افسردہ ہو گئے عائشہ نے دوپٹے سے چہرہ خشک کر کے شایان کو دیکھا جو ابھی تک رو رہا تھا اور اس کی طرف اپنے بازو پھیلا دیے۔

"ادھر میرے پاس آجاؤ۔" اور وہ روتے روتے ہی مزمل کے بازوؤں سے نکل کر ان کی آغوش میں سما گیا۔

وجدان دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیڈ پر بیٹھا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ شایان کے حوالے سے اس کے گھر والے کیا سوچ رہے تھے۔ اپنی ناکام تمنا کو اس روپ میں دیکھ کر اس کے سارے زخم رسنے لگے تھے وہ خود کو سمیٹنے میں لگا ہوا تھا کہ انیقہ اچانک ہی بنا دستک دیے گھبرائی سی کمرے میں چلی آئی۔

"کیا بات ہے بھابھی۔" وہ اس کی ہواس باختگی پر چونک گیا۔

"باہر آ کر دیکھو وجدان، شایان روتے روتے بے ہوش ہو گیا ہے۔" وجدان گھبرا کر اٹھا اور بھاگتا ہوا لاؤنج میں آ گیا مصطفیٰ عظیم بے ہوش شایان کو گود میں لیے بیٹھے تھے پاس ہی حواس باختہ سی عائشہ ہاتھ میں پانی کی بوتل لیے بیٹھیں اس کے چہرے پر چھینٹے مار مار کر ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وجدان کی جان پر بن آئی تھی اس نے تیزی سے شایان کو اپنی گود میں لے لیا۔

"شایان۔" وہ اس کے گال تھپک کر آوازیں دینے لگا۔

"آنکھیں کھولو بیٹا۔ میری طرف دیکھو۔" مگر اس کی صدائیں بے کار گئیں۔ وجدان گھبرا ہی تو گیا تھا۔

"اسے ہوش نہیں آ رہا ابو چلیں اسے ہاسپٹل لے کر چلتے ہیں۔"

"مزمل ڈاکٹر کو بلانے گیا ہے۔" وجدان پریشانی سے لب کاٹنے لگا پھر اسے گود میں اٹھا کر کمرے میں لے آیا اور بیڈ پر لٹا دیا۔ چند منٹ بعد ہی ڈاکٹر صاحب مزمل کی معیت میں چلے آئے انہوں نے اچھی طرح شایان کو چیک کیا پھر پوچھا۔

"یوں تو سب ہی ٹھیک لگ رہا ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ نے بچے کو کچھ زیادہ ہی ڈانٹ دیا ہو۔"

"کچھ ایسا ہی ہے۔" مزمل نے وجدان کو دیکھ کر کہا۔

"آپ کو اتنی سختی نہیں کرنی چاہیے بچہ سہم گیا ہے بہرحال میں انجکشن لگا دیتا ہوں دو گھنٹے میں اسے ہوش آ جائے گا لیکن آئندہ احتیاط کیجیے گا بعض بچوں کے ساتھ خاص طور پر نرمی برتنے کی ضرورت ہوتی ہے ان میں سختی برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہوتی آپ کا بچہ بھی بہت حساس ہے۔" ڈاکٹر نے شایان کو انجکشن لگا دیا۔

وجدان پریشان سا بیڈ پر بیٹھ کر اس کے بال سہلانے

لگا۔

عشاء کی نماز کے بعد دعا مانگ کر بھی وجدان گھر آنے کے بجائے گم صم سا وہیں مسجد میں بیٹھا رہا کافی دیر بعد جب احساس جاگا کہ سب نمازی چلے گئے ہیں تو وہ بھی سست قدموں سے چلتا مسجد سے باہر آ گیا اسے شدت سے غم گسار کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی گھر جانے کے بجائے وہ آفاق کے گھر آ گیا۔

"تم اس وقت، سب ٹھیک تو ہے پریشان سے لگ رہے ہو۔" اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ آفاق کو سمجھ نہیں آیا کہ یہ اس کے کس سوال کا جواب ہے اس لیے الجھ سا گیا۔

"اچھا اندر تو آؤ۔"

"نہیں باہر ہی ٹھیک ہے۔" آفاق کا ماتھا ٹھنکا مگر خاموش رہا۔ دونوں کچھ قدم دور الیکٹرک پول کے نیچے جا کر بیٹھ گئے۔

"کیا ہوا ہے۔" اسے خاموش دیکھ کر آفاق نے اسے بولنے پر اکسایا تو وہ کہنے لگا۔

"مجھے لگ رہا ہے کہ جیسے میں برف میں دفن ہو چکا ہوں اور جسم کے ساتھ میرا ذہن بھی سن ہو گیا ہے مجھے سمجھ نہیں آ رہا آفاق کہ میرے گھر والوں نے ملیحہ کے بارے میں یہ سوچا بھی کیسے ان کا مجھ سے یا شایان سے کوئی رشتہ رہا ہو گا۔" آفاق چپ سا رہ گیا پھر بولا۔

"اگر انہوں نے ایسا سوچا تو کچھ غلط نہیں کیا وہ تو یہی سمجھتے ہیں کہ شایان تمہارا اپنا بیٹا ہے اور تمہارے بیٹے کی ماں ملیحہ کے سوا کون ہو سکتی ہے۔"

"ان کے ساتھ میرا ایسا رشتہ نہ جوڑو۔" وجدان کا لہجہ عجیب سا ہو گیا تھا۔

"میں کب جوڑ رہا ہوں۔" آفاق جلدی سے ہاتھ اٹھا کر بولا۔

"ویسے اگر تم پہلے ہی اپنے گھر والوں کو شایان کے بارے میں سچ بتا دیتے تو آج یہ سب نہ ہوتا۔" اس کی بات پر وجدان وضاحت دینے لگا۔

"میں نے کبھی اپنے گھر والوں کو دانستہ اس بات کے لیے مجبور نہیں کیا تھا کہ وہ شایان کو میری سگی اولاد سمجھیں لیکن آج جب میں نے محسوس کیا کہ وہ ایسا ہی سمجھ رہے ہیں تو مجھے چپ رہنا بہتر لگ رہا ہے اور اس کی وجہ صاف ہے شایان کو جو محبت اور مقام میرے بیٹے کی حیثیت سے ملی ہے وہ کسی گمنام بچے کو نہیں ملے گی بلکہ یہ جان کر کہ اس کے پیدا کرنے والے اسے غلاظت کی طرح خود سے الگ کر کے پھینک گئے تھے اس کی ذات تضحیک و تحقیر کا نشانہ بن جائے گی لوگ اسے گناہ کی پیداوار کہہ کر دھتکار دیں گے ہمارے معاشرے میں اسی ظالم رسوم کا رواج ہے کہ گنہگار سے کوئی نہیں پوچھتا کہ اس نے گناہ کا ارتکاب کیوں کیا مگر بے گناہ کو سزا دینے سبھی چلے آتے ہیں میں شایان کو طنز کا نشانہ بننے نہیں دے سکتا ایسے سچ کا کیا فائدہ کہ لوگ اسے ذلت کے گڑھے میں اتار کر عمر بھر تحقیر کے پتھروں سے سنگسار کرتے رہیں کسی اور کو سچ بتانا تو دور میں کبھی شایان کو بتانے کی ہمت بھی نہیں کر پاؤں گا کیونکہ میں جانتا ہوں اگر اسے پتا چل گیا تو وہ اپنی ہی نظروں میں گر جائے گا نہیں آفاق یہ بات کسی کو پتا نہیں چلنی چاہیے۔" نم آنکھوں کے ساتھ وہ بے ساختہ نفی میں سر ہلاتا ہوا کہہ رہا تھا۔

"وعدہ کرو یہ راز ہمیشہ راز رہے گا میرے مرنے کے بعد بھی تم کسی قیمت پر اس راز سے پردہ نہیں اٹھاؤ گے۔ شایان میرا بیٹا ہے اور اس کا یہ بھرم ہمیشہ قائم رہنا چاہیے بلکہ میں تو یہ دعا کرتا ہوں کہ قیامت کے دن بھی اس کا یہ بھرم نہ ٹوٹے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں کبھی یہ بات میری زبان پر نہیں آئے گی۔" آفاق نے وعدہ کیا تھا پھر قصداً ماحول میں رچے تناؤ کو کم کرنے کے لیے مسکرا کر بولا۔

"تم صرف یہ وعدہ لینے کے لیے اس وقت چلے آئے۔" لیکن وجدان کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

"نہیں میں تو اس خیال سے پریشان ہو کر تمہارے پاس آیا تھا جو ملیحہ کے لیے میرے گھر والوں کے ذہن میں ہے۔"

"لیکن وہ بات تو صاف ہو گئی تھی۔" آفاق اچنبھے

سے بولا۔

"نہیں ہوئی لیکن انہیں تو میں کوئی بھی کہانی سنا کر سمجھالوں گا اصل مسئلہ شایان کا ہے جس کے دل میں ملیحہ ماں کی حیثیت سے نقش ہو چکی ہیں صرف ان کی تصویریں چھن جانے پر اس کا ردعمل اتنا شدید ہے کہ تمہارے جانے کے بعد روتے روتے بے ہوش ہو گیا کافی دیر بعد ہوش آیا بھی تو ابھی تک بخار میں پھنک رہا ہے لیکن دوپہر سے پانی کی ایک بوند بھی حلق سے نہیں اتاری دوا لینے کی تو بات ہی کیا ہے سوچتا ہوں اگر ملیحہ کا خیال اس سے چھن گیا تو کیا کرے گا؟" اس کی آواز کی پریشانی سے حالات کی سنگینی کا اندازہ کر کے آفاق بھی پریشانی میں گھر گیا لیکن اس کے پاس بھی اس پریشانی کا کوئی حل نہیں تھا دونوں کتنی ہی دیر خاموش بیٹھے اپنی سوچوں سے الجھتے رہے پھر تھک کر وجدان اٹھ کھڑا ہوا۔

"اب چلتا ہوں شایان کی طبیعت ٹھیک نہیں مجھے اس کی فکر ہو رہی ہے۔" آفاق نے بس سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

وجدان گھر پہنچا تو مصطفیٰ عظیم اس کے انتظار میں بے چینی سے گیٹ کے پاس ٹہل رہے تھے اسے دیکھ کر تیزی سے اس کے پاس آئے۔

"حد ہوتی ہے لاپرواہی کی بیمار بچے کو چھوڑ کر کئی گھنٹوں سے غائب ہو کسی اور کا احساس نہ سہی انسان اپنی اولاد کا احساس تو ہی کر لیتا ہے۔"

"کیا شایان کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے۔" ان کے انداز سے سمجھ کر وہ پریشان ہوا تو وہ اور بھی بھڑک گئے۔

"خود ہی جا کر دیکھ لو۔" کمرے میں آیا تو بیڈ پر نظر پڑتے ہی وہ گھبرا گیا۔ شایان بے سدھ پڑا تھا مزمل پریشان سی صورت لیے اس کے سرہانے بیٹھا تھا دوسری طرف متفکر سی بیٹھی انیقہ اس کے ماتھے پر پٹیاں رکھ رہی تھی اس کے سامنے ہی عائشہ بیٹھی تھیں اور ٹھنڈے پانی میں بھیگا تولیہ کبھی شایان کے تلووں پر رگڑتیں اور کبھی نم تولیے سے اس کا سینہ مسلنے لگتیں تو لگتا بھاپ اڑ رہی ہو۔ لیکن شایان کے دہکتے چہرے کو دیکھ کر لگ نہیں رہا تھا کہ ان کی کوششیں سودمند ثابت ہو رہی ہیں۔ وجدان بوکھلایا سا شایان کے پاس چلا آیا۔ عائشہ مصطفیٰ نے اسے بیڈ کے دوسری طرف آ کر بیٹھتے دیکھا تو غصے سے بولیں۔

"تم اب آ رہے ہو۔" وہ انہیں نظر انداز کرتا شایان کے چہرے پر ہاتھ رکھ کر بخار کی شدت محسوس کر کے پریشانی سے بولا۔

"بخار تو بہت تیز ہو گیا ہے۔" تو وہ تڑخ کر بولیں۔

"تمہیں کیا تم جا کر مری بیوی کا دکھ مناؤ زندہ اولاد چاہے تڑپتی رہ جائے پر یاد رکھو جس کی یاد میں صبح شام اداس پھرتے ہو اسے پیدا کرنے والی بھی وہی تھی تم ملیحہ پر صرف اپنا حق سمجھتے ہو مگر یہ بھی اس حق میں شامل ہے اور مت بھولو کہ عورت پر شوہر سے زیادہ حق اولاد کا ہوتا ہے اور جس نے یہ حق چھینا اسے معافی نہیں ملے گی۔"

"بس کریں امی۔" مزمل نے انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تو وہ اسی پر چڑھ دوڑیں۔

"خبردار جو تم نے اس کی طرف داری کی تو غضب خدا کا کیا حالت ہو گئی ہے بچے کی دوپہر سے رات تک میں نچڑ کر رہ گیا ہے مگر باپ کو پرواہی نہیں۔"

"کیا ہو گیا ہے امی کچھ تو خیال کریں اس کا بچہ بیمار ہے اور بھلا باپ سے زیادہ کسے پروا ہو سکتی ہے۔ ریلیکس یار اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں بچے تو بیمار پڑا ہی کرتے ہیں۔" مزمل کی تسلی کے جواب میں بھی وجدان خاموش ہی رہا۔ شایان کے تپتے ہاتھ کی پشت پر ہونٹ رکھتے ہوئے آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں وجدان کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں وہ خود کو بے بسی کی انتہا پر محسوس کر رہا تھا۔

"رات کافی ہو گئی ہے مزمل بھائی جائیں آپ بھابھی کو لے جائیں اور خود بھی آرام کریں اور ابو آپ بھی تو تھک گئے ہوں گے آپ شایان کی فکر نہ کریں میں اس کے پاس ہوں اور امی کو بھی سمجھائیں یوں پریشان ہونے سے ان کی طبیعت خراب ہو جائے

گی۔" اس نے مصطفیٰ عظیم سے کہا تو انہوں نے سر اثبات میں ہلا دیا اور اٹھ کر کمرے سے باہر چلے گئے وقفے وقفے سے سب اٹھ کر اپنے اپنے کمرے میں آرام کرنے چلے گئے۔

آٹھ سال میں پہلی بار ایسا ہوا کہ وجدان نے جماعت چھوڑ دی ہو فجر کی نماز اس نے کمرے میں ہی پڑھی تھی۔ فجر کی نماز کے بعد وہ جائے نماز پر بیٹھا دعا مانگ رہا تھا۔

"یہ تو میں جان چکا تھا کہ تو کبھی لے کر اور کبھی دے کر آزماتا ہے مگر یہ نہ جان پایا تھا کہ کبھی کبھی تو پرانے زخموں کو ادھیڑ کر بھی نئی آزمائش میں ڈالتا ہے۔ اللہ مجھے اتنی طاقت دینا کہ اس آزمائش سے گزر جاؤں نہ۔" منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ سجدہ ریز ہو گیا پھر جائے نماز تہہ کر کے الماری میں رکھتا وہ بیڈ پر بیٹھ کر شایان کا ٹمپریچر چیک کرنے لگا رات بھر وجدان نے کر بستر سے نہ لگنے دی تھی کی اب کہیں جا کر کچھ تسلی ہوئی تو وہ تکیہ اونچا کر کے نیم دراز ہو گیا۔ کچھ دیر ہی گزری تھی کہ وجدان کو اپنے بائیں ہاتھ کی پشت پر شایان کے ہاتھ کا لمس محسوس ہوا وہ دائیں بازو سے آنکھیں ڈھک کر لیٹا تھا چونکتے ہوئے بازو ہٹا کر شایان کو دیکھنے لگا اسے ہوش آ گیا تھا اور بار بار پلکیں جھپکتا وہ کسمسا رہا تھا وجدان تیزی سے اس کی طرف جھکا اور پیار سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بے تابی سے کہا۔

"بیٹا تم ٹھیک ہو نا۔" وہ خالی نگاہوں سے وجدان کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔

"امی کی تصویر دے دیں ابو۔" وجدان بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گیا پھر تھکن بھرے انداز میں سیدھا ہو بیٹھا۔ شایان بھی اٹھ کر بیٹھ گیا پھر اس کی آستین مٹھی میں پکڑ کر ہلاتے ہوئے بولا۔

"بیٹا ضد چھوڑ دو میں بہت پریشان ہو گیا ہوں اور ذرا اپنی حالت دیکھو خود کو بیمار کر لیا ہے پھر ان تصویروں کو پاس رکھنے سے ملیحہ تو تمہارے پاس نہیں آ جائے گی۔" وجدان بڑی عاجزی سے منت کر رہا تھا مگر شایان کے لیے تو بس یہی بات اہم تھی کہ وجدان اسے ملیحہ کی تصویریں دینے سے انکار کر رہا ہے پل بھر میں اس کے تاثرات بدلے اور سنجیدگی کو ہٹا کر اس کی صورت رونی ہو گئی وہ ایک دم سے وجدان کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹا کر اس کی طرف سے منہ پھیرتے ہوئے تکیے میں منہ چھپا کر لیٹ گیا اور کچھ دیر بعد ہی اس کے رونے کی آوازیں آنے لگیں پتا نہیں اس کے پاس اتنے آنسو کہاں سے آ گئے تھے کہ کل سے ابھی تک خشک ہی نہیں ہوئے۔ رونے سے اس کے جسم کو جھٹکے لگ رہے تھے جنہوں نے وجدان کو زلزلوں میں دھکیل دیا تھا کوئی بے بسی سی بے بسی تھی اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ شایان کو کیسے سمجھائے۔ وجدان کی برداشت ختم ہو چکی تھی وہ اس سے زیادہ شایان کا رونا بلکنا نہیں سہہ سکتا تھا وہ اٹھا اور الماری میں سے تصویروں کا لفافہ نکال کر ایک تصویر ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگا۔

"میں نے ہمیشہ ان فاصلوں کی عزت کی جو آپ نے کبھی اپنے اور میرے درمیان مٹنے نہیں دیئے مگر اب شاید میں ان کا بھرم نہ رکھ پاؤں یہ جرم آپ کے نزدیک بہت بڑا ہو گا لیکن مجھے معاف ضرور کر دیجیے گا۔" وہ دل ہی دل میں کہتا تصویر ہاتھ میں لیے بیڈ پر آ بیٹھا لفافہ سائیڈ میں رکھ کر اس نے ملیحہ کی تصویر شایان کے چہرے کے سامنے کر دی۔ اس نے روتے روتے آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا تھا پھر۔

"میری امی۔" کہتے اس نے تصویر جھپٹ لی اور اٹھ بیٹھا وہ سارا رونا بھول کر مسکرانے لگا تھا جیسے کوئی خزانہ ہاتھ آ گیا ہو۔

"میری پیاری امی۔" وہ پیار سے تصویر پر ہاتھ پھیر کر اسے چوم رہا تھا پھر اسے سینے سے لگا لیا وجدان اسے دیکھتا رہا جب وہ جی بھر کے ملیحہ کی تصویر کو پیار کر چکا تو وجدان نے پیالہ اٹھا کر یخنی چمچہ میں بھر کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"اب تو یخنی پیو گے۔"

"ساری پی جاؤں گا اور دوا بھی پیوں گا۔" وہ مگن سے انداز میں کہہ رہا تھا مگر وجدان جواب میں مسکرا بھی نہ سکا پھر واقعی اس نے پورا پیالہ ختم کر کے سیرپ

پیا اور اس کے بعد آرام سے سو گیا مگر سوتے ہوئے بھی ملیحہ کی تصویر اس کا گال کے نیچے دبی تھی۔

☼ ☼ ☼

شام میں آفاق شایان کی خیریت دریافت کرنے آیا تو وجدان اس وقت اپنے کمرے میں بیٹھا شایان کو پڑھا رہا تھا وہ آتے ہی صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

"السلام و علیکم۔" وجدان کی آواز میں تنبیہہ تھی آفاق بے تحاشا ہنستے ہوئے۔

"وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔" کہتا سیدھا ہو بیٹھا اور کہنے لگا۔

"یار یہ چنگ والے تجھے ماسٹر عبداللہ کیوں کہتے تھے انہیں تو تیرا نام مولوی عبداللہ رکھنا چاہیے تھا۔" وجدان ذرا سا مسکرا دیا۔

"ارے صاحب یہاں تو زوروں پر پڑھائیاں چل رہی ہیں لگتا ہے شایان ٹاپ کرے گا ویسے ٹیسٹ کی کیا ڈیٹ اناؤنس ہوئی ہے۔" اس نے وجدان سے پوچھا۔

"اگلے مہینے کی دو تاریخ۔" آفاق نے سر ہلا کر شایان کو دیکھا جو منہ میں پنسل دبائے کبھی اس کا تو کبھی وجدان کا چہرہ دیکھنے لگتا آفاق نے محسوس کیا کہ وہ واقعی ایک دن میں بہت کمزور ہو گیا تھا مگر اس وقت تو وہ ہشاش بشاش بیٹھا تھا آفاق کو شرارت سوجھی وہ ایک دم سے شایان کے بیگ میں کچھ ڈھونڈنے لگا۔

"کیا ڈھونڈ رہے ہیں انکل۔"

"بھئی تمہارے ابو کہہ رہے تھے تمہیں بخار ہے پر مجھے نظر نہیں آ رہا کہاں گیا۔

تم نے ضرور دوا کھالی ہوگی تبھی تو وہ بھاگ گیا۔"

"دوا سے تو نہیں بھاگا انکل وہ تو ابو نے امی کی تصویر دے دی تو وہ امی کے ڈر سے بھاگ گیا۔" آفاق جو بچے کے ساتھ مذاق کو انجوائے کر رہا تھا ٹھٹک کر بولا۔

"امی کی تصویر۔"

"ہاں یہ دیکھیں میری امی کی تصویر۔" اس نے سائیڈ میں رکھا فریم اٹھا کر آفاق کی طرف بڑھایا تو آفاق نے اب کہیں جا کر نوٹ کیا ملیحہ کی تصویر وجدان کے بیڈ کے سائیڈ ٹیبل پر فریم ہوئی رکھی تھی۔ فریم ہاتھ میں پکڑتے ہوئے اس نے وجدان کو دیکھا جس نے نظر جھکالیں پھر آہستہ سے اٹھ کر باہر چلا گیا آفاق کی نظریں بھی اس کے تعاقب میں دروازے تک گئی تھیں جبکہ نا سمجھ بچہ ان دونوں کی کیفیتوں سے بے خبر معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔

"انکل میری امی اچھی ہیں نا۔"

"میں ابھی آتا ہوں۔" آفاق عجلت میں اس سے کہہ کر باہر آ گیا وجدان اسے ٹیرس میں مل گیا تھا وہ ریلنگ پر کہنیاں ٹکائے سر جھکا کر نیچے دیکھ رہا تھا۔ آفاق اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔

"وہ بہت ضد کر رہا تھا آفاق۔" وجدان نے مڑے بغیر کہا جیسے اس کی آہٹ پہچان گیا ہو آفاق چلتا ہوا اس کے برابر ریلنگ تھام کر کھڑا ہو گیا وجدان کو اس کی خاموشی شرمندہ کر رہی تھی وہ دھیمی آواز میں کہنے لگا۔

"یہ سب وقتی ہے کچھ دن گزر جانے دو پھر میں اسے سمجھا بجھا کر ملیحہ کی تصویر واپس لے لوں گا۔"

"لیکن اس تصویر کا کیا جو اس کے ذہن میں فٹ ہو چکی ہے۔" اس کی بات سن کر وجدان نے لب بھینچ لیے۔

"بچہ ہی تو ہے بہل گیا تو بھلا بھی دے گا۔"

"محض خیال ہے تمہارا اس کے اندر ماں کا احساس جاگ چکا ہے وہ بہلے گا نہیں سوال کرے گا کہ اگر ملیحہ اس کی ماں نہیں تو پھر اس کی ماں کون تھی؟"

"اس نے نو سال میں کبھی مجھ سے یہ سوال نہیں پوچھا۔"

"اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں وہ نو سال بعد تم سے یہ سوال نہیں پوچھے گا آج اگر بہل بھی گیا تو اس وقت وہ ہر صورت اپنے سوال کا جواب جان کر رہے گا۔"

"کہہ دوں گا تھی کوئی اور اس کی پیدائش کے وقت مر گئی۔" وجدان جھنجلا کر بولا تھا۔

"تمہیں لگتا ہے وہ یہ سن کر مطمئن ہو جائے گا۔"

"ہو جانا چاہیے۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

"لیکن ہو گا نہیں وہ پوچھے گا اس کی ماں کس کی بیٹی تھی کہاں رہتی تھی کدھر دفن ہوئی اور اگر تم اسے اس کی ماں کی شناخت نہ دے پائے تو وہ یقیناً" اس تلاش میں چنگ والی کا رخ کرے گا۔ وہاں کے لوگ اسے اس کی ماں کی شناخت تو نہیں بتا سکیں گے لیکن شایان کو اس کی پہچان ضرور کرا دیں گے تو کیا یہ بہتر نہیں کہ تم اسے خود ہی سچ بتا دو...... ہماری سوسائٹی میں ایسے کئی بچے پیدا ہوتے ہیں جنہیں ان کی مائیں پولی تھن بیگ میں ڈال کر کچرے کے ڈھیر پر پھینک دیتی ہیں ان میں سے کئی تو اپنے ماں باپ کے طفیل جرم بے گناہی میں سزائے موت پا جاتے ہیں اور جو بچ جاتے ہیں وہ آخر کار اس تلخ حقیقت کو قبول کر لیتے ہیں..... ایک دن شایان بھی اس تلخ حقیقت کے ساتھ کمپرومائز کر لے گا۔"

"کمپرومائز..... ہونہہ۔" وجدان نے طنز سے کہا۔

"کمپرومائز کے اس دلاسے میں کتنا سچ ہے جاننا ہو تو ریکارڈ اٹھا کر دیکھو ایسے بچے آگے چل کر اینٹی سوشل ایکٹویٹیز کا حصہ بن جاتے ہیں میں نے عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ایسے کئی مجرموں کے چہرے دیکھے ہیں جن کی کہانی کچرے کے ڈھیر سے شروع ہوتی ہے اور ختم یا تو جیل کی سلاخوں پر ہوتی ہے یا کسی پولیس والے کے ریوالور سے نکلی گولی پر..... یا پھر وہ خود ہی اپنے ہاتھوں زندگی کا بوجھ اتار پھینکتے ہیں اور جو اس کی ہمت نہ کر سکیں وہ چرس اور افیون کا زہر رگوں میں اتارتے کسی گندے جوہڑ کے کنارے پڑے موت کے انتظار میں سسکتے رہتے ہیں۔ لیکن اس سب کے ذمہ دار صرف ان کے ماں باپ ہی نہیں ہیں میں بھی ہوں..... تم بھی ہو ہماری یہ سوسائٹی ہے جو ایسے لوگوں کو پروڈیوس کرتے ہیں جو گناہ کو عیب نہیں سمجھتے اور پھر جب وہ اپنے ماتھے پر لگے راتوں کے گناہ کے سیاہ داغوں کو دن میں نیک نامی کی چادر سے ڈھک کر معصوم چہرہ بنائے انجان سے ہمارے درمیان اٹھتے بیٹھتے ہیں تو مزید انہیں معزز کہہ کر انہیں پھلنے پھولنے کا موقع دیتے ہیں۔

ہم میں سے کوئی راتوں کو جاگ کر کچرے کے ڈبوں کی چوکیداری نہیں کرتا تاکہ ان گناہ گاروں کو دوسرے گناہ سے روکا جا سکے لیکن صبح جب چوہے ان معصوم بچوں کے نرم گوشت کتر چکے ہوتے، کتے رات بھر میں انہیں بھنبھوڑ ڈالتے ہیں تو پورا محلہ گہری نیند سے جاگ کر ان مسخ لاشوں کے آخری دیدار کو آ پہنچتا ہے پھر بڑے اہتمام سے ان کی تدفین ہوتی ہے اور اگر کوئی بد نصیب نوکیلے دانتوں کی کاٹ سہہ گیا ہو تو اس کی مرہم پٹی بھی کی جاتی ہے تاکہ وہ زندہ رہ کر زندگی بھر یہ طعنہ سنے کہ اسے ڈوب مرنا چاہیے۔ ہر ایک بے گناہ چہرے کے پیچھے دو گناہ گار چہرے چھپے ہوتے ہیں مگر بے گناہ تو چلتے پھرتے نظر آتے ہیں لیکن گناہ گاروں کی دو گنا اکثریت کہاں چلی جاتی ہے۔" وہ ماتھے پر سلوٹیں لیے سوال کر رہا تھا لیکن جواب خود اس کے پاس بھی نہیں تھا۔ اس نے لب بھینچتے ہوئے آفاق کے چہرے سے نظریں ہٹالیں پھر یوں بولا جیسے خود کلامی کر رہا ہو۔

"اللہ کہتا ہے باپ کا کیا اولاد سے نہیں پوچھا جائے گا لیکن انسان اولاد سے ماں باپ کے اعمال کا حساب لیتا ہے اور پھر سزا بھی سناتا ہے تو کیا اللہ کا عدل ناقص ہے یا ہمارے انصاف کے پیمانے اس کے پیمانوں سے بہتر ہیں لیکن نہیں جسے خود انصاف سے گزرنا ہو وہ منصف کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ اچانک آفاق کی طرف پلٹ کر بولا۔

"تم چاہتے ہو میں بھی اس صف میں کھڑا ہو جاؤں۔ جب میں نے شایان کے ماں باپ کا چہرہ نہیں دیکھا تو اسے وہ آئینہ کیوں دکھاؤں جس میں اس کے ادھورے وجود کی بگڑی ہوئی تصویر نظر آئے اگر وہ اپنی نظروں سے گر گیا تو چوٹ مجھے آئے گی..... سوال صرف شایان کی زندگی کا نہیں ہے آفاق دھیان سے دیکھو تو میری زندگی بھی جڑی ہے اور میں تو زندہ ہی اس کے لیے ہوں اگر وہ مجھ سے کھو گیا تو میں زندہ رہ کے کیا کروں گا؟" آفاق کو سچ مچ یوں لگا کہ وجدان اس سے

زندگی کی بھیک مانگ رہا ہو وہ سر جھکا کر رہ گیا پھر پلٹ کر جانے لگا لیکن چند قدم چل کر ہی وہ اچانک مڑ کر وجدان کو دیکھنے لگا جو ساکت نظروں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا پھر ہموار لہجے میں کہا۔

"اس بار میں تمہیں کچھ کھونے نہیں دوں گا۔" اس کی آنکھوں میں ایک خیال کی پرچھائیں تھی۔

☼ ☼ ☼

جب اس نے سمیرا کو اپنا خیال بتایا تو وہ حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

"مجھے حیرت ہو رہی ہے آفاق آپ دوستی میں اتنا آگے نکل گئے ہیں کہ آپ کو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ ملیحہ سے آپ کا بھائیوں جیسا رشتہ تھا اور کسی بھائی کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنی بہن کے بارے میں ایسی بات کرے۔" جب وہ اپنی بات کہہ چکی تو آفاق نے پرسکون انداز میں کہا۔

"مجھے سب یاد ہے وہ محبت بھی جو ملیحہ نے وجدان سے کی تھی اور میرے دل میں ان کی محبت کا بہت احترام ہے جب کسی کا اتنا احترام کر لیا جائے تو انسان اس کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے تم یقین کرو میں وجدان کے سامنے اتنا ہی بے بس ہوں۔ کہنے کو وہ میرا دوست ہے مگر میں اس کے سامنے انکار کی جرات نہیں کر سکتا اب تم اسے چاہے جو بھی کہو۔" پھر اسے گم سم دیکھ کر پوچھا۔

"چپ کیوں ہو گئیں۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"آپ نے بات ہی ایسی کہہ دی ہے کوئی کچھ کہہ نہیں سکتا۔" سمیرا کے چہرے سے فکرمندی جھلک رہی تھی۔

"لیکن مجھے نہیں لگتا کہ ابو اور چاچو وجدان کا ایسا لحاظ کریں گے۔"

"اگر ہم دونوں مل کر انہیں سمجھانے کی کوشش کریں تو شاید بات بن جائے ملیحہ کے حوالے سے ان کے دل وجدان کے لیے بہت گداز ہیں بلکہ ایسا کون سا شخص ہے جو ملیحہ سے محبت رکھتا ہو اور اس کی موت کے بعد اس نے وجدان کو دل میں جگہ نہ دی ہو۔"

"پھر صرف ہم دونوں کیوں..... فون کر کے سب کو بلوا لیتے ہیں ہم تمام کزنز کا رشتہ ملیحہ کے ساتھ ایک جیسا ہے اس لیے انہیں ساتھ ملنا آسان ہو گا پھر امی، چچی اور پھوپھو کو ہم خیال بنا کر ابو اور چاچو سے بات کریں گے تو انہیں منانا قدرے آسان ہو جائے گا۔"

"ویسے تمہارا آئیڈیا ہے تو زبردست۔ جاؤ جا کر فون لے کر آؤ میں ابھی جنید کو فون کر کے کہہ دیتا ہوں پہلی فلائٹ سے گوہر اور پھوپھو کو ساتھ لے کر کراچی آجائے اس کے بعد ہم صائمہ اور عظمیٰ کو بھی بلوا لیں گے۔"

"ٹھیک ہے پر صمد اور زارا سے آپ آج ہی بات کر لیں۔" وہ کہہ کر فون لانے کے لیے اٹھ گئی۔

آفاق کو اپنے کزنز کو اپنا ہم خیال بنانے میں دقت نہیں ہوئی ان سب نے ملیحہ اور وجدان کو ایک دوسرے کے لیے برباد ہوتے دیکھا تھا اور شاید اسی کا اثر تھا کہ سب نے آفاق کی بات پر اتفاق کیا اور اس کی ہدایت پر ہال میں جمع ہو گئے پھر آفاق، صمد اور جنید جا کر بڑوں کو ان کے کمروں سے بلا لائے انہوں نے جو ہال میں مجمع لگا دیکھا تو حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"کیا بات ہے آفاق سب ٹھیک تو ہے نا۔" منیر حسن الجھ سے گئے آفاق نے کہنا شروع کیا۔

"اصل میں بات یہ ہے پاپا کہ میں نے اتنے سالوں تک وجدان کے گھر والوں سے اپنا اور ملیحہ کا رشتہ چھپا کر رکھا اسی لیے وہ ملیحہ کی موت کے بارے میں بھی کبھی نہ جان سکے اور اب ان کی بے خبری کنفیوژن پیدا کر رہی ہے۔"

"کیسی کنفیوژن؟" اس کی امی نے ٹوکا۔

"ملیحہ کے جینے مرنے سے تو پہلے بھی ان کا کوئی تعلق نہیں تھا اور اب تو ان کا بیٹا لوٹ آیا ہے۔"

"یہیں سے تو کنفیوژن شروع ہوتی ہے کہ ان کا بیٹا اکیلا نہیں لوٹا اس کے ساتھ ایک بچہ بھی ہے جسے وہ اپنی دانست میں وجدان کی حقیقی اولاد سمجھ رہے ہیں۔"

"تو اس سے ملیحہ کا کیا تعلق۔" آمنہ تائی بھی سے بولیں۔

"تعلق یہ ہے آمنہ پھوپھو کہ وہ کیونکہ یہ نہیں جانتے کہ وجدان ملیحہ کے انتقال کے بعد ذہنی توازن بگڑ جانے کے باعث گھر سے چلا گیا تھا اس لیے ان کا خیال ہے کہ وجدان نے ملیحہ سے شادی کرنے کے لیے گھر چھوڑ دیا تھا اور پھر اس سے شادی بھی کر لی اور شایان ان دونوں کی اولاد ہے۔"

"کیا؟" بیک وقت سب کی زبانوں سے نکلا پھر افتخار حسن ناگواری سے بولے۔

"کسی کی بیٹی کے بارے وہ لوگ اتنی بڑی بات کیسے سوچ سکتے ہیں اور کیا وجدان نے بھی انہیں نہیں روکا۔"

"اسے پتا چلتا تو وہ روکتا اسے تو چند دن پہلے اتفاقاً یہ بات معلوم ہوئی جب شایان نے سب کے بیچ بیٹھے ہوئے ملیحہ کی تصویر یہ کہہ کر دکھائی کہ وہ اس کی امی ہے اس وقت میں بھی وہاں پر تھا وجدان تو شاکڈ رہ گیا تھا پھر اس نے فوراً ہی ملیحہ کی تصویر شایان سے لے لی مگر ملیحہ کے ساتھ وہ بچہ اتنا اٹیچڈ ہو گیا ہے کہ صرف تصویر چھن جانے پر بیمار پڑ گیا اور جب تک اسے ملیحہ کی تصویر واپس نہ کر دی گئی کھانا پینا تو دور اس بچے نے دوا تک لینے سے انکار کر دیا۔" وہ سانس لینے کو رکا تو منیر حسن نے حیرت سے سوال کیا۔

"لیکن ملیحہ کی تصویر شایان کو کہاں سے مل گئی۔" آفاق بے اختیار جھجک سا گیا پھر سنبھل کر بولا۔

"وجدان نے کبھی ملیحہ کی کچھ تصویریں کھینچی تھیں جو اس کے جانے کے بعد اس کے گھر والوں کے ہاتھ لگ گئیں پھر جب وجدان لوٹا تو اس کی ذہنی حالت کے پیش نظر خود ڈاکٹر نے بھی منع کر دیا کہ اس سے ملیحہ کا ذکر نہ کیا جائے وہ ڈپریسڈ ہو جائے گا اور مجھ سے پوچھنے کی شاید انہوں نے ضرورت محسوس نہیں کی اور ان کے ذہنوں نے حالات و واقعات کو جوڑ کر ایک کہانی تیار کر لی جو بظاہر سچ ہی لگتی ہے مگر مسئلہ یہ نہیں، انہیں تو سمجھایا جا سکتا ہے مسئلہ شایان کا ہے ان پانچ مہینوں میں یہ کہانی اسے اتنی بار سنائی گئی ہے کہ ملیحہ کا تصور اس کے دماغ میں راسخ ہو چکا ہے اول تو وہ بچہ اتنا چھوٹا ہے کہ اسے سمجھانا ممکن نہیں لیکن اگر اسے کسی طرح سمجھا بھی لیا جائے تو وہ یہ فطری سوال ضرور پوچھے گا کہ پھر اس کی ماں کون ہے اور وجدان اسے سچ بتانا نہیں چاہتا لیکن اس کے متوقع سوال کا جواب بھی اس کے پاس نہیں۔

شایان کے ذہن میں تجسس بے دار ہو جائے گا پھر اگر اس نے خود سے اپنی ماں کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تو اسے زیادہ محنت کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی اسے صرف اس گاؤں تک سفر کرنا پڑے گا جہاں وہ پیدا ہوا اور اب ایک تکلیف دہ سچ وہاں اس کا منتظر ہے اور یہی خیال وجدان کو پریشان کر رہا ہے اس کے دل میں یہ خوف بیٹھ گیا ہے کہ اگر شایان کو سچ پتا چلا تو وہ اسے کھو دے گا میں نے وجدان کی آنکھوں میں یہ خوف ایک بار پہلے بھی دیکھا تھا جب اسے ملیحہ کی انگیجمنٹ کا پتا چلا تھا لیکن اس نے ملیحہ کو کھو دیا۔ ذرا سوچیں ملیحہ کو کھو کر وہ پاگل ہو گیا تھا اگر شایان کو بھی کھو دیا تو مر جائے گا۔"

"اللہ نہ کرے؟" سمیرا کی امی بے اختیار اپنے کلیجے کو تھام کر رہ گئیں افتخار حسن بھی ایک پل کو بے قرار ہوئے تھے پھر تفکر سے گویا ہوئے۔

"اب اس پریشانی کا کیا حل۔" آفاق نے انہیں دیکھا۔

"ایک حل ہے لیکن شاید اسے قبول کرنا آپ لوگوں کے لیے مشکل ہو۔" وہ رکا اور بہن بھائیوں کے چہرے دیکھے جو اس کی ہمت بندھا رہے تھے۔

"کیوں نہ ہم شایان کو ملیحہ کے بیٹے کی حیثیت سے قبول کر لیں۔" اس کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ منیر حسن دھاڑے۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" پھر انہیں اچانک احساس ہوا کہ آفاق عمر کے اس حصے میں ہے کہ اب انہیں اس سے اس لہجے میں بات نہیں کرنی چاہیے تو وہ چپ ہو کر اپنا غصہ ضبط کرنے لگے۔

"تم نے ایسی بات کہنے کی جرات بھی کیسے کی

تمہیں ذرا شرم نہیں آئی۔" اس کی امی ملامت کر رہی تھیں۔ آمنہ بھی ناراضی سے بولیں۔

"کیا ہو گیا ہے آفاق اپنے دوست کی محبت میں اتنے اندھے ہو گئے ہو کہ بہن کے نام پر من گھڑت کہانیاں بناتے تمہیں ذرا احساس نہیں ہوا۔" دور بیٹھے جنید نے جو دیکھا کہ آفاق پر چڑھائی ہو رہی ہے تو فوراً "اٹھ کر ان کے پاس آیا۔

"امی پلیز اور ممانی جان آپ بھی ذرا سوچیں تو یہ من گھڑت کہانیاں وجدان کے جینے کا بہانہ بن سکتی ہیں۔" اب کونے میں دبکا صمد بھی آگے آیا۔

"شایان کی زندگی کو بھی رخ ملے گا اور چاہے ہمارا اس سے کوئی تعلق نہ ہو پر وہ ایک معصوم بچہ ہے اس کی گردن کے گرد کسی تلخ حقیقت کا پھندا کس کے ہمیں کیا مل جائے گا۔"

"اور اللہ بھی تو کہتا ہے دوسروں کے عیب ڈھکو ہمیں تو خوش ہونا چاہیے کہ ہماری ملیحہ کتنی قسمت والی ہے ورنہ لوگوں کے اچھے عمل ان کی موت کے ساتھ ہی رک جاتے ہیں پر ملیحہ مرجانے کے بعد بھی کسی کا پردہ بنی رہے گی۔" سمیرا پست لیکن مستحکم آواز میں بولی تو اس کی امی اسے گھورنے لگیں۔

"یہ بھلا کیا تک ہوئی کسی کا پردہ رکھنے کے لیے ملیحہ کے سر سے چادر اتار دیں۔ وہ ہماری بیٹی جیسی تھی ہم کیسے اپنی کنواری بیٹی کے لیے کہہ دیں کہ وہ کسی کی بیوی، کسی کے بچے کی ماں تھی۔" صائمہ ان کی بات سن کر رسان سے بولی۔

"اگر ملیحہ آپ کی بیٹی تھی تو وجدان کو بھی تو آپ اور ابو اپنا بیٹا مانتے ہیں بلکہ اس گھر میں اس کا جو بھی مقام ہے وہ آفاق کی وجہ سے نہیں آپ دونوں کی وجہ سے اسے ملا ہے۔ پھر آخر اس نے کیا کیا تھا۔ صرف محبت جس کے لیے وہ دس سال سے سزا کاٹ رہا ہے اور آخری سانس تک کاٹتا رہے گا کیا اس کا دکھ آپ کا دل نہیں دہلاتا اس کی عمر رائیگاں گئی ہے کم از کم ایک سکھ اسے مل جانے دیں۔" صائمہ کی آواز میں اداسی گھل گئی تھی جس نے اس کی امی کو بھی دلگرفتہ کر دیا تھا پھر جب بولیں تو ان کی آواز میں بھی پہلے جیسے تیزی نہیں تھی۔

"ایسا نہیں ہے کہ وجدان کی بربادی ہمیں نظر نہیں آتی لیکن جھوٹ کیسے بولے۔"

"اس جھوٹ پر تو اللہ بھی گناہ نہیں دیتا جو کسی کے فائدہ کے لیے کیا جائے جبکہ یہاں تو ایک بے گناہ کی زندگی کا سوال ہے۔" گوہر نے دھیرے سے کہا تو وہ اسے دیکھ کر رہ گئیں پھر کب سے خاموش بیٹھے افتخار حسن سے بولیں۔

"آپ کیوں چپ بیٹھے ہیں بھائی جان ذرا دیکھیں تو بچے کیا کہہ رہے ہیں۔" وہ سنجیدگی سے کہنے لگے۔

"بچے اب بڑے ہو گئے ہیں آمنہ اور خود بھی بچوں والے بن گئے ہیں مگر افسوس ابھی تک یہ رشتوں کی نزاکت نہیں سمجھ سکے ــــ وجدان سے کیا شکایت اس کی اپنی مجبوریاں ہیں مگر آفاق تم بتاؤ کسی اور کا گناہ اپنی بہن کے سر ڈالنے کے لیے تمہیں ہمت کہاں سے ملی؟" آفاق گناہ کے لفظ پر اچھل ہی تو پڑا تھا۔

"میں ملیحہ کے سر کوئی گناہ نہیں ڈال رہا اور نہ میں کچھ ایسا سوچ سکتا ہوں۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ ہم وجدان کے گھر والوں کے خیال کی تصدیق کر دیں کہ واقعی ملیحہ اور وجدان کی شادی ہو گئی تھی پھر شایان کی پیدائش پر ملیحہ کا انتقال ہو گیا جیسا وہ سمجھتے ہیں اور اس میں تو گناہ کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔"

"اس کہانی کا سب سے بڑا عیب یہی ہے کہ یہ جھوٹی ہے تم خود شادی شدہ ہو اور اس رشتے کی نزاکتوں اور تقاضوں سے واقف ہو نکاح کے بندھن میں بندھے دو لوگوں کے درمیان یہ نزاکتیں قابل احترام ہیں مگر جن کے بیچ یہ تعلق ہی نہ ہو ان کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ میاں بیوی تھے بہ ذات خود ایک الزام ہے اور تم تو اس الزام سے بھی آگے نکل کر دنیا سے کہلوانا چاہتے ہو کہ ملیحہ شایان کی ماں تھی۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولے کہ آفاق پہلو بدل کر رہ گیا۔

"میں ان گہرائیوں کے بارے میں دانستہ سوچنا نہیں چاہتا۔" وہ پیشانی مسلتے ہوئے دھیمے لہجے میں

نظریں چراتا ہوا بولا تو افتخار دبے دبے غصے سے کہا۔

"تم نے تو کسی بھی گہرائی کے بارے میں نہیں سوچا۔ جو جھوٹ تم دنیا کو سنانا چاہتے ہو اسے سچ کرنا ملیحہ کے اختیار میں تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ کیا کہو گے وجدان کے گھر والوں سے کہ ملیحہ نے گھر سے بھاگ کر شادی کی تھی کیونکہ بھائی صاحب تو اس کھیل میں شامل کیے نہیں جا سکتے۔"

"میں ملیحہ کے لیے یہ الفاظ کبھی استعمال نہیں کروں گا بلکہ کہوں گا کہ ملیحہ پھوپھا جان کو منا نہ سکی تو ہمارے گھر آ گئی تاکہ ہم انہیں منا لیں پھر جب وہ نہیں مانے تو آپ نے اور پاپا نے اپنے ہاتھوں سے رخصت کیا تھا آپ سمجھ رہے ہیں نا کوئی کبھی نہیں کہہ سکے گا کہ ملیحہ گھر سے بھاگی تھی بلکہ کہیں گے باپ کے گھر سے نہ سہی ماموں کے گھر سے سہی لیکن وہ بزرگوں کی چھاؤں میں وداع ہوئی تھی۔" آفاق کی بات سے وہ غمزدہ سے ہو گئے تھے۔ تھکے تھکے لہجے میں بولے۔

"سچ کہوں آفاق تو واقعی اگر ملیحہ کے دل کی بات مجھے اس کی زندگی میں پتا چل جاتی تو میں بھائی صاحب کی مخالفت لے کر بھی ملیحہ کو وجدان کے ساتھ رخصت کر دیتا وہ مجھے اتنی ہی عزیز تھی اور اسے بھی اندازہ ہو گا کہ میں اس کی خواہش کا احترام کروں گا پھر بھی اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا تو اس لیے کہ وہ اس مان کو نہیں توڑنا چاہتی تھی جو ہر باپ کو اپنی اولاد پر ہوتا ہے اس نے خود پر جبر کر لیا مگر باپ کی چوکھٹ پار نہیں کی۔ مجھے اس کی اس سعادتمندی پر فخر ہوتا ہے کہ مرتے دم تک اس نے باپ کی عزت سنبھالی اور اس کے مرجانے کے بعد تم لوگوں سے کہو گے وہ ان خود غرضوں میں سے تھی جو اپنے دل کی خوشی کے لیے ہر حد توڑ دیتے ہیں کیا یہ ملیحہ کے ساتھ زیادتی نہیں۔"

"شاید۔" وہ اقرار میں سر کو ذرا سا ہلا کر کہہ رہا تھا۔

"لیکن مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اگر ملیحہ کہیں سے آجائے تو وجدان کی محبت میں جان دینے والی وجدان کی خاطر اس زیادتی کو ہنستے ہنستے برداشت کر لے گی۔ آپ کو معلوم ہے وجدان کون ہے۔" افتخار حسن چپ سے رہ گئے اب آفاق روانی سے بول رہا تھا۔

"وجدان وہی شخص ہے جس نے ملیحہ کی محبت میں اپنے دس سال پھونک ڈالے اور میں جانتا ہوں اپنی باقی کی زندگی بھی وہ اسی فیاضی سے لٹا دے گا۔ لوگ کہتے ہیں ہم اس کی محبت میں دیوانے ہیں ــــ اور وجدان کو لوگوں نے دیوانہ کہا ہاتھوں میں پتھر لے کر "پاگل پاگل" کی صدائیں لگاتے اس کے پیچھے بھاگے اسے سنگ بار کیا ــــ بے رحمی سے پھینکے گئے پتھر اسے لہولہان کر دیتے مگر پھر بھی ملیحہ کا تصور نہیں ٹوٹتا۔ وجدان کی اس حالت کو سوچ کر میری روح کانپ جاتی ہے اور وہ یہ سب سہتا رہا بھلا کس نے محبت میں دنیا بھلائی ہے لیکن وجدان اپنا آپ بھول گیا۔ کہاں ایسے لوگ ملیں گے کہ ایک محبت میں مرجائے اور دوسرا زندہ بھی ہو تو مردوں سے بدتر میں ملیحہ کا بھائی ہوں مگر میرے ہی سامنے وجدان ملیحہ کا ذکر کرتے ہوئے بے اختیار ہو جاتا ہے اسے احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور میں محسوس کر کے بھی اسے ٹوک نہیں پاتا ٹوکوں بھی کیسے جب وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے ہر حد سے گزر گئے تو پھر میں حد کس طرح لگاؤں۔" آفاق کی سرگوشیوں میں ڈھلی آواز سن کر سمیر کی آنکھیں بھر گئیں۔ افتخار حسن کی حالت ایسی تھی جیسے آفاق نے ان شہہ رگ پر ہاتھ دھر دیا ہو۔

"پاپا، تایا جان۔" آفاق نے ان دونوں کو مخاطب کیا تو وہ شکستگی سے اسے دیکھنے لگے۔

"آپ دونوں ملیحہ سے بہت محبت کرتے ہیں نا ملیحہ کی خاطر وجدان کے لیے کچھ ایسا کر دیں اس کے لیے ہوا میں گھٹن کم ہو جائے ــــ وہ سانس نہیں لے پاتا۔" افتخار حسن بے ساختہ نظریں چراتے اٹھ گئے اور کسی نے بھی انہیں جانے سے نہیں روکا۔ ان کے جانے کے بعد آفاق عنبر حسن کے ہاتھ تھام کر منت سے بولا۔

"پاپا پلیز۔" تو وہ بے بسی سے بولے۔

"تم جو بات کہہ رہے ہو وہ بہت بڑی ہے۔"

"وجدان کی خاطر نہ سہی ملیحہ کی خاطر۔ اسے اسی ملال نے تو مار ڈالا تھا کہ پھوپھا جان نے اس کی محبت کو قبول نہیں کیا آج آپ تو اس کا لحاظ کرتے ہوئے وجدان کو اس خوف سے چھڑالیں کہ ایک دن وہ شایان کو کھودے گا پاپا پلیز شایان' وجدان کی زندگی کی آخری خوشی ہے اس خوشی کو اس کے پاس رہنے دیں کہیں یہ خوشی بھی اس سے کھو گئی تو اس کی عمر رائیگاں ہو جائے گی۔" آفاق کی باتیں انہیں جھنجھوڑ رہی تھیں وہ ایک دم سے اس کی بات کاٹ کر بولے۔

"بس آفاق اب اور کچھ مت کہنا۔"

"پاپا وجدان۔۔۔" آفاق نے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی۔ ان کو جاتا دیکھ کر جنید' تائی سے مخاطب ہوا۔

"آپ تو شایان والی بات کے لیے راضی ہیں۔" انہوں نے کچھ کہا تو نہیں مگر نم آنکھوں سے اسے تکنے لگیں۔ خواتین کو اداس دیکھ کر ان سب کو امید ہو چلی تھی کہ تین مہرے تو پٹ گئے۔ سمیرا کی امی دوپٹے سے آنکھیں صاف کرتے ہار ماننے کے انداز میں بولیں۔

"اچھا ٹھیک ہے میں افتخار سے بات کرتی ہوں۔"

"سچ۔" خوش تو سب ہوئے تھے پر ان کی بیٹیاں تو کھل اٹھیں اور ایک زبان ہو کر بولیں تو انہوں نے وارننگ دینا بھی ضروری سمجھا۔

"ہاں لیکن میں صرف بات کروں گی منانا تمہارا کام ہے میں اس عمر میں میاں کی جھڑکیاں نہیں سن سکتی۔"

"بھابھی آپ ان کی باتوں میں کیوں آرہی ہیں؟"

"بس آمنہ رہنے دو۔" وہ عاجزی سے بولیں۔

"ملیحہ مرچکی مگر وجدان زندہ ہے اگر ایک جھوٹ اس کے دل کو تسلی دے سکتا ہے تو کیا غلط ہے مجھ سے اس کی اداسی دیکھی نہیں جاتی اگر شایان کو کھونے کا دھڑکا اس کے دل سے نکل جائے تو شاید اس کے چہرے پر مسکراہٹ آجائے۔ میں دل سے چاہتی ہوں وہ ملیحہ کو بھول جائے اور شایان ہی وہ مشغلہ ہے جو وجدان کے ذہن سے ملیحہ کا خیال جھٹک سکتا ہے۔"

"بھابھی کیا ہو گیا ہے۔۔۔" اب کے آفاق کی امی ان سے الجھیں پھر تینوں میں دھواں دھار بحث چھڑ گئی کام بن گیا تھا۔ وہ سارے ایک دوسرے کو اشارے کرتے اٹھ گئے۔

☼ ☼ ☼

صبح ناشتے کی تیاری کے دوران سمیرا اور اس کی بہنیں سمیرا کی امی سے رپورٹ لے رہی تھیں۔

"آپ نے ابو سے بات کی۔" سمیرا نے پوچھا تو وہ منہ بنا کر بولیں۔

"کہاں میرے کمرے میں جانے سے پہلے ہی وہ سونے کے لیے لیٹ گئے تھے۔" پھر جوش سے مگر راز داری کے انداز میں کہنے لگیں۔

"تمہاری چچی تو رات میں مان گئیں لیکن آمنہ ابھی تک تنی ہے اصل مسئلہ ہے بھی انہی بہن بھائیوں کا ہے کوئی ایک بھی مان جائے تو باقی دو اپنے آپ کمزور ہو جائیں گے۔" ان کا جوش سرد ہو چکا تھا کہ پھر کسی خیال نے اسے ابھار دیا۔ وہ عظمیٰ کا بازو دبوچ کر کہنے لگیں۔

"تم سارے افتخار کے پیچھے پڑے ہو منیر سے کیوں نہیں کہتے۔"

"کیونکہ ابو بہن بھائیوں میں بڑے ہیں اگر وہ مان گئے تو باقی دو راضی ہوں نہ ہوں فرق نہیں پڑے گا وہ کبھی ابو کے فیصلے کے آگے نہیں بولیں گے۔" عظمیٰ کہہ کر تائید چاہنے کے انداز میں اپنی بہنوں کو دیکھنے لگی تو سب نے اس کی تائید کی۔

صائمہ کی نظریں کچن کی کھڑکی سے باہر گئیں اور وہ سمیرا کا کندھا ہلا کر بولی۔

"سمیرا ابو ناشتے کے لیے آگئے یہ آفاق کدھر ہے؟" سمیرا نے فوراً کھڑکی سے باہر دیکھا۔ افتخار حسن ڈائننگ ٹیبل کی چیئر گھسیٹ کر بیٹھ رہے تھے۔ کچھ دیر گزری تو منیر حسن اور صمد ساتھ ساتھ ہی آکر بیٹھ گئے۔

ماحول میں تناؤ محسوس کیا جاسکتا تھا ہر کوئی گردوپیش سے نظر چرائے خاموشی سے ناشتا کر رہا تھا۔ منیر حسن

اور افتخار حسن کو اندازہ تھا کہ وہ تینوں رات والا ٹاپک دوبارہ ضرور شروع کریں گے اس ٹاپک سے بچنے کے لیے ہی وہ اپنے بیٹوں کی طرف دیکھنے سے بھی گریز کر رہے تھے۔

"تایا جان آپ نے کیا سوچا۔"

"کس بارے میں؟" انہوں نے تجاہل عارفانہ برتا۔

"وہی جو رات میں بات ہوئی تھی۔" افتخار حسن کپ ٹیبل پر رکھ کر برہمی سے بولے۔

"وہ بات ایسی نہیں کہ اس کے بارے میں سوچا جائے۔"

"ہمیں آپ سے اجازت چاہیے ماموں جان اور اگر آپ سوچیں گے نہیں تو ہمیں اجازت کیسے دیں گے۔" جنید کے لہجے میں اصرار تھا۔ افتخار حسن کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"اجازت مانگنی ہے تو مجھ سے نہیں بھائی صاحب سے مانگو۔"

"ان کا یہاں کیا ذکر۔" بنا سوچے ہی صمد کے منہ سے نکلا پھر اسے فوراً ہی اپنی بات کے بے تکے ہونے کا احساس بھی ہو گیا تھا۔ افتخار حسن اس کی بات سن کر بولے۔

"ملیحہ ان کی بیٹی تھی اور اگر کل تم کسی کو ملیحہ کی اولاد کہتے ہو تو یہ ان کے خون میں ملاوٹ کے برابر ہے۔ جس پر اعتراض وہ ہی کریں گے میں نہیں، حسب نسب خاندانی وراثت ہوتی ہے جسے یوں ہی نہیں بانٹا جاتا۔ وجدان اگر شایان کو اپنی ولدیت دے رہا ہے تو یہ اس کی مرضی ہے پھر وہ ایسا اپنے والدین کے علم میں لائے بغیر کر رہا ہے اگر مصطفیٰ عظیم کو پتا چل جائے تو وجدان کی خاطر وہ ایک لے پالک کی حیثیت سے تو شایان کو شاید برداشت کر ہی لیں مگر وہ کبھی اسے اپنا وارث تسلیم نہیں کریں گے اظہر فاروقی کی تو بات دور ہے کبھی جاؤ ان کی زمینوں پر وہاں جانوروں کی منڈی جیسا ایک بڑا باڑہ ہے جس میں ہر نسل کا چوپایہ موجود ہے سوائے خچر کے۔۔۔ کیونکہ اس کی نسل دوغلی ہے جس شخص کو جانوروں کی نسل میں ملاوٹ پسند نہیں وہ اپنی نسل میں آمیزش کیا برداشت کرلے گا اظہر فاروقی کو اپنے اعلا نسب کا غرور ہے۔۔۔ وہ اپنے غرور کا تاج کبھی بھی کسی کی ناجائز اولاد کے سر پر نہیں سجائیں گے۔"

"آپ کیا صرف ان کی وجہ سے اعتراض کر رہے ہیں۔" جنید کے سوال پر وہ رخ بدل دوسری طرف دیکھنے لگے۔

"آپ کو یاد ہے خالو جان سے ہماری آخری بار ملاقات کب ہوئی تھی۔" اس نے ایک اور سوال کیا پھر ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر کہا۔

"ملیحہ کے سوئم پر اور آج ملیحہ کو گزرے ہوئے دس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے اس دوران نورالہدیٰ بھی آیا تو بس ایک بار اس کے علاوہ ان دونوں خاندانوں کے بیچ دس سال سے کوئی رابطہ نہیں ہوا اور آئندہ بھی ایسا ہونے کی کوئی امید نہیں پھر انہیں کیسے پتا چلے گا کہ دنیا میں کوئی ایسا بھی ہے جو ملیحہ کو ماں کہتا ہے۔۔۔ ماں۔" اس نے مٹھاس سے اس لفظ کو ادا کیا۔

"یہ لفظ کتنا مقدس کتنا قابل احترام ہے۔ ملیحہ کو اس سے اچھا خطاب اور کیا ملے گا۔" افتخار حسن نے کوئی جواب ہی نہیں دیا اور منیر حسن جو پہلے لاتعلق سے ناشتے میں مصروف تھے اب چہرے پر عجیب سے تاثرات لیے خاموش تھے اور ان کے سامنے پڑا ناشتا یوں ہی ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ وہ تینوں ہی محسوس کر رہے تھے کہ انہوں نے اپنے بڑے بھائی کی تائید میں ابھی تک کچھ نہیں کہا انہیں یہ خاموشی اپنے حق میں محسوس ہو رہی تھی۔ خاموشی کا وقفہ طویل ہو گیا تھا جسے آخر آفاق نے توڑا۔

"آپ دونوں پھوپھا جان کو صرف ملیحہ کی موت کے لیے ذمہ دار سمجھتے ہیں لیکن کیا وجدان کی بربادی ان کے ذمے نہیں۔۔۔۔ یہ دونوں الزام لازم و ملزوم ہیں لیکن پھوپھا جان اکیلے ملزم نہیں میرا ضمیر مجھے بھی ان الزاموں میں ان کے ساتھ شامل رکھتا ہے۔" افتخار حسن اور منیر حسن نے ذرا سا چونک کر اسے دیکھا صمد

اور جنید بھی حیرت سے اسے دیکھنے لگے جو سر کو جھکائے نیچی نگاہ کیے کہہ رہا تھا۔

"آپ کو بے خبری کا فائدہ حاصل ہے مگر میں وہ شخص ہوں جو ملیحہ کی زندگی میں ہی پورا سچ جان گیا تھا میرے پاس تین دن کی مہلت تھی اور میں ان تین دنوں میں بہت کچھ کر سکتا تھا مگر میں نے کچھ نہیں کیا ..... مجھے کچھ کرنے کا خیال ہی نہیں آیا میں ساحل پر کھڑا ان دونوں کے ڈوبنے کا نظارہ کرتا رہا یہاں تک کہ وہ دونوں ڈوب گئے۔" "یقیناً" آفاق کی آنکھوں میں نمی آگئی جسے اس نے اندر ہی روکتے ہوئے سلسلہ کلام جاری رکھا۔

"میری غلطی یہ تھی کہ میں ان کے جذبوں کی گہرائی کو سمجھ ہی نہیں سکا۔ سمجھتا بھی کیسے ایک انگوٹھی نے ملیحہ کو باندھ لیا اور گریز کے اشارے۔ نے وجدان کے راستے بدل دیے تو میں نے سوچا انہیں اگر محبت تھی بھی تو وہاں تک نہیں پہنچی جہاں ایک دوسرے کے لیے چوٹ سہی جاتی ہے مگر ان کی محبت تو وہاں تک پہنچ چکی تھی جہاں چاہے جانے والے شخص کے احترام میں اپنے ہاتھوں خود کو مٹا دیا جاتا ہے وجدان، ملیحہ کے لیے مٹتا رہا اور ملیحہ، نور الہدیٰ کے لیے مٹتے مٹتے وجدان کے لیے مٹ گئی۔ وہ اپنے آپ اس بھنور میں سے نہیں نکل سکتے تھے انہیں کسی تیسرے کی ضرورت تھی جو انہیں اس بھنور سے نکالتا مگر میں وہ تیسرا شخص کیسے بنتا..... نہ کوئی اعتراف..... نہ کوئی وعدہ محض چند ملاقاتیں اور کوئی اپنی زندگی خیرات کر دے..... ایسی کوئی مثال کانوں نے سنی کب تھی مگر میں پھر بھی شرمندہ ہوں پاپا۔" اس نے سر اٹھا کر منیر حسن کو پکارا۔

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ شایان کی صورت میں مجھے وہ موقع دیا گیا ہے کہ میں اپنی غلطی کا ازالہ کر سکوں پھر شاید وجدان کا سامنا کرتے ہوئے مجھے ندامت نہ ہو۔ میں اس بار ساحل پر بیٹھ کر وجدان کے ڈوبنے کا نظارہ نہیں کروں گا۔" منیر حسن اس کی آنکھوں میں پھیلی سرخی کو دیکھتے رہ گئے۔

"آج آفس سے ہاف ڈے لے لینا۔" آفاق اس غیر متعلقہ جملے پر اچھنبے سے بولا۔

"کیوں؟" وہ اس کا جواب دینے کے بجائے بولے۔ "میں وجدان کو بھی لنچ کے بعد آف کر دوں گا تم اس کے گھر جا کر شایان کو کچھ دنوں کے لیے یہاں لے آنا۔"

"ایک تو اس کا ایڈمیشن ٹیسٹ ہونے والا ہے دوسرا وجدان تو اعتراض نہ کرے لیکن اس کے گھر والے شایان کو ہمارے گھر کچھ دن رہنے کی اجازت کیوں دیں گے؟" منیر حسن بولے تو ان کے لہجے میں سکون تھا۔

"ایڈمیشن ٹیسٹ کی تیاری یہاں بھی ہو سکتی ہے اور وجدان کے گھر والے تمہیں شایان کو ساتھ لے جانے سے کیسے روک سکتے ہیں آخر تم اس کے ماموں ہو۔" جب ان کی بات آفاق کی سمجھ آئی تو وہ صمد اور جنید ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگے سمیرا کے ہونٹوں پر بھی آسودہ مسکراہٹ آگئی تھی مگر افتخار حسن فوراً "اسے" ٹوکتے بولے۔

"منیر حسن۔" لیکن ان کی آواز میں تیزی نہیں حیرت بھرا استفسار تھا۔

"میں جانتا ہوں افتخار بھائی آپ کیا سوچ رہے ہیں یہ سوچ میرے ذہن میں بھی ہے لیکن میں وجدان کے لیے بھی سوچ رہا ہوں۔ اگر ہم اس جھوٹ کی تصدیق کر دیں تو نقصان کوئی نہیں لیکن یہ فائدہ ضرور ہو گا کہ وجدان کے ذہن سے بوجھ ہمیشہ کے لیے اتر جائے گا لیکن اگر ہم تردید کرتے ہیں تو آج یا کل وجدان کو ایک اور خسارے سے گزرنا ہو گا..... آپ صحیح غلط کے چکر سے نکل آئیں۔ ہمیشہ اور ہر معاملے میں صحیح اور غلط کا ٹیگ لگانا ممکن نہیں ہوتا بعض چیزیں اس لیے ہوتی ہیں انہیں کسی ٹیگ کے بغیر قبول کر لیا جائے ان کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ خود وقت کرتا ہے۔" افتخار حسن نے پھر کچھ نہیں کہا اور سامنے رکھے کپ میں بچی ٹھنڈی چائے کے آخری گھونٹ حلق سے اتارنے لگے لیکن منیر حسن ٹھنڈے ناشتے پر قناعت نہیں کر سکے اور بلند آواز میں کچن کے دروازے کی طرف منہ

کر کے کہا۔

"سمیرا بیٹا ناشتا ٹھنڈا ہو گیا ہے اور لے آؤ۔" وہ دونوں ہی ناشتا کر کے جا چکے تو آفاق پر سوچ انداز میں بولا۔

"یار اس کہانی میں بہت جھول ہیں، محنت کرنی پڑے گی۔"

"کیسے جھول؟" جنید نے حیرت سے پوچھا تو آفاق نے کہا۔

"ہمیں ہر صورت اس بات پر قائم رہنا ہے کہ ملیحہ کی شادی ہماری سرپرستی میں ہوئی تھی جس کا مطلب ہوا کہ جب وجدان لاپتا ہوا تو اس کا اتہ پتا ہمارے پاس تھا اور میں نے جان بوجھ کر سالوں سال وجدان کی فیملی کو لاعلم رکھا اس کے ساتھ ہی وجدان کی اتفاقاً" واپسی بھی دھوکہ ہی لگے گی پھر شاید وہ وجدان کی مینٹل کنڈیشن والی بات کو بھی من گھڑت کہانی سمجھیں۔"

"ہوں۔" زارا پر سوچ انداز میں بولی۔

"اگر وجدان کی فیملی کا ہم پر سے اعتبار اٹھ گیا تو واقعی شکوک و شبہات کا کوئی انت نہیں۔"

"اور اس سے بھی بڑی مشکل یہ ہے کہ میں کسی بھی چیز کی وضاحت نہیں دے پاؤں گا۔" آفاق کا انداز ایسا تھا جیسے دیر تک اس مسئلے کو سوچتے وہ تھک گیا ہو مگر حل پھر بھی نہ ملا۔

"یہ واقعی بڑا مسئلہ ہو جائے گا اگر ہم ان کی نظر میں مشکوک ہو گئے تو وہ ہماری کہانی پر بھی آسانی سے اعتبار نہیں کریں گے اور ہو سکتا ہے کہ تصدیق کرنے کی کوشش میں وہ سچ تک پہنچ جائیں۔" فکرمندی سے کہتا صمد چپ ہوا تو سب پریشان صورت بنائے سر ہلانے لگے۔ سمیرا نے ان کے چہروں کو دیکھا اور کہا۔

"اس میں اتنا سوچنے کی کیا ضرورت ہے جو بات ناقابل اعتبار ٹھہرے وہ بات ہی نہ کریں۔"

"کیا مطلب؟" آفاق سمجھا نہیں۔

"ارے بھئی جھوٹ بولنے کے بجائے سچ بولیں کہ وجدان نے جب گھر چھوڑا ملیحہ کے انتقال کو چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے۔"

"تو شایان کہانی میں کیسے شامل ہو گا۔"

"خفیہ شادی کے ذریعے۔" سمیرا نے کہا۔

"مطلب۔" اس بار عظمیٰ نے وضاحت چاہی تو سمیرا سمجھانے لگی۔

"دیکھیں ملیحہ کی شادی تو ماموؤں کی سرپرستی میں ہی ہو گی یعنی خفیہ شادی۔" وہ بول کر داد طلب نظروں سے سب کو دیکھنے لگی پر ان کے چہرے بدستور ہونق بنے دیکھ کر سمیرا نے کہا۔

"کیوں بھئی کیا ہوا سمجھ نہیں آیا۔" سب نے کورس میں سر نفی میں ہلائے تو سمیرا کہنے لگی۔

"کوئی بات نہیں میں سمجھاتی ہوں۔ دیکھو ملیحہ کی ڈیتھ سے ایک سال پہلے وجدان اور ملیحہ کی شادی ہوئی، وہ پریگنینٹ ہوئی پھر 21 دسمبر 1981ء کی رات شایان کو جنم دیتے ہوئے ملیحہ کی ڈیتھ ہو گئی اور 22 دسمبر کو وجدان اپنے بیٹے کو لے کر چلا گیا..... کہاں بھلا ہم کیسے جان سکتے تھے۔" وہ چپ ہوئی جنید بے ساختہ بولا۔

"زبردست۔ آفاق، سمیرا کی بتائی کہانی پر کوئی سوال نہیں اٹھ سکتا بس اس رف آئیڈیا کو تھوڑا پالش کرنے کی ضرورت ہے۔" اور پھر اس کہانی کی نوک پلک سنواری جانے لگی۔ جب ہر زاویے پر غور کر لیا گیا تو آفاق اپنی جگہ سے اٹھا۔

"چلو تیار ہو جاؤ شایان کو لینے جانا ہے۔"

"بس ہم دونوں جائیں گے میرا مطلب ہے امی یا چچی جان میں سے کوئی ساتھ نہیں ہو گا۔" سمیرا نے کہا۔

"نہیں آج جھوٹ بولنے کا دن ہے اجازت دینا اور بات ہے لیکن جب ان کے سامنے ملیحہ اور شایان کے بیچ جھوٹے رشتے کا پل باندھا جائے گا تو ان کے لیے چپ رہنا مشکل ہو جائے گا پھر کیوں ہم انہیں اس مشکل میں ڈالیں۔ شایان کو لینے کے لیے بس میں اور تم ہی جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے آپ چلیں میں آتی ہوں۔" وہ آفاق سے کہتی اٹھ گئی۔

☆ ☆ ☆

ان دونوں کو وجدان کے گھر کے لاؤنج میں بیٹھے کافی دیر ہو گئی تھی مگر دونوں میں سے کسی کی سمجھ نہیں آرہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کریں کہ اچانک شایان باہر سے بھاگتا ہوا آیا اور آفاق کی گود میں چڑھ کر بیٹھ گیا۔

"انکل آپ جواد کو کیوں نہیں لائے میں نے اس کے ساتھ کرکٹ کھیلنی تھی۔" آج آفاق اسے ملیحہ کے حوالے سے دیکھ رہا تھا شاید اسی لیے معصومانہ خفگی سے منہ پھلاتا وہ ہمیشہ سے زیادہ اچھا لگا تھا آفاق کو اس پر ڈھیروں پیار آگیا تو جواب دیے بغیر مسکراتا ہوا اس کے گال چومنے لگا۔

"بیٹا پہلے سلام کرتے ہیں۔" وجدان نے ٹوکا تو شایان نے لہراتا ہوا سلام کیا۔

"السلام و علیکم انکل۔"

"وعلیکم السلام۔" آفاق نے اسی کے انداز میں جواب دے کر وجدان سے کہا۔

"اب اسے یہ بھی کہہ دو کہ مجھے انکل نہ کہا کرے غیریت سی محسوس ہوتی ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے انکل کا لفظ تو غیروں کے لیے بنا ہے۔" عائشہ فوراً اس کی تائید کرتی بولیں پھر شایان کو مخاطب کیا۔

"شایان تم آفاق کو چاچو کہا کرو آخر یہ وجدان کے بھائیوں جیسا ہے۔" اور آفاق کو بات کرنے کا موقع مل گیا وہ سوچ کر بولا۔

"چاچو نہیں آنٹی آپ مجھے اس سے ماموں کہلوائیں کیونکہ وجدان میرے بھائی جیسا ہے لیکن ملیحہ کا تو میں بھائی ہی تھا۔"

"کیا؟" عائشہ کے ساتھ مصطفیٰ عظیم اور انیقہ بھی بری طرح چونکے۔ وجدان بھی ٹھٹک گیا تھا۔

"جی ہاں۔" آفاق ان کے حیران چہروں پر نظر ڈالتا آرام سے کہہ رہا تھا۔

"ملیحہ میری پھپھو زاد بہن تھی۔" یہ ایک انکشاف تھا اور ان کی سمجھ نہیں آرہا تھا اس انکشاف پر کس

رد عمل کا اظہار کریں لیکن وجدان کی چھٹی حس نے اسے کوئی اشارہ کیا تھا وہ تیز لہجے میں بولا۔

"بس آفاق اس کے بعد کچھ مت کہنا۔"

"لیکن کیوں میں پاپا اور تایا جان کی اجازت لے کر اسی لیے آیا ہوں کہ انکل اور آنٹی ملیحہ اور میرے رشتے کے بارے میں جان جائیں اور میں انہیں یہ بھی بتا دوں کہ شایان میرا بھانجا ہے۔" آفاق نے پاپا اور تایا جان کا حوالہ اسی لیے دیا تھا کہ وجدان خاموش ہو جائے وہ واقعی چپ سا ہو گیا تھا پھر لب بھینچ کر اٹھا اور لاؤنج سے چلا گیا۔ آفاق اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا مگر وہ اس کے پیچھے نہیں جا سکتا تھا کیونکہ مصطفیٰ عظیم حیرت سے سنبھل کر سوالوں کا سلسلہ شروع کر چکے تھے اور آفاق کو ان کی طرف متوجہ ہونا پڑا جو کہہ رہے تھے۔

"ملیحہ تمہاری کزن تھی اتنی بڑی بات تم نے ہم سے چھپا کر رکھی کیوں؟"

"کیونکہ وجدان گمشدہ تھا اور آپ اس کی گمشدگی کا تعلق ملیحہ سے جوڑ رہے تھے اگر اس وقت میں کہتا کہ ملیحہ میری کزن تھی تو بدمزگی ضرور ہوتی مگر اب حالات میں ٹھہراؤ آچکا ہے پھر وقت بھی اتنا بیت چکا ہے کہ اس بات کو ظاہر کر دینے میں اب کوئی حرج نہیں۔" مصطفیٰ عظیم لب بھینچنے لگے پھر مشکوک انداز میں دیکھتے ہوئے۔

"ملیحہ تمہاری کزن تھی اور وجدان دوست اور جہاں تک میرا اندازہ ہے تم ان کے رازدار تھے سچ بتانا آفاق کیا وجدان نے گھر سے جانے کے بعد تم سے بھی کونٹیکٹ نہیں کیا۔"

"نہیں لیکن آپ کا یہ اندازہ درست ہے کہ میں ان دونوں کا رازدار تھا۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" انہوں نے اس کی لاعلمی کو رد کر دیا۔

"ملیحہ کو تم بہن کہہ رہے ہو اور دوست چاہے کتنا ہی قابل اعتبار ہو کوئی غیرت مند شخص اپنی بہن دوست کے حوالے نہیں کر سکتا جب تک وہ اس کے نکاح میں نہ آجائے اور اس کے بعد بھی جو وجدان نہ

ملیحہ تو تم سے رابطہ کرتی رہی ہو گی۔" آفاق نے انہیں اطمینان سے اپنی بات کہنے کا موقع دیا پھر جب وہ چپ ہوئے تو کہا۔

"اب بھی آپ کے سارے اندازے درست ہیں مگر ایک بات کی تصحیح کر لیجیے کہ وجدان نے گھر سے جانے کے بعد ملیحہ سے شادی نہیں کی تھی بلکہ جس وقت اس نے گھر چھوڑا اس وقت تک ملیحہ کی ڈیتھ ہو چکی تھی۔"

"کیا؟" حیرت کے ایک اور جھٹکے نے انہیں ہلا کر رکھ دیا۔ آفاق اسی سنجیدگی سے کہتا رہا۔

"آپ کو شاید یاد ہو جس رات وجدان نے گھر چھوڑا اس دن میں صبح وجدان کو لینے آیا تھا اور آپ کے پوچھنے پر بتایا تھا کہ پچھلی رات میری کزن کی ڈیتھ ہو گئی ہے اور میں وجدان کو جنازے میں شرکت کے لیے لے جا رہا ہوں۔" وہ رکا پھر کہا۔

"وہ کزن ملیحہ تھی۔"

"مجھے سمجھ نہیں آرہا تم کیا کہہ رہے ہو۔" عائشہ بری طرح الجھ رہی تھیں آفاق انہیں دیکھ کر کہنے لگا۔

"ٹھہریں میں آپ کو شروع سے بتاتا ہوں۔ ملیحہ کی ڈیتھ سے تقریباً" ڈیڑھ سال پہلے ان دونوں کی ملاقات ہوئی تھی اور چند ملاقاتوں میں ہی انہوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا لیکن جب ملیحہ نے اپنے بابا جان سے بات کی تو وہ چراغ پا ہو گئے ملیحہ نے انہیں منانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن وہ کسی صورت اس رشتے پر تیار نہیں ہوئے اور ملیحہ کے لیے وجدان کو بھولنا ناممکن تھا بات اتنی بڑھی کہ ملیحہ احتجاجاً" گھر چھوڑ کر ہمارے گھر آگئی اس کا خیال تھا کہ اکلوتی بیٹی کی جدائی پر ان کا دل پسیج جائے گا مگر ان کا غصہ اور بھی بڑھ گیا اور انہوں نے ملیحہ کو اپنی زندگی سے ہی بے دخل کر دیا اب ملیحہ واپس نہیں جا سکتی تھی ان حالات میں اس سے بہتر فیصلہ کوئی نہیں تھا کہ ملیحہ کی وجدان کے ساتھ شادی کر دی جائے پھر میرے پاپا اور تایا نے ملیحہ کے سرپرستوں کی حیثیت سے اسے وجدان کے ساتھ رخصت کر دیا۔ وجدان نے آپ لوگوں سے چھپ کر شادی کی کیونکہ

اسے خدشہ تھا کہ ملیحہ کے بابا جان کی طرح آپ لوگ بھی اس معاملے کو انا کا مسئلہ بنا لیں گے جبکہ اس شادی کو ٹالا نہیں جا سکتا تھا کیونکہ ملیحہ کو پھپھو جان سے بہت محبت تھی اور ان کی طرف سے تعلق توڑ لیے جانے کے بعد وہ ڈپریشن کا شکار رہنے لگی تھی اسے جذباتی سہارے کی ضرورت تھی جو اسے وجدان کے علاوہ کوئی نہیں دے سکتا تھا اس لیے وجدان نے کچھ وقت کے لیے اپنی شادی کو خفیہ رکھنے کا فیصلہ کیا پھر شادی کے کچھ مہینوں بعد....." آفاق گھر سے رٹ کر آئے جملوں کو روانی سے ادا کرتا جا رہا تھا کہ بولتے بولتے اس کی زبان لڑکھڑا گئی اس کے لیے بات کو جاری رکھنا مشکل ہو گیا تو چپ ہونے کے ساتھ ہی سر کو جھکاتے ہوئے اس نے غیر محسوس انداز میں اپنا چہرہ چھپا لیا جو ایک دم ہی سرخ ہو گیا تھا سمیرا بھانپ چکی تھی کہ یہ غیرت کی سرخی ہے وہ یہ بھی جانتی تھی کہ آفاق کی زبان کس بات نے پکڑلی ہے اس لیے اس کے چپ ہوتے ہی سمیرا نے بولنا شروع کر دیا۔

"جب ملیحہ امید سے ہوئی تو وجدان کو لگا کہ اسے شادی کا اعلان کر دینا چاہیے مگر پھر بھی اس میں اتنی جرات نہیں تھی کہ اچانک ایک دن ملیحہ کو آپ کے سامنے لے آتا پھر اس نے سوچا کہ ایک دم دھماکا کرنے کے بجائے وہ پہلے آپ لوگوں کو اس بات کے لیے راضی کر لے کہ آپ اس کی شادی ملیحہ کے ساتھ کرنے پر تیار ہو جائیں پھر وہ آپ کو بتا دے گا کہ وہ شادی کر چکا ہے۔ لیکن اس کی توقع کے عین مطابق آنٹی نے ملیحہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اب وجدان دوہرے عذاب میں گرفتار تھا ایک طرف اسے آپ کو منانا تھا دوسری طرف ملیحہ کی طبیعت خراب رہنے لگی وجدان کے لیے اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ فی الفور اسے گھر لے آئے تاکہ چوبیس گھنٹے اس کے پاس رہ سکے مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی جس رات شایان پیدا ہوا ملیحہ کی طبیعت اچانک ہی بگڑ گئی تھی اسے اسپتال لے کر گئے لیکن....." سمیرا نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی مصطفیٰ عظیم ہونٹوں پر

مٹھی جمائے خاموش بیٹھے تھے اور عائشہ مصطفیٰ پرنم آنکھوں کے ساتھ بولیں۔

"تو یہ وجہ تھی۔ میں اکثر سوچتی کہ میں نے تو وجدان سے کہہ دیا تھا کہ ملیحہ سے شادی کرلے پھر وہ کیوں چلا گیا آج پتا چلا میں نے اجازت دینے میں دیر کر دی میں نے اس وقت اسے ملیحہ سے شادی کرنے کی اجازت دی جب وہ ملیحہ کو دفنا کر آرہا تھا۔ اف میرے اللہ۔" انہوں نے کرب سے آنکھیں بھینچ لیں اور آنسو ٹپ ٹپ ان کے گالوں پر بہنے لگے۔

"کیسے برچھی کی طرح میرے لفظ وجدان کے سینے کے آرپار ہوئے ہوں گے۔ کیسی ماں ہوں اس کی حالت نہیں پہچان سکی مجھے آج بھی یاد ہے اس رات وجدان اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہا تھا کہ خود سے بچھڑ گیا تھا ٹوٹ رہا تھا وہ اور میں نے اسے ریزہ ریزہ کر دیا۔ کاش مجھے پہلے پتا چل جاتا تو ملیحہ کو خود جا کر گھر لے آتی اپنے ہاتھوں سے اس کا خیال رکھتی بھلا وجدان اسے اس حالت میں کہاں سنبھال پاتا ہو گا۔" پھر وہ آنسو پونچھتی مصطفیٰ عظیم سے بولیں۔

"یاد ہے مصطفیٰ صاحب ملیحہ کے انتقال سے کچھ مہینے پہلے وجدان نے اچانک گھر سے باہر رہنا شروع کر دیا آفس بھی نہیں جاتا تھا صبح کا نکلا آدھی رات کے بعد گھر میں گھستا تھا اور ہم ناراض ہوتے تھے اب سمجھ آیا اس کی بیوی ماں بننے والی تھی پھر وہ کیسے گھر اور آفس کی پروا کرتا اس کا دھیان تو ملیحہ میں اٹکا رہتا ہو گا۔" پھر جیسے انہیں کسی بات کا دھیان آیا تھا انہوں نے پکارا۔

"انیقہ۔"

"جی امی۔" وہ چونک کر بولی۔

"تم نے بتایا تھا کہ وجدان کے جانے سے دو تین دن پہلے جب اس کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا' ملیحہ' وجدان سے ملنے گھر آئی تھی۔" وہ ان کی بات کا مفہوم سمجھ کر سہمی آواز میں بولی۔

"جی بتایا تھا۔" عائشہ مصطفیٰ کے تیور بگڑ گئے۔

"مگر تم نے یہ نہیں بتایا تھا کہ ملیحہ پورے دنوں سے تھی۔" آفاق اور سمیرا ان کی بات سن کر گھبرا گئے آفاق کے ذہن سے یہ بات ہی محو ہو چکی تھی کہ انیقہ کی ملیحہ کے ساتھ ایک چھوٹی سی ملاقات ہوئی تھی اور اب اسے لگ رہا تھا کہ اس کا بھانڈا پھوٹنے والا ہے اور ساتھ ہی شایان کا بھی۔۔۔ وہ سٹپٹائی نظروں سے انیقہ کو دیکھنے لگا مگر آفاق کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ انیقہ اس سے بھی زیادہ بری طرح سٹپٹائی ہوئی تھی تیزی سے پلکیں جھپکتی وہ بار بار کچھ کہنے کے لیے منہ کھولتی لیکن کوئی جواب جیسے بن نہیں پا رہا تھا۔

"بولو انیقہ اب چپ کیوں ہو جواب دو۔" اس کی چپ سے جھنجلا کر مصطفیٰ عظیم بولے تو ان کی آواز میں دبا دبا غصہ تھا۔ انیقہ روہانسی ہو گئی۔

"کیا بولوں ابو جب میں نے کچھ محسوس ہی نہیں کیا تھا۔" آفاق کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

"کیا بات کر رہی ہو۔" عائشہ پہلے سے بھی تیز لہجے میں بولیں۔

"جس عورت کے ہاں دو چار روز میں ولادت ہونے والی ہو اسے تو کنواری بھی پہچان لے اور تم جو اس وقت بھی ایک بچے کی ماں تھیں اتنا بھی نہ دیکھ سکیں کہ ملیحہ امید سے ہے۔" انیقہ اتنی دیر میں خود کو سنبھال چکی تھی بولی۔

"امی میں سچ کہہ رہی ہو میں نے کچھ محسوس نہیں کیا تھا اصل میں، میں پہلے ہی وجدان کی طرف سے پریشان تھی پھر جب ملیحہ نے بتایا کہ وہ ملیحہ فاروقی ہے اور وجدان سے ملنا چاہتی ہے تو مجھے فطری طور پر غصہ آ گیا شاید اسی لیے میں نے اسے ٹھیک سے دیکھا ہی نہیں یا شاید دیکھا بھی ہو تو دھیان نہ دیا ہو گا کیونکہ وجدان تو یہی کہہ رہا تھا کہ ملیحہ سے شادی کرنا چاہتا ہے یہ کب کہا تھا کہ کر چکا ہے جو اس طرف دھیان جاتا اور پھر ملیحہ نے شال لے رکھی تھی حالانکہ دس سال پرانی بات ہے پھر بھی مجھے یاد ہے کہ ملیحہ کالے رنگ کی ساڑھی میں تھی اور اس نے اپنے گرد میرون کلر کی شال خوب پھیلا رکھی تھی ہو سکتا ہے اس لیے بھی میں دیکھ نہیں پائی۔" آفاق اور سمیرا سکون کا سانس لیتے ایک دوسرے کو دیکھ کر مبہم سا مسکرائے تھے حالانکہ

انیقہ "چشم دید گواہ" تھی پر اس کا وہ حال تھا کہ "مجھے خود اپنی نگاہوں پہ اعتبار نہیں" اس کا عذر سن کر بھی عائشہ کہے بغیر نہ رہ سکیں۔

"بہو تخلیق کے عمل سے گزر رہی ہو تو گئے گزرے بھی اس کے ناز اٹھاتے ہیں اور ہمارے پوتے کی ماں شوہر کی خبر لینے چوکھٹ پر آئی بھی تو تم نے اسے دروازے سے لوٹا دیا۔ تم نے بہت زیادتی کی انیقہ' وجدان کو پتا چلا ہو گا تو کتنا برا لگا ہو گا اسے کہ آج تک ناراض ہے ٹھیک ہی تھا پھر جو وہ اپنے بچے کو لے کر چلا گیا۔ بھلا وہ اپنے بچے کو اس گھر میں لے کر کیوں آتا جس گھر میں اس کے بچے کی ماں کو پاؤں رکھنے کی اجازت نہیں ملی۔"

"بیتی باتوں کا دکھ کرنے سے کیا ہو گا۔" "نہیں ماضی کا افسوس کرتے دیکھ کر مصطفیٰ عظیم نے دھیرے سے کہا پھر آفاق کی طرف مڑے۔

"تم یقین کرو ہم سب کو ملیحہ کی جواں مرگی کا بہت افسوس ہے میں تمہارے والد اور تایا سے بھی خود جا کر تعزیت کروں گا بے شک ملیحہ کے انتقال کو طویل مدت گزر چکی ہے مگر ہمیں تو آج ہی معلوم ہوا ہے کہ وہ تمہاری بہن تھی بلکہ تم مجھے ملیحہ کے والد کا بھی پتا بتا دو میں ان سے ملنے جاؤں گا۔"

"ایسا سوچیں بھی مت۔" آفاق گھبرا کر بولا۔

"کیوں؟"

"میں نے بتایا نا وہ اس رشتے پر خوش نہیں تھے۔"

"وہ تو تب کی بات تھی۔" مصطفیٰ عظیم الجھ کر بولے۔

"بات اب بھی یہی ہے۔"

"کیا بیٹی کی موت بھی ان کا غصہ ٹھنڈا نہیں کر سکی۔" وہ حیرت سے بولے پھر ایک خیال کے تحت پوچھا۔

"وہ ملیحہ کی وفات کے بارے میں تو جانتے ہیں نا۔"

"ہاں بلکہ وہ ملیحہ کی آخری رسوم میں شامل تھے لیکن انہوں نے ایک بار بھی شایان کی طرف نہیں دیکھا۔" آفاق اس خیال سے جلدی سے بولا کہ کہیں وہ ملیحہ کے جنازے میں بابا جان کی شمولیت کو ان طرف سے نرمی نہ سمجھ بیٹھیں۔

"حد ہو گئی۔" مصطفیٰ عظیم کو یقیناً "برا لگا تھا۔

"ٹھیک ہے بچوں سے غلطی ہو گئی تھی مگر اب تو انہیں معاف کر دینا چاہیے پھر جب بیٹی ہی نہیں رہی تو ناراضی کس بات کی۔"

"آپ نہیں جانتے انکل پھوپھا جان کی سخت مزاجی بے مثال ہے اگر وہ اتنے ضدی نہ ہوتے تو ملیحہ ان کی مرضی کے بغیر شادی کیوں کرتی اور آپ کو کیا لگتا ہے کیا ملیحہ نے اس کے بعد انہیں منانے کی کوشش نہیں کی ملیحہ نے بہت جتن کیے کہ وہ وجدان کو قبول کرلیں مگر پھوپھا جان ٹس سے مس نہ ہوئے۔ موت برحق ہے اور ایک دن سب کو مرنا ہے لیکن یہ بھی سچ ہے ملیحہ کو پھوپھا جان کی ناراضی نے موت سے پہلے مار دیا تھا اسے اپنے بابا جان سے بہت محبت تھی وہ ان کی ناراضی کے ساتھ سمجھوتا نہیں کر سکی۔ ان کی انا پرستی کا اندازہ لگائیں کہ وجدان کے ساتھ ان کی پہلی ملاقات ہی ملیحہ کے جنازے پر ہوئی تھی اور اس دن بھی انہوں نے وجدان کو مخاطب کرنا گوارا نہیں کیا اور اس دن سے لے کر آج تک انہوں نے ایک بار بھی وجدان سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔" آفاق یہ سب اس لیے کہہ رہا تھا کہ تاکہ مصطفیٰ عظیم بابا سے ملنے کا خیال ہی ذہن سے جھٹک دیں۔

"وجدان سے نہ سہی شایان سے ملنے کو تو دل چاہتا ہو گا آخر ان کا نواسہ ہے ان کا خون ہے۔"

"دل چاہتا تو کبھی ملنے نہ آتے۔" آفاق کی بات نے انہیں چپ ہونے پر مجبور کر دیا تھا پھر آزردگی سے بولے۔

"اگر غلطی ہوئی بھی تھی تو ملیحہ اور وجدان سے ہوئی تھی پر سمجھ نہیں آتا اس بچے کو کس چیز کی سزا مل رہی ہے کہ وہ سارے رشتوں سے دور ہے مجھ سے پوچھتا ہے زوار اور مناہل تو ہمیشہ سے آپ کے ساتھ رہتے ہیں میں کیوں نہیں رہتا تھا۔ کبھی جو وہ دونوں اپنے نانا کے گھر چلے جائیں تو یہ ضد کرنے لگتا ہے کہ مجھے بھی

نانا کے پاس جانا ہے اب میں اسے کیسے سمجھاؤں کہ اس کی قسمت میں ادھورے رشتے ہیں معصوم بچے کا ذہن الجھنوں کا گڑھ بن کر رہ گیا ہے۔" ان کی بات سن کر آفاق نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"میں اسے رشتے ہی دینے آیا ہوں۔" پھر وہ کچھ دور بیٹھے شایان سے بولا۔

"نانا کے گھر چلو گے۔" شایان کا ذہن آس پاس ہو رہی بات چیت کو یاد کرنے اور اس سے نتیجے اخذ کرنے میں لگا تھا وہ فوری طور پر کچھ نہیں بولا تو آفاق اسے ہاتھ پکڑ کر پاس بلاتے ہوئے بولا۔

"تمہیں امی کی تصویریں دیکھنا اچھا لگتا ہے نا۔" شایان نے زور زور سے سر ہلایا تو آفاق نے جیسے اسے لالچ دیتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس تمہاری امی کی بہت ساری تصویریں ہیں۔"

"آپ امی کے بھائی ہیں۔" اب اس نے اپنے ذہن کی بیٹری اسٹارٹ کی

"آپ مجھے امی کے بارے میں بتائیں گے۔"

"ہاں لیکن اگر تم میرے گھر چل کر رہنے پر تیار ہو جاؤ تو....." آفاق کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ اچھل کر بولا۔

"میں آپ کے گھر جاؤں گا۔" پھر ست ہو کر بولا۔

"لیکن ابو سے پوچھنا ہو گا۔"

"تو چلو ان سے پوچھتے ہیں۔" آفاق اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہو گیا تو عائشہ بولیں۔

"پوچھنا کیا ہے بس جا کر وجدان کو بتا دو تب تک میں اسے تیار کرتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" آفاق اس کا ہاتھ چھوڑ کر باہر آگیا۔ وجدان سر دونوں ہاتھوں پر گرائے سیڑھیوں پر بیٹھا تھا آفاق اس کے برابر آ کر بیٹھا تو وجدان سر اٹھائے بغیر بولا۔

"یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"ضرورت کو تم مجھ سے بہتر جانتے ہو۔" وجدان نے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور کہا۔

"میں اسے سمجھا لیتا۔"

"مان لو وجدان کہ شایان کے ذہن سے ملیحہ کا تصور جدا کرنا تمہارے بس میں نہیں تھا۔" وجدان بے بسی سے چہرہ موڑ کر سامنے دیکھنے لگا پھر تھکن بھری آواز میں بولا۔

"اب میں منیر انکل اور افتخار انکل کا سامنا کیسے کروں گا؟"

"عادت ہو جائے گی۔" اس کے لہجے میں لاپرواہی تھی۔

"تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" وجدان نے ملامت کی۔

"تو اور کیا کرتا۔" آفاق چڑ گیا۔

"اس دن جب شایان ملیحہ کو امی کہہ کر اس کی تصویریں دکھا رہا تھا تو وہاں جواد اور فائزہ بھی تھے جو ملیحہ کو دوسرے حوالے سے جانتے ہیں۔ وہ تو شکر تھا کہ انہوں نے ملیحہ کو نہیں پہچانا لیکن شکر کرنے کا یہ موقع ہمیشہ نہیں ملتا پھر تم کیا کرتے۔" وجدان نے کوئی جواب ہی نہیں دیا خاموشی کی اس دیوار کو شایان کی آواز نے توڑا جو "ابو" "ابو" پکارتا ان دونوں کی طرف بھاگا چلا آ رہا تھا قریب آنے پر وہ اپنی اسپیڈ کم کیے بغیر وجدان کے سینے میں گھس گیا تو وجدان ہلکے سے دھکے سے پیچھے ہو گیا۔ پھر اس کے سر پر چپت لگا کر بولا۔

"بریک تو لگا لیا کرو۔" مگر وہ اپنی ہی کہنے لگا۔

"پتا ہے ابو، ماموں کہہ رہے ہیں وہ مجھے نانا کے گھر لے کر جائیں گے۔" وجدان ہکا بکا رہ گیا پھر حواس باختہ سا آفاق سے بولا۔

"تم اسے بابا جان کے گھر لے کر جا رہے ہو۔" آفاق بدکا۔

"میری شامت آئی ہے۔ اسے وہاں لے کر گیا تو پھوپھو جان مجھے جان سے مار دیں گے۔"

"مجھے ان کے گھر جانا بھی نہیں۔" شایان کے ناراضی سے کہنے پر وہ دونوں اسے دیکھنے لگے۔

"کیوں بھئی۔" آفاق نے دلچسپی سے پوچھا تو وہ بدستور منہ پھلائے کہنے لگا۔

"انہوں نے امی کو ڈانٹا تھا وہ گندے ہیں۔"

"ایسا نہیں بولتے۔" وجدان نے فوراً ٹوکا جبکہ آفاق نے ہلکا سا مسکراتے ہوئے کہا۔

"جب یہ اس طرح سے باتیں کرتا ہے تو مجھے یقین ہونے لگتا ہے کہ یہ ملیحہ کا ہی بیٹا ہے۔" وجدان دانستہ تبصرے سے گریز کرتے ہوئے بولا۔

"اچھا سنو تم اسے لے کر جا رہے ہو تو واپس کب تک چھوڑنے آؤ گے۔"

"پہلی بار ملیحہ کا بیٹا بن کر میرے گھر جا رہا ہے دس بارہ دن تو رکے گا ہی۔"

"میں شایان کے بغیر اتنے دن نہیں رہ سکتا۔" وجدان تیزی سے بولا۔

"زیادہ سے زیادہ دو دن، پرسوں شام میں اسے واپس چھوڑ جانا۔"

"دیکھیں گے۔" آفاق نے بے نیازی سے کہا تو وجدان انگلی دکھا کر بولا۔

"اگر تم اسے چھوڑنے نہیں آئے تو میں خود اسے لینے آ جاؤں گا۔"

"کہا نا دیکھیں گے۔" آفاق کا انداز ہنوز وہی تھا۔ پھر سارا وقت وجدان اسے یہی تاکید کرتا رہا کہ ایک دو دن کے بعد وہ شایان کو بھیج دے اور آفاق بھی لاپرواہی سے سر ہلاتا رہا۔

رات کے کھانے کے بعد جب وہ جانے لگے تو سب انہیں گاڑی تک چھوڑنے باہر آگئے۔ رخصت کے لیے ہاتھ ملاتے ہوئے وجدان پھر سے تاکید کرنے لگا۔

"بس کل کا دن کافی ہے پرسوں اسے لے آنا۔" آفاق چڑ کر عائشہ سے بولا۔

"آنٹی اس کا بیگ بھی تیار کر دیں۔" تو وجدان نے بے بسی سے کہا۔

"مذاق مت کرو میں واقعی شایان کے بغیر نہیں رہ سکتا میں نے کبھی ایک دن کے لیے بھی اسے خود سے الگ نہیں کیا اور وہ بھی میرے بغیر اداس ہو جائے گا۔"

"ہاں یہ تو ہے بلکہ دیکھو وہ ابھی سے اداس ہو گیا ہے۔" اس نے گاڑی کی طرف دیکھا جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر شایان بیٹھا تھا۔

"تم بہت ہی بدتمیز انسان ہو۔" اور گاڑی کے پاس آ کر ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر پاؤں باہر رکھے اندر سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بعد شایان کو بازوؤں میں جکڑ کر سینے سے لگا کے پیار کرتے ہوئے بولا۔

"وہاں جا کر شرارت مت کرنا اور اداس ہو جاؤ تو ماموں سے کہہ دینا وہ تمہیں میرے پاس لے آئیں گے۔" پھر سمیرا سے کہنے لگا۔

"بھابھی ذرا خیال رکھیں یہ سارا وقت کھیلتا نہ رہے اس کا ایڈمیشن ٹیسٹ ہونے والا ہے۔ کھانے کا بھی دھیان رکھیں یہ ٹائم پر کھانا نہیں کھاتا اور دودھ سے تو بھاگتا ہے آپ کو زبردستی پلانا پڑے گا۔"

"تم بالکل فکر مت کرو میں شایان کا پورا خیال رکھوں گی۔" سمیرا نے اسے مطمئن کرنے کو کہا تبھی آفاق جو دروازے میں جھک کر کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا وجدان کے کندھے پر ہاتھ مار کر متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

"جیسے سکھا رہے ہو اسے دو بچے پالنے کا تجربہ ہے اور اب آپ باہر آیئے۔" آفاق نے اسے بازو پکڑ کر باہر نکالا پھر لے جا کر مصطفیٰ عظیم کے برابر کھڑا کر دیا۔

"ذرا اسے پکڑ کر رکھیے تاکہ میں جا سکوں۔" پھر وجدان کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر مذاق اڑاتا ہوا بولا۔ اور گاڑی میں جا بیٹھا پھر انجن اسٹارٹ کرتے گیٹ سے باہر نکال لے گیا۔

مصطفیٰ عظیم نے وجدان کی طرف دیکھا جو کچھ سوچتا ہوا گیٹ سے باہر سڑک کو دیکھ رہا تھا۔

"زندگی میں یہی ایک الجھن بچی تھی وہ بھی سلجھ گئی اب تمہیں فیصلہ کر لینا چاہیے۔" وجدان چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔

"کیسا فیصلہ؟"

"دوبارہ گھر بسانے کا فیصلہ۔" واپس گردن موڑتے ہوئے وجدان سامنے دیکھنے لگا۔

"زندگی میں ایسے شخص کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے جو دکھ سکھ بانٹ سکے، تھک جاؤ تو تھکن سمیٹ لے، لڑکھڑاؤ تو ہاتھ تھام لے پھر ابھی تمہاری عمر بھی اتنی نہیں ہوئی کہ تنہائی کو عادت بنالو اب بھی تمہارے سامنے زندگی کا لمبا سفر باقی ہے۔ یہ سفر اکیلے نہیں کٹ سکے گا۔"

"میں اکیلا کہاں ہوں میرے پاس شایان ہے۔" اس کی بات پر مصطفیٰ عظیم بولے۔

"یہ فیصلہ تمہاری ہی نہیں شایان کی بھی ضرورت ہے اسے ماں مل جائے گی۔ تم کب تک اسے اکیلے سنبھالتے رہو گے بچے پالنا مردوں کے بس کی بات نہیں۔" وجدان بولا۔

"میں نے اس وقت بھی شایان کو سنبھالا تھا جب اس کی ماں پیدائش کے فوراً بعد ہی اسے چھوڑ گئی تھی پھر اب کیوں نہیں سنبھال سکتا پھر کچھ سالوں کی بات ہے وہ جوان ہو جائے گا تب تو مجھے اسے سنبھالنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔" وہ اسے بے بسی سے دیکھتے ہوئے بولے۔

"شادی مرد کی ضرورت ہوتی ہے وجدان تم کب تک اس ضرورت سے آنکھ چراؤ گے۔"

"لیکن مجھے کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔"

"تم ملیحہ کو بھول نہیں سکتے۔" کچھ توقف کے بعد انہوں نے پوچھا تو وجدان نے نظر جھکاتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

"بھول بھی جاؤں تو یاد آتی رہیں گی۔" اور مصطفیٰ عظیم مایوسی سے سر جھکا کر پلٹ گئے مگر اندر جانے سے پہلے انہوں نے مڑ کر دیکھا تو وجدان پورچ کی تیز روشنیوں میں گم سم کھڑا تھا اسے دیکھ کر آہ بھرتے وہ اندر چلے گئے۔

☆ ☆ ☆

شایان آیا تو سب ہال میں جمع ہو گئے۔

"آؤ تمہاری سب سے جان پہچان کرواؤں۔" سب سے آفاق کا تعارف کروا رہا تھا اور شایان ان رشتوں کو ذہن میں نقش کر رہا تھا۔

رات میں وہ گوہر اور زارا بچوں کو ان کے مشترکہ کمرے میں سلانے آئیں تو کچھ دیر بعد ہی ارم دودھ کا جگ اٹھائے کمرے میں آ گئی زارا کی بیٹی نے کچھ نخرہ تو کیا مگر دودھ بھی پی لیا لیکن گوہر کے بیٹے اور سمیرا کے بچوں نے آرام سے اپنا اپنا دودھ کا گلاس ختم کر لیا تو ارم نے گلاس بھر کر شایان کی طرف بڑھایا اور وہ ناک بند کر کے۔

"میں نہیں پیوں گا۔" کہہ کر تکیے میں منہ گھسا کر لیٹ گیا تو ارم پاس بیٹھ کر اسے گدگدانے لگی۔

"دودھ پیے بغیر کوئی نہیں سو سکتا اٹھو۔" اور وہ لیٹے لیٹے ہی دونوں ہاتھ اٹھا کر انکار میں ہلانے لگا تو سمیرا ارم کو اشارہ کر کے بولی۔

"دیکھا زارا شایان، ملیحہ کا بیٹا ہو کر دودھ نہیں پیتا۔" شایان کے کان کھڑے ہو گئے زارا مسکراہٹ دبا کر بولی۔

"واقعی کتنی عجیب بات ہے ملیحہ تو دودھ شوق سے پیتی تھی مگر شایان۔" شایان نے ذرا سی گردن موڑ کر ان کی طرف دیکھا تبھی ارم بھی بولی۔

"میں تب بہت چھوٹی تھی لیکن مجھے یاد ہے ملیحہ آپی روز رات کو سونے سے پہلے ایک گلاس دودھ پیا کرتی تھیں۔"

شایان اٹھ کر بیٹھ گیا اور بظاہر اس کی طرف سے انجان بنی خواتین سے بولا۔

"امی کو دودھ اچھا لگتا تھا۔"

"ہاں۔" وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر سرسری سے انداز میں بولیں تو شایان جلدی سے بولا۔

"مجھے بھی دودھ اچھا لگتا ہے۔" اور خود ہی ارم کے ہاتھ سے گلاس لے کر غٹاغٹ چڑھا گیا پھر گلاس واپس کر کے ہاتھ کی پشت سے منہ پونچھنے کے بعد آرام سے لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ان چاروں کے چہرے ہنسی روکنے کی کوشش میں سرخ ہو گئے۔

☆ ☆ ☆

اگلی صبح افتخار حسن فجر نماز کے لیے گھر سے نکلنے لگے تو انہوں نے دیکھا کہ شایان گیٹ کے پاس بنی بینچ پر چڑھ کر بیٹھا ہے۔ رات تو انہوں نے شایان کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا مگر اس وقت حیرت کے زیر اثر اس کے پاس چلے آئے۔

"تم اتنی صبح جاگ گئے اور اتنی ٹھنڈ میں باہر کیوں آئے ہو۔"

"نماز پڑھنی ہے بڑے نانا مگر مجھے پتا ہی نہیں مسجد کدھر ہے۔" چھوٹے بچے کے منہ سے ایسی بات سن کر انہیں بے اختیار اس پر پیار آ گیا تھا مگر اپنے انداز سے انہوں نے کچھ ظاہر نہ ہونے دیا اور سپاٹ آواز میں بولے۔

"میں بھی نماز پڑھنے جا رہا ہوں میرے ساتھ آجاؤ۔" اور وہ "جی بڑے نانا" کہتا چھلانگ لگا کر بینچ سے اترا اور پاس آ کے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ افتخار حسن اسے ساتھ لے کر چل پڑے۔ جاتے ہوئے وہ پورا راستہ باتیں کرتا رہا مگر جب نماز پڑھ کر مسجد سے باہر آئے تو افتخار حسن نے محسوس کیا کہ وہ چپ چپ سا ہے اسے دیکھ کر دل پر بوجھ آ پڑا تھا۔ اندرونی دروازے کے باہر بنے دالان میں سمیرا کی امی تخت پر بیٹھی قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھیں۔ شایان نے گیٹ سے اندر آتے ہی افتخار حسن کا ہاتھ چھوڑ دیا اور چلتا ہوا تخت کے پاس آیا اور چپل اتار کر تخت پر چڑھتا وہ بڑی نانی کی گود میں منہ چھپا کر لیٹ گیا۔ انہوں نے آیت مکمل کی اور قرآن بند کرتیں اس کے گھنے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگیں۔

"کیا بات ہے اداس لگ رہے ہو؟"

"بڑے نانا مجھ سے ناراض ہیں۔" وہ اس طرح سے بولا کہ سمیرا کی امی مسکرانے لگیں۔

"وہ تم سے ناراض نہیں ہیں۔"

"مجھے پتا ہے وہ ناراض ہیں وہ مجھ سے بات نہیں کر رہے اور مجھے گود میں لے کر پیار بھی نہیں کیا۔"

"میں جو تمہیں گود میں لے کر بیٹھی ہوں اور چھوٹے نانا تو رات کو ہمارے بیٹے کے لیے جہاز بھی تو لائے تھے۔ تمہیں اچھا لگا تھا نا۔" وہ اسے بہلانے کی کوشش کر رہی تھیں مگر وہ ضد سے بولا۔

"لیکن مجھے بڑے نانا کی گود میں بیٹھنا ہے۔"

"تو جاؤ جا کر بیٹھ جاؤ۔" شایان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

وہ فوراً تخت سے اترا اور اندر بھاگ گیا۔ دروازے پر رک کر اس نے جھانکا۔ افتخار حسن چہرے کے سامنے اخبار پھیلائے بیٹھے تھے۔ وہ دبے پاؤں چلتا آیا پھر ایک دم سے اخبار کے نیچے سے گھس کر ان کی گود میں جا چڑھا اور افتخار حسن "ارے ارے" ہی کرتے رہ گئے۔

"آپ مجھ سے کیوں ناراض ہیں بڑے نانا میں نے تو کوئی شرارت بھی نہیں کی۔" وہ ان کے گلے میں بازو حمائل کیے اتنے لاڈ سے بول رہا تھا کہ افتخار حسن خود ساختہ اجنبیت کو قائم نہ رکھ سکے اور مسکرا کر بولے۔

"میں تم سے ناراض نہیں ہوں بلکہ تم اتنے اچھے بچے ہو کہ تم سے کوئی بھی ناراض نہیں ہو سکتا۔"

"میں بھی اخبار پڑھوں گا۔" اور ان کی گود میں پھیل کر بیٹھ گیا۔ ناچار انہوں نے اخبار سیدھا کیا مگر پڑھ نہ پائے کیونکہ شایان ٹوٹی پھوٹی ہجے کرتا بلند آواز میں غلط پڑھ رہا تھا۔ سمیرا کی امی شایان کو دیکھنے اندر آئیں تو شایان افتخار حسن کی گود میں بیٹھا انہیں اخبار پڑھ کر سنا رہا تھا۔

"یہ کیا چل رہا ہے۔"

"خبریں سنائی جا رہی ہیں۔" افتخار حسن نے کہا پھر ہنستے ہوئے بولے۔

"میں نے اخبار میں اتنے مزے کی خبریں کبھی نہیں پڑھیں جیسی یہ سنا رہا ہے تم بھی آ کر سنو۔" ان کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر وہ بولیں۔

"آخر شایان نے آپ کو منا ہی لیا۔" انہوں نے لب بھینچ کر مسکراہٹ روک لی پھر الجھ کر بولے۔

"لگتا ہے اس میں کوئی مقناطیس فٹ ہے جو دل اس کی طرف کھنچا جاتا ہے اور کل سے تو ایک عجیب سی بات ہو رہی ہے میں جتنی بار اس کا چہرہ دیکھتا ہوں اس میں ملیحہ کی جھلک نظر آتی ہے۔" وہ سانس بھر کر

بولیں۔

"ملیحہ سے محبت بھی تو بہت کرتا ہے اور انسان جس سے محبت کرے اس کا عکس بن جاتا ہے پھر ہمیں ملیحہ اور وجدان کے سوا اور کوئی حوالہ بھی تو معلوم نہیں، اس کے وجود میں تلاش کیا تو وہی دونوں نظر آئیں گے اس میں عجیب کیا ہے۔" افتخار حسن کا دل ہی اچاٹ ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

شایان کو یہاں آئے سات دن ہو چکے تھے۔ شروع کے دو تین دن تو اس کی شوخیوں کا وہی عالم رہا پھر دھیرے دھیرے اداس ہوتا چلا گیا بات یہ تھی ان سات دنوں میں وجدان ایک بار بھی اس سے ملنے نہیں آیا تھا اور جب وہ آفاق سے گھر جانے کے لیے کہتا تو وہ بھی کوئی جواب نہ دیتا آج سمیرا اسے رات کے کھانے کے لیے بلانے آئی تو وہ بستر پر بیٹھا رو رہا تھا اور سمیرا کے لاکھ چپ کرانے پر بھی چپ نہیں ہوا وہ پریشان سی اٹھ کر آفاق کے پاس آگئی جو سب کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا تھا۔

"آفاق کھانا بعد میں کھا لیجیے گا پہلے شایان کو اس کے گھر چھوڑ کر آئیں وہ بہت رو رہا ہے۔"

"لیکن رو کیوں رہا ہے؟" افتخار حسن نے حیرت سے پوچھا تو آفاق بولا۔

"وجدان کی یاد آ رہی ہو گی اس سے ملنے بھی تو نہیں آیا پھر خود سے فون بھی نہیں کرتا میں ہی شایان کی اس سے بات کرا دوں تو کرا دوں لیکن آفس میں بار بار فون کر کے کہتا ہے شایان کو بھیج دو۔" اس کی بات پر منیر حسن بھی پریشانی سے گویا ہوئے۔

"کئی دن سے آفس بھی نہیں آ رہا کل تو میں نے اس سے فون پر بھی کہا تھا کہ آفس آ جائے ڈاکومنٹس اسے ہینڈ اوور کرنے ہیں مگر وہ آیا ہی نہیں۔ آفاق پتا تو کرو کہیں بیٹے کی جدائی میں بیمار نہ پڑ گیا ہو۔"

"ہو بھی سکتا ہے۔" آفاق بولا۔

"لیکن میں جانتا ہوں وہ آپ دونوں کے سامنے آنے سے کترا رہا ہے ورنہ وہ کبھی بھی شایان کے بغیر اتنے دن نہ گزارتا۔" اس کی امی بولیں۔

"تم اسے چھوڑ ہی آؤ بچہ کتنی بار کہہ چکا ہے گھر جانا ہے۔"

"میں چاہتا ہوں وجدان خود اسے لینے آئے تاکہ اس کا گریز ختم ہو۔" پھر اس نے سمیرا سے کہا۔

"جاؤ شایان کو لے کر آؤ اور آتے ہوئے فون بھی لیتی آنا۔" کچھ دیر بعد وہ شایان کے ساتھ لوٹی تو آفاق اس سے بولا۔

"ابو یاد آ رہے ہیں۔" اور اس نے ناک سڑکتے ہوئے ہاں میں سر ہلایا اور رونے لگا۔ آفاق اسے کندھے سے لگا کر تھپکتا ہوا بولا۔

"ابھی میں ابو کو فون ملاؤں گا اور تم یہی بات ان سے کہنا۔" شایان نے روتے روتے پھر سے سر ہلایا تو آفاق سمیرا کے ہاتھ سے کارڈلیس لے کر نمبر ملانے لگا پھر وجدان کی آواز سنتے ہی اس نے فون شایان کو پکڑا دیا جو فون پکڑتے ہی ابو کہہ کر اونچی آواز میں رونے لگا تھا۔

وجدان خود بہت بے چین تھا پہلی بار شایان اس کی آنکھوں سے دور ہوا تھا روز ہی آفاق کو فون کر کے کہتا کہ شایان کو بھیج دے مگر آفاق سنی ان سنی کرتا رہا خود اس میں اتنی اخلاقی جرات نہیں تھی آفاق کے پاپا یا تایا کا سامنا کر پاتا بلکہ وہ تو آفاق کے گھر کے کسی بھی فرد سے آنکھیں ملانے کی ہمت نہیں رکھتا تھا اسے لگ رہا تھا جیسے وہ زبردستی ایسی چیز پر ملکیت کا حق جتا رہا ہو جس پر اس کا کوئی استحقاق نہیں مگر شایان کی آواز پر وہ پگھل کر رہ گیا تھا۔

"آپ یاد آ رہے ہیں ابو آ کر لے جائیں۔"

"تم بھی مجھے بہت یاد آ رہے ہو۔" وجدان ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ابو مجھے یہاں سے لے جائیں۔" وہ بار بار ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھا۔

"میں آ رہا ہوں میری جان بس تم رونا بند کر دو۔" وجدان کی بے چینی کو محسوس کر کے شایان آنسوؤں کو

ضبط کرنے کی کوشش میں بھرائی آواز میں بولا۔

"جلدی آئیے گا۔"

"بس تم فون رکھو میں دو منٹ میں آ رہا ہوں۔" وجدان نے کہنے کے ساتھ ہی فون بند کر دیا اور گاڑی کی چابی اٹھا کر تیزی سے باہر لپکا۔

شایان کی پکار اس کے سب احساسات پر بھاری تھی۔ اور وہ فل اسپیڈ سے گاڑی بھگاتا آنا "فانا" آفاق کے گھر آ پہنچا، وجدان نے ہال میں قدم رکھا تو سامنے ہی افتخار حسن اور منیر حسن شایان کو ساتھ لیے صوفے پر بیٹھے تھے باقی لوگ بھی وہیں موجود تھے اور شایان کو دلاسے دے رہے تھے جو ابھی تک رو رہا تھا۔

"شایان۔" وجدان نے اس پر نظر پڑتے ہی پکارا۔ شایان نے آواز کی سمت دیکھا پھر "ابو آ گئے۔" کہتا بندوق سے نکلی گولی کی طرح اٹھ کر وجدان کی طرف دوڑ پڑا اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر گھٹنے زمین پر ٹکا کر بیٹھتے ہوئے وجدان نے اپنی بانہیں کھول دیں اور شایان دوڑتا ہوا آ کر ان میں سما گیا۔ دیکھنے والوں کو لگ رہا تھا جیسے دونوں برسوں بعد ملے ہوں۔ وجدان اسے بے تحاشا چوم رہا تھا اور شایان اس سے لپٹتا جا رہا تھا۔

پھر وجدان کا دھیان سب کی طرف گیا جو اس کے گرد گھیرا ڈالے مسکراتی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

"السلام علیکم۔" شایان کا ہاتھ پکڑ کر کھڑے ہوتے اس نے سب کو مشترکہ سلام کیا تھا۔

"تم آفس کیوں نہیں آ رہے۔" منیر حسن کڑے تیور سے بولے تو وجدان سٹپٹا تا ہوا۔

"انکل وہ میں۔۔۔" کرنے لگا تو انہوں نے کہا۔

"بس رہنے دو مجھے پتا چل گیا ہے تم کبھی نہیں سدھرو گے میری بھانجی نہیں رہی تو کیا ہوا اس کا بیٹا جو ہے جس کے نام پر تم جی بھر کے اوٹ پٹانگ حرکتیں کر سکتے ہو۔" وجدان خفیف سا مسکراتے ہوئے گدی مسلنے لگا تبھی اس کی نظر افتخار حسن پر پڑی اور بلا ارادہ ہی اس نے رخ پھیرتے ہوئے چہرہ چھپانا چاہا۔

"کیا ساری عمر چہرہ چھپاتے رہو گے۔" وجدان نے کچھ ہچکچاہٹ کے بعد ان کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر نرم سے تاثر نے اسے شرمندہ کر دیا۔

"میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ اس فسانے کو سن کر آپ کو کتنی تکلیف ہوئی ہو گی۔"

"اب اس ذکر کو جانے دو یوں بھی تقدیر کی بس ایک لکیر ہی درمیان میں ہے ورنہ یہ فسانہ ملیحہ کی داستان حیات بھی ہو سکتا تھا۔" وہ متانت سے بول کر چپ ہوئے تو سمیرا کی امی وجدان کا بازو تھام کر بولیں۔

"اب یوں کھڑے نہ رہو۔ آؤ بیٹھ جاؤ۔" تو وہ فوراً ہی معذرت کرنے لگا۔

"سوری خالہ بیٹھ نہیں سکتا میں گھر میں کسی کو بتا کر نہیں آیا سب پریشان ہو رہے ہوں گے۔"

"آئے ہو تو ڈاکومنٹس لے جاؤ۔" اسے جاتے دیکھ کر منیر حسن جلدی سے بولے۔

"آفاق کے ساتھ جاؤ وہ تمہیں بتا دے گا۔" ساتھ آفاق کو اشارہ کیا وہ سر ہلاتا وجدان کو ساتھ آنے کا کہہ کر اسٹڈی کی طرف چل پڑا۔ اندر آ کر وہ چلتا ہوا ٹیبل کے پاس آ رکا اور فائل میں سے کچھ کاغذات دیکھ کر نکالنے لگا وجدان بھی اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔ آفاق نے ایک کاغذ نکال کر وجدان کی طرف بڑھاتے ہوئے سنجیدہ چہرے کے ساتھ کہا۔

"یہ شایان کا برتھ سرٹیفکیٹ ہے جس میں شایان کی ماں باپ کی حیثیت سے وجدان مصطفیٰ اور ملیحہ فاروقی کے نام درج ہیں اور اس برتھ سرٹیفکیٹ میں شایان کی تاریخ پیدائش وہی درج کی گئی ہے جو ملیحہ کی اصل تاریخ وفات ہے۔" وجدان نے سپاٹ چہرے کے ساتھ وہ سرٹیفکیٹ آفاق سے لے کر ٹیبل پر رکھ دیا اس کے بعد آفاق نے ایک اور کاغذ اس کے ہاتھ میں دیا۔ وجدان نے اس کاغذ پر نظر ڈالی اور ہکلاتا ہوا بولا۔

"یہ۔۔۔ یہ تو۔"

"نکاح نامہ ہے۔" آفاق اس کی بات پوری کرتے ہوئے بولا۔

"اس پر ملیحہ کے دستخط بھی موجود ہیں جو ایک ایکسپرٹ سے کروائے گئے ہیں اور انہیں جعلی ثابت کرنا آسان نہیں گواہوں کے طور پر میں پاپا' بابا جان اور صمد سائن کر چکے ہیں تم بھی دستخط کر دینا اس کے بعد اگر شایان کے اصل ماں باپ بھی کہیں سے اٹھ آئیں تو برتھ سرٹیفکیٹ اور نکاح نامے کی موجودگی میں تمہیں شایان پر اپنا حق ثابت کرنے کے لیے کسی دوسری گواہی کی ضرورت نہیں رہے گی کیونکہ اب قانونی طور پر ملیحہ تمہاری مرحومہ بیوی اور شایان تم دونوں کی اولاد ہے۔" وجدان کے دماغ میں بگولے اٹھ رہے تھے اور کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ اسے ملیحہ کے ساتھ ہوئی پہلی ملاقات یاد آنے لگی...... اور اپنا پہلا جملہ جو اس نے ملیحہ سے کہا تھا...... وہ جملہ جو ایک سوال تھا۔

"آپ مجھ سے شادی کریں گی۔" مگر اس سوال کو جواب نہ مل سکا اور اس ملال نے ایک عمر وجدان کے جنون کو سرگرداں کیے رکھا...... یہ دکھ وجدان کو عزیز بھی بہت تھا...... یہ دکھ ہی تو اس کی چاہت کا صلہ تھا...... یہ دکھ ہی اس کی عمر کا حاصل تھا...... اور آج وجدان کے ہاتھ میں پکڑا کاغذ کا ٹکڑا کہہ رہا تھا کہ ملیحہ' وجدان کی بیوی تھی اور شایان سے اس کے تعلق کا ثبوت...... مذاق اور ایسا مذاق وجدان کو لگ رہا تھا کہ اس کا ملال' اس کی جاگیر اس سے چھین لی گئی ہے۔ اب وہ کسے جا کر کہے گا کہ اس نے محبت میں خسارہ اٹھایا ہے۔ لب آزاد ہوں تو درد کو جھیلنا کچھ سہل ہو جاتا ہے مگر وجدان کو درد کے دلدل میں اتار کر طاقت فریاد چھین لی گئی تھی۔ وجدان کو لگا اس کی ناکام آرزوں کو تماشا بنا دیا گیا ہے یہ تضحیک اس کی برداشت سے باہر تھی۔ خالی ہاتھ رہ جانا ہمیشہ تکلیف دیتا ہے لیکن جس کے دامن میں صرف ایک دکھ ہو پھر اگر وہ بھی اس چھن جائے تو...... یہ چارہ گری کسے بھائے گی۔

ایک مدت سے وجدان نے آنسوؤں کو پلکوں کی سلاخوں میں قید رکھا تھا لیکن آج وجدان نے انہیں آزادی کی نوید دے دی۔ اب وہ پھوٹے چلے آرہے تھے مگر وجدان ہنس رہا تھا...... وہ تقدیر کے اس مذاق پر قہقہے لگا رہا تھا اور ساتھ ساتھ اس کا چہرہ بھیگتا جا رہا تھا پھر جانے کیا ہوا ہنستے ہنستے اس کے ہونٹوں سے قہقہوں کی جگہ آہ و بکا نکلنے لگیں وہ اس کاغذ کو دیکھ دیکھ کر ٹوٹنے لگا اس نے سر کو اٹھا کر چھت کی طرف دیکھا جیسے اس کی نگاہیں سیدھی آسمان تک جا پہنچیں گی اور آنسوؤں کے بیچ پکارا۔

"اللہ۔" اس کی آواز میں ڈھیروں شکوے تھے۔ مگر عرش سے وہی خاموشی سنائی دی جیسے اللہ کہہ رہا ہو۔

"جو میری رضا۔" اور وجدان نے سر جھکا دیا ہونٹ کاٹتے ہو درد برداشت کرنے کی کوشش میں بے دم ہو کر فرش پر بیٹھ گیا۔

"میرے زخم بھر جانے دے اللہ' میرے زخم بھر جانے دے۔" دونوں بازو سر پر رکھے وہ پھوٹ پھوٹ کر روتا ہوا کہتا جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

سمیرا چپ ہوئیں تو انہیں بے تحاشا تھکن کا احساس ہوا یہ تھکن صرف اس لیے نہیں تھی کہ وہ مستقل کئی گھنٹوں سے بول رہی تھیں بلکہ ماضی کے پرخار راستوں پر ننگے پاؤں چلنے کا نتیجہ تھی وہ راستے بے شک ان کا نصیب نہیں تھے مگر جن کے تھے ان کے پاؤں کے زخم انہوں نے انگلیوں پر شمار کیے تھے انہیں اپنا حلق سوکھتا ہوا محسوس ہوا تو بیڈ پر بیٹھے بیٹھے ہی انہوں نے سائیڈ ٹیبل پر رکھے جگ سے پانی گلاس میں انڈیلا اور گلاس ہونٹوں سے لگا کر حلق تر کرنے کے بعد گلاس میں جھانکتی ہوئیں بولیں۔

"آج دیکھنے والی آنکھیں جسٹس وجدان مصطفیٰ کو رشک سے دیکھتی ہیں کون ایسا خوش نصیب ہو گا جسے زندگی میں اتنی کامیابیاں ملی ہوں کہ جو بھی چاہا آخر اسے پا لیا۔ عزت' شہرت' دولت...... اور محبت بھی کیونکہ دنیا تو یہی دیکھتی ہے کہ وجدان نے جس لڑکی سے محبت کی وہ اس کی بیوی بن گئی' جی نہ سکی یہ اور بات ہے مگر وہ ان چند خوش نصیبوں میں سے ہے جن کی محبت تکمیل کو پہنچتی ہے اور اس محبت کی حسین یادگار ہے شایان مصطفیٰ۔

جوان بیٹے کا باپ ہونا اپنے آپ میں خوش بختی ہے اور بیٹا اگر اے ایس پی شایان مصطفیٰ ہو تو کیا کہنے۔ ذہانت اور وجاہت تو اسے ماں باپ سے ورثے میں ملی ہے اور اس کی سعادت مندی اور فرماں برداری یقیناً" وجدان کی تربیت کا نتیجہ ہے جس نے صحیح معنوں میں محبوبہ بیوی کی نشانی کو سینے سے لگا کر رکھا۔ لوگ وجدان کو دیکھتے ہیں تو رشک سے سوچتے ہیں کاش انہیں بھی ایسی قسمت مل جائے مگر میں ہر بار وجدان کو دیکھ کر یہی دعا کرتی ہوں کہ اس جیسی قسمت اللہ کسی کو نہ دے۔" انہوں نے سر اٹھا کر تانیہ کو دیکھا جو دیوار کے ساتھ کمر ٹکائے کارپٹ پر بیٹھی تھی دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے اس کا چہرہ آنسوؤں سے دھلا تھا۔

"وجدان کی زندگی میں قیامتیں بہت آئی ہیں آج یوم حساب بھی آگیا مجھے ڈر ہے کہیں اسے گناہ گار نہ ٹھہرا دیا جائے۔" وہ خوفزدہ سی کہہ رہی تھیں تانیہ نے کچھ بھی نہ کہا اور پیشانی ہاتھوں کی پشت پر ٹکا دی۔

☼ ☼ ☼

وجدان' بابا جان اور نورالہدیٰ کے سامنے ہاتھ باندھے یوں کھڑے تھے جیسے احتساب کے کٹہرے میں لائے گئے ہوں اور اعتراف جرم کے بعد ان کے چہرے پر سزا کا انتظار تھا مگر محتسب ان کی زندگی کا حساب کتاب جو کرنے لگے تو مخمصے میں پڑ گئے ان کے چہروں پر فیصلے کی ہچکچاہٹ تھی۔ وجدان نے جھکی نظر اٹھا کر بابا جان کو دیکھا مگر ان کے چہرے پر کچھ پڑھ نہ سکے پھر بھاری آواز میں بولے۔

"میں اپنی خطا کی کوئی وضاحت نہیں دوں گا نہ اپنی عمر کی رائیگانی دکھا کر آپ سے کوئی رعایت مانگوں گا مجھے سزا دیجیے بابا جان۔" بابا جان ایک گہری نگاہ ان پر ڈال کر بولے۔

"میں تمہیں سزا تو دینا چاہتا ہوں مگر پھر مجھے ملیحہ سے معافی کون دلائے گا میری بیٹی میں انصاف کی خوبی ہی نہیں وہ تمہارے معاملے میں ہمیشہ جانبدار رہے گی۔" وہ ایسے بولے جیسے ملیحہ کی اس کمزوری پر افسوس کر رہے ہوں۔ ان کی طرف سے ناامید ہو کر وجدان نورالہدیٰ کی طرف مڑے۔

"آپ ہی سزا دے دیجیے ہادی بھائی آپ کا تو حق بھی بنتا ہے ملیحہ منگیتر تھیں آپ کی' زندگی نے بیوی بننے کی مہلت نہیں دی مگر وہ آپ کے لیے دلہن تو بنی ہی تھیں۔" نورالہدیٰ گمبھیر لہجے میں بولے۔

"مجھ سے سزا نہ مانگو وجدان میں اس معاملے میں بے بس ہوں۔ میں نے ملیحہ سے زیادہ محبت کسی سے نہیں کی مگر میں یہ بات کبھی نہیں بھول سکتا ملیحہ نے سب سے زیادہ تمہیں چاہا تھا تمہاری خطا تو وہ سنتے ہی معاف کر دے گی مگر تمہیں سزا دینے والے کو معافی نہیں ملے گی۔" پھر وجدان بولے تو ان کی آواز پہلے سے بھی بھاری ہو گئی۔

"ملیحہ وہ پہلی اور آخری لڑکی تھیں جنہیں دیکھ کر جن کے ساتھ زندگی جینے کا خیال آیا تھا مگر میں یہ بات کبھی نہیں بھول سکتا کہ انہوں نے جسے ہم سفر بنانے کا فیصلہ کیا وہ آپ تھے۔ آپ بے خوف ہو کر سزا سنائیے کیونکہ جس دن معافی نامے جاری ہونے لگے وہ مجھ سے پہلے آپ کو معاف کر دیں گی۔" نورالہدیٰ نے نظر جھکالی پھر اٹھ کر ان کے پاس آگئے۔

"ضد کر رہے ہو تو سزا دے ہی دیتا ہوں اور سزا یہ ہے کہ تم اپنے ٹوٹے خواب کی کرچیاں عمر بھر اپنے زخمی ہاتھوں میں سمیٹتے رہو۔"

"ہادی بھائی۔" وجدان نے حیرت میں گھر کر پکارا تھا تو نورالہدیٰ نے ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر عاجزی سے کہا۔

"آج تک تم ہر کسی سے درخواست کرتے آئے ہو یہ بات اپنی زبان پر نہ لائیں کہ شایان تمہارا بیٹا نہیں آج میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ کبھی یہ بات اپنی زبان پر نہ لانا کہ شایان' ملیحہ کا بیٹا نہیں۔"

"نورالہدیٰ۔" بابا جان نے ان کی بات سنی تو بل

کھا کر رہ گئے۔

"یہ فیصلہ تم نہیں کر سکتے۔" نور الہدیٰ ان کی طرف پلٹ کر بولے۔

"پلیز بابا جان۔ تانیہ نے کہا نہیں مگر کل جب وہ کہہ رہی تھی کہ شایان کو بھول جائے گی میں اسی وقت سمجھ گیا تھا وہ شایان کو کبھی بھول نہیں سکتی۔ میرا ظرف اتنا بڑا نہیں ہے مگر تانیہ کی خوشی کی خاطر میں اس کا ہاتھ ایک بے نشان شخص کے ہاتھ میں دے دوں گا مگر یہ سچ دنیا کو سنا کر میں اپنی بیٹی کا تماشا نہیں بنا سکتا۔"

"نور الہدیٰ تم ..." وہ ناگواری سے کچھ بولنے لگے تھے کہ نور الہدیٰ انہیں بیچ میں ہی ٹوک دیا۔

"آپ کی بیٹی مر چکی ہے بابا جان میری بیٹی کو نہ ماریں۔" بابا جان چپ سے ہو گئے پھر اٹھے اور کمرے سے نکل گئے وجدان نے انہیں جاتا دیکھا تو دل گرفتہ سے ہو گئے وہ یاسیت بھری نگاہوں سے اس دروازے کو دیکھ رہے تھے جس سے بابا جان گزر کر گئے تھے کہ نور الہدیٰ نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر انہیں متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں شایان سے ملنا چاہتا ہوں۔" وجدان پلٹ کر انہیں دیکھنے لگے تو انہوں نے مزید کہا۔

"کل اسے اپنے ساتھ لے آنا۔" وجدان گم سم سے ہو گئے تو نور الہدیٰ نے کہا۔

"کیا ہوا وجدان۔" وہ بولے۔

"آج جب میں نے قصر فاروقی میں قدم رکھا تھا تو لگا میں مقتل میں آ گیا ہوں اور زندگی کچھ پلوں کی مہمان ہے یہ تو سوچا بھی نہیں تھا مقتل مجھے زندگی بخش دے گا۔ تھینک یو ہادی بھائی۔" نور الہدیٰ خفیف سا مسکرا کر بولے۔

"اسی قصر فاروقی نے ایک بار تمہاری زندگی چھینی بھی تو تھی آج اگر بخش دی تو شکریہ کس بات کا یہ تمہارا ہم پر قرض تھا جو آج اتر گیا مگر ستائیس سالوں سے اس قرض پر جو سود چڑھتا رہا وہ ابھی باقی ہے وہ سود مجھے معاف کر دو مجھ میں اسے چکانے کی سکت نہیں۔" ان کی آواز میں ندامت اور ملال کی آمیزش تھی جس نے وجدان کو مضطرب کر دیا۔

"آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں ہادی بھائی آپ تو شروع سے ہی لاعلم تھے۔"

"اس لاعلمی کی تو سزا کاٹ رہا ہوں، ستائیس سالوں سے ایک پھانس دل میں چبھ رہی ہے۔" کرب سے ہونٹ کاٹتے انہوں نے سختی سے آنکھیں میچ کر پلکوں پر آئی نمی کو اندر اتارا اور کہا۔

"کاش میں ہمیشہ لاعلم رہتا۔" ان کی اذیت کو محسوس کر کے وجدان نے سر جھکا لیا پھر نظروں کا زاویہ بدل کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

تانیہ نے لاؤنج میں قدم رکھا تو سامنے عذیر اور عمیر سر جوڑے بیٹھے تھے اور آہٹ پر سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

"کیا کھسر پھسر کر رہے تھے۔" تانیہ نے ارد گرد نگاہ گھماتے محتاط انداز میں کہا۔

"انکل چلے گئے۔"

"ہاں۔" عذیر نے کہا پھر جوش میں کہنے لگا۔

"آپ کو پتا ہے آپی وہ انکل کون تھے۔" تانیہ نے ٹھٹک کر پوچھا۔

"کون تھے؟" عذیر اٹھ کر اس کے پاس آ کر بولا۔

"ان کا نام وجدان مصطفیٰ ہے اور وہ جو لڑکی ہے نا... وہی جن کی تصویر دادا جان کے کمرے میں لگی ہے وہ دادا جان کی بیٹی تھیں ان کا نام ملیحہ تھا اور وجدان انکل ملیحہ آنٹی کے شوہر ہیں اور دادا جان بھی ہمارے دادا نہیں ہیں وہ پاپا کے چچا ہیں۔"

"واٹ ربش۔" تانیہ ناگواری سے بولی۔

"وہ پاپا کے بابا ہیں یا چچا ہمارے دادا ہی ہیں۔"

"ہاں وہ تو ہے۔" عذیر ہکلایا پھر چڑ کر بولا۔

"اچھا نا بات تو سن لیں۔" اور تانیہ مطمئن سی بولی۔

"ہاں بھی سنائیں۔" اور وہ کہنے لگا۔

"ملیحہ آنٹی نے وجدان انکل کے ساتھ لو میرج کی تھی اس لیے دادا جان ان سے ناراض ہو گئے پھر آنٹی

کی بھی ڈیتھ ہو گئی تو دونوں فیملیز میں رابطہ ہی ختم ہو گیا لیکن اب وجدان انکل اچانک ہی دادا جان سے ملنے آ گئے دراصل وہ چاہتے ہیں کہ اب دادا جان ان سے ناراضی ختم کر کے انہیں فیملی ممبر کے طور پر قبول کر لیں۔" عذیر کی باتوں سے تانیہ کا اطمینان بڑھتا گیا۔ وجدان کی زندگی کا یہ طوفان دبے پاؤں گزر گیا تھا۔

"کاش یہ سکون مستقل ہو۔" اس نے دل سے دعا کی تبھی عمیر پاس آ کر جھنجلاہٹ سے بولا۔

"بے کار کی باتیں کیے جاؤ اصل بات تو بتا دو۔"

"کون سی بات۔" تانیہ چونکی۔

"بابا چاہتے ہیں کہ آپ کی شادی وجدان انکل کے بیٹے کے ساتھ کر دی جائے۔" تانیہ نے حیرت سے اسے دیکھا وہ اس خبر کی تو توقع بھی نہیں کر رہی تھی نور الہدیٰ اور بابا جان کے بیچ جانے کے بعد اسے اتنا تو اندازہ تھا کہ نور الہدیٰ، وجدان کو سپورٹ کریں گے مگر وہ سب جان کر بھی شایان کو قبول کر لیں گے، تانیہ کو امید بھی نہیں تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ اگر وہ ایسا کرنے پر مجبور ہوئے ہیں تو صرف اس کی خاطر۔ اسے اپنے پاپا پر ڈھیروں پیار آ گیا ہولے سے مسکرا کر اس نے پوچھا۔

"پاپا کہاں ہیں۔"

"اپنے کمرے میں، لیکن آپ وہاں مت جائیں۔" عمیر کی بات سنتے ہی وہ نور الہدیٰ کے کمرے میں جانے کے لیے پلٹی تو عمیر جلدی سے بولا۔

"کیوں؟" تانیہ اسے حیران ہو کر دیکھا۔

"آپ کی شادی والی بات پر ماما کا پاپا سے جھگڑا چل رہا ہے۔"

"کیوں؟" تانیہ نے پھر سے کہا بعد میں اسے احساس ہوا کہ اسے یہ سوال نہیں کرنا چاہیے تھا عمیر بھی ان کے کیوں پر گڑبڑا کر سوچتا ہوا بولا۔

"شاید اس لیے وہ شایان بھائی کو نہیں جانتی ہیں اور وہ پہلے سے ہی افسر بھائی کو آپ کے لیے پسند بھی کر چکی ہیں۔" پھر اس نے تانیہ کی طرف دیکھا اور شرارت سے بولا۔

"لیکن آپ تو انہیں جانتی ہیں بابا بتا رہے تھے کہ آپ کی فرینڈ فائزہ کے پیرنٹس ملیحہ آنٹی کے کزنز تھے اور وجدان انکل کا ان کی فیملی کے ساتھ کافی اسٹرونگ ریلیشن ہے اور آپ ان کے گھر شایان بھائی سے مل چکی ہیں۔"

"ہاں لیکن مجھے باقی باتوں کا علم نہیں تھا۔" اس نے جلدی سے کہا پھر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئی۔

نور الہدیٰ کے کمرے سے جھگڑا کرنے کی دبی دبی آوازیں آ رہی تھیں۔ تانیہ جانتی تھی کہ اس جھگڑے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے اس نے بس ایک پل کو سوچا پھر دستک دیے بغیر دروازہ کھول کر کمرے میں آ گئی۔

"بھول جاؤ نور الہدیٰ میں تمہاری یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہونے دوں گی۔" مریم کسی بات پر تنفر سے کہہ رہی تھیں وہ بیڈ پر بیٹھی تھیں غصے کی زیادتی سے ان کا تنفس بگڑا ہوا تھا اور چہرے کے نقوش جن میں ہمیشہ نرمی گھلی رہتی تھی کھردرے سے لگ رہے تھے۔ نور الہدیٰ ایک جانب رکھی کرسی پر اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام کر بے بس سے بیٹھے تھے دونوں دروازہ کھلنے کی آواز پر بیک وقت تانیہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اسے دیکھتے ہی نور الہدیٰ تیزی سے کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔

"تانیہ تم یہاں سے جاؤ۔"

"سوری پاپا مگر میں نہیں جاؤں گی۔" وہ دھیمی آواز میں کہہ کر مریم سے بولی۔

"ماما میں جانتی ہوں آپ پاپا سے کیوں جھگڑا کر رہی ہیں پلیز آپ پاپا کو ہرٹ مت کریں۔"

"تم کچھ نہیں جانتیں۔" وہ قطعیت سے بولیں۔

"تمہیں پتا ہے تمہارے پاپا شایان مصطفیٰ کے ساتھ تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں مگر میں ہرگز یہ نہیں ہونے دوں گی۔" ان کا لہجہ اتنا اٹل تھا تانیہ گھبرا اٹھی اور نور الہدیٰ کی موجودگی کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

"پلیز ماما۔ پاپا نے اگر فیصلہ کیا ہے تو سوچ سمجھ کر کیا

ہو گا۔" مگر مریم ذرا متاثر نہیں ہوئیں۔

"شایان ملیحہ فاروقی کا بیٹا ہے جس کے نام پر نورالہدیٰ کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں وہ فیصلہ کیا سوچ سمجھ کرے گا۔"

"چپ ہو جاؤ مریم۔" تانیہ کی موجودگی میں نورالہدیٰ خجل ہو گئے تو مریم نے چمک کر کہا۔

"واہ ابھی سے چپ ہونے کو کہہ رہے ہو ابھی تو میں نے تانیہ کو یہ بتایا ہی نہیں کہ اس کا باپ شایان کی ماں سے ہمیشہ محبت کرتا رہا اور آج بھی کرتا ہے۔"

"فار گاڈ سیک مریم بیٹی کے سامنے تو زبان قابو میں رکھو۔" وہ جھنجلا کر بولے تو مریم طنز سے مسکرانے لگیں۔

"کمال ہے میرے سامنے تو بے دھڑک ملیحہ سے عشق کا اعتراف کرتے ہو اور اگر یہی بات میں نے بیٹی سے کہہ دی تو تمہیں میری زبان کی فکر ہو گئی ہے۔" تانیہ کے سامنے مریم کے طنز انہیں بے چین کر رہے تھے مگر وہ کسی طرح چپ نہ ہوئیں تو نورالہدیٰ ضبط کی انتہا پر تانیہ سے بولے۔

"تانیہ تم اسی وقت یہاں سے چلی جاؤ۔"

"جی پاپا۔" تانیہ ان کی خجالت محسوس کر کے جلدی سے کہہ کر دروازے کی طرف بڑھی تھی کہ مریم نے اس کا بازو جکڑ لیا اور لفظ چبا چبا کر بولیں۔

"تانیہ کہیں نہیں جائے گی۔" نورالہدیٰ نے خود کو بے چارگی کی انتہا پر محسوس کیا۔

"میرے صبر کا امتحان مت لو۔"

"صبر کا امتحان تو تم لیتے آئے ہو نورالہدیٰ پچیس سالوں سے میں ایسے شخص کے ساتھ زندگی گزار رہی ہوں جو کسی اور کا دم بھرتا ہے میں نے اپنا سب کچھ تمہیں بخش دیا پھر بھی تم میرے نہ ہوئے ہمیشہ اسی کے رہے جو تمہیں چھوڑ کر کسی دوسرے کے ساتھ نکل بھاگی تھی۔"

"شرم آنی چاہیے تمہیں اس طرح کی بات کرتے ہوئے۔" نورالہدیٰ نے بھڑک کر کہا جواباً وہ سرد لہجے میں بولیں۔

"کسی دوسرے کی بیوی کسی کے بچے کی ماں سے عشق کرتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آنی چاہیے۔" نورالہدیٰ نے کوفت سے انہیں دیکھا پھر تانیہ سے تیز لہجے میں بولے۔

"میں تمہیں جانے کو کہہ رہا ہوں تو جاتی کیوں نہیں۔" اس کا بازو ابھی بھی مریم کے ہاتھ میں تھا انہوں نے نورالہدیٰ کی بات سن کر اپنی جنونی گرفت اتنی سخت کر لی کہ ان کے ناخن تانیہ کی نرم کھال میں گھس گئے اور چلا کر بولیں۔

"یہ یہاں سے نہیں جائے گی۔"

"ماما پلیز میرا بازو چھوڑ دیں۔" تانیہ درد سے بلبلائی تو وہ اس کے بازو کو جھٹکا دے کر سختی سے بولیں۔

"کہہ دیا نا تم یہاں سے نہیں جاؤ گی۔" پھر وہ گردن موڑ کر نورالہدیٰ کو دیکھنے لگیں اور کہا۔

"آج مجھے تم پر ترس آ رہا ہے نورالہدیٰ مجھے یاد ہے سرکل کی کوئی ایک لڑکی ایسی نہیں تھی جو تم سے شادی نہ کرنا چاہتی ہو مگر جس سے تم شادی کرنا چاہتے تھے وہ تمہیں چھوڑ کر کسی اور کی بیوی بن گئی۔ سو سیڈ۔" وہ ہمدردی جتا کر بولیں تو نورالہدیٰ طیش میں آ گئے۔

"میں نے کبھی ملیحہ کو پانے کی خواہش نہیں کی تھی۔" وہ یک دم مشتعل ہو گئیں۔

"پھر تم کس لیے اس ڈائن کا سوگ مناتے ہو۔" تانیہ کو برا لگا تو فوراً اسے ٹوکنے لگی۔

"ماما اتنا تو خیال کر لیں کہ وہ مر چکی ہیں۔" وہ تیز لہجے میں بولیں۔

"اسے مرا ہوا مت کہو تانیہ وہ مرتی ہی تو نہیں۔ اگر مر گئی ہوتی تو آج نورالہدیٰ میرا ہوتا مگر اسے زندہ رہنے کا ایسا لالچ ہے کہ مر کر بھی نہیں مری اس کا وجود اس دنیا سے اٹھ گیا پھر بھی وہ دنیا چھوڑنے کو تیار نہیں ہے وہ لڑکی نہیں آسیب ہے جس نے ہر ایک کو اپنے دام میں گرفتار کر رکھا ہے ایک باپ بیٹا میرے گھر میں اس کے عاشق ہیں ایک باپ بیٹا اس کے گھر میں اس کے نام کی تسبیح پڑھتے ہیں اور جانے کون کون ہے جسے

اس نے اپنے سحر میں جکڑ رکھا ہو گا۔" پھر وہ اچانک نورالہدیٰ سے بولیں۔

"اس میں ایسا کیا تھا نورالہدیٰ جو ہر کوئی اس کی محبت میں مرا جا رہا ہے اس میں کون سی کشش تھی جو کم نہیں ہوتی کیوں میری محبت اس کی موت کے سامنے بے بس ہے۔" پھر خود ہی سر جھٹک کر کہا۔

"جنتر منتر پھونکے ہوں گے اس چڑیل نے ورنہ کون اس گری ہوئی لڑکی کو یاد کرتا' جو ایک طرف کزن کو الو بناتی رہی دوسری طرف وجدان کو پھانس کر بیاہ رچا لیا۔"

"وہ ایسی نہیں تھیں جیسا آپ بول رہی ہیں اگر ہوتیں کوئی انہیں یاد نہ کرتا ہاں وہ نہیں مریں کیونکہ جو دلوں میں جینے کا ہنر سیکھ لے اسے موت نہیں مار سکتی۔" مریم نے یوں تانیہ کو دیکھا جیسے یقین نہ آیا ہو یہ سب اس نے کیا ہے پھر طنز سے مسکراتیں نورالہدیٰ سے بولیں۔

"مبارک ہو نورالہدیٰ ملیحہ کے عاشقوں کی فہرست میں نئے نام کا اضافہ ہوا ہے۔" پھر وہ تانیہ کا بازو جھٹک کر پیچھے ہٹتیں خونخوار لہجے میں بولیں۔

"تم دونوں اس سے کتنی بھی محبت کر لو میری نفرت سے جیت نہیں سکتے اور کان کھول کر سن لو میں کسی قیمت پر ملیحہ کے بیٹے کو اپنی بیٹی کی زندگی میں برداشت نہیں کروں گی۔" نورالہدیٰ نے سرد سپاٹ نظروں سے ان کی طرف دیکھا اور کاٹ دار آواز میں بولے۔

"تم بھی ایک بات سمجھ لو میں تم جیسی کم ظرف عورت کے لیے اپنی بیٹی کی زندگی داؤ پر نہیں لگاؤں گا۔" وہ رک کے پھر کہا۔

"میں نے تم سے بہت محبت کی ہے مریم.... اتنی کہ خود بھی ڈر گیا کہیں ملیحہ کو نہ بھول جاؤں مگر وہ تم تھیں جس نے کبھی مجھے ملیحہ کو بھولنے نہیں دیا اس کی تصویر ہمیشہ میرے ذہن میں تازہ رکھی لیکن تمہارے اس احسان کے باوجود آج مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم سے شادی کرنا میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔" وہ اجنبیت سے بول کر لمبے لمبے ڈگ بھرتے کمرے سے چلے گئے۔

آسمان پر اتنا اندھیرا نہیں تھا جتنا مریم کی آنکھوں کے سامنے چھا گیا تھا کسی عورت کے لیے اس سے بڑا طمانچہ اور کیا ہو گا کہ اس سے کہا جائے کہ اس کے ساتھ پچیس سال کی رفاقت غلطی تھی۔ وہ گرنے کو تھیں کہ تانیہ نے بڑھ کر انہیں تھام لیا پھر سہارا دیتی انہیں بیڈ تک لے آئی اور انہیں آرام سے بٹھا کر ان کی کمر کے پیچھے تکیہ لگا دیا۔ وہ سراسیمہ سی تانیہ کا ہاتھ تھام کر بولیں۔

"تم نے سنا نورالہدیٰ نے کیا کہا آج اسے مجھ سے شادی کرنا غلطی لگ رہا ہے یہ شخص مجھے اور کتنی تکلیف دے گا۔" تانیہ نے دیکھا ان کی آنکھوں میں آنسو تھے وہ نرمی سے بولی۔

"آپ بھی تو ماما ایسی بات کے لیے پاپا سے الجھتی ہیں جو ان کے اختیار میں نہیں۔"

"میرا بھی تو خود پر اختیار نہیں۔" وہ بے بسی سے بولیں۔

"جتنی شدت سے میں نے نورالہدیٰ کو چاہا اگر پتھر کو بھی پوجتی تو خدا ہو جاتا لیکن نورالہدیٰ میرا نہ ہوا۔"

"ایسا کیوں سوچتی ہیں ماما۔ ملیحہ آپ سے پہلے پاپا کی زندگی میں آئی تھی اور آپ سے پہلے ہی پاپا کی زندگی سے نکل گئی اب اگر وہ ان کے دل میں ہے تو کیا' ان کی زندگی میں تو آپ کے سوا کوئی نہیں پھر پاپا نے کب آپ سے کچھ چھپایا تھا۔"

"یہی تو تم نہیں سمجھتیں اس کی زندگی میں کوئی اور ہوتی تو میں گوارا کر لیتی مگر اس کے دل میں کوئی اور ہے یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ ابھی بھی جا کر دیکھ لو آج کے جھگڑے کا فائدہ اٹھا کر وہ ملیحہ کے کمرے میں گیا ہو گا جانتا ہے نا جب تک وہ نہیں منائے گا میں اس کے پاس نہیں جاؤں گی سوچا ہو گا کیوں نا اس سنہری موقع کا فائدہ اٹھا کر محبت کے مقبرے کی زیارت کر لی جائے اور یہ وہ پہلی بار نہیں کرے گا شادی کے شروع کے دنوں میں بھی وہ اکثر وہاں جایا کرتا تھا میں

نے روکا تو چھپ کر میری غیر موجودگی میں جانے لگا۔ میں نہیں چاہتی کہ دوبارہ ہمارا آمنا سامنا ملیحہ کے کمرے کے باہر ہو اس لیے میں نے گھر سے باہر مصروفیات ڈھونڈ لیں تاکہ نورالہدیٰ کو موقع ملتا رہے اور میں لاتعلق رہ سکوں میں خود بھی دوبارہ ملیحہ کے کمرے کی طرف نہیں گئی اور تم لوگوں کو بھی روک کر رکھا مگر نورالہدیٰ کی غلط فہمی ہے کہ مجھے پتا نہیں چلتا میں تو اس کی آنکھیں دیکھ کر پہچان جاتی ہوں کہ آج وہ محبت کے مقبرے پر یادوں کی چادر چڑھا کر آیا ہے۔"

بولتے بولتے وہ ایک دم چپ ہو گئیں اور سر تکیے پر ڈال کر ہانپنے لگیں جیسے لمبی دوری کا سفر پیدل کیا ہو۔ ان کی اداسی تانیہ کو بھی اداس کر رہی تھی مگر اس کے پاس ان کی اداسی دور کرنے کا کوئی حل نہیں تھا اس لیے انہیں سمجھانے لگی۔

"حقیقت کتنی ہی تکلیف دہ ہو اس کی خوبی یہی ہے کہ اسے بدلا نہیں جا سکتا اور جس کو بدلا نہ جا سکے اس کے ساتھ سمجھوتا کر لینا چاہیے۔" مریم نے آنکھیں بند کر لیں۔

"کہنا بہت آسان ہے مگر کرنا مشکل ہے۔ کیا تم کبھی محبت میں سمجھوتا کر پاتیں۔"

"کر چکی ہوں۔" اس نے دل میں کہا۔

"جب محبت ترک کرنا بس میں نہیں ہو تو سمجھوتا تو کرنا پڑے گا۔" پھر ان کی بند آنکھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کو تو پاپا سے محبت کا دعوا ہے پھر آپ نے انہیں اکیلا کیسے چھوڑ دیا۔" مریم نے آنکھیں کھولیں پھر سر تکیے سے اٹھا کر اسے دیکھنے لگیں۔ جو کہہ رہی تھی۔

"جسے چاہا جائے اس کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی پر آپ نے تو کبھی پاپا کی تکلیف کو محسوس بھی نہیں کیا۔ پاپا جسے خوش دیکھنا چاہتے تھے اسے ستائیس سال سے نہیں دیکھا اور قیامت تک نہیں دیکھ پائیں گے۔ آپ اگر انہیں اپنے کندھے پر سر رکھ کر رونے کی اجازت دے دیتیں تو وہ اکیلے خالی کمرے میں بیٹھ کر اپنا دکھ کیوں مناتے۔ آپ ہمیشہ انہیں اپنا بنانے کی ضد کرتی رہیں خود ان کی کیوں نہ ہو گئیں یہ کیوں نہ سوچا کہ وہ آپ کے نہ ہو سکے تو کیا شکایت وہ خود اپنے بھی نہیں رہے آپ خود ہی ان سے دور رہیں تو وہ آپ کے پاس کیسے آتے ماما لیکن پاپا نے کبھی آپ کے اور اپنے بیچ کی خلیج ہمیں محسوس نہیں ہونے دی مگر میں جانتی ہوں وہ خوش نہیں اور خوش آپ بھی نہیں ہیں تو اس لڑائی سے آپ نے کیا پایا۔" تانیہ انہیں خاموش دیکھ کر ان کے پاس سے اٹھ کر آ گئی۔

☼ ☼ ☼

کافی رات بیت چکی تھی نورالہدیٰ ابھی تک کمرے میں نہیں آئے تھے وہ ان کی تلاش میں پچھلے پورشن کی طرف آ نکلی ہال کی چھت سے لٹکتے جھومر کے نیچے کھڑی وہ سامنے سیڑھیوں کو دیکھ رہی تھی۔ تانیہ نے آج تک ان سیڑھیوں پر پاؤں نہیں رکھا تھا۔ ریلنگ کو تھام کر تانیہ نے پہلی سیڑھی پر پاؤں رکھا تو اس نے محسوس کیا اس کے دل کی دھڑکنیں معمول سے تیز ہو گئی ہیں اس نے دوسری سیڑھی پر پیر جمایا تو اس کی سانسیں بھی اتھل پتھل ہونے لگیں مگر وہ اپنے حواس کو مجتمع رکھے ایک ایک سیڑھی چڑھتی زینے تک آ گئی۔ اس نے پلٹ کر نیچے دیکھا پھر گردن موڑ کر اپنے سامنے منقش آبنوسی دروازے کو دیکھنے لگی۔ بھاری تالا کھلا ہوا کنڈی سے لٹک رہا تھا اور زنجیر ایک طرف کو ہٹی ہوئی تھی۔ تانیہ نے دونوں پٹوں پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا دھکیلا اور وہ کھلتے چلے گئے۔ تانیہ کو لگا اس پر طلسم ہوشربا کا دروازہ کھل گیا ہو۔ سرد ہوا اس کے چہرے سے ٹکرائی تو اس نے سانس روک لیا پھر اس نے ایک قدم اٹھایا اور کمرے میں آ گئی۔

نورالہدیٰ سامنے بیڈ پر دراز تھے تانیہ کو دیکھ کر چونکتے ہوئے اٹھ بیٹھے مگر تانیہ نے ان کی موجودگی کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ کمرے میں ٹیبل لیمپ کی ہلکی سی روشنی تھی تانیہ اس روشنی میں نظریں گھمائی کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ یہاں ستائیس سالوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ سب طرف دیکھتی نورالہدیٰ کے پاس چلی آئی بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اس کی نگاہ پائنتی کی طرف رکھے چھوٹے صوفہ سیٹ پر پڑی تھی جس پر کچھ فریم ہوئی تصویریں رکھی تھیں اور ٹیبل پر زیورات کے ڈھیر کے ساتھ عروسی لباس تہہ کیا پڑا تھا تانیہ نے اسے دیکھ کر نگاہیں پھیر لیں۔

نورالہدیٰ بہت غور سے اسے دیکھ رہے تھے تانیہ نے گہرا سانس اندر اتار کر کہا۔

"اس ہوا میں عجیب سی خوشبو محسوس ہو رہی ہے۔ شاید یہ ملیحہ فاروقی کی خوشبو ہو۔" پھر اچانک ہی مڑ کر نورالہدیٰ کو دیکھا۔

"آپ کو یہی خوشبو یہاں لے آتی ہے نا۔" وہ چونک کر بولے۔

"تم مریم کی باتوں کو سنجیدگی سے مت لو وہ ایسے ہی بولتی رہتی ہے۔"

"میں سب جانتی ہوں پاپا۔" اس نے نرم مسکراہٹ کے ساتھ کہا پھر ایک دم اس کی مسکراہٹ معدوم ہو گئی اور وہ انگلیوں کو آپس میں الجھا کر بولی۔

"وہ بھی جو شایان نہیں جانتا۔" اب کے نورالہدیٰ ٹھٹک گئے۔

"تمہیں یہ سب کس نے بتایا؟"

"کیا فرق پڑتا ہے۔" وہ کہہ کر دوبارہ مسکرانے لگی۔ نورالہدیٰ پر سوچ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"کیا تم شایان کو قبول کر سکتی ہو۔"

"کیا دادا جان شایان کو ملیحہ کا بیٹا قبول کر لیں گے۔" جواباً اس نے سوال کیا تو نورالہدیٰ چپ سے ہو گئے۔

"اگر دادا جان شایان کو قبول کر لیتے ہیں تو ٹھیک ورنہ جانے دیجیے گا آج اسے اپنا ساتھ میرے لیے مناسب نہیں لگتا۔ کل اسے اپنا آپ میرے قابل نہیں لگے گا میں نے پہلے بھی اسے کھونا تھا بعد میں بھی کھو دوں گی پھر اسے وہ سچ کیوں سناؤں جسے سن کر وہ اپنی ہی نظروں میں گر جائے۔" بات کرتے ہوئے اس کا دل بھر آ گیا اور اس نے خود کو رونے سے روکنے کی کوشش بھی نہیں کی اور نورالہدیٰ کے بازو سے لگ کر رونے لگی انہوں نے بھی اسے چپ نہیں کرایا اور اس کے گرد بازو پھیلا کر تھپکتے رہے جب وہ روتے روتے تھک گئی تو خود ہی ان کے کندھے سے سر اٹھا کر آنسو پونچھنے لگی۔

"بس۔" نورالہدیٰ اسے دیکھ کر مسکرائے پھر اس کے گال پر ہاتھ مار کر بولے۔

"اپنے پاپا پر اتنا سا بھی یقین نہیں ہے۔ میں تمہیں کبھی کچھ کھونے نہیں دوں گا۔" وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھے اسے یقین دلا رہے تھے۔ تانیہ بولی۔

"میں اپنے لیے نہیں رو رہی تھی پاپا میں تو آپ کے لیے رو رہی تھی محبت بچھڑ جانے کے خوف سے میں نے تین سال تین صدیوں کی طرح گزارے ہیں اور آپ نے محبت سے بچھڑ کر ستائیس سال کیسے گزارے ہوں گے 'محبت تو آباد کرتی ہے نا۔۔۔ یہ محبت کا کون سا چہرہ ہے کہ آپ 'ملیحہ آنٹی' وجدان انکل اور دادا جان چاروں نے ایک دوسرے سے محبت کی اور چاروں برباد ہو گئے۔" نورالہدیٰ جبڑے بھینچ کر سامنے دیکھنے لگے۔

"خیر۔" اس نے کہا۔

"جو ہوا برا ہی سہی مگر بدلنا ممکن نہیں لیکن آپ کیوں دادا جان سے آج تک ناراض ہیں انہوں نے کب چاہا تھا کہ ان کی بیٹی مر جائے جو بھی غلطیاں ان سے ہوئیں نادانستگی میں ہوئیں۔ وقت ہی خراب تھا شاید ورنہ اتنے بچانے والے ہاتھ ہوں تو کوئی کیسے دریا برد ہو سکتا ہے۔ دادا جان کو اپنی خطا کا اعتراف بھی تو ہے پھر بھی اگر آپ انہیں سزا دینا چاہتے ہیں تو تسلی رکھیں انہیں سزا مل چکی ان کی بیٹی کی موت کو ستائیس سال گزر چکے ہیں اور ایک باپ کے لیے اس سے بڑا عذاب کوئی نہیں۔" نورالہدیٰ بے بسی سے بولے۔

"مجھے ان کے زیاں کا احساس ہے مگر جب ملیحہ کا خسارہ یاد آتا ہے تو ان کی تکلیف بے معنی سی لگنے لگتی

ہے۔" وہ فلسفیانہ انداز میں بولی۔

"خسارے تو ایک سے ہی ہوتے ہیں ان میں کمی بیشی ناپنے کا کوئی پیمانہ نہیں۔ دکھ کی کوئی مقدار نہیں ہوتی بس احساس ہوتا ہے اور انہیں ملیحہ کے دکھ کا احساس ہے اسی لیے تو پچھتاتے ہیں۔" نورالہدیٰ تلخی سے بولے۔

"اب پچھتانے سے کیا جب ملیحہ ہی نہیں رہی۔"

"دھیان رہے پاپا کہیں ایسا نہ ہو کل جب آپ پچھتائیں تو دادا جان نہ رہیں۔" اس کی بات نے انہیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا وہ خوفزدہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے۔

"ان کی عمر ستتر برس ہو چکی ہے بیٹی سے ملنے کی خواہش انہیں اور کتنے دن آپ کی ناراضی ختم ہونے کا انتظار کرنے دے گی۔ ایک سال دو سال چار سال وقت تیزی سے گزر رہا ہے پاپا کہیں دیر نہ ہو جائے۔" وہ تو ضرب لگا کر چلی گئی اور نورالہدیٰ کے اندر بھونچال آگیا۔

وہ رشتوں سے محبت کرنے والے شخص تھے مگر بدقسمتی سے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی وہ کئی رشتوں کو کھو بیٹھے تھے اپنے ماں باپ کو بھی، جب ہوش سنبھالا تو انہوں نے بابا جان، امی اور ملیحہ کو ہی اپنی زندگی میں پایا اور انہیں اپنی زندگی کی اساس بنا لیا مگر ان کی بدقسمتی ایک بار پھر ہاتھ دکھا گئی اور فریال کا انتقال ہو گیا پھر ستائیس برس کی عمر میں غیر محسوس طور پر ہی ملیحہ کو دیکھ کر سحر زدہ رہ گئے..... وہ عام تو پہلے بھی نہ تھی اب اور بھی خاص ہو گئی مگر یہ خوشی بھی عارضی ثابت ہوئی۔ اب صرف بابا جان بچے تھے۔ وہ نورالہدیٰ کے لیے کیا تھے سمجھانا مشکل نہیں تھا لیکن ملیحہ کی موت کبھی نہ بھلایا جانے والا صدمہ تھی جس نے ان کے اندر اس انتہائی رد عمل، کو تحریک دی کہ وہ بابا جان کو موردِ الزام ٹھہرا کر ان سے ہمیشہ کے لیے ناراض ہو گئے مگر ان سے محبت کرنا نہ چھوڑ سکے اور وہ محبت ہمیشہ ان کے اندر سر اٹھاتی رہی مگر ملیحہ کو کھو دینے کا دکھ اس پر حاوی ہو جاتا۔

آج اچانک ہی تانیہ نے اپنی باتوں سے ملیحہ کے دکھ کو پس منظر میں دھکیل دیا تھا۔ اب وہ صرف بابا جان کے بارے میں سوچ رہے تھے جب انہوں نے باپ کی شفقت کو کھو دیا تھا تو بابا جان نے ان کی زندگی کی اس کمی کو آگے بڑھ کر پورا کر دیا لیکن جب ان کی بیٹی چل بسی تو نورالہدیٰ ان کی تکلیف سے نظر چرا کر لاتعلق ہو گئے۔ آج جو سوچا تو نورالہدیٰ کو ندامت ہونے لگی۔

"انسان کو بہت سی چیزوں کا احساس وقت گزرنے کے بعد ہوتا ہے کیونکہ اسے ہمیشہ یہی لگتا ہے کہ ابھی بہت وقت باقی ہے مگر کیا آپ نے ملیحہ کی موت سے سیکھا نہیں کہ وقت کی الٹی گنتی کبھی بھی شروع ہو سکتی ہے۔" جانے سے پہلے انہوں نے تانیہ کی کہی آخری بات کو یاد کیا پھر اپنی عرق آلود پیشانی کو مسلتے ایک فیصلہ کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆ ☆ ☆

آج وجدان سے مل کر کرنل اظہر فاروقی کا زخم ہرا ہو گیا تھا۔ وہ ملیحہ کی ڈائری کو مقدس صحیفے کی طرح سینے سے لگائے راکنگ چیئر پر نیم دراز ملیحہ کی تصویر کو نگاہوں میں قید کیے ہوئے تھے اور ان کا دل ملیحہ سے ہم کلام تھا۔

"بابا کی جان، تمہیں کیا ہو گیا ہے میری ملیحہ ایسی تو نہ تھی کہ اس کے بابا جان اس سے معافی مانگتے اور وہ بے نیاز بنی رہتی۔ ستائیس سال ہو گئے ہیں بیٹا معاف نہیں کرنا تو سزا ہی دے دو مگر تم تو اپنے باپ کی طرف دیکھتی ہی نہیں تم سے اچھا تو نورالہدیٰ ہے معاف وہ بھی نہیں کرتا نہ سزا سناتا ہے مگر اس نے بے رخی کا ہی سہی کوئی رشتہ تو رکھا ہے۔ اور بیٹا اب تو دل پر بوجھ بہت بڑھ گیا ہے آج وجدان آیا تھا جاتے جاتے اس بوجھ کا وزن کئی من بڑھ گیا۔ کوئی ایسی سبیل ہو کہ یہ بوجھ میرے دل سے اتر جائے۔" انہوں نے یوں سانس بھرا جیسے واقعی سینے پر کوئی بوجھ دھرا ہو۔ جسے اٹھانے کی اب طاقت نہیں رہی کہ کوئی دستک دیے بغیر ہی اندر آیا تھا۔

آتشدان کی زرد روشنی میں انہیں نیم تاریک ہیولہ نظر آیا تھا اور اس ہیولے میں نورالہدیٰ کا سراپا دیکھ کر بابا جان کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا بھلا وہ ان کے کمرے میں کیوں آتے وہ بھی اس وقت سنہری فریم کی عینک اتار کر آنکھوں کی نمی صاف کرتے انہوں نے دوبارہ سر اٹھا کر دیکھا..... وہ نورالہدیٰ ہی تھے جو نیم تاریکی سے نکل کر روشنی میں آگئے تھے پھر یوں ہی چلتے ہوئے وہ بابا جان کے سامنے دو زانو بیٹھے اور ان کے دونوں ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔

"مجھے معاف کر دیجیے بابا جان۔" وہ جھکے سر کے ساتھ ندامت سے چور لہجے میں بولے۔ بابا جان نے حیرت سے کہا۔

"کس بات کی معافی۔"

"اس بات کی معافی کہ میں آپ کا بیٹا نہیں بن سکا۔ اس بات کی معافی کہ آپ اپنی ساری زندگی میرے سکھ کی خواہش کرتے رہے اور میں نے اپنی آدھی عمر آپ کو دکھ دینے میں گزار دی۔ اس بات کی معافی کہ یہ جانتے ہوئے کہ آپ کو قصوروار ٹھہرانے کا حق صرف ملیحہ اور وجدان کے پاس ہے میں ستائیس سالوں تک آپ کو قصوروار ٹھہراتا رہا۔" رک رک بولتے ہوئے وہ بابا جان کو وہی پرانے نورالہدیٰ لگ رہے تھے انہوں نے آہستگی سے اپنے ہاتھ چھڑا لیے تو نورالہدیٰ نے سر اٹھا کے انہیں سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ بابا جان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے انہوں نے اسی آہستگی سے نورالہدیٰ کا چہرہ ہاتھوں میں بھرا اور جھک کر ان کے ماتھے پر ہونٹ رکھ دیے۔ ستائیس سالوں کی دوری اور ناراضی ایک پل میں ہی غائب ہو گئی تھی بابا جان شفقت سے بھرپور آواز میں بولے۔

"کون کہتا ہے تم میرے بیٹے نہیں بن سکے۔ تم میرے ہی بیٹے ہو بس ذرا ناراض ہو تو کیا بیٹا باپ سے ناراض ہو جائے تو بیٹا نہیں رہتا۔" اب وہ ان کے بال سلجھا رہے تھے۔

"تم نے میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی تمہارا غصہ تمہاری ناراضی جائز ہے۔ ہاں مگر دل دکھتا ہے تو کیا، میں نے بھی تو بہت بار ملیحہ کا دل دکھایا ہے شاید اس طرح کفارہ ادا ہو جائے۔" نورالہدیٰ بے تابی سے ان کے ہاتھ تھام کر بولے۔

"کیوں اس کا دل دکھاتے تھے جانتے تھے وہ کتنا اداس ہو جایا کرتی تھی۔ ایک بار مجھ سے بھی کہا تھا کہ آپ سے پوچھوں کیوں آپ اس کی پروا نہیں کرتے آپ آج مجھے ملیحہ کے سوال کا جواب دیجیے۔" آج اچانک ہی انہیں ملیحہ کا سوال یاد آیا تو پوچھ بیٹھے۔ بابا جان نے جو سنا کہ یہ ملیحہ کا سوال تھا انہیں دکھ نے آگھیرا سسکتے ہوئے کہنے لگے۔

"میں ڈرا ہوا انسان ہوں نورالہدیٰ موت نے مجھ سے ہر اس شخص کو چھین لیا جس سے میں نے محبت کی۔ انسان دنیا میں آنے کے بعد سب سے پہلے جس وجود سے محبت کرتا ہے وہ ماں ہے میں دس سال کا تھا جب اماں جی چل بسیں آج ستتر برس کی عمر میں بھی مجھے ان کی آغوش یاد آتی ہے پھر ابا میاں بھی جلد ہی ساتھ چھوڑ کر چلے گئے..... پر چلو ان کی تو عمر ہو چلی تھی سمجھا لیا خود کو مگر بھائی جی کی عمر تو مرنے کی نہیں تھی وہ اٹھائیس سال کے تھے جب وہ ایکسیڈنٹ ہوا ابھی تو بہت زندگی باقی تھی اور وہ اچانک ہی دنیا سے اٹھ گئے تمہاری ہر خوشی مناتے ہوئے میرے دل میں ان کی موت کا غم تازہ ہو جاتا ہے انہوں نے تمہارے حوالے سے کتنے خواب دیکھے تھے..... ایک ایک کر کے وہ سارے خواب پورے تو ہو گئے مگر ان کی آنکھیں نہ دیکھ سکیں۔ بہت بڑا جھٹکا تھا نورالہدیٰ فریال مجھے نہ سنبھالتی تو میں کبھی اس جھٹکے سے نہ سنبھل پاتا۔ فریال آئیڈیل بیوی تھی۔ سمجھنے والی، ساتھ دینے والی، محبت کرنے والی۔ میں اس کے ساتھ اپنی پوری زندگی گزارنا چاہتا تھا مگر ملے صرف اٹھارہ سال۔ ایک عورت جس سے محبت بھی ہو پھر وہ بیوی بھی ہو اور بچے کی ماں بھی اگر موت اسے الگ کر دے تو کیسا لگتا ہے جانتے ہو۔" وہ ہانپتے ہوئے پوچھ رہے تھے نورالہدیٰ نے کچھ بولے بغیر نظر جھکا لی اور بابا جان سر پیچھے ٹکا کر

ملیحہ کی تصویر کو دیکھنے لگے۔

"ملیحہ' فریال کا دیا ہوا سب سے خوب صورت تحفہ تھی۔ میں سب کو کھو چکا تھا لیکن ملیحہ کو کیسے کھو سکتا تھا۔ اس میں تو میری جان تھی تم خود بھی باپ ہو نورالہدیٰ اولاد کیا ہوتی ہے جانتے ہو۔ اولاد سے ایک پل کی جدائی برداشت نہیں ہوتی دائمی جدائی کا تو تصور کون کرے گا۔ مگر یہ خوف میرے ذہن میں بیٹھ گیا تھا۔ میں نے جس سے بھی محبت کی وہ جدا ہو گیا مگر مجھ میں ملیحہ کی جدائی سہنے کی طاقت نہیں تھی۔ میں نے سوچ لیا میں اس سے محبت نہیں کروں گا مگر دل بھاگ بھاگ کر اس کی طرف جاتا لیکن میں اس کے چہرے پر نظر ڈالنے سے ڈرتا تھا کہ کہیں اسے میری نظر نہ لگ جائے مگر وہ خود ہی میرے پاس آجاتی میرے قدموں میں بیٹھ جاتی پھر میرے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر مجھے "بابا جان" کہہ کر پکارتی تو میرے اندر زندگی کی لہر دوڑ جاتی خود پر چڑھایا خول چٹخنے لگتا لیکن کہیں ٹوٹ نہ جائے اس ڈر سے میں اسے خود سے دور کر دیتا۔ یہ سب کرنا آسان نہیں تھا نورالہدیٰ' ملیحہ بیٹی تھی مجھے پیار آتا تھا اس پر اس کی مسکراہٹ پر لیکن نظر نہ لگ جائے اس خوف سے میں نے خود پر اس کی خوشیاں حرام کر لیں۔ اس کا مسکراتا ہوا چہرہ چاہے نظر نہ آئے مگر وہ خوش ہے اتنا ہی کافی تھا میرے لیے۔"

"اسے نظر لگ جانے کے ڈر نے آپ کو اتنا خوفزدہ کر دیا کہ خود اس کی خوشیوں سے دور رہتے رہتے اسے ہی خوشیوں سے دور کر دیا۔" اس حیرت انگیز انکشاف پر شاکڈ نورالہدیٰ نے شکوہ کیا تو بابا جان نے کہا۔

"ملیحہ بالکل اپنی ماں جیسی تھی بس ایک فرق تھا فریال شوخ تھی اور ملیحہ خاموش' اس کی خاموشی نے مجھے فیصلے سنانے کی عادت ڈالی تھی۔ ملیحہ نہیں جانتی تھی مگر تمہیں تو پتا ہے کہ تم دونوں کی شادی کا فیصلہ میں بہت پہلے کر چکا تھا پھر ملیحہ نے وجدان کا ذکر کیا تو مجھے غصہ آگیا اور غصے میں نہ جانے کیا کچھ کہہ دیا مگر اس کی اداس صورت دیکھی نہیں گئی اور زندگی میں پہلی بار میں نے فیصلہ بدلنے کا ارادہ کر لیا اس دن میں شدت سے انتظار کر رہا تھا کہ ملیحہ کسی بھی وقت وجدان کو لے کر آجائے گی مگر وہ لوٹی تو تنہا تھی پھر جب اس نے چپ چاپ تمہارے ہاتھوں سے انگوٹھی پہن لی تو مجھے یقین ہو گیا کہ وجدان شادی کا وعدہ کر کے مکر گیا ہے۔" نورالہدیٰ ان کی بات کاٹ کر بولے۔

"آپ نے اس سے پوچھا کیوں نہیں فرض کیوں کر لیا کہ وجدان نے انکار کر دیا ہو گا۔"

"میں اس کا بھرم نہیں توڑنا چاہتا تھا۔" وہ بول کر ہونٹ کاٹنے لگے پھر سسک کر بولے۔

"مجھ سے غلطی ہو گئی تھی نورالہدیٰ اور اس غلطی کی سزا بھی ملی۔ میری بیٹی مر گئی ہے۔" وہ اس طرح بول کر رو پڑے جیسے ملیحہ آج مری ہو انہوں نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا تھا نورالہدیٰ کے گال بھی بھیگنے لگے تھے انہوں نے تاسف کی نگاہ بابا جان پر ڈالی پھر ان کے ہاتھوں کو چہرے سے ہٹاتے ہوئے بولے۔

"ہم کب تک ایک ہی دکھ پر الگ الگ آنسو بہائیں گے بابا جان کیوں نہ مل کر رویا کریں۔" بابا جان نے اچانک ہی اپنے ہاتھ ان کے آگے جوڑ دیے اور بھرائی آواز میں بولے۔

"مجھے معاف کر دو نورالہدیٰ۔" نورالہدیٰ تیزی سے ان کے ہاتھ الگ کرتے ہوئے بولے۔

"یہ کیا کر رہے ہیں بابا جان میں کہہ چکا ہوں یہ حق مجھے نہیں ہے۔"

"تمہیں حق ہے نورالہدیٰ میں نے اس لڑکی کو مارا ہے جس سے تمہیں محبت تھی میرے ہاتھوں تمہارے دل کی دنیا برباد ہوئی ہے میں تمہارا مجرم ہوں اور مجھے اپنے جرم کا اعتراف ہے اور جانتے ہو اعتراف کے بعد جزا و سزا کے عمل میں تاخیر بہت گراں گزرتی ہے یہ سکوت ناقابلِ برداشت ہے نورالہدیٰ اسے توڑ دو۔"

"ٹھیک ہے۔" نورالہدیٰ ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیے بولے۔

"اگر میرے کہہ دینے سے آپ کو سکون ملتا ہے تو کہہ دیتا ہوں۔" وہ رکے پھر ان کی طرف دیکھتے ہوئے

ٹھہر ٹھہر کر بولے۔

"میں نے آپ کو معاف کیا۔" بابا جان کو لگا کسی نے ان کے سینے سے خنجر کھینچ نکالا ہے مگر زخم تو باقی تھا اور درد بھی ..... انہوں نے سر کرسی کی پشت سے ٹکاتے آنکھیں بند کر کے سکون کا سانس لیا۔

"تم نے میرے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ ایک معافی اور مل جائے تو باقی کا بوجھ بھی اتر جائے گا پھر بس تھکن باقی رہ جائے گی۔" پھر وہ آنکھیں کھول کر چھت کو دیکھتے ہوئے بولے۔

"کاش وقت لوٹ آئے اور تمہاری جگہ ملیحہ میرے سامنے بیٹھی مجھ سے وجدان کا ساتھ مانگ رہی ہو..... اس بار میں انکار نہیں کروں گا۔" ان کی آواز میں حسرت گھلی ہوئی تھی۔ نورالہدیٰ دھیمی آواز میں بولے۔

"وقت لوٹ آیا ہے بابا جان لیکن ملیحہ کی جگہ تانیہ نے لے لی ہے اور فیصلہ آج بھی آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اس بار انکار مت کیجیے گا۔" نورالہدیٰ کی آواز رندھ گئی تھی۔ بابا جان مضطرب ہو گئے۔

"اقرار بہت مشکل ہے۔"

"پلیز بابا جان۔ تاریخ خود کو دہرا رہی ہے..... جو ہو چکا ہے اسے دوبارہ مت ہونے دیں۔ میری بیٹی کو کچھ نہ ہونے دیں۔ ستائیس سال پہلے ایک گھاؤ دل پر لگا تھا جو آج بھی رس رہا ہے میرے دل پر دوسرا زخم نہ لگائیں۔ میری تانیہ خوش نہ رہی تو میں بھی خوش نہیں رہ پاؤں گا پلیز بابا جان تانیہ کی خاطر شایان کو قبول کر لیں۔ آپ کا سچ میری بیٹی کو مار دے گا..... میری بیٹی کو اس کی زندگی بخش دیں۔" وہ عاجزی سے نم آواز میں منتیں کر رہے تھے اور بابا جان کے ماتھے پر سلوٹیں بڑھتی جا رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

تانیہ گہری نیند میں تھی کہ اچانک اس کے بھائیوں نے اس کے کمرے میں دھاوا بول دیا۔

"آپی اٹھیں۔ جلدی سے اٹھیں نا۔" وہ اس پر سے کمبل کھینچ کر اسے جھنجوڑ رہے تھے وہ بے چاری حواس باختہ سی۔ "کیا ہوا کیا ہوا۔" کرتی جلدی سے اٹھ بیٹھی۔

"جلدی نیچے چلیں آپ کو کچھ دکھانا ہے۔"

"کیا بدتمیزی ہے عمیر میں رات کو تین بجے سوئی ہوں اور تم دونوں صبح صبح میرے سر پر ڈھول پیٹنے آگئے ہو۔"

"اوفو آپی آپ چلیں تو کیوں ٹائم ویسٹ کر رہی ہیں۔" عذیر بولا پھر اس کے نہ نہ کرتے وہ دونوں زبردستی اسے بازو سے پکڑ کر بستر سے کھینچتے نیچے لے آئے۔

"وہ دیکھیں۔" لان میں لے جا کر انہوں نے ایک طرف اشارہ کیا۔ تانیہ نے جھنجلا کر اس طرف دیکھا اور اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

نورالہدیٰ اور بابا جان چیئرز پر بیٹھے ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ ایسا کوئی منظر ان تینوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اسے خوشگوار حیرت ہوئی اور مسکراتے ہوئے فریش ہونے کے لیے باتھ روم میں گھس گئی

اس کے دل کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی ایک طرف تو وہ خوش تھی کہ آج شایان اس کے پاپا سے ملنے آرہا ہے دوسری طرف اسے بابا جان کی طرف سے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ متضاد کیفیتوں میں گھری وہ ناشتے کے لیے ڈائننگ روم میں آئی تو نورالہدیٰ اور بابا جان کے علاوہ عمیر اور عذیر بھی ٹیبل پر موجود تھے۔

"تم دونوں کالج نہیں گئے۔" اپنے لیے چیئر گھسیٹ کر بیٹھتی وہ بولی تو عمیر بولا۔

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ پاپا آفس نہیں گئے۔" سلائس پر جیم لگاتے وہ اس جواب پر حیرت سے بولی۔

"پاپا تو اس لیے آفس نہیں گئے کیونکہ آج کوئی ان سے ملنے آرہا ہے۔" عذیر اس کی بات دہرا کر بولا۔

"میں بھی اسی لیے کالج نہیں گیا کہ آج کوئی پاپا سے

ملنے آرہا ہے۔ ویسے آپ آفس کیوں نہیں گئیں۔" عزیر نے معنی خیزی سے کہہ کر آنکھیں نچائیں تو وہ چڑ کر بولی۔

"میری مرضی۔" پھر سلائس دانتوں سے کتر کر بولی۔

"ماما نظر نہیں آرہیں۔"

"وہ کمرے سے ہی نہیں نکلیں لگتا ہے ابھی تک ان کا موڈ خراب ہے۔" عمیر کے سنجیدگی سے بتانے پر ثانیہ چپ سی رہ گئی اور ایک نگاہ نورالہدیٰ کے خاموش چہرے پر ڈال کر کپ ہونٹوں سے لگالیا۔

ابھی وہ سب ناشتا کر ہی رہے تھے کہ مریم غیر متوقع طور پر ڈائننگ روم کے دروازے سے اندر آتی نظر آئیں۔ وہ چلتی ہوئی آئیں اور نورالہدیٰ کے سامنے جا کھڑی ہوئیں۔ وہ سر اٹھا کر انہیں دیکھنے لگے۔ انہوں نے کہا۔

"مجھے ملیحہ کے کمرے کی چابی چاہیے۔" ان کے تیور عجیب سے ہو رہے تھے نورالہدیٰ تذبذب میں گھر گئے وہ ان کی آفت مچانے والی طبیعت سے واقف تھے مگر بچوں کے سامنے کوئی حوالہ دے کر منع بھی نہیں کر سکتے تھے۔

"تھہو میں لاتا ہوں۔" آخر وہ کہہ کر چابی لانے کے لیے اٹھ گئے کچھ دیر واپس آئے تو مریم نے انہیں دیکھتے ہی اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا نورالہدیٰ نے چابی ان کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے ہولے سے کہا۔

"خیال رکھنا۔" مریم مٹھی بند کر کے عجیب سے انداز میں مسکرائیں۔ نورالہدیٰ ان کی مسکراہٹ کا مطلب اخذ نہ کرسکے اور وہ جھٹکے سے ہال کی طرف جانے والے دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔ سب ناشتے سے ہاتھ روک کر بیٹھے تھے۔ عمیر اور عزیر تو ٹھیک سے صورت حال کو سمجھے ہی نہیں تھے مگر بابا جان کے چہرے پر تشویش تھی نورالہدیٰ اپنی جگہ پر خاموش کھڑے تھے اور ثانیہ بھی ان کی طرف چپ بیٹھی اٹھا پٹخ کی آوازوں کا شعوری طور پر انتظار کر رہی تھی مگر کوئی آواز نہیں آئی۔ نورالہدیٰ اپنے اندر کے اضطراب کو دبا نہ پائے اور لمبے لمبے قدم اٹھاتے دروازے تک آئے تو ہال سے اندر آتی مریم سامنے آگئیں۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر رک گئے تھے۔ مریم ہاتھوں میں کچھ فوٹو فریم اٹھائے ہوئے تھیں انہیں ایک ہاتھ سے سنبھالتے ہوئے انہوں نے دوسرے ہاتھ میں پکڑی چابی نورالہدیٰ کی طرف بڑھائی۔

"تمہاری امانت۔" نورالہدیٰ نے کچھ کہے بغیر چابی ان کے ہاتھ سے لے لی تو بولیں۔

"جا کر تسلی کرلو۔" پھر بہادر کو آواز دے کر اپنے ساتھ آنے کا کہتی لاؤنج کی طرف بڑھ گئیں۔

نورالہدیٰ کچھ دیر اپنی جگہ ساکت کھڑے رہے پھر چابی پاکٹ میں ڈال کر لاؤنج میں چلے آئے۔ بہادر ان کی ہدایت پر دیوار پر سے کئی فریم اتار چکا تھا پھر مریم نے ملیحہ کی تصویروں والے فریم ان کی جگہ لگوادیے۔

"ان تصویروں کو کہاں لگانا ہے بیگم صاحب۔" بہادر تصویریں لگا چکا تو اسٹول سے اتر کر صوفے پر پڑی تصویروں کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"ابھی تو انہیں رکھ دو تھوڑی دیر میں ملیحہ کا شوہر اور بیٹا آنے والے ہیں ان کے جانے کے بعد بتاؤں گی کہ ان تصویروں کو کہاں لگانا ہے۔"

"جی بیگم صاحب۔" وہ نورالہدیٰ کو کن انکھیوں سے دیکھتا ہوا بولا اور رفوچکر ہو گیا۔

نورالہدیٰ چلتے ہوئے مریم کے پاس آگئے اپنی پشت پر ان کا رکنا محسوس کر کے وہ پلٹیں نورالہدیٰ سامنے لگی تصویروں کو دیکھ رہے تھے بولے۔

"یہ سب کیا ہے؟" مریم ان کی بات سن کر اداسی سے بولیں۔

"جب میں ملیحہ کی تصویر تمہارے دل سے ہی اتار نہ پائی تو دیوار سے اتارنے کا کیا فائدہ۔" نورالہدیٰ نے انہیں دیکھا پھر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے پکارا۔

"مریم۔" اور وہ ایک دم سے ہاتھ اٹھا کر بولیں۔

"بس نورالہدیٰ کچھ نہ کہنا میری عمر بھر کی ریاضت

بے کار گئی ہے۔" نورالہدیٰ ان کے چہرے پر دکھ کے سائے لرزتے دیکھتے رہے پھر ان کے گرد بازو پھیلا کر انہیں خود سے قریب کر لیا۔

"میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں مریم میرا اعتبار کرو۔" وہ ان کے کان میں کہہ رہے تھے مریم نے بے بسی سے آنکھیں بند کرتے ہوئے ان کے سینے پر سر رکھ دیا۔

"صاب۔" بہادر بوتل کے جن کی طرح حاضر ہو کر اچانک سے بولا نورالہدیٰ نے مریم کے شانے سے بازو ہٹاتے ہوئے کہا۔

"ہاں بولو۔"

"وجدان صاب آگئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے تم بابا جان کو اطلاع کرو۔" وہ جلدی سے اسے کہہ کر وجدان کے استقبال کے لیے باہر جانے لگے۔

دو تین قدم آگے جا کر انہیں احساس ہوا مریم ان کے ساتھ نہیں ہیں وہ رک کر پلٹے اور انہیں دیکھ کر بولے۔

"آج چاہے ملیحہ کے بیٹے کی شکل نہ دیکھو پر کیا کل ثانیہ کے شوہر کی صورت دیکھنے سے بھی انکار کرو گی اور یاد رکھنا یہ فیصلہ میرا نہیں ہماری بیٹی کا ہے۔" انہوں نے ایک پل کو سوچا پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ان کے پاس آکر بولیں۔

"چلو۔" نورالہدیٰ کے چہرے پر بڑی جاندار مسکراہٹ پھیل گئی۔

"تھینکس۔" مریم ان کی مسکراہٹ کا برا مان کر بولیں۔

"میں یہ سب اپنی بیٹی کے لیے کر رہی ہوں تمہارے لیے نہیں۔"

"میں بھی یہ سب اپنی بیٹی کے لیے کر رہا ہوں۔" انہوں نے سنجیدگی سے کہا اور فوراً پلٹ کر چلنے لگے۔

گاڑی پورچ میں رک چکی تھی کار کا دروازہ کھول کر اترتے وجدان کو دیکھ کر نورالہدیٰ ان کی طرف چلے آئے۔

"السلام علیکم ہادی بھائی۔" وجدان نے ان کی طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ نورالہدیٰ ان کا ہاتھ تھام کر۔ "وعلیکم السلام۔" کہتے ان سے بغلگیر ہو گئے۔

"کیسے ہو۔"

"اللہ کا کرم ہے۔ آپ سنائیں۔" وہ ان سے الگ ہوتے ہوئے بولے۔

پھر شایان کو دیکھنے لگے جو گاڑی لاک کر کے انہی کی طرف آرہا تھا ورزشی جسم پر بلیک ڈریس پینٹ کے ساتھ میرون کلر کی شرٹ پہنے لمبے چوڑے سراپے والا شایان نورالہدیٰ کو پہلی نظر میں اچھا لگا تھا۔

"السلام علیکم ہادی انکل۔" کہہ کر وہ ان کے گلے لگ گیا ان سے گلے ملتے ہوئے اس کی نظر باہر آتی ثانیہ پر پڑی تھی ثانیہ نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ دونوں کی ہی آنکھوں میں چمک لہرائی تھی پر لب مسکرا نہ سکے۔ شایان اس کے چہرے سے نظر ہٹا تا نورالہدیٰ سے الگ ہو گیا۔

"وعلیکم السلام بیٹا۔" نورالہدیٰ اسے توصیفی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے پھر مریم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وجدان سے بولے۔

"اس سے ملو وجدان یہ مریم ہے میری بیوی۔"

"کیسی ہیں بھابھی۔" وجدان خوش اخلاقی سے مسکراتے ہوئے بولے۔

"ٹھیک ہوں۔ آپ اندر آیئے اور شایان بیٹا تم بھی آؤ نا۔" وہ اندر جانے لگے تو ثانیہ نے جھٹ سے آگے ہو کر وجدان کو سلام کیا پل بھر کو اس کا سر اپنے کندھے سے لگا کر سلام کا جواب دیتے وہ نورالہدیٰ کی ہمراہی میں اندر آگئے۔ نورالہدیٰ انہیں ڈرائنگ روم میں لے جانے کے بجائے سیدھے لاؤنج میں لے آئے۔

"بابا جان کہاں ہیں؟" عزیر نے عمیر کے چپ رہنے کے اشارے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"وہ تو وجدان انکل کا سن کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔" ایک پل کے لیے ہر کوئی چپ سادھ گیا پھر

نورالہدیٰ وجدان سے بولے۔

"تم بیٹھو میں بابا جان کو لے کر آتا ہوں۔" اور جانے لگے تو وجدان نے ان کا بازو پکڑ کر روکتے ہوئے کہا۔

"آپ اجازت دیں تو میں انہیں لے آؤں۔" نورالہدیٰ نے ذرا سا مسکرا کر سرہلاتے ہوئے اجازت دے دی۔ پھر انہیں لیے بابا جان کے کمرے تک آئے اور ہاتھ کے اشارے سے اندر جانے کا کہتے ہوئے پلٹ گئے۔

وجدان نے دروازہ کھولتے ہوئے اندر قدم رکھا اور ان کی نگاہیں سیدھی ملیحہ کی تصویر سے جا ٹکرائیں۔ ایک پل کے لیے وجدان کی آنکھیں وجدان کا دل بن گئی تھیں مگر انہوں نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور راکنگ چیئر پر بیٹھے بابا جان کو دیکھنے لگے۔ جو ان کی طرف گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ چلتے ہوئے ان کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔

"کیوں آئے ہو تم یہاں۔" بابا جان چیخ کر بولے۔

"میرے پچھتاوے کو بڑھانے کے لیے کہ ستائیس سال پہلے جب ملیحہ میری منتیں کر رہی تھی کہ ایک بار تم سے مل لوں تو تم سے کیوں نہیں ملا۔ جاؤ وجدان چلے جاؤ میں آج بھی تم سے ملنا نہیں چاہتا..... تمہاری صورت میری تکلیف کو بڑھا رہی ہے۔" انہوں نے منہ پھیر لیا تو وجدان دکھ سے بولے۔

"لیکن میری تکلیف کا کیا ہو گا بابا جان۔ آپ نے ستائیس سال پہلے بھی مجھے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا آپ ستائیس سال بعد بھی مجھے قبول کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں ملیحہ کی آخری خواہش کیا تھی۔" بابا جان نے ان کی طرف دیکھا لیکن کچھ بولے نہیں وجدان توقف کے بعد کہنے لگے۔

"وہ مجھے 'آپ کو اور ہادی بھائی کو ایک ساتھ دیکھنا چاہتی تھیں ان کی خواہش تھی کہ آپ مجھے قبول کر لیں۔ مرنے والے کی آخری خواہش اس کی زندگی میں ہی پوری کرنے کی کوشش کی جاتی ہے مگر ستائیس سالوں میں ملیحہ کی خواہش کو پورا کرنے کی کوشش نہ میں نے کی نہ آپ نے اور نہ ہادی بھائی نے..... مگر میں مجبور تھا۔ ملیحہ کے انتقال کے بعد کے دس سال تو جیسے میری عمر سے تحلیل ہو گئے اور اس کے بعد میں ان کی خواہش کی تکمیل کے لیے آپ کے پاس آنا چاہتا تھا پر شایان نے مجھے کمزور کر دیا لیکن آج اسی نے اتنی طاقت دی ہے کہ آپ کے پاس آسکوں اب تو مجھے قبول کر لیجیے بابا جان۔" انہوں نے عاجزی سے کہا تو بابا جان حسرت بھرے لہجے میں بولے۔

"کاش تم اس کی زندگی میں مجھ سے ملنے آجاتے تو میں تمہیں قبول کر لیتا پھر شاید ملیحہ بھی نہ مرتی..... مگر اب کیا فائدہ میری بیٹی تو مر چکی۔" ان کی آواز بھیگ گئی تھی۔

"جانتے ہو اولاد کو قبر میں اترتے دیکھنا کیسا لگتا ہے پھر مجھے تو اللہ نے اولاد کے لیے ترسایا بھی بہت تھا۔ ملیحہ میری شادی کے سات سال بعد پیدا ہوئی تھی اور آج مجھے اس کی موت کا سوگ مناتے ہوئے ستائیس سال ہو گئے ہیں۔" ان کا گلا رندھ گیا۔

"میری بچی صرف بیس سال زندہ رہی کیا اس سے بہتر نہیں تھا کہ اللہ مجھے بے اولاد ہی رکھتا۔" انہیں سسکتا ہوا دیکھ کر وجدان ان کے پاس آکر بیٹھ گئے اور ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولے۔

"اللہ کے کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتے بابا جان یقیناً" آپ کو اولاد دے کر لے لینے میں اس کی کوئی مصلحت ہو گی اور اللہ کی مصلحتیں سمجھ آجائیں تو صحیح 'نہ سمجھ آئیں تو ضد نہیں کرتے قبول کر لیتے ہیں۔ میں مانتا ہوں آپ کا دکھ بڑا ہے مگر وقت بھی تو بہت گزر چکا..... وقت ہر درد کی دوا ہے آپ اگر صبر کرنے کی کوشش کرتے تو آپ کا درد کم ہو ہی جاتا۔"

"تم تو صبر کرنے کی کوشش کرتے رہے ہو..... کیا تمہارا درد کم ہوا۔" وہ ان کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔ وجدان نظر چرا گئے۔

"برداشت درد سے بڑھ گئی ہے۔" پھر کچھ دیر پہلے بابا جان کی کہی بات کو یاد کر کے بولے۔

"میں آپ کی تکلیف کو بڑھانے نہیں آیا تھا بلکہ اس تکلیف کو ختم کرنے آیا تھا جو کل آپ کو مجھ سے پہنچی ہے۔ میں اپنے ساتھ شایان کو بھی لایا ہوں وہ باہر بیٹھا ہے آپ میرا ایک کام کریں گے بابا جان..... مجھ میں شایان کو سچ بتانے کی طاقت نہیں آپ جائیں اور جا کر اس سے کہہ دیں کہ اس کا ملیحہ سے کوئی رشتہ نہیں بلکہ یہ بھی کہہ دیں کہ اس کا مجھ سے بھی کوئی رشتہ نہیں وہ ان لوگوں کی اولاد ہے جو رات کے اندھیرے میں اپنے بچوں کو پھینک آتے ہیں مگر دن کے اجالے میں کسی سے نہیں کہتے کہ کچرے کے ڈھیر پر پڑی مسخ شدہ لاش ان کے بچے کی ہے مگر پہلے وعدہ کریں کہ اس کے بعد آپ اسے دھتکاریں گے نہیں اور ثانیہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیں گے۔"

"اس کے بعد شایان کا کیا ردعمل ہو گا۔" پتا نہیں کیوں وہ یہ سوال کر رہے تھے۔ وجدان نے سوچا اور کہا۔

"ظاہر ہے ناراض ہو گا پوچھے گا کہ کیوں میں نے اسے دھوکے میں رکھا لڑے گا بھی بہت مگر مجھ سے محبت کرتا ہے اس لیے مان بھی جائے گا۔" ان کی بات سن کر بابا جان بولے۔

"نورالہدیٰ بھی مجھ سے محبت کرتا ہے مگر اس نے ایک عمر مجھ سے ناراض رہنے میں گزار دی اگر شایان بھی نہ مانا تو....."

"تو کیا ہو گا۔" پتا نہیں کیوں وہ ہنس پڑے۔

"اللہ کو میرے ایمان پر بڑا شک ہے بار بار آزما کر بھی اسے یقین نہیں آتا اور مجھے ایک کے بعد دوسری آزمائش میں ڈالتا رہتا ہے جہاں اتنی آزمائشیں بھگت لیں وہاں ایک اور کے آجانے سے کیا ہو گا بلکہ اچھا ہو گا جو ایسا ہو جائے۔ مولوی صاحب مرحوم کہا کرتے تھے شایان کا نصیب میرے نصیب سے جڑا ہے اچھا ہو گا اگر اس کا نصیب میرے نصیب سے الگ ہو جائے میرے نصیب کی سختیاں اب اس کے نصیب پر سایا ڈالنے لگی ہیں۔" کل وہ بار بار شایان کو اپنی برباد عمر کا حاصل کہہ رہے تھے اور آج اسے خود سے الگ کرنے کی بات کر رہے تھے۔ بابا جان حیرت سے اپنے سامنے بیٹھے اس شخص کو دیکھ رہے تھے جو کسی اور کے فائدے کے لالچ میں اپنی زندگی بھر کی جمع پونجی لٹانے کو کمربستہ تھا۔ انہیں یاد آیا کہ ملیحہ کی ڈائری میں انہوں نے پڑھا تھا کہ ایک بار ملیحہ کی کسی بات پر وجدان نے مذاقاً" اقرار کیا تھا۔

"میں پاگل بھی ہوں اور دیوانہ بھی....." اور بابا جان ایمان لے آئے اور واقعی پاگل اور دیوانہ تھا ٹھیک ہے آج کوئی اسے پتھر نہیں مارتا اور اس کے پاس مینٹل نارملیٹی کا سرٹیفکیٹ بھی ہے مگر دیوانہ پھر بھی دیوانہ تھا اور بابا جان کو یقین ہونے لگا تھا کہ دنیا بھر کے سائیکاٹرسٹ مل کر بھی علاج کر لیں تو بھی اس کی دیوانگی نہ جائے گی۔

وجدان بابا جان کو ساتھ لیے لاؤنج میں آئے تو وہاں بیٹھے ہر شخص کی نظریں ان دونوں پر ٹھہر گئیں۔ شایان تو ان دونوں کو دیکھ کر اضطراب میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے اندر ہیجان برپا تھا مگر وہ افراتفری کا مظاہرہ کیے بغیر بڑے بڑے قدم اٹھاتا ان کے سامنے جا رکا تو بابا جان بھی رک گئے اور اسے دیکھنے لگے۔ بابا جان کے نقوش میں ملیحہ کی جھلک صاف نظر آرہی تھی جسے محسوس کر کے شایان گویا ہوا۔

"سر میری ماں نہیں ہے مگر دل تو ہے جو چاہتا ہے کہ میری ماں زندہ ہوتی جو مجھے انگلی پکڑ کر چلنا سکھاتی' مجھے اپنے ہاتھوں سے کھلاتی پلاتی اور پھر جب میں تھک جاتا تو مجھے گود میں لے کر لوری سناتی جسے سنتے سنتے میں ان کی گود میں سو جاتا مگر میں ایک پل کے لیے بھی اپنی ماں کی آغوش کو محسوس نہیں کر سکا اور شاید انہیں خود سے قریب محسوس کرنے کے لیے ہی مجھے ہر اس شے سے محبت ہو جاتی ہے جس سے امی کو محبت تھی..... ابو بتاتے ہیں امی کو آپ سے بہت محبت تھی۔ مجھے بھی آپ سے بہت محبت ہے۔" وہ رکا پھر کہنے لگا۔

"مگر میں جانتا ہوں سر آپ کو مجھ سے پیار نہیں ہے لیکن میری ماں آپ کی بیٹی تھی ان کی خاطر مجھے اتنی اجازت دے دیجیے کہ کبھی کبھی آپ سے ملنے آجاؤں۔" وہ جب تک بولتا رہا بابا جان چپ رہے

جب وہ چپ ہوا تو بولے۔

"جسے تم نے ماں کہا ہے وہ میری بیٹی تھی۔۔۔" ان کی آواز کی وہ گونج۔۔۔ وجدان نے دعا کی کاش وہ بہرے ہو جائیں بھلا وہ ان لفظوں کو کیسے سن پائیں گے جو شایان کی زندگی میں اندھیرا کرنے والے ہیں وہ چشم تصور سے شایان کے تاریک ہوتے چہرے کو دیکھ رہے تھے نورالہدیٰ نے بے ساختہ وجدان کے سفید پڑتے چہرے کو دیکھا پھر فوراً" ہی ان کی نظر تانیہ پر گئی جس کا سانس تک رک چکا تھا۔ بابا جان نے اسی گونج دار آواز میں اپنا جملہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"اس لیے دوبارہ مجھے سر کہنے کی جرات نہیں کرنا۔" وجدان نے بے اختیار شکر ادا کیا کہ ان کی دعا قبول نہ ہوئی ورنہ وہ شایان کے چہرے پر روشنی بکھیرتے لفظوں کو کیسے سن پاتے۔ تانیہ کا سانس بھی بحال ہو چکا تھا اور نورالہدیٰ کی جان میں بھی جان لوٹ آئی تھی۔ شایان ان کی بات سن کر مسکراتا ہوا بولا۔

"تو کیا میں آپ کو نانا جان کہوں۔"

"تم مجھے اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہو۔" وہ پوچھ رہے تھے شایان کندھے اچکا کر بولا۔

"کچھ بھی نہیں۔" پھر کہا۔

"کیا میں آپ کے گلے لگ سکتا ہوں۔" اور انہوں نے مسکرا کر شایان کو گلے لگا لیا۔ اس نے ملیحہ کی کوکھ سے جنم نہیں لیا تھا پھر بھی بابا جان کو ایک پل کے لیے یوں لگا کہ انہوں نے ملیحہ کو گلے لگایا ہو۔

"میرا بہت دل چاہتا تھا کہ آپ سے ملوں مگر ڈر بھی لگتا کہیں آپ ملنے سے ہی انکار نہ کر دیں۔ نانا جان آپ کا کبھی دل نہیں چاہا کہ آ کر مجھ سے ملتے۔" وہ ان سے لپٹا ہوا کہہ رہا تھا۔ بابا جان خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ اس سے الگ ہوتے ہوئے بولے۔

"جو ہونا چاہیے تھا اور جو نہ ہوا سے جانے دو یوں بھی وقت گزر جانے کے بعد ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں ملال کرنے سے کب گزرا ہوا وقت واپس آ سکتا ہے۔ چلیں چھوڑیں ان باتوں کو میں پہلی بار آپ سے مل رہا ہوں اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں آئیے۔" وہ انہیں لے کر صوفے کی طرف بڑھا وجدان بھی انہونی کو ہوتا دیکھ کر حیران سے نورالہدیٰ ساتھ جا بیٹھے دونوں کے بیچ کوئی بات نہیں ہوئی مگر نظروں کا تبادلہ ہوا تھا۔ بیٹھنے کے بعد شایان بولا

"میں جانتا ہوں نانا جان کہ آپ امی سے بہت ناراض ہیں اسی لیے کبھی مجھ سے اور ابو سے نہیں ملے لیکن اگر آج میں امی کی طرف سے آپ سے معافی مانگوں تو بھی کیا آپ کی ناراضی ختم نہ ہو گی۔" بابا جان اس کی بات سن کر بولے۔

"میں ملیحہ سے ناراض نہیں ہوں اور نہ ہی مجھے وجدان سے کوئی شکایت ہے۔" وجدان نے فوراً" نظر اٹھا کر انہیں دیکھا وہ بھی انہیں ہی دیکھ رہے تھے وجدان کے دیکھنے پر نظر جھکاتے ہوئے بولے۔

"ملیحہ نے تو پوری زندگی مجھے شکایت کا موقع نہیں دیا لیکن اسے مجھ سے بہت سی شکایتیں تھیں مگر اس نے کبھی کچھ کہا ہی نہیں شاید اسے ڈر تھا کہ وہ روٹھ گئی تو میں اسے نہیں مناؤں گا مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ میں اسے خود سے روٹھنے ہی نہیں دیتا لیکن وہ یہ سب کیسے جان پاتی جب میں نے اسے کبھی اپنے پاس ہی نہیں آنے دیا۔" وہ اپنی پیشانی کو مسلنے لگے پھر نورالہدیٰ کو دیکھ کر بولے۔

"مجھے نورالہدیٰ کو دیکھ کر رشک آتا ہے یہ اپنی بیٹی سے اتنا قریب ہے کہ وہ اپنے دل کی ہر بات نورالہدیٰ سے بے جھجک کہہ دیتی ہے اور نورالہدیٰ بھی اس کے دل کی بات سنتا ہے اور اس کی خوشی کی خاطر کسی بھی حد تک جا سکتا ہے جیسے وجدان نے تمہاری خوشیوں کے آگے کوئی حد نہیں رکھی اور صرف تمہاری خاطر یہاں تک چلا آیا یہ جانتے ہوئے بھی کہ اگر اظہر فاروقی نے نورالہدیٰ سے باپ بننا نہ سیکھ لیا ہوتا تو آج وجدان مصطفیٰ، اظہر فاروقی سے اپنی زندگی کی آخری بازی بھی ہار جاتا۔ یہ دونوں دنیا کے سب سے

اچھے باپ ہیں اور ملیحہ دنیا کی سب سے اچھی بیٹی۔۔۔ اور مجھے یقین ہے اگر اس کی آغوش میں تم ہوتے تو وہ سب سے اچھی ماں ہوتی۔" وہ چپ ہو گئے تھے۔ پھر ان کے برابر بیٹھے شایان نے عجیب سی حرکت کی وہ اپنی جگہ سے کھسک کر کارپٹ پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا پھر ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر سر اٹھا کے انہیں دیکھتا ہوا پکارا۔

"نانا جان۔" اس کا انداز ملیحہ کی عادت سے اس قدر مشابہ تھا کہ بابا جان کے اندر ہلچل سی مچ گئی۔ ان کی آنکھوں میں نمی امڈتے دیکھ کر شایان نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کیا ہوا نانا جان۔" اور قصداً" مسکرا کر بولے۔

"تم نے اس طرح پکارا کہ ملیحہ یاد آ گئی وہ مجھے اسی طرح پکارا کرتی تھی۔" پھر اسے آزردہ ہوتے دیکھ کر فوراً" خود کو سنبھال کر بولے۔

"کہو کیا کہہ رہے تھے۔" اور وہ نیچی آواز میں بولا۔

"میں کبھی امی کی قبر پر نہیں گیا نانا جان آپ مجھے وہاں لے جائیں گے۔"

"تم نے کبھی وجدان سے نہیں کہا۔" وہ حیرت سے پوچھ رہے تھے شایان بتانے لگا۔

"ہر سال 21 دسمبر کو ابو امی کے لیے قرآن خوانی کا اہتمام کر کے ان کی نام کی فاتحہ پڑھواتے ہیں پھر میری سالگرہ کا کیک کٹتا ہے اور مجھ سے کہتے ہیں جو دل چاہے وہ تحفہ مانگ لو اور میں ہر سال ان سے کہتا ہوں مجھے امی کی قبر پر لے جائیں لیکن ابو کہتے ہیں کہ انہیں امی کی قبر کی جگہ یاد نہیں۔" بابا جان اس کی بات سن کر وجدان کو دیکھنے لگے جو نظر چرا گئے تھے۔ نورالہدیٰ نے بھی ٹھٹک کر انہیں دیکھا تھا اور بولے۔

"وجدان جھوٹ بولتا ہے وہ اپنے گھر کا پتا بھول جائے گا لیکن ملیحہ کی قبر کا نشان نہیں بھول سکتا۔"

"لیکن وہ جھوٹ کیوں کہیں گے؟" شایان نے اچنبھے سے کہا نورالہدیٰ بولے۔

"کیونکہ جسے زندگی سے زیادہ چاہا ہو اس کی قبر پر فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھانا دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔"

ان کی بات سن کر شایان بولا۔

"پھر تو آپ بھی امی کی قبر پر نہیں جاتے ہوں گے کیونکہ آپ کو بھی تو امی سے بہت محبت ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔ جس دن سے ملیحہ کو دفنا کر آیا ہوں دوبارہ وہاں جانے کی ہمت نہیں کر سکا۔" نورالہدیٰ کی آواز ست ہو گئی تھی ان کی بات سن کر مریم کے دل میں کانٹے چبھنے لگے تھے وہ آہستگی سے اٹھیں اور وہاں سے چلی گئیں اور تو کسی نے محسوس بھی نہیں کیا تھا مگر تانیہ نے انہیں جاتے ہوئے دیکھ کر دکھ سے سوچا تھا۔

"کچھ درد شاید ہمیشہ زندگی کے ساتھ رہیں گے۔" جبکہ شایان بابا جان سے کہہ رہا تھا۔

"آپ بھی امی کی قبر پر نہیں جاتے۔"

"نہیں۔" وہ بولے۔

"لیکن صرف اس وجہ سے نہیں کہ وہاں جا کر تکلیف ہو گی بلکہ اس لیے بھی کہ میں ملیحہ سے شرمندہ تھا اور اپنی پیشانی سے ندامت کے داغ کو دھوئے بغیر میں اس کی قبر پر کیسے جاتا، میری بیٹی کو خود سے زیادہ دوسروں کی خوشیاں عزیز تھیں اسے دوسروں کا دکھ بھی اپنے دکھ سے بڑا لگتا تھا اس لیے میں سوچتا اگر نورالہدیٰ نے مجھے ملیحہ کو موت کے لیے معاف کر دیا تو وہ بھی مجھے معاف کر دے گی مگر آج جب نورالہدیٰ مجھے معاف کر چکا ہے پھر بھی لگتا جیسے ملیحہ ابھی تک مجھ سے ناراض ہے دل پر رکھا بوجھ ہلکا تو ہوا ہے ابھی اترا نہیں ہے۔۔۔ مگر اب سمجھ آ رہا ہے کہ وہ بوجھ وجدان کے نام کا ہے اور اس کے معاف کر دینے کے بعد ہی دل سے ہٹے گا۔"

"کس چیز کے لیے معافی کی بات کر رہے ہیں بابا جان۔" وجدان نے ان کی بات سنی تو حیرت سے چونک کر بولے۔ بابا جان نے ان کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

"کیوں کیا تم مجھے قصوروار نہیں سمجھتے۔ اگر میں تمہیں قبول کر لیتا تو ملیحہ کیوں مرتی۔۔۔ ملیحہ کی موت کے لیے تمہاری بربادی کے لیے میں ہی ذمہ دار ہوں

میرے ہی فیصلے نے تین زندگیوں کو عذاب میں ڈالا تھا۔"

"نہیں بابا جان میں آپ کو قصور وار نہیں سمجھتا۔" وجدان پرسکون انداز میں کہہ رہے تھے۔

"اور نہ آپ کا فیصلہ غلط تھا اگر آج بھی مجھے ملیحہ کے لیے کسی شخص کے انتخاب کا اختیار دیا جائے تو میں سب سے پہلے ہادی بھائی کا نام لوں گا کیونکہ ان سے زیادہ کوئی شخص ملیحہ کو خوش نہیں رکھ سکتا..... میں بھی نہیں۔" نورالہدیٰ نے حیران ہو کر خود سے ایک فٹ دور بیٹھے شخص کو دیکھا جو بابا جان کو بھی حیرت میں مبتلا کرتا ہوا کہہ رہا تھا۔

"پھر آپ کا فیصلہ غلط کیسے ہوا، غلطی تو وقت میں تھی جو کسی کے اختیار میں نہیں اور بابا جان اب خود کو یا کسی دوسرے کو الزام دے کر کیا حاصل ہو گا جو ہوا برا ہوا نہیں ہونا چاہیے تھا..... مگر مشیت ایزدی یہی تھی ملیحہ اتنی ہی عمر لکھا کر لائی تھیں جو انہوں نے گزار لی..... بیس سال واقعی بہت کم ہیں مگر اب ان میں اضافہ ممکن نہیں اور جس دن سے میں نے یہ جانا کہ ان کی موت نے مجھے جو سکھایا ان کی زندگی نہیں سکھا سکتی تھی میرے دل سے ان کے جانے کا گلہ مٹ گیا، بس افسوس ہی باقی ہے اور جس دن جان گئی وہ بھی چلا جائے گا۔" ان کی باتوں نے بابا جان کو ٹرانس میں مبتلا کر دیا تھا وہ خواب جیسے عالم میں بولے۔

"ستائیس سال تک میں حیران رہا کہ ملیحہ نے تم سے محبت کیوں کی اور اتنی محبت کہ مر ہی گئی لیکن آج مجھے اس سوال کا جواب مل گیا ہے آج مجھے تم میں وہ نظر آ رہا ہے جو ملیحہ نے تم میں دیکھا تھا آج سمجھ آیا، کیوں ملیحہ کو یقین تھا کہ اگر میں ایک بار تم سے مل لوں گا تو اس کے انتخاب کو قبول کر لوں گا۔ وہ میری منتیں کرتی رہی کہ وجدان بہت اچھا ہے بابا آپ اس سے ملیں گے تو آپ کو بھی اچھا لگے گا وہ پورا دن تمہیں پاگلوں کی طرح ڈھونڈتی رہی کہ بس ایک بار تمہیں میرے سامنے لے آئے۔ تم اسے کیوں نہیں ملے وجدان۔" وہ سسکنے لگے۔

"ملیحہ کا یقین سچا تھا میں اگر تم سے مل لیتا تو واقعی انکار نہ کر پاتا..... کاش تم اسے مل گئے ہوتے۔" وہ رکے اور اپنی آواز کی لرزش کو قابو کر کے بولے۔

"آج اگر مجھے ملیحہ کے لیے کسی شخص کے انتخاب کا اختیار دیا جائے تو میں سب سے پہلے تمہارا نام لوں گا کیونکہ ملیحہ کی خوشی صرف تمہارے ساتھ میں تھی اور میری بیٹی کا انتخاب میرے انتخاب سے بہتر ہے۔" ان لفظوں میں وہ جادو تھا کہ وجدان کو لگا ان کی محبت احترام پا گئی ہے برسوں کی رائیگانی کا صلہ ایک پل میں مل گیا تھا۔ بابا جان کہہ رہے تھے۔

"مجھے یہ اعتراف کرنے میں بہت دیر ہو گئی ہے پھر بھی یہ میری بیٹی کی خواہش تھی کہ میں تمہیں اپنا لوں مگر میں اس کی زندگی میں یہ خواہش پوری نہیں کر سکا لیکن آج میں ملیحہ کی خواہش کو پورا کر دینا چاہتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھے اور گم سم بیٹھے وجدان کے پاس چلے آئے انہیں بازوؤں سے تھام کر اپنے مقابل کھڑا کیا اور گلے لگا لیا انہیں گلے لگاتے ہی ان کے سینے پر سے تمام بوجھ اتر گیا تھا اور انہیں ایسا لگا کہ کہیں بہت پاس ان کی بیٹی انہیں دیکھ کر مسکرائی تھی "کاش" نم آنکھوں کے ساتھ وجدان کو سینے سے لگائے ان کے ذہن میں اسی لفظ کی تکرار ہو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

شام ڈھلنے کو تھی قبرستان کی خاموش فضا میں ہوا کے جھونکے دبی دبی سرگوشیوں کا شور پیدا کرتے خشک پتوں کو اڑائے چلے جا رہے تھے جب سات لوگوں کا یہ قافلہ اس قبر کے پاس چلتا ہوا آ پہنچا جو برسوں سے تنہا تھی۔ سفید سنگ مرمر کی بنی قبر کے اوپری حصے پر مدفن کی مٹی نظر آ رہی تھی اور کتبے پر سیاہ روشنائی سے لکھا تھا۔

ملیحہ فاروقی بنت اظہر فاروقی۔
تاریخ پیدائش : 15 ستمبر 1960ء
تاریخ وفات : 21 دسمبر 1981ء

بابا جان کی نظر کتبے کی تحریر پر پڑی اور ان کے قدم لڑکھڑا گئے مگر ان کے دائیں بائیں موجود نورالہدیٰ اور وجدان نے فوراً انہیں سنبھال لیا۔ جان تو شایان کے پیروں میں بھی نہ رہی تھی۔ وہ بے دم سا ہو کر قبر کی پائنتی کے پاس بیٹھ گیا۔ کسی کو کسی کی خبر نہ تھی بس اتنا پتا تھا کہ اپنے دل پر قیامت بیت رہی ہے۔

تانیہ نے فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھا دیے، دعا مانگ کر اس نے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سامنے دیکھا۔ بابا جان کے دائیں جانب نورالہدیٰ اور بائیں جانب وجدان کھڑے تھے اور تینوں کے ہاتھ فاتحہ کے لیے اٹھے ہوئے تھے..... وہ تین لوگ جنہیں ملیحہ نے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ چاہا تھا..... وہ تین لوگ جو ملیحہ کی زندگی کی اساس تھے..... وہ تین لوگ جن میں سے کوئی ایک بھی اگر کم ہو جاتا تو ملیحہ جی نہیں پاتی..... جی نہ پائی..... وہ تین لوگ جن کے بارے میں ملیحہ کو یقین تھا کہ کبھی ایک ساتھ کھڑے نہ ہو پائیں گے مگر انہیں ایک ساتھ کھڑے دیکھنے کی خواہش اس نے پوری شدت سے کی تھی۔ آج..... ملیحہ کے مرنے کے ستائیس سال بعد وہ تین لوگ ایک ساتھ کھڑے تھے..... کیا یہ معجزہ نہیں تھا..... مگر یہ معجزہ اس وقت رونما ہو رہا تھا جب اسے دیکھنے کی منتظر آنکھیں مدتوں پہلے تھک کر سو چکی تھیں۔ تانیہ کا جی چاہا وہ قبر میں سو رہی ملیحہ کو جھنجھوڑ کر اٹھا دے اور کہے۔

"ذرا آنکھیں کھول کر اس منظر کو تو دیکھ لو جسے دیکھنے کی حسرت میں تم دنیا سے اٹھ گئیں..... ستائیس برس کا ہی تو انتظار تھا کاش کر لیا ہوتا..... تم تو بے کار میں مر گئیں۔" ایک آنسو تانیہ کی آنکھ سے ٹپک گیا تھا اسے اپنی پوروں میں جذب کرتے ہوئے اس نے شایان کو دیکھا جس کے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے اور قبر کی مٹی کو مٹھی میں جکڑے اس کی آنکھوں کی نمی بے خیالی میں ہی اس کے چہرے کو بھگوتی جا رہی تھی۔ تانیہ چلتے ہوئے اس کے پاس آئی اور نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیے۔ یہ سہارا اسے مضبوط کرنے کے بجائے کمزور کر گیا اور وہ بھرائی آواز میں بولا۔

"میرا دل چاہ رہا ہے میں مٹی کی اس دیوار کو ہٹا کر قبر میں اتر جاؤں بے شک امی مجھے گلے نہ لگا سکیں گی مگر میں ان کا چہرہ تو دیکھ لوں گا۔"

"ایسی باتیں نہ کرو۔" تانیہ نے اسے ٹوکا مگر وہ پھر بھی بولتا رہا۔

"تانیہ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میرا آدھا وجود قبر میں دفن ہو چکا ہے یہ قبریں اتنی تاریک اور گھٹن زدہ کیوں ہوتی ہیں؟"

"وہ عورت بدنصیب ہے شایان جس نے تمہیں پیدا کیا اور پھر خود کو تم سے محروم کر دیا مگر یہ قبر والی خوش نصیب ہے جس نے تمہیں پیدا نہیں کیا پھر بھی حشر کے دن تم اس کے نام سے پکارے جاؤ گے۔"

قبرستان زندوں کی سرائے اور مردوں کا ٹھکانہ ہے یہاں وہی ٹھہرتا ہے جو کندھوں پر آئے پیروں سے چل کر آنے والوں کو واپس جانا ہی ہوتا ہے۔ وہ سات لوگ بھی واپس جا رہے تھے۔ شام سرمئی ہو گئی تھی کہیں سے ایک سفید کبوتر اڑتا ہوا آیا اور مٹی کے پیالے سے گھونٹ گھونٹ پانی پینے لگا قبر کے کتبے کے پاس رکھے دیے کی لو تیز ہوا سے پھڑپھڑائی پھر بجھنے کے بجائے اور تیز ہو کر جلنے لگی۔ پاگلوں کی طرح چلتی ہوا کے ساتھ ایک دبی دبی سرگوشی تھی ایک گھٹن بھری آواز اس ویرانے میں پھیل گئی۔

"وہ چیز جو میں زندگی میں کبھی نہیں سیکھ پائی محبتوں کو کیٹگرائز کرنا ہے..... میں کبھی جان نہیں پائی کہ کیسے کسی محبت کو سب سے اوپر والے خانے میں رکھتے ہیں اور کسی دوسری محبت کو نیچے والے خانے میں..... مجھے تو بس محبت کرنا آتا تھا اور وہی میں نے کی....." ہوا نے رک کر اس سوگ بھری آواز کو سنا پھر سر جھٹک کر اپنی راہ ہو لی۔

☼ ☼ ☼

نورالہدیٰ انٹرنس کا دروازہ کھول کر اندر آئے اور ہمیشہ کی طرح نگاہ سامنے صوفے پر جا ٹھہری بے اختیاری بھی کیا چیز ہے انہوں نے شگفتگی سے سوچا۔

"کیا کبھی ایسا ہو گا کہ میں گھر لوٹوں اور تمہاری یاد میری منتظر نہ ہو۔" ہر روز کی طرح آج بھی خالی صوفہ ان کے اندر کے خالی پن کو بڑھا گیا۔

"ایک تم جو نہیں ہو تو لگتا ہے کچھ نہیں ہے۔۔۔ کہیں سے آجاؤ ملیحہ تمہیں دیکھے ہوئے مدت گزر گئی۔ مگر تم کہاں سے آؤ گی۔" انہوں نے ہمیشہ کی طرح اپنی بے بسی کا اعتراف کرتے ہوئے ہر روز کی جانے والی خواہش کی تھی اور روز کی طرح ہی اپنی خواہش کا گلا خود ہی گھونٹ ڈالا تھا۔

"سنا تھا لوگ پیار میں مر جاتے ہیں پر کبھی کسی کو مرتے نہیں دیکھا تھا، تم مر گئیں تو یقین آگیا اور امید بھی بندھ گئی کہ ایک دن میں بھی تم سے محبت کرتے کرتے مر جاؤں گا مگر تمہارے بغیر جینے کی ایسی عادت پڑ گئی ہے کہ موت نہیں آتی۔۔۔ ویسے تمہیں نہیں لگتا کہ میری عادتیں کافی بگڑ گئی ہیں۔"

آنکھوں میں اس کا عکس لیے وہ خالی صوفے کی طرف دیکھتے ہوئے پر تشویش انداز میں سوال کر رہے تھے۔

"مگر عادتیں تو تمہاری بھی خراب ہو گئی ہیں۔۔۔ میں اکیلا بولتا جاتا ہوں اور تم جواب نہیں دیتیں۔ بری عادت ہے یہ۔" وہ خفگی سے کہہ رہے تھے۔

"کھانا لگا دوں صاب۔" بہادر پاس آکر بولا تھا۔ نورالہدی نے اسے دیکھ کر نفی میں سر ہلایا اور انٹرنس کا دروازہ بند کرتے خالی صوفے سے نظر بچا کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔

نورالہدی دروازہ کھول کر اپنے بیڈ روم میں آئے تو کمرے میں اندھیرا بھرا ہوا تھا اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے انہوں نے اندازے سے سوئچ بورڈ ٹٹول کر لائٹ جلا دی۔ وہ پلٹے تو دیکھا مریم دونوں پاؤں اٹھا کر بیڈ کے کنارے گھٹنوں میں چہرہ چھپائے اپنے گرد بازو لپیٹ کر بیٹھی تھیں۔ انہوں نے دروازہ بند ہونے کی آواز نہیں سنی تھی اس لیے کمرے میں روشنی بکھرتے ہی انہوں نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔

"تم نے کمرے میں اندھیرا کیوں کر رکھا ہے۔" نورالہدی حیرت سے بولے پھر ٹھٹک گئے۔

"تم رو رہی ہو۔" بات حیرانی کی ہی تھی ازدواجی زندگی کے پچیس سالوں میں نورالہدی نے کبھی انہیں روتے نہیں دیکھا مگر اس وقت ان کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ کئی گھنٹوں سے لگاتار رو رہی تھیں چہرے کے تیکھے نقوش ملاحت میں ڈوبے تھے آنسوؤں سے دھل کر ان کے چہرے کی چاندنی نکھر آئی تھی مستقل رونے سے ان کی آنکھیں اور ناک سرخ ہو رہی تھی۔ انہوں نے بس ایک پل کے لیے سر اٹھا کر نورالہدی کو دیکھا تھا پھر دوبارہ سر گھٹنوں پر رکھ لیا اور بے آواز رونے لگیں نورالہدی کو انہیں روتے ہوئے دیکھ کر تکلیف ہوئی تھی۔ وہ پاس بیٹھ کر ان کے بال سہلاتے ہوئے نرمی سے بولے۔

"تم رو کیوں رہی ہو؟" انہوں نے سر اٹھائے بغیر چہرہ موڑ کر انہیں دیکھا ان کی سوجی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر نورالہدی کے اندر بے چینی بڑھ گئی ان کے سر پر رکھے ہاتھ کو ان کے چہرے تک لا کر انگوٹھے سے ان گال سے نمی سمیٹتے ہوئے بولے۔

"پچیس سال میں آج پہلی بار تمہیں روتے ہوئے دیکھ رہا ہوں اور تم مجھے بالکل اچھی نہیں لگ رہیں۔ تم بس لڑتی جھگڑتی ہی اچھی لگتی ہو اگر مجھ سے شکایت ہے تو کہو بلکہ ایسا کرو، جھگڑا ہی کر لو مگر یوں رو کر میری عمر بھر کی محبت برباد نہ کرو۔"

"تم نے ملیحہ سے محبت کیوں کی؟" ہمیشہ ہی یہ شکایت کرتے ہوئے مریم آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑتیں مگر آج واقعی کچھ ہوا تھا جو وہ یوں ٹوٹ کر بکھرتے ہوئے شکوہ کر رہی تھیں نورالہدی اپنا ہاتھ ان کے چہرے سے ہٹاتے ہوئے دھیمی آواز میں بولے۔

"کی کب تھی ہو گئی تھی۔"

"مجھ سے محبت کیوں نہیں ہوئی۔" انداز روٹھا روٹھا سا تھا نورالہدی بے ساختہ مسکرائے۔

"کون کہتا ہے میں تم سے محبت نہیں کرتا۔" وہ تھکن بھری آواز میں بولیں۔

"محبت کرنے میں اور محبت ہو جانے میں فرق ہے

یہ معاملہ اختیار اور بے اختیاری کا ہے، مجھ سے محبت کرنا تمہارے اختیار میں ہے مگر ملیحہ کو نہ چاہنا تمہارے اختیار میں نہیں۔" نورالہدی عاجز آکر بولے۔

"تم میری بیوی ہو مریم میرے بچوں کی ماں ہو۔ ملیحہ میری کچھ نہیں تھی صرف محبت ہی اس سے کی تھی کبھی اسے پانے کی آرزو نہیں کی مگر تمہیں پانا چاہا تھا اور پا لیا ہے۔" وہ حسرت سے بولیں۔

"کاش میں تمہاری بیوی نہ ہوتی، تمہارے بچوں کی ماں نہ ہوتی کاش تم مجھے پانے کی خواہش ہی نہ کرتے بس مجھ سے محبت کرتے۔۔۔ ویسی محبت جیسی تمہیں ملیحہ سے ہے۔" وہ آواز میں بے چارگی سمو کر بولے۔

"تم کیوں اپنا مقابلہ ملیحہ سے کرتی ہو۔ کیوں تمہیں یقین نہیں آتا کہ میرے دل میں ہر طرف تم ہی ہو بس ایک کونا ایسا ہے جہاں ملیحہ رہتی ہے مگر میرے دل میں حکم صرف تمہارا چلتا ہے تمہاری جگہ کوئی نہیں لے سکتا ملیحہ بھی نہیں۔" ان کی آواز کا سچ ان کی آنکھوں سے بھی جھلک رہا تھا جس نے مریم کو اور بھی آزردہ کر دیا۔

"وہ میری جگہ لے گی بھی کیوں جبکہ اس کی جگہ میری جگہ سے اچھی ہے۔"

"تم میری بیوی ہو مریم۔۔۔" نورالہدی نے انہیں احساس کرانا چاہا تھا مگر وہ ان کی بات کاٹ کر بولیں۔

"مجھے خود سے اپنے رشتے نہ گنواؤ نورالہدی۔" پھر اچانک ہی ان کے ہاتھ تھام کر منت کرنے لگیں۔

"میرا ایک کام کرو گے۔ اپنے سارے رشتے ملیحہ کو دے دو اسے چاہو۔۔۔ ہر سانس کے ساتھ اس کی آرزو کرو اپنے دل کی حکمرانی کا تاج میرے سر سے اتار کر ملیحہ کے سر پر رکھ دو اور بدلے میں مجھے وہ کونا دے دو جو تم نے ملیحہ کے نام کر رکھا ہے۔" ان کا وہ جنون اور دیوانگی۔۔۔ نورالہدی بوکھلا گئے۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے مریم۔" مگر انہوں نے سنا ہی نہیں وہ تڑپ تڑپ کر روتے ہوئے کہتی جا رہی تھیں۔

"مجھے تمہارا دل نہیں چاہیے بس مجھے وہ کونا دے دو تمہیں ملیحہ کی قسم ہے مجھے تہی دامن کر دو مجھے اپنے گھر سے اپنی زندگی سے نکال دو بس وہ کونا مجھے دے دو مجھے تمہارا دل نہیں چاہیے مجھے تمہارے دل کا وہ کونا چاہیے جہاں ملیحہ کے سوا کسی کی دسترس نہیں۔"

"ہوش میں آؤ مریم۔" نورالہدی نے انہیں شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا تو وہ چپ ہو کر انہیں دیکھنے لگیں پھر اپنے شانوں سے ان کے ہاتھ ہٹا کر دور جا بیٹھیں اور دکھ سے بولیں۔

"میں جانتی ہوں تم کبھی ایسا نہیں کرو گے وہ کونا ہی تو تمہارے دل کی کائنات ہے تم کیسے ملیحہ کو اپنی کائنات سے بے دخل کر سکتے ہو۔" نورالہدی بہت پیار سے ان کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں بھر کر بولے۔

"میری کائنات تمہارے بغیر ادھوری ہے۔" وہ اداس مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔

"تم خود نہیں جانتے نورالہدی کہ تم نے جو کونا ملیحہ کے نام کیا تھا وہ تمہارے دل کی چوکھٹ ہے، جس پر پاؤں رکھنے کی مجھے اجازت نہیں۔۔۔ میں اندر کیسے آؤں۔" وہ روہانسی ہو گئیں تو نورالہدی مضبوط آواز میں بولے۔

"تم میرے دل میں ہو مریم میں نے تمہیں محسوس کیا ہے۔ تمہیں کیوں محسوس نہیں ہوتا۔"

"کاش تم نے مجھے اس طرح چاہا ہوتا جیسے ملیحہ کو چاہا ہے۔" "حسرتیں ہیں کہ تمام نہیں ہوتیں۔ نورالہدی تھک کر بولے۔

"یہ جھگڑا پھر کسی دن کر لینا۔ آج میں بہت اداس ہوں آج ایسا کرو میری اداسی سمیٹ لو وہاں ملیحہ کے کمرے میں ہر چیز میری تکلیف کو بڑھاتی ہے مگر تمہاری تکلیف نہ بڑھے اس لیے کبھی تمہارے پاس اپنے درد لے کر نہیں آیا لیکن آج اکیلے نہیں رو پاؤں گا ملیحہ یاد آئے تو بکھرنا لازم ہے لیکن آج مٹ جانے کا ڈر ہے تم پاس ہو تو میں سنبھال لو گی۔"

"مجھے حیرت ہوتی ہے نورالہدی ملیحہ کو مرے ہوئے ستائیس سال ہو گئے اور تم آج بھی اس سے

محبت کرتے ہو۔" وہ سچ مچ حیران تھیں۔

"تمہاری حیرت میرا دکھ ہے مریم میں جس سے محبت کرتا ہوں وہ لڑکی ستائیس سال پہلے مر چکی ہے۔" نورالہدیٰ یہ کہہ کر رو پڑے ان کی آواز میں وہ درد تھا کہ مریم بھی کانپ گئیں وہ تھم رہے تھے۔

"کوئی چیز اس اذیت کی برابری نہیں کر سکتی مگر تم اس درد کو اس وقت سمجھو گی جب میں مر جاؤں گا۔" صرف یہ سن کر ہی مریم کی روح فنا ہو گئی انہوں نے تڑپ کر اپنا ہاتھ نورالہدیٰ کے ہونٹوں پر رکھ دیا اور وہ ان کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے ہٹا کر مریم کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئے۔ مریم ساکت نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھیں مریم کا ہاتھ نورالہدیٰ کے سینے پر ان کے ہاتھ کے نیچے دبا تھا اور ان کی بند آنکھوں کے کونوں سے گرم سیال بہہ کر مریم کے کپڑوں میں جذب ہو رہا تھا آج انہیں ملیحہ کو یاد کرتے دیکھ کر مریم کو اعتراض نہ ہوا کیونکہ آج وہ صرف ان کے دکھ کو محسوس کر رہی تھیں ان کا دل گداز ہونے لگا وہ انہیں پرسکون کرنے کے لیے دھیرے دھیرے ان کے بالوں میں انگلیاں چلانے لگیں اور نورالہدیٰ نے ستائیس سال بعد اپنی رگوں میں سکون اترتا محسوس کیا تھا۔

"ہم بہت اچھی زندگی گزار سکتے تھے مریم۔" نورالہدیٰ نے بند آنکھوں سے کہا اور ان کی آواز میں وہ افسوس تھا کہ ان کے بالوں میں گردش کرتا مریم کا ہاتھ لرز گیا۔

☼ ☼ ☼

لان میں دھوپ کھلی ہوئی تھی مگر ہلکی ہلکی خنکی میں یہ دھوپ خوشگوار لگ رہی تھی۔ راڈ کی ڈبل سیٹر چیئر پر تانیہ وجدان کے بازو سے لگی بیٹھی تھی۔ وجدان کے ہاتھ میں اخبار تھا اور تانیہ خبروں پر بے تکے تبصرے کرتے مستقل انہیں ہنسا رہی تھی کہ شایان نے ٹیرس پر آکر اسے آواز دی مگر وہ اتنی مگن تھی کہ سنا ہی نہیں۔ وجدان نے اخبار رول کر کے اس کے سر پر ہلکے سے مارا پھر ٹیرس کی طرف اشارہ کر کے بولے۔

"شوہر کی تو سن لو۔" تانیہ نے ٹیرس کی طرف دیکھا تو شایان نے وہیں سے آواز لگائی۔

"میرے یونیفارم کے بیجز نہیں مل رہے آکر دیکھو۔"

"آتی ہوں۔" تانیہ نے اونچی آواز میں کہا تو وہ اندر پلٹ گیا۔ تانیہ جھنجھلا کر بڑبڑائی۔

"اچھی مصیبت ہے چھٹی کے دن بھی یہ آدمی مجھے چین نہیں لینے دیتا جب دیکھو تانیہ تانیہ کی آوازیں لگاتا ہے۔" اس بے زاری میں جو ناز چھپا تھا وجدان اسے محسوس کر کے مسکرائے تو وہ ان پر چڑھ دوڑی۔

"یہ غلط بات ہے ابو آپ کا بیٹا مجھے پریشان کرتا ہے تو آپ اسے ڈانٹنے کے بجائے ہنستے ہیں۔"

"میں نے کیا کیا ہے؟" وہ فوراً" ہنسی ضبط کر کے معصومیت سے بولے تو تانیہ چڑ کر بولی۔

"ساری غلطی ہی آپ کی ہے لاڈ پیار کر کے صاحبزادے کا دماغ خراب کر دیا ہے اوپر سے دادا جان نے اسے سر پر چڑھا رکھا ہے مگر آپ لوگوں کا کیا بھگتنا تو مجھے ہے۔" وہ خفگی سے کہہ کر اٹھی اور اپنے کمرے میں آگئی۔

"یار میرے بیجز نہیں مل رہے کب سے ڈھونڈ رہا ہوں۔" شایان نے اسے دیکھتے ہی دہائی دی وہ ایک نظر اس پر ڈال کر ڈریسنگ ٹیبل کے پاس آئی اور دراز کھینچ کر باہر نکال لیا شایان نے آگے ہو کر دیکھا اس میں اس کے سارے بیجز موجود تھے۔

"بس یہیں پر نہیں دیکھا تھا۔" وہ گدی سہلانے لگا تانیہ نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔

"صاف کیوں نہیں کہتے میں پاس نہ دکھوں تو چین نہیں پڑتا۔"

"جب جانتی ہو تو خود ہی میرے پاس آجایا کرو۔" اس کی ڈھٹائی پر تانیہ گھور کر بولی۔

"شرم تو نہیں آتی اس حالت میں مجھ سے اوپر نیچے کے چکر لگواتے ہو۔"

"کس حالت میں۔۔۔" اس نے محظوظ ہو کر پوچھا تانیہ بری طرح شرما گئی اور جھینپ مٹانے کو بولی۔

"اچھا زیادہ باتیں نہ بناؤ، جاؤ جا کر تیار ہو میں ناشتے کا کہتی ہوں۔"

"ارے بھئی ناشتے کا ٹائم نہیں ہے ڈی آئی جی آپریشن نے فوراً" میٹنگ کے لیے بلایا ہے۔" وہ یونیفارم اٹھا کر عجلت میں باتھ روم کی طرف بڑھا تو تانیہ بولی۔

"اتنی جلدی ہوتی ہے تو وقت پر کیوں نہیں اٹھتے فجر کی نماز بھی بند آنکھوں سے پڑھتے ہو۔ دیر تک سونے کی عادت تو نہ ابو میں ہے نہ امی میں تھی پتا نہیں تم میں کہاں سے آگئی۔" وہ جاتے جاتے رک کر بولا۔

"تمہیں امی کی عادتوں کا کیا پتا۔"

"ان کے بارے میں تم سے زیادہ جانتی ہوں۔" وہ اٹھلائی۔

"کیا جانتی ہو۔" وہ تو بحث کے موڈ میں آگیا۔ تانیہ بولی۔

"بعد میں بتاؤں گی ابھی تمہارا ناشتا تیار کر لوں۔"

"میں ناشتا نہیں کروں گا۔" وہ باتھ روم کی طرف جاتا ہوا بولا۔

"جتنی دیر یہ بحث کرنی ہے وہ سینڈوچ آرام سے کھائے جا سکتے ہیں اور جوس تو میں نے صبح ہی بنا کر فریج میں رکھ دیا تھا۔" اس کی بات کے جواب میں ٹھک سے دروازہ بند ہونے کی آواز آئی تھی وہ منہ بناتی کچن میں آگئی اور جب وہ سینڈوچ کی پلیٹ اور جوس کا گلاس لے کر کمرے میں آئی تو شایان ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا یونیفارم کی شرٹ کے بٹن بند کر رہا تھا۔

"میں نے کہا تھا میں ناشتا نہیں کروں گا۔" شایان نے اسے گلاس اور پلیٹ ٹیبل پر رکھتے دیکھ کر کہا۔

"اور میں نے بھی ہزار بار تم سے کہا ہے کہ مجھے تمہارا خالی پیٹ گھر سے جانا پسند نہیں۔" یہ کہہ کر تانیہ نے سینڈوچ اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ اس کے بٹن بند ہونے تک سینڈوچ ختم ہو چکا تھا تانیہ نے دوسرا سینڈوچ اس کے ہاتھ میں دیا اور خود اسے بٹھا کر اس کے بال بنانے لگی وہ بال بنا کر فارغ ہوئی تو شایان

آخری نوالہ منہ میں رکھ کر جوس کا گلاس اٹھا چکا تھا اس نے ایک سانس میں گلاس خالی کر دیا۔

"اب اجازت ہے۔" شایان نے گلاس ٹیبل پر رکھ کر پوچھا۔ تانیہ نے اسٹک اور کیپ اس کے ہاتھ میں دے کر کہا۔

"جاؤ۔" وہ اسے باہر تک چھوڑنے گئی تو ساتھ ساتھ کہتی رہی۔

"اس سے تو اچھا تھا شایان تم سکھر میں ہی رہتے ہفتے میں ایک دن آتے تھے پر وہ پورا دن گھر میں گزرتا تھا اب جب سے کراچی ٹرانسفر ہوا ہے سارا دن آفس میں رہتے ہو گھر تو بس سونے کے لیے آتے ہو۔ مجھے کمپنی دینے کے لیے تمہارے پاس ذرا وقت نہیں ہے۔"

"کیا کریں جان من نوکری ہی ایسی ہے۔" وہ جیپ کا دروازہ کھول کر اس کی طرف مڑتا ترنگ میں بولا۔

"بدتمیز۔" تانیہ نے گھورا وہ ہنسا پھر نرمی سے بولا۔

"بس تین چار مہینے اور انتظار کر لو پھر تمہیں کمپنی دینے والا آجائے گا۔" وہ سرخ چہرے کے ساتھ بولی۔

"وہ تم تو نہیں ہو گے۔"

"اس مسئلے کا تو کوئی حل نہیں ہے۔" اس نے بے چارگی سے کندھے اچکا کر کہا پھر لان چیئرز کی طرف منہ کر کے زور سے کہا۔

"اللہ حافظ ابو۔"

"اللہ حافظ۔" انہوں نے وہیں سے اسے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ پولیس جیپ پورچ سے نکل گئی تو تانیہ وجدان کے پاس چلی آئی۔

"میرا چائے پینے کو دل چاہ رہا ہے آپ پئیں گے۔"

"نیکی اور پوچھ پوچھ۔" وہ مسکرائے۔ تانیہ ہنس کر بولی۔

"ابھی لائی۔" وہ اندر کی طرف پلٹ گئی۔

وجدان اسے ہی دیکھ رہے تھے کہ ٹیرس پر رنگین آنچل لہراتا ہوا محسوس ہوا۔ "تانیہ تو نیچے ہے پھر یہ کون؟" انہوں نے چونک کر اوپر دیکھا اور پتھر کے ہو گئے۔ ملیحہ ٹیرس کی ریلنگ پر آگے کو جھکی ایک ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے رکھے بہت دلچسپی سے انہیں دیکھتے ہوئے دلکشی سے مسکرا رہی تھی اس کے کھلے بال ہوا سے اڑتے اس کے چہرے پر آرہے تھے اور آنچل ہوا کے دوش پر لہراتا دھنک بکھیر رہا تھا وہ اس منظر میں کھو کر زیر لب بولے۔

"اٹھارہ سال بعد۔۔۔" اور ایک یاسیت ان کے اندر پھیل گئی۔

"کہا تھا آپ سے جب تک سانسیں ہیں تب تک جی لینے دیں۔۔۔ پھر، پھر آج کیوں؟" منظر حسین سہی۔ پھر اٹھارہ سال بعد بھی وجدان میں اسے دیکھنے کی تاب نہیں تھی۔

انہیں یقین تھا اگر وہ یوں ہی اس منظر کو دیکھتے رہے تو ایک بار پھر دیوانے ہو جائیں گے۔۔۔ اور تب نہ جانے کیا ہوا واہمہ حقیقت بنا کر حقیقت واہمہ بن گئی ملیحہ کو دیکھتے ہوئے وجدان نے اپنا دایاں ہاتھ دل پر رکھ کر بے قابو ہوتی دھڑکنوں کو سہارا دیا تھا اور اب ان کے ہاتھ کی پشت پر نرم انگلیوں کا لمس جاگا تھا وہ ابھی اس احساس سے سنبھلے نہ تھے کہ ان انگلیوں نے بڑھ کر ان کے ہاتھ پر ملائمت سے گرفت کر لی اور انہیں لگا کہ گداز ہتھیلی سے درد کی گرم سلاخ نکل کر ان کے ہاتھ سے گزرتی دل میں جا گھسی ہے، بہت تیز درد تھا۔ وجدان نے تڑپ کر آنکھیں کھولنی چاہیں مگر پلکیں تھرتھرا کر رہ گئیں تبھی کسی نے ان کے شانے پر اپنا سر رکھ دیا تھا ان کا بایاں پہلو گداز بدن کے لمس سے سنسنا اٹھا تھا۔ وجدان کی دھڑکنیں ڈگمگائیں اور پھر تال سے ہٹ گئیں انہیں محسوس ہوا کہ درد خون کے ساتھ بہتا ان کے جسم کے بائیں حصے میں مکڑی کے جال کی طرح پھیل گیا ہے۔ درد بہت شدید تھا۔۔۔ رگوں کو کاٹتا ہوا مگر اس میں عجیب سا نشہ ملا تھا وجدان مدہوش ہونے لگے۔۔۔ ان کے چہرے پر ریشمی زلفیں لہرائی تھیں جن کی مہک نے ان کے رہے سہے ہوش بھی چھین لیے اپنی گردن پر گرم سانسوں کو محسوس کر کے ان کی سانسیں اکھڑتی جا رہی تھیں۔۔۔ بے قابو دھڑکنیں تیز ہوتی گئیں اور تیز۔۔۔ اور تیز۔۔۔ درد چھانے لگا۔ نشہ بڑھنے لگا۔۔۔ اور کیف کے لمحے دراز ہوتے چلے گئے۔

ہم نے بھلا کس سے کہا
کرتے رہے ہیں عمر بھر
کس راہ گزر کی جستجو
آنکھوں سے کیوں او جھل ہوا
منسوب جس کے نام تھی
ہر روشنی ہر آرزو
تیز تھی موج بلا
مرگ تمنا عام تھی
چپ چاپ ہم کس کے لیے
تھامے رہے جلتے رہے
دیکھو کہ پھر تحلیل ہوئے
شہر وفا کے آئینے
آتی رتوں کی آہٹیں
بیتے دنوں کے نقش پا
دیکھو کہ وہ آرام جاں
ہم پر ہوا پھر مہرباں
ہم نے بھلا کس سے کہا

"لیجیے ابو آپ کی چائے۔" تانیہ نے ٹرے ٹیبل پر رکھتے ہوئے بڑے خوشگوار سے انداز میں وجدان سے کہا تھا پھر ان کی طرف سے جواب نہ پا کر اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے ایک ہاتھ سینے پر رکھے بہت پر سکون نظر آرہے تھے تانیہ ان کے چہرے پر نظر ڈال کر مسکرائی۔ "ابو۔" مگر اس کی پکار کا جواب نہیں آیا تو اسے عجیب سا لگا۔

"کیا سو گئے۔" اس نے حیرت سے کہا اور پھر سے پکارنے لگی "ابو چائے تو پی لیں پھر اندر جا کر سو جائیے گا۔"

وہاں اب بھی خاموشی تھی تانیہ کے اندر بے چینی پھیل گئی اسے یہ سکوت غیر فطری لگنے لگا تھا وہ اٹھ کر ان کے پاس آگئی۔

"ابو۔" آواز دینے کے ساتھ ہی اس نے ان کے سینے پر رکھا ہاتھ کہنی سے پکڑ کر ہلایا تو وہ بے جان سے انداز میں پہلو میں جا گرا۔ اس نے گھبرا کر دو قدم پیچھے کیے اور کچھ سیکنڈ تک بے یقینی سے انہیں دیکھتی رہی پھر اس کے حلق سے فلک شگاف چیخ بلند ہوئی تھی "ابو۔" اور دوڑ کر وجدان کے بے روح جسم سے لپٹتی اور اونچی آواز میں رونے لگی۔ ملازم اس کے بین کی آوازیں سن کر دوڑے چلے آئے مگر انہیں سوال کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وجدان کے چہرے کا سکون اور تانیہ کے گالوں پر بہتے آنسو بتا رہے تھے کہ وجدان راہی ملک عدم ہو چکے۔۔۔ بظاہر یہ اختتام ہے لیکن کہانی یہاں ختم نہیں ہوتی۔۔۔ اس اختتام سے نئی شروعات کی ابتدا ہو گی۔

محبت جسے بخش دے زندگانی
نہیں موت پر ختم اس کی کہانی

☆ ☆

عاصمہ ریاض

جو سوئے یار سے ملا

دانیال کا تبادلہ ہوا تو پرانے شہر وہاں کے لوگوں اور در و دیوار کے ہجر میں، میں بوجھل سی ہو گئی۔

"او خدایا!" نیا شہر، نت نئے لوگ اور اہم ترین مرحلہ گھر کی سجاوٹ کا تھا، ایسے معاملوں میں، میں بے حد محتاط تھی۔ لہٰذا رہائش گاہ کے درشن ہوئے تو یاسیت قدرے کم ہو گئی، تین کمرے، ڈرائنگ روم، چھوٹا سا کچن، خصوصاً "کشادہ صحن سے دل خوش ہو گیا، آنگن میں تھوڑے سے رقبے کو کیاری میں ڈھال دیا کیاری کے اندرونی حصے میں بنفشہ کے ساتھ ساتھ انار اور فالسے کے پودے لگائے۔ علاوہ ازیں نسترن، چنبیلی، اور گلفام کے پھولوں سے آراستہ کیا، کمروں میں سے ایک کمرے کو چھوٹی سی آرٹ گیلری کی شکل جاہ رفعت بخشی۔

ایک شاہکار جو میں نے چند سال پہلے ایک آرٹ گیلری سے خریدا تھا۔ بھینس کے جسم پر اونٹ کی گردن لگی تھی، اس کی ٹانگیں مسواک کی طرح پتلی تھیں۔ ایک تصویر جو کہ دانیال نے آرٹ کے لیے میرا کریز دیکھ کر برتھ ڈے پر مجھے دی تھی۔ دیکھنے والوں کو یوں لگتا تھا جیسے صاف کاغذ پر مختلف رنگوں کو گرا دیا گیا ہو۔ ایک اور تصویر تھی اس کا نقشہ کچھ یوں تھا اس کی آڑی ترچھی لکیریں سورج کی کرنوں کی طرح آتی تھیں، جیسے کسی ٹوٹے ہوئے شیشے پر پڑ رہی ہوں۔ یہ تمام انکشافات میری پرانی محلے دار دوستوں نے ان نمونوں کے متعلق کیے تھے۔ "جو تن لاگے سو تن جانے" کے جملے میں انہیں لاجواب کر دیتی ـــــــ ایک طرف کتابوں کو ترتیب سے لگا دیا اور ادبی کتابوں کو یکجا کرنے میں تو دانیال بھی برابر کے شریک تھے۔ حالانکہ کچن اور دیگر کمروں کی آرائش ہنوز جوں کی توں تھی۔ بہرحال ایک ہفتے میں گھر کے کام کاج نبٹائے، اس محنت سے میں شدید تکان میں گھر گئی۔

دانیال بھی گھر کی آب و تاب سے محظوظ ہوئے، یوں بھی میری سرشت سے بخوبی واقف تھے کہ گھر کی معمولی ساخت پر ہرگز اکتفا نہیں کروں گی، ان رجحانات سے ہٹ کر میری ایک اور بری عادت تھی۔ جس نے کافی حد تک میری ناک میں دم کیا تھا۔ لوگوں کے نجی و ذاتی معاملات کی خبرگیری رکھنا خواہ وہ محلے دار ہوں یا دوست! ان سے بات چیت کے دوران میں موشگافیوں میں پڑ جاتی، کب ہوا، کیوں ہوا، کیسے؟ کے سوالات میرے ذہن میں بے دار ہوتے رہتے، جنہیں میں زبان سے اگل دیتی، یہ جانے بغیر کہ دوسرا میرے بارے میں کیا کیا اندیشے پال لے گا۔ الغرض اس بار میں ٹھان چکی تھی کہ کسی پڑوسی سے میل جول کو طول نہیں دوں گی، وگرنہ لینے کے دینے پڑ جائیں گے، میری چھٹی حس مجھے بارہا خبردار کرتی رہی۔

☼ ☼ ☼

شام کا وقت تھا میں کیاری کے قریب ہی چیئر پہ براجمان چائے کی چسکیاں لے رہی تھی، کسی بندہ خدا نے ڈور بیل بجائی اور میں گیٹ کی جانب لپکی، دانیال تو نہیں ہو سکتے۔ غالباً "کوئی محلے دار ہو گا۔ یہ ہی سوچ کر دروازہ کھولا، پر چوکھٹ پہ ننھے مہمان کو پا کر میں خود بخود ہنس دی۔

"آنٹی میں اپنا فٹ بال لینے آیا تھا۔" معصوم سوال میری سماعت پر پڑا۔

"آؤ لے لو۔" میں نے بچے کے کاندھے کو تھپکا، پھر یہ برخوردار ایسے آئے کہ یہیں کے ہو کے رہ گئے۔ درحقیقت میرا لخت جگر سحاب اسی کی عمر کا تھا اور جبلی طور پر میری ہی طرح گپ شپ، کھیل کود، مار دھاڑ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا، کچھ دن بیتے تو میں نے سحاب کو میسم ہی کے اسکول میں داخل کروا دیا، کیونکہ میں زیادہ دیر سحاب کی پڑھائی کا حرج نہیں کر سکتی تھی۔ اس لحاظ سے میسم کی دوستی بڑی کار آمد ثابت ہوئی، سحاب کا اسکول میں جی لگ گیا۔

☼ ☼ ☼

مجھے کسی کام سے مارکیٹ جانا تھا۔ میسم اور سحاب کو صحن میں اچھل کود کرتے دیکھ کر زرینہ (کام والی) کو تنبیہہ کر گئی۔ ان کا خیال رکھنا میں ذرا کام سے جا رہی ہوں۔ واپسی پر بچوں کو نہ پا کر زرینہ کو آڑے ہاتھوں لیا۔

"بی بی جی وہ میسم کے گھر پر ہوں گے۔" وہ بوکھلا سی گئی۔ زرینہ سے گھر کا پتا دریافت کیا اور آؤ دیکھا نہ تاؤ میسم کے گھر کی راہ لی، زن سے بنگلے میں جا گھسی، مکان تقریباً" ایک کنال پر محیط تھا۔ جس میں ڈیڑھ مرلے کا رقبہ گیراج اور ایک مرلہ لان کو سونپا گیا تھا۔ لان میں میسم اور سحاب کو دیکھا، تب جا کے میرے دل کو اطمینان ہوا، میں ہولے ہولے ان تک پہنچنے ہی کو تھی کہ یک دم ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"عینی تم!"

"تم نزہت ہو نا۔" میں نے سوال کیا۔

"ہاں یار!" اور وہ مجھ سے چمٹ گئی۔

"اوہ گاڈ تم نہیں جانتیں مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے تم مسز ملک کے ہاں شفٹ ہوئی ہو نا! میں بھی کہوں سحاب میں اتنی جاذبیت کیوں ہے یار تمہارا بیٹا جو ہے۔"

نزہت میری کالج فرینڈ تھی۔ ہمارا ٹکراؤ اتنی تاخیر کے بعد ہوا تھا۔ اس کا تپاک بجا تھا۔ فی الحقیقت میری باچھیں بھی کھلیں، شکر تھی نئے محلے دار سے پالا نہیں پڑا تھا، پر حیرت ہوئی کہ نزہت کے رویے میں ذرا برابر تبدیلی نہیں آئی تھی، بس پھر میں تھی نزہت اور ہماری دعوتیں! نزہت مجھے محلے بھر کی خبریں دیتی اور میں عادتاً" گپ شپ کا چسکا لیتی رہتی، ہر شام ہم ایک ساتھ چائے کے نشے سے سرشار ہوتے نزہت میری چائے کو مدح سے نوازتی، حالانکہ دھن دولت کے لحاظ سے آج بھی ہمارے درجوں میں امتیاز برقرار تھا۔ نزہت کا بنگلہ نہایت شاندار تھا۔ گھر کی ہر شے میں جدت تھی۔ لان کی آرائش سے تو میں بہت متاثر ہوئی نزہت کے شوہر نامدار۔ "جبران بیگ" کسی بزنس ٹرپ کے سلسلے میں بیرون ملک تھے۔ ہماری باہمی قرابت اس حد تک تجاوز کر گئی تھی کہ کپڑوں میں بھی ہم آہنگی کا عنصر پیدا ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

تقریباً" سہ پہر کے چار بجے تھے، نزہت کچھ ادبی کتابیں لینے آئی تھی۔

"عینی مجھے ان کا مطالعہ کرنا تھا۔" نزہت نے کتابیں ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"کچھ دن بعد لوٹا دوں گی۔" وہ زیر لب بڑبڑائی۔

"نزہت میں کب کہہ رہی ہوں کہ تم ہڑپ کر جاؤ گی۔" میرا لہجہ استہزائیہ تھا۔

"ٹھہرو میں چائے لاتی ہوں۔" میرے یہ کہنے کی دیر تھی کہ گیٹ کے باہر کار کا ہارن گونجا۔ ہم دونوں متوجہ ہوئیں، دانیال اس وقت کیسے میں نے تعجب سے سرگوشی کی۔

"از ایوری تھنگ آل رائٹ دانیال۔" میں نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی سوال داغا۔

"یس ڈارلنگ دائے آر یو اپ سیٹ۔" میرے خدشے پہ دانیال نے مجھے دلاسا دیا۔

"دانیال یہ نزہت ہے میری کالج فرینڈ اسی کے متعلق ہی بتایا تھا میں نے آپ کو اتفاقاً" اسی ایریے میں مقیم ہے۔" میں نے نزہت کا تعارف کرایا۔

"اوہ آئی سی، آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔" دانیال نے معمولی رد عمل کا مظاہرہ کیا۔ جبکہ نزہت قدرے بے تکلف ہو گئی، مجھے کوئی دھچکا نہیں لگا، کیونکہ میں نزہت کی فطرت سے آشنا تھی۔ ابتدا ہی سے اسے مردوں کی محفل بھاتی تھی، جہاں کہیں ہینڈسم نوجوان دیکھتی اس کی گرویدہ ہو جاتی۔

"آپ لوگ بیٹھیں میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔" میں اپنے پسندیدہ مشروب کو بھلا کیسے فراموش کر سکتی تھی۔ الغرض اس شام غضب کی محفل جمی۔ باہر میسم اور سحاب اپنا کھیل اور اندر ہم اپنی بیٹھک انجوائے کرتے رہے۔

"کیسی لگی میری دوست۔" نزہت کی رخصتی کے بعد میں نے دانیال سے دریافت کیا۔ جواباً" دانیال نے خفیف سی تعریف کی۔

☼ ☼ ☼

سنڈے کو تعطیل کے باعث میں مزے دار کھانوں اور گھر کی سیٹنگ میں تھوڑی بہت تبدیلی سے پرلطف بنا دیتی، یوں ہم کہیں باہر جانے کی بجائے گھر ہی میں تفریح کرتے، آج میں نے کھانے میں چکن جنجر اور میٹھے میں شاہی ٹکڑوں کا انتخاب کیا تھا۔ سویرے بے دار ہوئی پورے گھر کی صفائی کی دانیال اور سحاب کو ہلکا پھلکا ناشتا کرایا، پھر منتخب ڈشوں کی تیاری میں جت گئی۔ ساڑھے بارہ بجے کے قریب لذیذ کھانوں کی مہک آب و ہوا میں جھومنے لگی، حسب معمول دانیال صفحات پلٹ پلٹ کر نیوز پیپرز کا مطالعہ کر رہے تھے۔

"واہ بیگم صاحبہ! خوشبو کے جادو سے تو پیٹ میں چوہے ناچنے لگے ہیں۔" مجھے خوشی ہوئی، چونکہ دانیال کی داد وصول کرنا میری زندگی کا منتہائے مقصود تھا۔ سحاب کو کان سے پکڑ کر ڈائننگ چیئر پہ بٹھایا۔ جو ہمہ وقت کھیل میں مشغول رہتا تھا۔

"چلو کھانا کھاؤ۔"

"کھانا اچھا بنا ہے۔" میں اپنے شوہر سے تعریف بٹورنا چاہ رہی تھی۔

"یس ایزوژیول اور کچھ نہیں پوچھو گی۔" لمحے بھر کے توقف میں دانیال نے بات جاری کی۔

"واٹ۔" میں نے تیوری چڑھائی۔

"میرا مطلب یہ کہ تم اچھی لگ رہی ہو، ان کپڑوں میں۔" دانیال کے انداز پر میں مسکرا اٹھی، پھر مجھے سیانوں کی وہ کہاوت یاد آئی کہ شوہر کے دل تک پہنچنے کے لیے پیٹ سے گزرنا پڑتا ہے، تب ہی تو میں دانیال کے دل کو لبھا رہی تھی۔

"کل میں نے نزہت کو بینک میں دیکھا، میں سمجھا اپنے کسی اکاؤنٹ کے سلسلے میں آئی ہو گی۔ پر یہ جان کر کافی شاکڈ ہوا کہ وہ ہمارے برانچ مینجر کی بھانجی ہے۔" دانیال نے مجھے بتایا۔

"اچھا!" میں نے کہا۔

"ہوں۔" دانیال نے نوالہ چباتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

"نزہت کو میرا نمبر تم نے دیا تھا۔"

"ن... نہیں، تو کک کیوں۔" دانیال کی شکایت پر میں ہکلا گئی۔

"یار وہ وقت بے وقت مجھے کال کر دیتی ہے، پوچھنے پر کہتی ہے۔ کچھ نہیں، بور ہو رہی تھی سوچا آپ ہی کو کال کر لوں۔" دانیال نے ہو بہو نزہت سی آواز نکالی تو بے ساختہ میری ہنسی چھوٹ گئی۔

"اوہ یو ڈونٹ مائنڈ وہ تھوڑی دل پھینک ہے، شاید آپ پر بھی دل ہار بیٹھی ہے۔" میرا لہجہ سراسر استہزائیہ تھا۔ دانیال نے مسکرا کر سر کو جنبش دی اور گفتگو وہیں تھم گئی۔

☼ ☼ ☼

اگلے روز خالہ کلثوم (ہمسائی) نے میرے در کو

کھٹکھٹایا، جن کے بارے میں نزہت نے مجھ سے ذکر کیا تھا۔

"آیئے آنٹی اندر آجایئے۔" میں بے تکلفانہ انداز میں بولی۔ وہ شکل سے کافی معمر تجربہ کار عورت معلوم ہو رہی تھیں۔

"آپ تشریف رکھیں، میں چائے لاتی ہوں۔" میری پیش کش پہ انہوں نے ہولے سے ہامی بھری، کچھ دیر میں، میں چائے کی ٹرالی دھکیلتی چائے لے آئی، چائے پینے کے دوران ازراہ مروت انہوں نے بات شروع کی۔

"بیٹا تم اس محلے میں نئی ہو، میں تمہاری عادت سے واقف نہیں، نہ جانے تم میری بات کا کیا مطلب لے لو۔"

"آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟" میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"مطلب یہ کہ تم نزہت کے بارے میں کتنا جانتی ہو، تمہیں آئے ہوئے چند ماہ ہی بیتے ہیں۔ اس کا تمہارے گھر یوں آنا جانا تمہارے ساتھ علیک سلیک، چلو سب ٹھیک ہے پر تمہارے خاوند کے ساتھ اس کی بے تحاشا بے تکلفی زیب نہیں دیتی۔" وہ کہہ رہی تھیں اور میری صورت سے اضطراب جانے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نزہت کو کالج سے جانتی ہوں، ایسا کچھ نہیں ہے۔" میں نے انہیں تسلی دی۔

"ہو سکتا ہے تم ٹھیک کہہ رہی ہو، پر کیا تم یہ جانتی ہو کہ اس کے اپنے شوہر سے کیسے تعلقات ہیں۔"

کلثوم خالہ کے اس سوال پر میں اٹک گئی۔

"جبران ایک اچھا لڑکا ہے، پر اس کی نزہت سے ایک منٹ نہیں بنتی، خدا بہتر جانے کیا مسئلہ ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ۔۔۔" وہ رک گئیں، لمحہ بھر سانس لینے کے بعد وہ بولیں۔

"میں نے ہی نہیں بہت سی محلے دار بہنوں نے بھی ایک، دو بار تمہاری دوست کو تمہارے آدمی کے ساتھ کار میں آتے جاتے دیکھا ہے، سب ہی اس صورت حال سے لطف اندوز ہو رہے تھے، پر میں نے مناسب سمجھا کہ تمہیں اطلاع دے دوں کہ اپنے گھر کو بھونچال سے بچالو جو ایسی عورتیں گھر میں برپا کرتی ہیں۔"

کلثوم خالہ تو چلی گئیں، پر میرے دماغ میں اندیشوں کا ڈھیر لگا گئیں، رات گئے تک یہ سوالات میرے دماغ کی سطح پر تیر رہے تھے۔

"تمہارے آدمی سے بے تکلفی کیسی۔"

"اس کے اپنے شوہر کے ساتھ کیسے تعلقات ہیں۔" میں دل ہی دل میں کلس رہی تھی کہ کل تک میں لوگوں کے ازدواجی معاملوں میں دلچسپیاں رکھتی تھی، تب ہی تو آج سب ہی لوگ میرے پرسنل میٹرز میں دخل اندازی کر رہے تھے۔ آج میں خلق خدا کے سامنے تماشا بن رہی تھی۔

"خیر تو ہے۔" دانیال نے پوچھا۔

"ہوں، کچھ نہیں۔" میں سوالات کے سمندر میں غوطے کھاتی ہوئی آہستگی سے بولی۔

"نزہت کار میں دانیال کے ساتھ۔۔۔" دانیال نے میرے ساتھ ذکر تک نہیں کیا، میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہیں، میرا ذہن مجھے قطعی اجازت نہیں دے رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

میری کچھ دنوں کی لاپروائی سے سحاب کی پڑھائی کا بے حد حرج ہوا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے تب ہوا جب سحاب کی ٹیچر نے مجھے اس کی تعلیمی قابلیت میں کمتری کا احساس دلایا تھا۔ چونکہ اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا میرے لیے یہ خبر شاک تھی، فی الفور خالہ کلثوم کی نصیحت قیاس بن کر ذہن میں گونج اٹھی۔

"آپ فکر نہ کریں، میں اب اس پر پوری توجہ دوں گی۔" میں نے ٹیچر کو خاصا مطمئن کیا اور وہاں سے چل دی، گھر پہنچ کر ڈرائنگ روم میں نزہت اور دانیال کو ایک ساتھ پا کر میرے حواس بے قابو ہو گئے۔ بجائے

اس کے کہ نزہت تجل ہوتی کھلکھلاتے ہوئے میری طرف لپکی۔

"او عینی یار میں تمہاری طرف ہی آئی تھی۔"

حالات میرے خلاف کیا چال چل رہے تھے، میرا ماتھا ٹھنکا، میں کشش و پنج میں مبتلا تھی۔ اس کے بعد میرا برتاؤ نزہت سے اکھڑا اکھڑا سا ہو گیا، میں نے اس سے ملنا کم کر دیا۔ محض نزہت ہی نہیں دانیال کے متعلق بھی میرے ذہن میں فتور ابھر آیا۔ طبیعت میں چڑچڑا پن چھلکنے لگا۔ نزہت ایسے معاملات میں جودت رکھتی تھی۔ غرض یہ کہ جلد بھانپ گئی۔ موقع و محل دیکھ کر میں نے دانیال سے بھی اس موضوع پر تذکرہ کیا۔ انہوں نے اپنی صفائی میں بہت کچھ کہا، بڑی دلیلیں دیں، مجھے ڈوبتے ہوئے تنکے کا سہارا ملا تو تشفی ہوئی۔

"نزہت سے اتنی بے تکلفی اچھی نہیں، آپ وعدہ کریں اب ایسی نوبت نہیں آنے دیں گے کہ ہمارے درمیان شبہ باقی رہے۔"

دانیال ہر قول و قرار پر آمادہ ہو گئے۔ اب جا کے میری جان میں جان آئی تھی، پر بلا تو ہنوز سر پر منڈلا رہی تھی، جس سے میں غافل تھی۔

کوئی قومی دن تھا، اسی بنا پہ دانیال کا آف تھا۔

"دانیال شاپنگ پہ چلیں۔" ایک عرصے بعد میں نے فرمائش کی تھی۔

"تم اکیلی چلی جاؤ، میرا موڈ نہیں ہے۔" لہجے کی تپش نے مجھے اندر تک سوختہ کر دیا۔ لمحہ بھر آہ بھری، پھر ان کے پہلو میں آبیٹھی۔

"سب کچھ ٹھیک تو ہے۔" میں صلح جو انداز میں بولی۔

"ہاں سب کچھ ٹھیک ہے، مجھے ایک دوست کی طرف کام سے جانا ہے۔" وہ "آناً" "فاناً" وہاں سے اٹھ گئے، ان کا نظر انداز کیا جانا قابل برداشت تو تھا، پر قابل فہم مطلق نہ تھا۔ چنانچہ میں سارا دن گمانوں میں الجھی رہی، سویرے کے گئے شام کو لوٹے۔

"آئیں دانیال، ہم چائے پیتے ہیں، میں آپ ہی کی منتظر تھی۔" میں نے مان جتایا۔

"میں چائے پی کے آیا ہوں۔" جواب میں درشتی سے یوں لگا جیسے دل پر کسی نے سوئی چبھو دی ہو۔ وہ چپ چاپ کمرے میں جا کے بیڈ پر لیٹ گئے، میں بھی سرعت سے بیڈ کے ایک طرف بیٹھ گئی، ان کا ہاتھ تھام لیا۔

"کیا بات ہے دانیال، کیوں خفا ہیں۔ مجھے میرا جرم تو بتادیں۔" میرا کانپتا لہجہ رحم کی التجا کر رہا تھا۔ میرے اصرار پر وہ بول اٹھے۔

"میں تمہیں سب کچھ بتاؤں، پر افسوس تم مجھے اس قابل نہیں سمجھتیں۔" ان کا بے جا گلہ میری سمجھ سے باہر تھا۔

"پر میں نے آپ سے کیا چھپایا ہے۔" ان کی بھڑاس نے میرے وجود کے ہر حصے کو سلگا دیا تھا۔

"معصوم مت بنو عینی! حالانکہ تم شادی سے پہلے کسی اور کو چاہتی تھیں، ہے نا، ایسا ہی ہے نا۔" انہوں نے میرے شانوں کو جھنجوڑا۔

"آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" میں بے جان لبوں سے بمشکل کہہ پائی تھی۔

"وہ ہی جس کے افسانے تم کالج میں چھیڑا کرتی تھیں۔ کیا وہ سب جھوٹ تھا بولو۔" جملے یکے بعد دیگرے میرے کانوں کی سطح پر گرتے رہے، لیکن آخری جملے نے مجھے حد درجہ ششدر کر دیا۔ بلاشبہ یہ نزہت نے میرے آشیانے میں چنگاری پھینکی تھی۔ ہاں نزہت نے ہی میرے خلاف دانیال کے کان بھرے تھے۔ جب اس کی دال نہیں گلی تو اس نے مجھ ہی پر وار کر دیا۔ دانیال طیش میں وہاں سے چلے گئے۔ جبکہ میرا رنگ فق ہو گیا۔ رات بھر میرے سینے پر سانپ لوٹتے رہے، میں نے اپنی بے گناہی کی کوئی دلیل نہ پیش کی، میں بھلا کیسے اس تقصیر سے سبکدوش ہو سکتی تھی، اس الزام کو کیسے بے بنیاد قرار دیتی۔

☼ ☼ ☼

ایف اے میں، میں نے فائن آرٹ کو جوائن کیا تو سابقہ دوستوں سے علیحدگی کا ملال مجھے اندر سے کاٹنے

خوشبو کا راستہ

شاہدہ ملک

لگا۔ تب ہی میرا گٹھ جوڑ نزہت اور فائزہ سے ہوا۔ فائزہ اور نزہت کی طبیعت میں بھی کافی تلون پایا جاتا تھا' اس لیے قرابت پروان چڑھنے میں زیادہ مدت نہیں لگی' فائزہ اور نزہت امیر طبقے سے وابستہ تھیں' جبکہ میری نسبت مڈل کلاس سے تھی۔ شاہانہ درجے کی لڑکیوں کی باتیں سن کر کبھی کبھار تو منہ میں پانی بھر آتا تھا۔ کالج میں کوئی تقریب یا پارٹی منعقد ہوتی تو نزہت اور فائزہ دیدہ زیب جوڑوں میں ملبوس جلوہ افروز ہوتیں۔ بالمقابل میں اتنے نایاب کپڑے اور زیور افورڈ نہیں کر سکتی تھی' سو گپ شپ کے دوران ایسے موضوعات پر میرا جوش ماند پڑ جاتا۔

کالج میں کلرڈے تھا۔ میں دس بجے کے قریب کالج میں تھی' نت نئے کپڑوں میں ملبوس لڑکیوں سمیت ہر شے پر بہار کا سا منظر تھا۔ خوش ذائقہ کھانوں کی خوشبوئیں ناک کے نتھنوں سے ہوتی ہوئی سانس کی نالی میں سفر کر رہی تھیں۔ کالج کے گراؤنڈ میں اسٹالز کی قطاریں تھیں' بریانی اور کولڈ ڈرنک کے اسٹال پر ہجوم تھا۔ نزہت کی آمد نے پورے ماحول کو دلکشی بخش دی۔ نزہت شاکنگ پنک رنگ کے امبرائیڈڈ جوڑے میں تھی۔ اس پر میچنگ نیکلس اور جوتے بھی تھے۔ فائزہ کی سج دھج کا بھی کچھ ایسا ہی عالم تھا۔ وضع قطع کے لحاظ سے تو ہم تینوں مشابہت رکھتی تھیں' کسی کو ایک دوسرے پر فوقیت حاصل نہیں تھی' بس متوسط طبقہ ہی ایک عیب تھا' جو میری شخصیت کو مدھم رکھتا۔ ان دونوں کے برعکس مجھ میں بانکپن کی کسر تھی۔

سلام دعا کے بعد ہم اسٹالز پر پہنچیں۔ بریانی اور کولڈ ڈرنک کا مزا لوٹتی رہیں۔ پھر گپوں کا سلسلہ شروع ہوا' حسب معمول فائزہ اور نزہت معمول کی باتوں میں محو ہو گئیں۔ میرے پاس ماسوائے بوریت کے کچھ نہ تھا۔ یکدم مجھے ترکیب سوجھی' میں فٹ سے بولی۔

"نزہت' فائزہ مجھے تم دونوں سے کچھ شیئر کرنا تھا۔"

"کیا؟" وہ دونوں چونکیں۔

"وہ دراصل میرا ایک کزن ہے معزم۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے جملہ مکمل کیا۔ اوہ دونوں نے یکجا صدا بلند کی۔

"پھر!" فائزہ کھوج میں پڑ گئی۔

"پھر کیا! وہ مجھ میں انٹرسٹڈ ہے۔" میرے لبوں پہ مسکان پھیل گئی۔

"اچھا یار تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔"

"یار ابھی بتا رہی ہوں نا۔" میں نے کہا' بس پھر میں تھی اور میری من گھڑت کہانیاں۔ انجانے میں' میں اول فول بکتی رہتی اور ٹوکنے کی بجائے مجھے رشک کی نظروں سے دیکھا جاتا۔ حقیقتاً" یہ بھی کالج کا رواج تھا جو لڑکی بوائے فرینڈ نہیں رکھتی تھی' اسے کمتر خیال کیا جاتا تھا' میرے اس جھوٹے اعتراض پہ فائزہ اور نزہت نے بھی اپنا بھید فاش کیا' روز بروز میں انہیں تازہ ترین حالات سے روشناس کراتی۔ "اس نے مجھے تحفہ دیا' مجھے پھول دیا۔" بے بنیاد باتوں سے میرا منہ نہ تھکتا تھا۔ حالانکہ درحقیقت معزم کا کوئی وجود بھی نہیں تھا۔ وہ صرف ایک خیالی کردار تھا جسے میں نے موضوع گفتگو بنا رکھا تھا۔ فائزہ اور نزہت ہر آئے دن بوائے فرینڈ میں ردوبدل رواں رکھتیں' اس نے میری فلاں بات نہیں مانی وہ فلاں لڑکی سے فلرٹ کر رہا تھا۔ ایسے جواز ڈھونڈ کر پرانے بوائے فرینڈ پہ نئے کو ترجیح دیتیں۔

مگر میرے لیے ایک اور معزم تخلیق کرنا محال تھا۔ اسی لیے میں نے اسی پہ اکتفا کیا' ماحصل وہ معزم اور مجھے تمغہ جرات سے نوازتیں اور ہماری موانست کو بے نظیر کا خطاب دیتیں۔

احباب میں برتری اور ان کی توجہ حاصل کرنے کے لیے میں نے اس عصیاں کا ارتکاب کیا تھا اور میں اس الزام سے مکر بھی نہیں سکتی تھی' اچھے دوستوں کی متقاضی تھی اور آج ان ہی دوستوں نے میرے آشیاں کو بکھیر دیا۔

جسے میں نے تنکے تنکے سے تعمیر کیا تھا۔ دانیال کا بگڑا لہجہ دن بہ دن میری بدکرداری کی چغلی کھا رہا تھا اور میں ان کا اعتماد حاصل کرنے کی خاطر کوشاں تھی کہ شاید۔۔۔

"چائے نہیں آئی ابھی تک۔" آفس سے واپس آتے ہی ضیا صاحب اماں کے بلاوے پر حاضری دے کر واپس آئے تو بیڈ پر گر سے گئے تھے۔

"فضا لا رہی ہے۔" نجمہ بیگم نے انہیں آئینے کے عکس میں دیکھتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"کیا کہہ رہی تھیں اماں؟" بالوں میں برش کر کے ساڑھی کی فال درست کرتے ہوئے ان کے مقابل صوفے پر آن بیٹھی تھیں۔

"فاطمہ خالہ کراچی آنا چاہ رہی تھیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے اماں کو فون کیا تھا۔"

"اف مائی گاڈ۔" نجمہ بیگم نے فوراً" ہی سر پکڑ لیا تھا۔

"یہ اماں کے رشتہ داروں کو ہمارا گھر ہی ملتا ہے رہنے کے لیے، بھرے پرے شہر میں ان کی اور کوئی جان پہچان نہیں نکلتی' اور نہیں تو اتنے ہوٹل پڑے ہیں، ہمیں کیوں خوامخواہ ڈسٹرب کرنے چل پڑتے ہیں؟ ہماری پرائیویسی کیوں خراب کرتے ہیں۔ آپ نے کہیں فرماں برداری کا ثبوت دیتے ہوئے ہامی تو نہیں بھر لی۔" نجمہ بیگم شروع ہوئیں تو ان کی گفتگو میں فل اسٹاپ نام کی کوئی چیز نہ تھی۔

"ایک تو آپ بولنا شروع کرتی ہیں تو چپ کرنا بھول جاتی ہیں، فاطمہ خالہ کی آمد کا مقصد کچھ اور ہے، وہ اپنی سنبل کا ہاتھ مانگنے کے لیے آنا چاہتی ہیں۔"

"واٹ؟ دماغ خراب ہو گیا ہے ان کا' کس کے لیے وہ سنبل کا ہاتھ مانگنا چاہتی ہیں؟" انہیں تو جیسے سو واٹ کا کرنٹ لگا تھا۔

"بھئی اپنے پوتے فرحان کے لیے اور کس کے لیے۔" ضیا صاحب عاجز ہو کر کہہ رہے تھے۔

"میری بیٹی گاؤں میں رہے گی اس فرحان کے ساتھ جس کی مہینے کی پے میری بیٹی کی پاکٹ منی کا مقابلہ نہیں کر سکتی، آپ صاف صاف منع کر دیں اماں کو۔ فاطمہ خالہ کو یہ زحمت کرنے کی قطعاً" ضرورت نہیں۔ فوراً" ہی منع کر دیں ضیا' ایسا نہ ہو کہ آپ کی خالہ بوریا بستر اٹھائے آن پہنچیں۔"

"صبح آفس جانے سے پہلے اماں کو بتا دوں گا۔" ضیا صاحب نے ہاتھ اٹھا کر گویا انہیں موضوع لپیٹنے کا اشارہ دیا تھا۔

"کہیں چائے لینے کینیا تو نہیں بھیجا آپ نے کسی کو؟" ضیا صاحب سر دباتے ہوئے معصومیت سے پوچھ رہے تھے۔

"فضا' فضا۔" نجمہ بیگم نے اونچی آواز لگائی تھی۔

"یہ لیں ماموں جان گرما گرم چائے۔" تب ہی فضا کسی جن کی طرح چائے لیے حاضر ہوئی تھی۔

"ویسے ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے، آپ اماں کو مشورہ دیں کہ وہ اپنی فضا کا رشتہ وہاں کر دیں۔" فضا کے چائے سرو کرنے اور باہر جانے تک ایک نیا خیال نجمہ بیگم کے ذہن میں پرورش پا چکا تھا۔

"بھئی اب انہوں نے سنبل کے لیے کہا ہے تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔" انہوں نے نجمہ بیگم کی بات کو رد کر دیا تھا۔

"سنبل کے لیے میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ مسز اظہر نے مجھ سے بات کی تھی' ان کا بیٹا ڈاکٹر ہے اور انگلینڈ میں ہوتا ہے' اور کرنل رضوی کی بیگم بھی اپنے دیور حمزہ کے لیے کہہ چکی ہیں' ویسے دونوں فیملیز بہت زبردست ہیں' کیا خیال ہے آپ کا؟" نجمہ بیگم سنبل کے لیے آنے والے تازہ ترین رشتوں کے بارے میں ان کی رائے لے رہی تھیں۔

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے' ایسا کرو دونوں فیملیز کو مناسب سا وقفہ رکھ کر گھر پر انوائیٹ کر لو۔ وہ لوگ سنبل بیٹی کو دیکھ لیں گے اور ہم بھی اس میل ملاقات سے کوئی فیصلہ کر لیں گے۔" ضیا صاحب نے ٹی وی آن کرتے ہوئے مشورہ دیا تھا۔

"چلیں یہ بھی ٹھیک رہے گا' ویسے آپ میری بات کو یوں ہی رد کر رہے ہیں' ایک دفعہ اماں جان کو فضا کے بارے میں کہہ کر تو دیکھیں کہ وہ خالہ فاطمہ سے بات کریں' اچھا ہے نا کہ اماں اپنی زندگی میں ہی اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کر جائیں' ورنہ لوگ کہیں گے ماموں' ممانی نے یتیم بھانجی کے ساتھ یہ کیا تو وہ

کیوں کیا؟" نجمہ بیگم چائے کا خالی کپ ٹرے میں رکھتے ہوئے ایک مرتبہ پھر سابقہ موضوع کی طرف پلٹ گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"اماں جان سنبل جس لائف اسٹائل کی عادی ہے وہ اسے گاؤں میں میسر نہیں آ سکے گا' اس لیے آپ اس بارے میں تو بالکل نہ سوچیں' سنبل کی ماں بھی اس بات کے بالکل خلاف ہے۔" ضیا صاحب نے آفس جانے سے پہلے اماں جان کو تمام تر صورت حال سے آگاہ کیا تھا۔

"چلو بھئی تم دونوں سنبل کے ماں' باپ ہو' اس کے بارے میں اچھا ہی سوچو گے۔" اماں جان نے فراخدلی سے ان کا فیصلہ تسلیم کر لیا تھا۔

"البتہ ایک بات ہے' اگر آپ کو بری نہ لگے تو؟" ضیا صاحب نے جھجک کر پوچھا تھا۔

"کہو میاں ایسی کیا بات ہے جو تم اٹک رہے ہو۔" اماں جان پاندان کھولتے ہوئے گویا ہوئیں۔

"اگر آپ فضا بیٹی کے بارے میں خالہ جان کو کہیں... دیکھیں نا اماں فضا اور سنبل دونوں کی زندگی آپ کے سامنے ہے۔ سنبل بہت ناز و نعم میں پلی ہے' جبکہ فضا نے ہر طرح کے حالات کو برتا ہے' پھر اس کا پہننے اوڑھنے' اٹھنے بیٹھنے کا طریقہ' وہ گاؤں میں ایڈجسٹ کر جائے گی۔"

"بات تو تمہاری دل کو لگتی ہے۔" اماں جان کا انداز پرسوچ تھا۔

"چلو ٹھیک ہے فاطمہ کا فون آئے گا تو میں یہ ذکر کر ڈالوں گی اور میرا نہیں خیال کہ اسے کوئی اعتراض ہو گا اور اگر وہ فضا کے لیے آنا چاہے تو میں اسے ایک مہینے بعد کا کہہ دوں گی۔ جیسا کہ تم بتا رہے ہو وہ رضوی اور اظہر صاحب کی دعوت کرنی ہے تو تب تک ہم سنبل کے بر دکھاوے کے معاملات سے بھی فارغ ہو جائیں گے۔"

"جیسے آپ مناسب سمجھیں۔"

☼ ☼ ☼

فضا' ضیا صاحب کی مرحومہ بہن فخر النساء کی بیٹی تھی۔ فخر النساء نے اپنے کسی یونیورسٹی فیلو سے والدین کی مخالفت کے باوجود شادی کی تھی۔ لوئر مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والا جمیل احمد بڑے اونچے آورش اور عزائم رکھتا تھا۔ مگر وہ سب تو صرف یونیورسٹی کی حد تک تھا۔ عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد فخر النساء کو بھی ان مسائل کا سامنا کرنا پڑا جو اپر کلاس سے مڈل کلاس کی طرف سفر کرنے والی کسی بھی لڑکی کا نصیب ہو سکتے ہیں اور صرف اس پر بس نہیں تھا۔ جمیل احمد کے گھر والوں نے اسے جن خوابوں کی تکمیل کے لیے اپنایا تھا وہ تو فخر النساء کے گھر سے قدم نکالتے ہی چکنا چور ہو گئے تھے۔ پھر کیوں نہ وہ اس سے اپنے خوابوں کے ٹوٹنے کا خراج وصول کرتے۔ مگر شادی کے تین سال بعد فضا کی پیدائش پر اس کی دکھوں بھری زندگی کا باب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا یوں فضا نے سوتیلے رشتوں کا ذائقہ چکھتے ہوئے اپنی زندگی کے سترہ سال گزارے تھے۔

باپ کے مرنے کے بعد سوتیلی ماں نے اس کی شادی اپنے ڈھلتی عمر کے بھائی کے ساتھ طے کر دی تو باپ کی وصیت کے مطابق اسے اپنے ننھیال سے رابطے کا خیال آیا تھا۔ اور پھر نانی نے اس کے حالات جان کر اسے کلیجے سے لگا لیا۔ اس پر اپنی پچھلی زندگی کی چھاپ اس قدر گہری تھی کہ اس ماحول میں رہتے ہوئے وہ یہاں کے مکینوں سے الگ تھلگ نظر آتی تھی۔ باپ کی توجہ کے باعث اس نے جیسے تیسے انٹر کیا تھا۔ پھر پڑھائی کا سلسلہ منقطع ہو گیا؟ اماں کی شفقت و توجہ نے اسے ایک مرتبہ پھر اس سلسلے کو جوڑنے پر راغب کیا تھا۔ سو وہ گریجویشن کی طالبہ تھی۔ پڑھائی سے جو وقت بچتا وہ کچن میں گھس کر نت نئے تجربات کی نذر ہو جاتا تھا۔ باپ کے خوب صورت نقوش اور ماں سے گوری رنگت ورثے میں لینے والی فضا بڑے سے دوپٹے کو اپنے اردگرد پھیلائے رکھتی تو

بڑی عام سی دکھتی۔ یہاں کے ماحول سے قطعی میل نہ کھاتی۔ مگر بہرحال وہ یہاں بہت خوش تھی، مطمئن اور پرسکون۔

"سوکھا سڑا لمبا بانس یا پھر کوئی بگلا معلوم ہوتا ہے یہ حمزہ۔ کرنل رضوی کا بھائی تو بالکل نہیں لگ رہا تھا۔" مہمانوں کے جانے کے بعد تبصرے کا عمل شروع ہوا تھا۔

"نہیں بھئی مجھے تو اچھا خاصا سوبر لگا' آپ ایسے کیوں کہہ رہی ہیں۔" ضیا صاحب حیران ہو کر پوچھ رہے تھے۔

"توبہ ہے بابا' اس کے منہ پر اگی گھاس پھوس دیکھ کر وہ آپ کو سوبر لگنے لگا ہوگا ہے نا؟" سنبل نے اپنے منہ پھٹ انداز میں ہنس کر کہا تھا۔

"نعوذ باللہ یوں نہیں کہتے بیٹا داڑھی سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔" ضیا صاحب نے تڑپ کر بیٹی کو سرزنش کی تھی۔

"مجھے تو کوئی پہاڑی بکرا لگ رہا تھا۔" نجمہ بیگم کے کہنے پر ماں' بیٹی کا مشترکہ قہقہہ گونج اٹھا تھا۔

"رضوی صاحب کی والدہ کی سنو' کہہ رہی تھیں میرا بیٹا بہت نیک' نماز' روزے کا پابند ہے' میرا تو ان سے یہ کہنے کو دل چاہا کہ بھئی ہمیں اپنی بیٹی کے لیے شوہر چاہیے' کسی مسجد کے لیے پیش امام نہیں۔" نجمہ بیگم نے کہا تو ماحول پھر ماں' بیٹی کے قہقہوں سے زعفران زار بن گیا تھا۔

"اچھا بھئی اب سونے کا پروگرام نہیں ہے کیا؟ مجھے تو سخت نیند آرہی ہے۔" ضیا صاحب جمائی کو روک کر محفل برخاست کرتے ہوئے بولے تھے۔ یہ تو طے تھا کہ رضوی صاحب کی فیملی کے اعزاز میں کی جانے والی یہ دعوت اپنے مقصد کے اعتبار سے بالکل ناکام رہی تھی۔

✵ ✵ ✵

بیگم اظہر فیملی کو ڈنر پر انوائیٹ کیا گیا تھا۔ نجمہ بیگم پورے گھر میں پھرکی بنی ہوئی تھیں۔ وہ کچن میں مصروف فضا اور ملازمہ کو ہدایات دے رہی تھیں۔ جب آگے پیچھے گیٹ سے دو گاڑیاں اندر داخل ہوئی تھیں۔ مہمان یقیناً" آچکے تھے۔ وہ فوراً" سنبل کے کمرے کی طرف بڑھیں جو ابھی ابھی پارلر سے تیار ہو کر آئی تھی۔ اس کی تیاری پر ایک مطمئن سی نظر ڈال کہ وہ ڈرائنگ روم میں پہنچیں' جہاں ضیا صاحب مہمانوں سے بات چیت کرتے ہوئے انہیں اندر لا رہے تھے۔ بیگم اظہران کی دونوں بیٹیاں' داماد اور ڈاکٹر یاور خود بھی ساتھ آیا تھا۔ یاور کو دیکھ کر نجمہ بیگم کے دل کی کلی کھل گئی تھی۔ وہ دیکھنے میں بہت خوش شکل اور مہذب نظر آرہا تھا۔ پھر انگلینڈ میں ویل سیٹلڈ' انہیں سنبل کے لیے اور کیا چاہیے تھا۔

"السلام علیکم۔" مہمانوں کی آمد کے تھوڑی دیر بعد فضا چائے کی ٹرالی گھسیٹتی اندر آئی تھی۔

"وعلیکم السلام۔" سب نے باجماعت جواب دیا تھا۔

"یہ ہماری مرحومہ نند کی بیٹی ہے فضا' یہیں ہمارے ساتھ رہتی ہے۔" نجمہ بیگم نے مسکرا کر اس کا تعارف کرایا تھا۔

"ماشاء اللہ بیٹی پڑھتی ہیں آپ؟" بیگم اظہر اس سے رسمی سے سوال و جواب کرنے لگیں۔

"بہن' سنبل بیٹا کو تو بلایئے۔" تھوڑی ہی دیر کے بعد انہوں نے نجمہ بیگم سے کہا تھا۔

"فضا بیٹی جاؤ بہن کو بلا لاؤ۔" اماں جان نے فضا سے کہا تھا۔

بلیک کلر کی سلیولیس شارٹ شرٹ اور ٹراؤزر کے ساتھ اونچی ہیل میں سنبل کا متناسب قد کچھ اور دراز لگ رہا تھا۔ بلیک یوں بھی اس پر بہت جچتا تھا اور آج تو بیوٹیشن کے ماہر ہاتھوں نے اسے اپسرا کا کوئی مجسمہ بنا ڈالا تھا۔ ماں اور دادی کے درمیان صوفے پر آن بیٹھی تو مقابل بیٹھے ڈاکٹر یاور کی نظریں بغور ایک لمحے کے لیے اٹھیں اور پھر جھک گئی تھیں۔

دو روز بعد ہی اماں جان کے پاس ڈاکٹر یاور کی والدہ کا فون آگیا۔ انہوں نے فضا کے رشتے کے لیے بات کی تھی۔

"سچی بات یہ ہے کہ انگلینڈ میں بھی ہمارے سرکل میں کئی لڑکیاں تھیں۔ مگر یاور یہاں کے ماحول میں رچی بسی کسی لڑکی سے شادی کا خواہاں ہے۔ سنبل بھی اپنی ہی بچی ہے' رب اس کا نصیب بھی اچھا کرے گا۔" بیگم اظہر کسی قدر شرمندگی سے کہہ رہی تھیں۔ اماں جان کو اگرچہ یہ صورت حال کچھ زیادہ پسند نہیں آئی تھی۔ مگر تقدیر نے فضا کے اچھے نصیب کے لیے جو دست سوال دراز کیا تھا اسے رد کرنا بھی ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ نجمہ بیگم کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ بھلا چادر میں لپٹی بوبو کا ڈاکٹر یاور نے کیا کرنا ہے۔ اسے زندگی کے سفر میں کسی اچھے ساتھی کی ضرورت تھی۔ یقیناً" کوئی خاکہ اس نے اپنے ذہن میں پہلے سے ہی ترتیب دے رکھا تھا۔ تب ہی تو دو دن میں ہی فیصلہ کرلیا۔

حمزہ کے پروپوزل اور فضا کی قسمت کا اگرچہ آپس میں قطعی کوئی تعلق نہیں تھا۔ مگر ڈاکٹر یاور کا فضا کے لیے آنے والا پروپوزل نجمہ بیگم کو وہ الفاظ یاد دلا گیا تھا جو انہوں نے حمزہ کو ریجیکٹ کرتے ہوئے کہے تھے۔ آج وہی الفاظ ان کا منہ چڑا رہے تھے۔ سو نجمہ بیگم نے بخوبی جان لیا تھا کہ شریعت الٰہی اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق زندگی گزارنے والے لوگ دراصل خوشبو کے راستے پر سفر کرتے ہیں۔ خوشبو کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ لہٰذا ایسے لوگ ہر ماحول میں احسن طریقے سے سروائیو کرجاتے ہیں۔

اگلے ہفتے خالہ فاطمہ کراچی آرہی تھیں۔ اور نجمہ بیگم کے لیے ضروری ہوگیا تھا کہ وہ سنبل کی ڈھلتی عمر کو مدنظر رکھ کر ان کے پیشگی استقبال کی کچھ خصوصی تیاریاں کرلیں۔

✵ ✵

آصفہ عنبرین قاضی

برگِ زرد

اسٹڈی روم کی فضا خنکی کی وجہ سے معمول سے زیادہ ٹھنڈی ہو چکی تھی' باہر برفیلی ہوائیں چل رہی تھیں اور وہ جانے کب سے ہوش و خرد سے بے گانہ رائٹنگ ٹیبل پر جھکا ہوا تھا۔

رات دوسرے پہر میں داخل ہو رہی تھی اور اسے سونے سے زیادہ کام مکمل کرنے کی جلدی تھی' مگر اب ہڈیوں کو چیرتی ہوئی سردی اس کے اعصاب منجمد کرنے لگی تھی۔ رائٹنگ پیڈ پر تیزی سے چلتا ہوا قلم اب اپنی روانی کھو رہا تھا۔ اس کی انگلیاں ٹھنڈ کی وجہ سے سن ہو رہی تھیں۔ اس نے پین بند کر کے ٹیبل پر رکھ دیا اور دونوں ہاتھ آپس میں رگڑ کر جیکٹ کی

مکمل ناول

جیبوں میں ڈال لیے وہ کچھ دیر یوں ہی بے حس و حرکت بیٹھا رہا' پھر اٹھ کھڑا ہوا سارے منتشر اوراق کو اکٹھا کر کے فائل میں رکھا اور اسٹڈی روم سے باہر نکل آیا۔ کوریڈور میں زیرو پاور بلب کی مدھم دودھیا روشنی میں ہر چیز دھندلائی ہوئی تھی۔ وہ اپنے کمرے کی طرف جانے لگا تو آغا جان کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے رک گیا۔ ان کے کمرے میں تیز روشنی تھی جو روشن دان کی درز سے ایک لکیر کی صورت میں باہر کوریڈور میں آ رہی تھی' جس کا مطلب تھا وہ ابھی تک سوئے نہیں تھے' اس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر وقت دیکھا' رات کے سوا دو بج رہے تھے' اس نے دروازے کو ذرا سا کھول کر اندر جھانکا' آغا جان اپنے بیڈ پر نیم دراز مطالعے میں مصروف تھے اور ہاتھ میں اپنی پسندیدہ کتاب "ارتھ آف ڈار" تھام رکھی تھی۔

ایک ریٹائرڈ کرنل کے طور پر وہ عسکری مہمات اور موضوعات پر لکھی گئی کتابیں اور مضامین بہت شوق سے پڑھتے تھے اور ریٹائرمنٹ کا بور ترین دور گزارنے کے لیے مطالعہ ہی ان کی مصروفیت کا واحد ذریعہ تھا۔ وہ انہیں کتاب پڑھنے میں محو دیکھ کر واپس پلٹنا ہی چاہتا تھا کہ ان کی نظر پڑ گئی۔

"اندر آ جاؤ برخوردار۔" وہ چشمے کو ناک کی پھننگ سے ذرا نیچے کرتے ہوئے بہزاد سے مخاطب ہوئے تو وہ اندر چلا آیا۔

"آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں۔" سوال اگرچہ نہایت فضول سا تھا' مگر اسے پوچھنا پڑا کہ اس کے علاوہ اسے کوئی اور بات سوجھی نہیں تھی۔

"بس مطالعے میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ احساس ہی نہیں ہوا وقت گزرنے کا۔" وہ اپنا چشمہ اتار کر کتاب پر رکھتے ہوئے اپنے مخصوص نرم لہجے میں بولے۔

"وہ تو ٹھیک ہے آغا جان' مگر رات کافی ہو گئی ہے' آپ کو نیند کی بھی تو ضرورت ہے۔" وہ چلتا ہوا ان کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

"مجھے چھوڑو' یہ بتاؤ تم اتنی رات گئے کمروں میں تانک جھانک کیوں کر رہے ہو؟" وہ معنی خیزی سے بہزاد کی طرف دیکھتے ہوئے بولے تو وہ مسکرا کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔

"میں بھی پڑھ رہا تھا' ابھی اسٹڈی روم سے باہر نکلا تو ادھر چلا آیا' حالانکہ اٹھا تو میں سونے کی غرض سے تھا۔" وہ وضاحت پیش کرنے لگا۔

"تمہارے انگزامز تو شروع نہیں ہو گئے؟" انھوں

نے استفہامیہ انداز میں بہزاد کو دیکھا۔

"بس کچھ دن تک شروع ہو جائیں گے' آخری سمسٹر کے صرف چند دن ہی رہ گئے ہیں۔"

"شانزہ سے ملاقات ہوتی رہتی ہے' اس کا بھی تو فائنل سمسٹر چل رہا ہے' تیاری کیسی ہے اس کی؟" انہیں اچانک اپنی لاڈلی نواسی کی یاد آگئی جو بہزاد کے ساتھ ہی یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔

"کل ملی تھی مجھے' مگر یہ نہیں پوچھا کہ اس کی تیاری کیسی ہے؟" وہ کھسیانہ سا ہو کر بولا۔

"اسے کہنا اس ویک اینڈ پہ ادھر آجائے' کافی دن ہو گئے ہیں اس سے ملاقات ہی نہیں ہوئی' اس نے چکر بھی تو نہیں لگایا۔" وہ شکوہ کناں تھے' حالانکہ آٹھ دس دن پہلے ہی وہ اپنی امی کے ساتھ آئی تھی' مگر آغا جان کو اس کی چند دن کی غیر حاضری بھی طویل لگتی تھی اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ وہ اکثر یونیورسٹی یا شہر کے بک فیر سے ان کے لیے بہت عمدہ کتابیں اور آرٹیکلز لے کر آتی تھی کتابوں کے معاملے میں اس کا انتخاب آغا جان کو بہت پسند آتا تھا' اس لیے آغا جان کو شانزہ سے زیادہ اس کی لائی گئی کتابوں کا انتظار رہتا۔

"آپ کا پیغام تو میں اس تک پہنچا دوں گا' مگر آپ خود کیوں نہیں چلتے ان کے گھر' پھوپھو بھی خوش ہو جائیں گی۔" وہ ان کے ہاتھ پر محبت سے اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولا' وہ جانتا تھا کہ کافی عرصے سے انہوں نے کہیں آنا جانا ترک کر رکھا تھا' اسی بہانے وہ ان کو گھر سے باہر لے جانا چاہتا تھا۔

"برخوردار اب جی ہی نہیں چاہتا باہر نکلنے کو' شاید عمر ہی ایسی آگئی ہے۔" وہ سستی سے گویا ہوئے۔

"ارے آغا جان آپ تو فوج میں اتنا عرصہ رہے ہیں' آپ کو تو بہت ایکٹیو ہونا چاہیے۔" وہ ان کا ہاتھ دباتے ہوئے بولا۔

"ہاں ہونا تو چاہیے' مگر پتا نہیں کیوں اب دل نہیں کرتا کمرے سے بھی نکلنے کو' شاید اس لیے کہ اب ہر قدم پر مصنوعی سہارا درکار ہوتا ہے۔" انہوں نے یاسیت سے بیڈ کے دائیں طرف رکھی وہیل چیئر کی طرف دیکھا۔

آرمی کی متحرک اور مضبوط زندگی گزارنے کے بعد انہیں اپنی اچانک معذوری کا بہت قلق تھا۔ ٹانگوں پر فالج کے حملے نے انہیں تقریباً" چلنے پھرنے سے مفلوج کر دیا تھا۔ اگرچہ انہوں نے اس بیماری کو دل سے نہیں لگایا تھا' مگر رائیگانی کا ایک ہلکا سا احساس انہیں ہر وقت گھیرے رہتا تھا۔ ایسی وجہ سے انہوں نے اپنی سوشل لائف کو کافی محدود کر دیا تھا' حالانکہ ان کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا' مگر اس معذوری کی وجہ سے وہ حساس اور تنہائی پسند ہو گئے تھے۔ لوگ اب بھی ان سے ملنا اور گفتگو کرنا پسند کرتے تھے۔ مگر انہوں نے اپنا حلقہ بہت محدود اور مختصر کر لیا تھا۔

"میں کل لے چلوں گا آپ کو' اور کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔" وہ حتمی لہجے میں بولا تو آغا جان مسکرا دیے۔

"ٹھیک ہے جوان' چلوں گا۔" وہ ہتھیار پھینکتے ہوئے بولے۔

"تھینک یو۔" وہ ممنونیت سے کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"تیمور آپ کی میڈیسن لے آیا تھا؟" اسے یاد آیا۔

"لے آیا تھا۔" آغا جان نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔

"دوائی آپ نے باقاعدگی سے لینی ہے۔" وہ ان کے جسم پر کمبل اوڑھاتے ہوئے بولا۔

"اب آپ سونے کی کوشش کیجیے۔" اس نے ان کے پہلو میں دھری کتاب اٹھا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی۔

"یہ سامنے والی کھڑکی کھول دینا۔" وہ دروازے کی طرف پلٹا ہی تھا کہ انہوں نے پیچھے سے آواز دی' اس نے سامنے لگے پردے ہٹا کر ذرا سی کھڑکی کھول دی' تاکہ تازہ ہوا اندر آسکے۔

"اور آپ فکر مت کیجیے' میں شانزہ کے اچھی طرح کان کھینچ کر آؤں گا' کل وہ سر کے بل چل کر آئے گی یہاں۔" وہ جاتے جاتے شرارت سے بولا تو آغا جان مسکرا دیے۔

ان کے کمرے سے نکلتے ہی اس کا سامنا تعبیر سے ہو گیا' وہ کچن میں کسی کام سے آئی تھی' وہ پانی لینے کے لیے اس طرف آیا تو کچن کے دروازے پر دونوں کا سامنا ہو گیا' وہ اس مڈبھیڑ کے لیے تیار نہیں تھا' وہ بہزاد کے تایا کی بڑی بیٹی تھی اور بیماری کی حد تک حاسد اور خود پسند طبیعت کی مالک تھی' مگر بہزاد کے معاملے میں وہ ساری انا پس پشت ڈال دیتی' وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھی یا بہزاد کے گریز کا امتحان لیتی تھی' وہ کبھی نہ سمجھ سکا جو بھی تھا وہ اکثر تعبیر سے کترا کر گزر جانے میں ہی عافیت سمجھتا تھا۔

"تم ابھی تک جاگ رہے ہو؟" وہ گلاس ہاتھوں میں تھام کر اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"ہاں... وہ میں آغا جان کے پاس بیٹھا تھا۔" اسے خوامخواہ وضاحت دینی پڑی' حالانکہ وہ اسے بتانے کا مجاز نہیں تھا کہ وہ کہاں تھا اور کیا کر رہا تھا۔

"کیوں خیریت؟" وہ بھنویں اچکاتے ہوئے تشویش سے گویا ہوئی۔

"ہاں خیریت ہے' بس یوں ہی گپ شپ کے لیے بیٹھا تھا۔" وہ اتنا کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھنے ہی لگا کہ تعبیر ایک بار پھر اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔

"چائے بنا دوں تمہارے لیے؟" وہ اس کا راستہ روکے کھڑی تھی اور بہزاد کو ایسی صورت حال سے ہمیشہ کوفت ہوتی تھی۔

"نہیں مجھے چائے کی طلب نہیں ہے' تم سو جاؤ جاکر۔" اس نے سہولت سے انکار کر دیا۔

"تم میری فکر مت کرو بہزاد۔" وہ پتا نہیں انجان تھی یا جان بوجھ کر معصوم بن رہی تھی' وہ بہزاد کے انکار کا کچھ اور مطلب نکال بیٹھی' کوریڈور میں لگا وال کلاک رات کے تین بجا رہا تھا' گھر کے تمام مکین اگرچہ گہری نیند میں تھے' مگر کوئی بھی اس وقت جاگ گیا تو ان دونوں کو کوریڈور میں رات کے اس پہر کھڑے دیکھ کر حیران ضرور ہوگا اور افسانہ بننے میں دیر کتنی لگتی ہے' وہ رائی کا پہاڑ بنانے کا موقع کسی کو نہیں دینا چاہتا تھا' وہ کسی قسم کی غلط فہمی پیدا کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر تعبیر شاید ان باتوں کو اہمیت نہیں دیتی تھی۔ وہ بہزاد کو شیشے میں اتارنے کے لیے ہر حربہ آزما رہی تھی اور اس کے لیے وہ کبھی کبھی اپنی عزت نفس کو بھی خاطر میں نہ لاتی' وہ اس بات پر اعتقاد رکھتی تھی کہ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہے اور اگر ظاہری انا کو پاؤں تلے روند کر اسے بہزاد حاصل ہو جائے تو یہ سودا گھاٹے کا ہرگز نہیں ہوگا۔

"تعبیر مجھے نیند آرہی ہے' پلیز آگے سے ہٹ جاؤ۔" اس نے قدرے بےزاری سے کہا' نیند واقعی اس کی پتلیوں میں چبھ رہی تھی' مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی' اس کی آنکھوں میں بہزاد کے لیے جذبے ڈھکے چھپے تھے' اس نے جب دیکھا کہ اس کی بات کا تعبیر پر کوئی اثر نہیں ہوا تو وہ اسے ہاتھ سے ایک طرف ہٹا کر دوسری طرف سے نکل گیا اور اپنے کمرے میں گھس کر دروازہ بند کر دیا۔ وہ غصے سے لب کاٹتے ہوئے بند دروازے کو دیکھنے لگی۔

"تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو بہزاد! میں نے تمہاری اس نام نہاد شرافت کا لبادہ سرِعام نہ چاک کیا تو میرا نام بھی تعبیر فاروق نہیں، جو پینگیں تم شانزہ سے بڑھا رہے ہو میں اس سے بھی اچھی طرح واقف ہوں۔" وہ خالی گلاس شیلف پر پٹختے ہوئے غصے سے سوچنے لگی۔

☼ ☼ ☼

یونیورسٹی کے اردو ڈیپارٹمنٹ میں معمول سے زیادہ چہل پہل تھی، جوں جوں آخری سمسٹر قریب آرہا تھا کلاسز میں اسٹوڈنٹس کی تعداد حوصلہ افزا ہوتی جارہی تھی۔ شانزہ نے ماسٹرز کے لیے اردو ادب کا انتخاب کیا تھا، جبکہ بہزاد اکنامکس میں ماسٹرز کررہا تھا۔ وہ سر عبدالمبین کا اقبالیات پر لیکچر بہت توجہ سے سن رہی تھی۔

"علامہ اقبال اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ ایک مردِ مومن کی طاقت و قوت کسی معجزے سے کم نہیں، اللہ تعالیٰ کی مشیت اور قوت قاہرہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی ہے اور اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو نہ تو پہاڑ روک سکتا ہے، نہ کوئی دریا اس کی راہ میں حائل ہوسکتا ہے۔" سر عبدالمبین اپنے دلکش انداز میں طلبا و طالبات کو اقبال کے مردِ مومن کی تشریح و توضیح پیش کررہے تھے۔

"سر کیا آج کے دور میں اقبال کے مردِ مومن کو تلاش کیا جاسکتا ہے؟" شانزہ کے دائیں طرف بیٹھے منصور حسین نے سوال اٹھایا۔

"تلاش کرنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے، مگر آج کے دور میں ایسا انسان تلاش کرنا جو اقبال کے مردِ مومن کی سچی تصویر ہو، بہت مشکل ہے، جب غیر اسلامی اور باطل قوتیں غالب ہوجاتی ہیں تو ایمان کی چنگاری بجھ جاتی ہے اور اس مادیت پرستی اور نفسا نفسی میں مردِ مومن کے سارے ذاتی خواص ناپید ہوجاتے ہیں۔" وہ روسٹرم پر دونوں کہنیاں ٹکائے اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے لہجے میں بول رہے تھے۔

"سر کیا ماضی میں کوئی ایسا انسان گزرا ہے جو اقبال کے مردِ مومن کی تعریف پر پورا اترا ہوا؟" شانزہ نے نکتہ اٹھایا۔

"بالکل! اگر آپ مسلم تاریخ پر نظر دوڑائیں تو کئی نام آپ کو تاریخ کے دھارے اور قوم کی تقدیر بدلتے نظر آئیں گے۔ سعد بن ابی وقاص، خالد بن ولید، صلاح الدین ایوبی، طارق بن زیاد، محمد بن قاسم اور ایسے کئی بہادر انسان اور ان کے زندہ جاوید کارنامے اقبال کے مردِ مومن کی سچی اور عملی تصویریں ہیں۔"

موضوع اتنا دلچسپ تھا کہ وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا شانزہ کا ارتکاز اس وقت ٹوٹا جب پیریڈ ختم ہوگیا اور سر عبدالمبین بات سمیٹ کر باہر چلے گئے۔ وہ بھی کتابیں اور نوٹس سنبھالے کلاس روم سے باہر آگئی، سامنے ہی اسے بہزاد نظر آگیا جو غالباً اسی کے انتظار میں کھڑا تھا۔ وہ سیدھا اسی کے پاس چلی آئی۔

"شکر ہے آپ کا دیدار نصیب ہوا، پچھلے آدھے گھنٹے سے یہاں کھڑا ہوں۔" وہ گھاس پر بیٹھتے ہوئے شکوہ کرنے لگا۔

"کیوں خیریت؟" وہ مسکراتے ہوئے کتابیں ایک طرف رکھ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"بالکل بھی خیریت نہیں ہے، آغا جان تمہاری غیر حاضری کی وجہ سے سخت غصے میں ہیں، بلکہ تشویش میں مبتلا ہیں۔" وہ چہرے پر حد درجہ سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بولا۔

"لیکن میں تو باقاعدگی سے یونیورسٹی آرہی ہوں، انہیں کس نے بتایا کہ میں غیر حاضر ہوں۔" وہ حیرانی سے گویا ہوئی تو بہزاد ہنس پڑا۔

"بے وقوف لڑکی وہ یونیورسٹی کی نہیں، گھر کی بات کررہے ہیں، اتنے دنوں سے تم نے چکر ہی نہیں لگایا اور وہ بہت مس کررہے ہیں تمہیں۔" اسے وضاحت کرنا پڑی۔

"صرف آغا جان یا کوئی اور بھی؟" اس نے کھوجنے والے انداز میں بہزاد کی طرف دیکھا تو وہ کندھے اچکا کر بولا۔

"بخدا اس وقت تو صرف وہ ہی تشویش میں مبتلا ہیں، تم خوامخواہ مجھ معصوم پر شک مت کرو۔" وہ کچھ ایسے کنی کترا کر نکلا کہ شانزہ ہنس پڑی۔

"میں تمہاری بات نہیں کررہی تھی، یہ چور کی داڑھی میں تنکے والی بات ہوگئی، اس گھر میں اور بھی تو کئی لوگ ہیں میرا دھیان تمہاری طرف تھوڑی تھا۔" وہ جان بوجھ کر اسے تنگ کررہی تھی وہ خجل سا ہو کر ماتھا کھجانے لگا۔

"اچھا تم یہ بتاؤ آج شام کو آرہی ہو نا۔" وہ سوالیہ انداز میں شانزہ کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہوں... دیکھوں گی۔" وہ لاپروائی سے بالوں کو پیچھے کی طرف سمیٹتے ہوئے بولی تو وہ اس کی بے نیازی پر جل سا گیا۔

"مس شانزہ حسن صاحبہ اگر آپ اپنے قیمتی وقت سے چند لمحے نکال کر ہمارے غریب خانہ پر قدم رنجہ فرما دیں تو ہم تا عمر آپ کے ممنون رہیں گے، شاید آپ کے لیے ہی کسی شاعر نے جسارت کی ہے کہ۔

کہاں یہ مرتبہ حاصل کہ تکلیف شراکت دوں
مگر مہمان فقیروں کے ہوئے ہیں بادشاہ اکثر

وہ دونوں ہاتھ باندھ کر ادب سے اس کے سامنے جھکنے کی اداکاری کرنے لگا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

"بس... بس جناب آجاؤں گی، لیکن آج نہیں کل۔" وہ دھوپ سے بچنے کے لیے ہاتھوں کا چھجا بنا کر بولی۔

"تمہیں پتا ہے تم ہفتے میں ایک چکر نہ لگاؤ تو آغا جان اداس ہوجاتے ہیں، ویسے میں پوچھ سکتا ہوں تم اتنے دنوں سے کہاں تھیں؟" وہ اب سنجیدہ تھا۔

"سوری بہزاد بس وقت ہی نہیں مل رہا تھا، حالانکہ میرا بھی دل چاہ رہا تھا آغا جان سے ملنے کو، مگر ان دنوں مصروفیت کچھ زیادہ ہی ہوگئی تھی۔"

"کیسی مصروفیت؟" وہ دونوں ہاتھ پیچھے گھاس پر ٹکا کر ریلیکس ہو کر بیٹھ گیا۔

"دراصل چھوٹی فیصل بھی کالج ٹور پر ایبٹ آباد گیا ہوا ہے اور فائزہ نے چند دن سے اکیڈمی جوائن کر رکھی

ہے' ایسے میں امی کو اکیلا چھوڑ کر کیسے آسکتی تھی اور ان دنوں ان کی طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں تھی' بس اسی بھاگ دوڑ میں آغا جان سے بھی بات نہ ہو سکی۔" اس نے سامنے دھری کتاب کے ٹائٹل پر انگلی پھیرتے ہوئے بہزاد کو تفصیل سے آگاہ کیا۔

"کیا ہوا پھوپھو کو؟" اس کے چہرے پر تفکر کی لکیریں نمایاں ہوئیں۔

"اب تو ٹھیک ہیں' بس وہ ہی استھما کا اٹیک ہوا تھا' پولن الرجی کی وجہ سے اس موسم میں ان کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب ہو گئی تھی' لیکن اب بہتر ہیں ڈونٹ وری۔" وہ بہزاد کو دیکھ کر آرام سے بولی۔

"ایسا کرو پھر تم نہ آؤ میں آغا جان کو لے کر آؤں گا' ان سے کل بات کی ہے میں نے۔" بہزاد نے اس کی مشکل حل کر دی۔

"اچھا واقعی؟" وہ ایک دم خوش ہو گئی۔

"تعبیر اور صبا کو بھی ساتھ لے آنا' سب مل کر آئیں گے تو خوب رونق رہے گی۔"

"نہ بابا! تم خود ہی آکر اس سے مل لینا' میرے سر پر یہ مصیبت سوار مت کرو۔" وہ بے زاری سے بولا۔

"کیوں تم اس سے اتنا چڑتے کیوں ہو؟" وہ سمجھ گئی تھی کہ بہزاد' تعبیر کے ذکر پر اکثر ایسے ہی کوفت میں مبتلا ہو جاتا تھا' مگر وجہ اسے معلوم نہ تھی۔

"وہ شاید ان احسانات کا بدلہ مجھ سے لینا چاہ رہی ہے جو اس کے والدین نے مجھ پر کیے ہیں؟" وہ گھاس کو مٹھی میں بھرتے ہوئے بولا۔

"کون سے احسانات؟" شانزہ نے نا سمجھی کے عالم میں اسے دیکھا۔

"میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم اتنی بے خبر ہو' کیا ان کا یہ احسان کم ہے کہ چھ سال کے بچے کو انہوں نے ماں باپ کی وفات کے بعد پال پوس کر بڑا کیا۔ میں اگر چاہوں بھی تو اس احسان کے بوجھ تلے سے نہیں نکل سکتا۔" وہ گہری سانس لے کر بولا' اسے اپنے امی ابو کی یاد ہمیشہ ہی ایسے اداس کر دیتی تھی جو ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں اس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے تھے۔

"یہ ان کا احسان نہیں فرض تھا اور اس میں ماموں جان سے زیادہ آغا جان کا ہاتھ ہے' انہوں نے اپنی عمر کا ایک حصہ تمہاری دیکھ بھال اور پرورش میں گزارا ہے۔ تمہارا حق بھی اس گھر پر اتنا ہے جتنا فاروق ماموں کے بچوں کا' پھر تم ہمیشہ اسے احسان کا نام کیوں دیتے ہو؟" وہ اسے رسان سے سمجھاتے ہوئے بولی۔

"میں کسی اور کی نہیں صرف تعبیر کی بات کر رہا ہوں' وہ مجھ سے بہت سی توقعات وابستہ کیے بیٹھی ہے۔"

"تم محبت کو توقعات کا نام دے رہے ہو؟" وہ بہزاد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

"محبت اور تعبیر ناممکن۔" وہ سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے بولا۔

"وہ صرف اپنے آپ سے محبت کرتی ہے' دوسروں انسانوں کو کیڑے مکوڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی' مجھے تو وہ بس اپنے زعم میں جیتنا چاہتی ہے' وہ محبت کو جذبہ نہیں قبضہ سمجھتی ہے اور میں کسی کی سلطنت نہیں ہوں کہ یلغار کر کے قبضہ کر لیا جائے۔" وہ گھاس کو نوچتے ہوئے بولا۔

"ہو سکتا ہے یہ سب تمہارا وہم ہو' ورنہ مجھے تو وہ ایسی نہیں لگتی۔" شانزہ نے اس کے خیالات کی تردید کی۔

"تمہیں اس لیے وہ ایسی نہیں لگتی کہ اس کا اور تمہارا سامنا کبھی کبھار ہوتا ہے' میں اسی گھر میں رہتا ہوں' اس لیے میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔" وہ قدرے درشتگی سے گویا ہوا۔

"اصل میں بہزاد تعبیر جیسی لڑکیاں۔۔۔"

"پلیز بند کرو اس تعبیر نامہ کو' کوئی اور بات کرو۔" اس نے بے زاری سے شانزہ کی بات کاٹ دی۔

"اب بات کیا کرنی ہے' چلو کینٹین چلتے ہیں' مجھے سخت بھوک لگی ہے۔" شانزہ نے گھاس پر رکھا بیگ اور کتابیں اٹھاتے ہوئے کہا تو وہ بھی ہاتھ جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

☆ ☆ ☆

سر شام آسمان پر بادل ٹولیوں کی شکل میں اکٹھا ہونا شروع ہو گئے تھے' مگر بارش کا ابھی کوئی امکان نہیں تھا۔ بہزاد نے پختہ روش پر اپنی بائیک کھڑی کر کے اس کی ہفتہ وار صفائی شروع کر رکھی تھی' تیمور اور صبا لان میں بیڈ منٹن کھیل رہے تھے۔

"آج کہیں جانے کی تیاری ہے کیا؟" وہ پانی کا پائپ لے کر بائیک کا پچھلا ٹائر دھو رہا تھا' جب تعبیر ہاتھ میں موبائل پکڑے اس کے پاس آن کھڑی ہوئی۔

"نہیں تو۔" اس نے بغیر نظر اٹھائے مختصراً' کہا' وہ اسے نہیں بتانا چاہ رہا تھا کہ وہ پھوپھو کے ہاں جا رہا تھا۔

"میرے خیال میں تو تم اور آغا جان نے شانزہ کے گھر جانا تھا۔" اسے آغا جان سے معلوم ہوا تھا یا اس کی قیافہ شناسی تھی' مگر بہزاد کو ایسے لگا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو' وہ ایک مرتبہ گڑبڑا سا گیا' مگر اگلے ہی لمحے خود کو نارمل رکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاں ارادہ تو ہے' اگر موسم ٹھیک رہا تو۔" وہ ٹالنے والے انداز میں بولا' تعبیر کے چہرے پر ایک سایہ سا آکر گزر گیا۔

"کیوں جا رہے ہو' ملاقات ہو تو جاتی ہے تمہاری شانزہ سے ہر روز۔" اس نے عام سے لہجے میں کہا تھا' مگر بہزاد اس سوال میں مخفی طنز کو سمجھ گیا تھا۔

"میں آغا جان کو لے کر جا رہا ہوں' پھوپھو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" وہ کوئی سخت سا جواب بھی دے سکتا تھا' مگر اس نے حد درجہ ضبط سے کام لیتے ہوئے بس اتنا ہی کہا' وہ جانتا تھا ذو معنی جملوں میں وہ تعبیر سے سبقت نہیں لے سکتا۔

"پھوپھو کی طبیعت خراب ہے' پھر تو مجھے بھی جانا چاہیے۔" اس نے بائیک کی پچھلی سیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بہزاد کو دیکھا' وہ پائپ کو کیاری میں پھینکتے ہوئے واپس اس کی طرف پلٹا۔

"تعبیر اور تمہارا رشتہ تو ان سے ایک ہی طرح کا ہے نا' مجھے بھی جانا چاہیے' کیوں بہزاد؟" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔

"ہاں ضرور جاؤ' میں نے کب منع کیا ہے۔" وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔

"اوکے' پھر آج شام اکٹھے چلیں گے۔" وہ بالوں کو ایک خاص ادا سے جھٹک کر بولی۔

"اکٹھے؟" بہزاد نے یہ لفظ کڑوے گھونٹ کی طرح نگلا۔

"آغا جان کو تم پاپا کی گاڑی میں لے کر جاؤ گے نا' اور گاڑی میں تو کئی لوگ جا سکتے ہیں۔" اس نے کلچ کو دباتے ہوئے ایک نظر تعبیر کی طرف دیکھا جو فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ وہاں سے چلی گئی تھی' وہ بے بسی سے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا' کیونکہ تعبیر فاروق نے اس کے لیے انکار کا کوئی جواز نہ چھوڑا تھا' اس کا سارا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا تھا۔ اس نے تلملا کر بائیک کی پیٹرول ٹنکی پر مکا رسید کیا کہ اس سے زیادہ وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

شام گہری ہونے سے پہلے وہ تینوں شانزہ کے گھر موجود تھے۔ پھوپھو آغا جان کی آمد پر خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھیں' کیونکہ وہ کافی عرصے کے بعد ان کے گھر آئے تھے۔ آخری بار وہ دو سال پہلے پھوپھو کی دعوت پر اس وقت ان کے ہاں آئے تھے جب فیصل نے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا تھا۔

"آغا جان آپ ہمارے پاس رہیں گے نا کچھ روز؟" فائزہ ان سے فرمائش کرنے لگی۔

"بیٹا میں ضرور رہتا' مگر میری دوا کا مسئلہ ہے اور۔۔۔" اس سے پہلے کہ وہ اور عذر پیش کرتے شانزہ کی امی نے ان کی بات قطع کر دی۔

"نہیں آغا جان آپ کچھ روز ادھر رہیں گے' بہزاد آپ کی دوا کے بارے میں بتا دے گا' آخر ہمارا بھی کچھ حق ہے آپ پر' کچھ خدمت کا ہمیں بھی موقع دیں۔" آخر میں وہ خاصی جذباتی سی ہو گئیں تو آغا جان نے ہامی بھر لی۔

"ٹھیک ہے' اب تم لوگ اپنی بات پر اڑ ہی گئے ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں' لیکن ایک ہفتے سے زیادہ نہیں

رکوں گا۔" انہوں نے آمادگی کے ساتھ شرط بھی لگادی توسب نے بخوشی تسلیم کرلی۔

"بہزاد' اب چلیں؟" کچھ دیر بعد اس نے ایک ادا سے بہزاد کو مخاطب کیا تو وہ گڑبڑا سا گیا۔

"آں... چلو۔" اس نے کلائی پر بندھی ریسٹ واچ کو دیکھا۔

"ارے کہاں چلو' اب رات کا کھانا کھاکر جانا تم لوگ۔" پھوپھو فوراً" بولیں۔

"نہیں پھوپھو' پھر کبھی چکر لگائیں گے' مما انتظار کررہی ہوں گی۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی مبادا بہزاد مزید ٹھہرنے کا ارادہ نہ باندھ لے' وہ بھی مرتا کیا نہ کرتا کی تفسیر بنا صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا' شانزہ زیر لب مسکراہٹ دبا کر اسے ہی دیکھ رہی تھی' اسے بہزاد کی حالت پر رحم آرہا تھا' جسے اب واپسی کا ایک گھنٹے پر مشتمل سفر تعبیر کی معیت میں اکیلے ہی طے کرنا تھا۔

"اوکے' اللہ حافظ۔" وہ سینٹر ٹیبل سے گاڑی کی چابیاں اٹھاتے ہوئے بے دلی سے گویا ہوا۔

"اللہ ہی حافظ۔" وہ جب شانزہ کے پاس سے گزرا تو اس نے دھیمی آواز میں شرارت سے کہا تو وہ غصے سے اس کی جانب پلٹا' اس کی بے بسی سے حظ اٹھا رہی تھی' مگر اپنے عقب میں آتی تعبیر کو دیکھ کر کچھ بھی کہنے سے گریز کیا اور سر جھٹک کر باہر نکل آیا۔

گاڑی جوں ہی گیٹ سے باہر نکلی ہلکی ہلکی بوندیں ونڈ اسکرین کو بھگونے لگیں۔ سڑک پر پھسلن بہت زیادہ تھی۔ وہ گاڑی معمول سے قدرے کم رفتار پر چلا رہا تھا۔ اس نے ایک نظر ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی تعبیر فاروق پر ڈالی جو خلاف معمول چپ کا لبادہ اوڑھے شیشے سے پار آس پاس گزرتی عمارتوں کو دیکھ رہی تھی۔ بہزاد کو اس کی خاموشی کی وجہ معلوم نہ تھی' مگر اتنا ضرور تھا کہ وہ چپ رہ کر اچھی خاصی معقول لگ رہی تھی' وہ زیر لب مسکرا کر سامنے دیکھنے لگا' جب کافی دیر تک اس نے لبوں کا قفل نہ کھولا تو مجبوراً" بہزاد کو پوچھنا پڑا' مبادا اس کی طبیعت تو نہیں خراب ہے۔

"کیا بات ہے' آج بہت خاموش بیٹھی ہو۔" وہ یوٹرن لیتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے کچھ توقف کے بعد کہا' مگر اپنی نظروں کا زاویہ تبدیل نہ کیا۔

"کوئی بات تو ہے۔" وہ مصر تھا' تعبیر نے اس کو ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔

"آج میری بڑی فکر ہورہی ہے۔" وہ شرمندہ سا ہوگیا۔

"تم اتنا اصرار کیوں کررہے ہو' فرض کرو اگر مجھے کوئی پرابلم ہے تو کیا تم اسے حل کرلوگے۔" وہ جھنجلاتے ہوئے انداز میں گویا ہوئی۔

"ہوسکتا ہے کوئی حل نکل ہی آئے' تم مسئلہ تو بتاؤ۔" وہ سامنے گیلی سڑک پر نظریں جمائے ہلکے پھلکے انداز میں اس سے مخاطب ہوا' موسم اچھا تھا اور اس کا اثر بہزاد پر بھی ہورہا تھا' وہ نہیں چاہتا تھا کہ تعبیر سے کوئی سخت بات کرکے خواہ مخواہ کی بدمزگی پیدا کی جائے' اس لیے وہ قدرے خوشگوار موڈ میں اس سے مخاطب تھا۔

"تم حل کروگے میرا مسئلہ؟" اس نے بے یقینی سے بہزاد کی طرف دیکھا۔

"کوشش کروں گا' تم بتاؤ۔" وہ گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے بولا۔

"میرا پرابلم تم ہو اور مجھے اس کا کوئی حل نظر نہیں آرہا' تم جانتے ہو میرا مسئلہ۔" آسمانی بجلی زور سے کڑکی تھی' روشنی کے کوندے سے بہزاد کی آنکھیں ایک دم چندھیا سی گئیں' اس کو بریک لگانا پڑی تو گاڑی ایک جھٹکا کھاکر رک گئی' بارش میں تیزی آگئی تھی۔ وہ ہونٹ بھینچے اسٹیرنگ کو دیکھنے لگا اور وہ امید بھری نظروں سے بہزاد کو' وہ خاموش تھا' اس نے گاڑی اسٹارٹ کرنے کے لیے گیئر کو تھاما تو تعبیر نے اپنا نرم ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا' وہ چونکا نہیں تھا۔

"مجھے تمہاری محبت چاہیے بہزاد۔" وہ لہجے میں اپنائیت سموتے ہوئے بولی۔

"تعبیر تم کیوں نہیں سمجھتیں محبت کسی کی جاگیر یا میراث نہیں ہے کہ جب چاہا حاصل کرلی' اپنے تسلط

میں لے لی۔" وہ زچ ہوگیا' اسے اندازہ نہیں تھا کہ تعبیر کی سوئی اسی جگہ اٹکی ہوئی ہے۔

"مجھے سمجھارہے ہو' تم خود کیوں نہیں سمجھ جاتے' آخر کیسی ضد ہے تمہیں میرے ساتھ۔" وہ روہانسی ہوکر بولی۔

"مجھے تمہارے ساتھ کوئی ضد نہیں ہے' میں تو تمہیں حقیقت کی دنیا میں لانا چاہتا ہوں' تم خیالی دنیا میں رہتی ہو' بی پریکٹیکل' یہ سب بچکانہ حرکتیں ہیں۔"

"محبت بچپنا نہیں ہوتی بہزاد۔" وہ اس کی بات پر تڑپ کر بولی' وہ باہر آبشار کی طرح برستی بارش کو دیکھ رہا تھا۔

"تم اتنے سخت دل کیوں ہو بہزاد' بالکل سرد برف سے ڈھکی چوٹی کی مانند۔" وہ اپنے ہاتھ کا دباؤ بڑھاتے ہوئے بولی' وہ شاید اپنے لمس سے اس برف کو پگھلانے کا سوچ رہی تھی' مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ ہاتھ کی تپش سے دلوں کے گلیشئر نہیں پگھل سکتے' دلوں کی برف تو محبت کی لو سے پانی ہوتی ہے اور اس کی محبت کی حدت ابھی بہزاد کے دل تک نہیں پہنچی تھی۔

اس نے آہستگی سے اپنا ہاتھ تعبیر کے ہاتھ سے کھینچ لیا اور گاڑی اسٹارٹ کردی' تعبیر نے شکست خوردہ انداز میں بہزاد کو دیکھا اور ہاتھ اپنی گود میں رکھ لیا' لیکن وہ ہار تسلیم کرنے والوں میں سے نہیں تھی۔ ابھی تک اس نے سنگ پر پانی کا پہلا قطرہ گرایا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ پانی یوں ہی گرتا رہا تو اک دن اس پتھر میں سوراخ ضرور ہوگا۔ دور' دور تک چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔ گاڑی کے اندر ایک تناؤ کی سی کیفیت آچکی تھی اور باقی ماندہ سفر دونوں نے اسی تناؤ میں کرنا تھا۔

✲ ✲ ✲

نوٹس بناتے ہوئے اسے اچانک اکتاہٹ نے آن گھیرا تھا۔ صفحے پر ترمرے سے ناچنے لگے تھے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ جب سے یونیورسٹی سے واپس آیا تھا اسی کام میں منہمک تھا اور پچھلے چار گھنٹوں کی عرق ریزی اور دیدہ ریزی کے بعد وہ تھکاوٹ کا شکار ہوگیا تھا۔ اس کی آنکھیں دکھنے لگی تھیں اور گردن کے پچھلے حصے میں شدید اکڑاؤ سا محسوس ہونے لگا تھا۔ اس نے تمام کاغذات سمیٹ کر ٹیبل پر اکٹھے کیے تو اس کی نظر بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر دھری چائے کی پیالی پر پڑی جو کچھ دیر قبل صبا رکھ کر گئی تھی' وہ اس کا مشکور تو ہوا تھا' مگر کام کے دوران بھول ہی گیا تھا کہ اسے چائے پینی ہے۔ نتیجتاً" وہ اس کی بے توجہی کی تاب نہ لاتے ہوئے ٹھنڈی ہوچکی تھی۔ وہ بیڈ پر بیٹھ کر کچھ دیر چائے کی سطح پر جمی بالائی کو دیکھتا رہا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا' اسے چائے کی شدید طلب ہورہی تھی' وہ خود ہی کچن کی طرف چلا آیا۔

اسے وقت بے وقت فرمائش کرنے کی عادت نہیں تھی' اگر کبھی کچھ کھانے کو زیادہ ہی جی مچل جاتا تو وہ بنفس نفیس باورچی خانے میں آنکلتا اور چائے یا کافی وغیرہ خود ہی بنالیتا۔ عصر کا وقت تھا اور کچن عموماً" اس وقت ویران ہی ہوتا تھا' اس نے چائے کا پانی چولہے پر رکھا اور کسی خیال کے تحت آغا جان کے کمرے کی طرف چلا گیا۔

"چائے پئیں گے آغا جان۔" اس نے دروازے سے سر نکال کر پوچھا۔

"برخوردار نیکی اور پوچھ پوچھ! میں چائے کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا' حالانکہ بے چاری تعبیر صبح سے اب تک کئی بار بنا کر دے چکی ہے' مگر اس کمبخت چائے کی طلب کم ہی نہیں ہورہی۔" وہ سامنے پھیلا ہوا اخبار الٹتے ہوئے بولے۔

"میں بس ابھی لایا۔" وہ اتنا کہہ کر واپس مڑ گیا۔ چائے کا پانی تیار تھا' اس نے جلدی سے فریج میں سے دودھ نکالا اور ساس پین میں انڈیل دیا۔ اسے ہلکی سی بھوک بھی محسوس ہوئی تو کیبنٹ سے بسکٹ اور نمکو کا جار نکال لیا اور اسے پلیٹوں میں رکھنے لگا۔ کچن میں کھٹ پٹ کی آواز سن کر تعبیر دروازے پر آن کھڑی ہوئی۔ بہزاد اس کی جانب پشت کیے کچھ بنانے میں مصروف تھا۔

"یہ موصوف اس وقت یہاں کیا کررہے ہیں۔" وہ

ہے، ایسے میں امی کو اکیلا چھوڑ کر کیسے آسکتی تھی اور ان دنوں ان کی طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں تھی بس اسی بھاگ دوڑ میں آغا جان سے بھی بات نہ ہو سکی۔" اس نے سامنے دھری کتاب کے ٹائٹل پر انگلی پھیرتے ہوئے بہزاد کو تفصیل سے آگاہ کیا۔

"کیا ہوا پھوپھو کو؟" اس کے چہرے پر تفکر کی لکیریں نمایاں ہوئیں۔

"اب تو ٹھیک ہیں بس وہ ہی استھما کا اٹیک ہوا تھا پولن الرجی کی وجہ سے اس موسم میں ان کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب ہو گئی تھی لیکن اب بہتر ہیں ڈونٹ وری۔" وہ بہزاد کو دیکھ کر آرام سے بولی۔

"ایسا کرو پھر تم نہ آؤ میں آغا جان کو لے کر آؤں گا ان سے کل بات کی ہے میں نے۔" بہزاد نے اس کی مشکل حل کر دی۔

"اچھا واقعی؟" وہ ایک دم خوش ہو گئی۔

"تعبیر اور صبا کو بھی ساتھ لے آنا سب مل کر آئیں گے تو خوب رونق رہے گی۔"

"نہ بابا! تم خود ہی آکر اس سے مل لینا میرے سر پر یہ مصیبت سوار مت کرو۔" وہ بے زاری سے بولا۔

"کیوں تم اس سے اتنا چڑتے کیوں ہو؟" وہ سمجھ گئی تھی کہ بہزاد تعبیر کے ذکر پر اکثر ایسے ہی کوفت میں مبتلا ہو جاتا تھا مگر وجہ اسے معلوم نہ تھی۔

"وہ شاید ان احسانات کا بدلہ مجھ سے لینا چاہ رہی ہے جو اس کے والدین نے مجھ پر کیے ہیں؟" وہ گھاس کو مٹھی میں بھرتے ہوئے بولا۔

"کون سے احسانات؟" شانزہ نے نا سمجھی کے عالم میں اسے دیکھا۔

"میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم اتنی بے خبر ہو کیا ان کا یہ احسان کم ہے کہ چھ سال کے بچے کو انہوں نے ماں باپ کی وفات کے بعد پال پوس کر بڑا کیا۔ میں اگر چاہوں بھی تو اس احسان کے بوجھ تلے سے نہیں نکل سکتا۔" وہ گہری سانس لے کر بولا اسے اپنے امی ابو کی یاد ہمیشہ ہی ایسے اداس کر دیتی تھی جو ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں اس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے تھے۔

"یہ ان کا احسان نہیں فرض تھا اور اس میں ماموں جان سے زیادہ آغا جان کا ہاتھ ہے انہوں نے اپنی عمر کا ایک حصہ تمہاری دیکھ بھال اور پرورش میں گزارا ہے۔ تمہارا حق بھی اس گھر پر اتنا ہے جتنا فاروق ماموں کے بچوں کا پھر تم ہمیشہ اسے احسان کا نام کیوں دیتے ہو؟" وہ اسے رسان سے سمجھاتے ہوئے بولی۔

"میں کسی اور کی نہیں صرف تعبیر کی بات کر رہا ہوں وہ مجھ سے بہت سی توقعات وابستہ کیے بیٹھی ہے۔"

"تم محبت کو توقعات کا نام دے رہے ہو؟" وہ بہزاد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

"محبت اور تعبیر ناممکن۔" وہ سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے بولا۔

"وہ صرف اپنے آپ سے محبت کرتی ہے دوسروں انسانوں کو کیڑے مکوڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی مجھے تو وہ بس اپنے زعم میں جیتنا چاہتی ہے وہ محبت کو جذبہ نہیں قبضہ سمجھتی ہے اور میں کسی کی سلطنت نہیں ہوں کہ یلغار کر کے قبضہ کر لیا جائے۔" وہ گھاس کو نوچتے ہوئے بولا۔

"ہو سکتا ہے یہ سب تمہارا وہم ہو ورنہ مجھے تو وہ ایسی نہیں لگتی۔" شانزہ نے اس کے خیالات کی تردید کی۔

"تمہیں اس لیے وہ ایسی نہیں لگتی کہ اس کا اور تمہارا سامنا کبھی کبھار ہوتا ہے میں اسی گھر میں رہتا ہوں اس لیے میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔" وہ قدرے درشتگی سے گویا ہوا۔

"دراصل میں بہزاد تعبیر جیسی لڑکیاں۔۔۔"

"پلیز بند کرو اس تعبیر نامہ کو کوئی اور بات کرو۔" اس نے بے زاری سے شانزہ کی بات کاٹ دی۔

"اب بات کیا کرنی ہے چلو کینٹین چلتے ہیں مجھے سخت بھوک لگی ہے۔" شانزہ نے گھاس پر رکھا بیگ اور کتابیں اٹھاتے ہوئے کہا تو وہ بھی ہاتھ جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

✹ ✹ ✹

سرِ شام آسمان پر بادل ٹولیوں کی شکل میں اکٹھا ہونا شروع ہو گئے تھے مگر بارش کا ابھی کوئی امکان نہیں تھا۔ بہزاد نے پختہ روش پر اپنی بائیک کھڑی کر کے اس کی ہفتہ وار صفائی شروع کر رکھی تھی تیمور اور صبا لان میں بیڈمنٹن کھیل رہے تھے۔

"آج کہیں جانے کی تیاری ہے کیا؟" وہ پانی کا پائپ لے کر بائیک کا پچھلا ٹائر دھو رہا تھا جب تعبیر ہاتھ میں موبائل پکڑے اس کے پاس آن کھڑی ہوئی۔

"نہیں تو۔" اس نے بغیر نظر اٹھائے مختصراً کہا وہ اسے نہیں بتانا چاہ رہا تھا کہ وہ پھوپھو کے ہاں جا رہا تھا۔

"میرے خیال میں تو تم اور آغا جان نے شانزہ کے گھر جانا تھا۔" اسے آغا جان سے معلوم ہوا تھا یا اس کی قیافہ شناسی تھی مگر بہزاد کو ایسے لگا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو وہ ایک مرتبہ گڑبڑا سا گیا مگر اگلے ہی لمحے خود کو نارمل رکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاں ارادہ تو ہے اگر موسم ٹھیک رہا تو۔" وہ ٹالنے والے انداز میں بولا تعبیر کے چہرے پر ایک سایہ سا آکر گزر گیا۔

"کیوں جا رہے ہو ملاقات ہو تو جاتی ہے تمہاری شانزہ سے ہر روز۔" اس نے عام سے لہجے میں کہا تھا مگر بہزاد اس سوال میں مخفی طنز کو سمجھ گیا تھا۔

"میں آغا جان کو لے کر جا رہا ہوں پھوپھو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" وہ کوئی سخت سا جواب بھی دے سکتا تھا مگر اس نے حد درجہ ضبط سے کام لیتے ہوئے بس اتنا ہی کہا وہ جانتا تھا ذو معنی جملوں میں وہ تعبیر سے سبقت نہیں لے سکتا۔

"پھوپھو کی طبیعت خراب ہے پھر تو مجھے بھی جانا چاہیے۔" اس نے بائیک کی پچھلی سیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بہزاد کو دیکھا وہ پائپ کو کیاری میں پھینکتے ہوئے واپس اس کی طرف پلٹا۔

"تعبیر اور تمہارا رشتہ تو ان سے ایک ہی طرح کا ہے نا مجھے بھی جانا چاہیے کیوں بہزاد؟" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔

"ہاں ضرور جاؤ میں نے کب منع کیا ہے۔" وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔

"او کے پھر آج شام اکٹھے چلیں گے۔" وہ بالوں کو ایک خاص ادا سے جھٹک کر بولی۔

"اکٹھے؟" بہزاد نے یہ لفظ کڑوے گھونٹ کی طرح نگلا۔

"آغا جان کو تم پاپا کی گاڑی میں لے کر جاؤ گے نا اور گاڑی میں تو کئی لوگ جا سکتے ہیں۔" اس نے کلچ کو دباتے ہوئے ایک نظر تعبیر کی طرف دیکھا جو فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ وہاں سے چلی گئی تھی وہ بے بسی سے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا کیونکہ تعبیر فاروق نے اس کے لیے انکار کا کوئی جواز نہ چھوڑا تھا اس کا سارا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا تھا۔ اس نے تلملا کر بائیک کی پیٹرول ٹنکی پر مکا رسید کیا کہ اس سے زیادہ وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

شام گہری ہونے سے پہلے وہ تینوں شانزہ کے گھر موجود تھے۔ پھوپھو آغا جان کی آمد پر خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھیں کیونکہ وہ کافی عرصے کے بعد ان کے گھر آئے تھے۔ آخری بار وہ دو سال پہلے پھوپھو کی دعوت پر اس وقت ان کے ہاں آئے تھے جب فیصل نے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا تھا۔

"آغا جان آپ ہمارے پاس رہیں گے نا کچھ روز؟" فائزہ ان سے فرمائش کرنے لگی۔

"بیٹا میں ضرور رہتا مگر میری دوا کا مسئلہ ہے اور۔۔۔" اس سے پہلے کہ وہ اور عذر پیش کرتے شانزہ کی امی نے ان کی بات قطع کر دی۔

"نہیں آغا جان آپ کچھ روز ادھر رہیں گے بہزاد آپ کی دوا کے بارے میں بتا دے گا آخر ہمارا بھی کچھ حق ہے آپ پر کچھ خدمت کا ہمیں بھی موقع دیں۔" آخر میں وہ خاصی جذباتی سی ہو گئیں تو آغا جان نے ہامی بھر لی۔

"ٹھیک ہے اب تم لوگ اپنی بات پر اڑ ہی گئے ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں لیکن ایک ہفتے سے زیادہ نہیں

رکوں گا۔" انہوں نے آمادگی کے ساتھ شرط بھی لگادی تو سب نے بخوشی تسلیم کرلی۔

"بہزاد' اب چلیں؟" کچھ دیر بعد اس نے ایک ادا سے بہزاد کو مخاطب کیا تو وہ گڑبڑا سا گیا۔

"آں۔ چلو۔" اس نے کلائی پر بندھی ریسٹ واچ کو دیکھا۔

"ارے کہاں چلو' اب رات کا کھانا کھا کر جانا تم لوگ۔" پھوپھو فوراً بولیں۔

"نہیں پھوپھو' پھر کبھی چکر لگائیں گے' مما انتظار کررہی ہوں گی۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی مبادا بہزاد مزید ٹھہرنے کا ارادہ نہ باندھ لے' وہ بھی مرتا کیا نہ کرتا کی تفسیر بنا صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا' شانزہ زیر لب مسکراہٹ دبا کر اسے ہی دیکھ رہی تھی' اسے بہزاد کی حالت پر رحم آرہا تھا' جسے اب واپسی کا ایک گھنٹے پر مشتمل سفر تعبیر کی معیت میں اکیلے ہی طے کرنا تھا۔

"اوکے' اللہ حافظ۔" وہ سینٹر ٹیبل سے گاڑی کی چابیاں اٹھاتے ہوئے بے دلی سے گویا ہوا۔

"اللہ ہی حافظ۔" وہ جب شانزہ کے پاس سے گزرا تو اس نے دھیمی آواز میں شرارت سے کہا تو وہ غصے سے اس کی جانب پلٹا' اس کی بے بسی سے حظ اٹھا رہی تھی' مگر اپنے عقب میں آتی تعبیر کو دیکھ کر کچھ بھی کہنے سے گریز کیا اور سر جھٹک کر باہر نکل آیا۔

گاڑی جوں ہی گیٹ سے باہر نکلی ہلکی ہلکی بوندیں ونڈ اسکرین کو بھگونے لگیں۔ سڑک پر پھسلن بہت زیادہ تھی۔ وہ گاڑی معمول سے قدرے کم رفتار پر چلا رہا تھا۔ اس نے ایک نظر ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی تعبیر فاروق پر ڈالی جو خلاف معمول چپ کا لبادہ اوڑھے شیشے سے پار آس پاس گزرتی عمارتوں کو دیکھ رہی تھی۔ بہزاد کو اس کی خاموشی کی وجہ معلوم نہ تھی' مگر اتنا ضرور تھا کہ وہ چپ رہ کر اچھی خاصی معقول لگ رہی تھی' وہ زیر لب مسکرا کر سامنے دیکھنے لگا' جب کافی دیر تک اس نے لبوں کا قفل نہ کھولا تو مجبوراً بہزاد کو پوچھنا پڑا مبادا اس کی طبیعت تو نہیں خراب ہے۔

"کیا بات ہے' آج بہت خاموش بیٹھی ہو۔" وہ یوٹرن لیتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے کچھ توقف کے بعد کہا' مگر اپنی نظروں کا زاویہ تبدیل نہ کیا۔

"کوئی بات تو ہے۔" وہ مصر تھا' تعبیر نے اس کو ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔

"آج میری بڑی فکر ہورہی ہے۔" وہ شرمندہ سا ہوگیا۔

"تم اتنا اصرار کیوں کررہے ہو' فرض کرو اگر مجھے کوئی پرابلم ہے تو کیا تم اسے حل کرلوگے۔" وہ چبھتے ہوئے انداز میں گویا ہوئی۔

"ہوسکتا ہے کوئی حل نکل ہی آئے' تم مسئلہ تو بتاؤ۔" وہ سامنے گیلی سڑک پر نظریں جمائے ہلکے پھلکے انداز میں اس سے مخاطب ہوا' موسم اچھا تھا اور اس کا اثر بہزاد پر بھی ہورہا تھا' وہ نہیں چاہتا تھا کہ تعبیر سے کوئی سخت بات کرکے خوامخواہ کی بدمزگی پیدا کی جائے' اس لیے وہ قدرے خوشگوار موڈ میں اس سے مخاطب تھا۔

"تم حل کروگے میرا مسئلہ؟" اس نے بے یقینی سے بہزاد کی طرف دیکھا۔

"کوشش کروں گا' تم بتاؤ۔" وہ گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے بولا۔

"میرا پرابلم تم ہو اور مجھے اس کا کوئی حل نظر نہیں آرہا' تم جانتے ہو میرا مسئلہ۔" آسمانی بجلی زور سے کڑکی تھی' روشنی کے کوندے سے بہزاد کی آنکھیں ایک دم چندھیا سی گئیں' اس کو بریک لگانا پڑی تو گاڑی ایک جھٹکا کھا کر رک گئی' بارش میں تیزی آگئی تھی۔ وہ ہونٹ بھینچے اسٹیئرنگ کو دیکھنے لگا اور وہ امید بھری نظروں سے بہزاد کو' وہ خاموش تھا' اس نے گاڑی اسٹارٹ کرنے کے لیے گیئر کو تھاما تو تعبیر نے اپنا نرم ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا' وہ چونکا نہیں تھا۔

"مجھے تمہاری محبت چاہیے بہزاد۔" وہ لہجے میں اپنائیت سموتے ہوئے بولی۔

"تعبیر تم کیوں نہیں سمجھتیں محبت کسی کی جاگیر یا میراث نہیں ہے کہ جب چاہا حاصل کرلی' اپنے تسلط

میں لے لی۔" وہ زچ ہوگیا' اسے اندازہ نہیں تھا کہ تعبیر کی سوئی اسی جگہ اٹکی ہوئی ہے۔

"مجھے سمجھا رہے ہو' تم خود کیوں نہیں سمجھ جاتے' آخر کیسی ضد ہے تمہیں میرے ساتھ۔" وہ روہانسی ہوکر بولی۔

"مجھے تمہارے ساتھ کوئی ضد نہیں ہے' میں تو تمہیں حقیقت کی دنیا میں لانا چاہتا ہوں' تم خیالی دنیا میں رہتی ہوئی پریکٹیکل' یہ سب بچکانہ حرکتیں ہیں۔"

"محبت بچپنا نہیں ہوتی بہزاد۔" وہ اس کی بات پر تڑپ کر بولی' وہ باہر آبشار کی طرح برستی بارش کو دیکھ رہا تھا۔

"تم اتنے سخت دل کیوں ہو بہزاد' بالکل سرد برف سے ڈھکی چوٹی کی مانند۔" وہ اپنے ہاتھ کا دباؤ بڑھاتے ہوئے بولی' وہ شاید اپنے لمس سے اس برف کو پگھلانے کا سوچ رہی تھی' مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ ہاتھ کی تپش سے دلوں کے گلیشیئر نہیں پگھل سکتے' دلوں کی برف تو محبت کی لو سے پانی ہوتی ہے اور اس کی محبت کی حدت ابھی بہزاد کے دل تک نہیں پہنچی تھی۔

اس نے آہستگی سے اپنا ہاتھ تعبیر کے ہاتھ سے کھینچ لیا اور گاڑی اسٹارٹ کردی' تعبیر نے شکست خوردہ انداز میں بہزاد کو دیکھا اور ہاتھ اپنی گود میں رکھ لیا' لیکن وہ ہار تسلیم کرنے والوں میں سے نہیں تھی۔ ابھی تک اس نے سنگ پر پانی کا پہلا قطرہ گرایا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ پانی یوں ہی گرتا رہا تو اک دن اس پتھر میں سوراخ ضرور ہوگا۔ دور' دور تک چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔ گاڑی کے اندر ایک تناؤ کی سی کیفیت آچکی تھی اور باقی ماندہ سفر دونوں نے اسی تناؤ میں کرنا تھا۔

☼ ☼ ☼

نوٹس بناتے ہوئے اسے اچانک اکتاہٹ نے آن گھیرا تھا۔ صفحے پر ترمرے سے ناچنے لگے تھے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ جب سے یونیورسٹی سے واپس آیا تھا اسی کام میں منہمک تھا اور پچھلے چار گھنٹوں کی عرق ریزی اور دیدہ ریزی کے بعد وہ تھکاوٹ کا شکار ہوگیا تھا۔ اس کی آنکھیں دکھنے لگی تھیں اور گردن کے پچھلے حصے میں شدید اکڑاؤ سا محسوس ہونے لگا تھا۔

اس نے تمام کاغذات سمیٹ کر ٹیبل پر اکٹھے کیے تو اس کی نظر بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر دھری چائے کی پیالی پر پڑی جو کچھ دیر قبل صبا رکھ کر گئی تھی' وہ اس کا مشکور تو ہوا تھا' مگر کام کے دوران بھول ہی گیا تھا کہ اسے چائے پینی ہے۔ نتیجتاً وہ اس کی بے توجہی کی تاب نہ لاتے ہوئے ٹھنڈی ہوچکی تھی۔ وہ بیڈ پر بیٹھ کر کچھ دیر چائے کی سطح پر جمی بالائی کو دیکھتا رہا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا' اسے چائے کی شدید طلب ہورہی تھی' وہ خود ہی کچن کی طرف چلا آیا۔

اسے وقت بے وقت فرمائش کرنے کی عادت نہیں تھی' اگر کبھی کچھ کھانے کو زیادہ ہی جی مچل جاتا تو وہ بنفس نفیس باورچی خانے میں آنکلتا اور چائے یا کافی وغیرہ خود ہی بنالیتا۔ عصر کا وقت تھا اور کچن عموماً اس وقت ویران ہی ہوتا تھا' اس نے چائے کا پانی چولہے پر رکھا اور کسی خیال کے تحت آغا جان کے کمرے کی طرف چلا گیا۔

"چائے پئیں گے آغا جان۔" اس نے دروازے سے سر نکال کر پوچھا۔

"برخوردار نیکی اور پوچھ پوچھ! میں چائے کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا' حالانکہ بے چاری تعبیر صبح سے اب تک کئی بار بنا کر دے چکی ہے' مگر اس کمبخت چائے کی طلب کم ہی نہیں ہورہی۔" وہ سامنے پھیلا ہوا اخبار الٹتے ہوئے بولے۔

"میں بس ابھی لایا۔" وہ اتنا کہہ کر واپس مڑ گیا۔

چائے کا پانی تیار تھا' اس نے جلدی سے فریج میں سے دودھ نکالا اور ساس پین میں انڈیل دیا۔ اسے ہلکی سی بھوک بھی محسوس ہوئی تو کیبنٹ سے بسکٹ اور نمکو کا جار نکال لیا اور اسے پلیٹوں میں رکھنے لگا۔ کچن میں کھٹ پٹ کی آواز سن کر تعبیر دروازے پر آن کھڑی ہوئی۔ بہزاد اس کی جانب پشت کیے کچھ بنانے میں مصروف تھا۔

"یہ موصوف اس وقت یہاں کیا کررہے ہیں۔" وہ

کچھ سوچتی ہوئی اندر چلی آئی۔

"گر کچھ چاہیے تھا تو بتادیتے" مانا کہ ہمارے درمیان ایسی بے تکلفی نہیں ہے' مگر دشمنی بھی تو نہیں ہے کہ تم کھانے کے متعلق کچھ بتانے میں عار محسوس کرو۔" وہ اس کے پاس کھڑے ہو کر بولی۔

"میں اس گھر میں مہمان تو نہیں ہوں۔" وہ شیلف پر چائے کی پیالیاں ترتیب سے رکھتے ہوئے بولا۔

"مگر تمہارا رویہ اکثر مہمانوں والا ہوتا ہے جیسے اس گھر کے لوگوں سے تمہارا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔" وہ اس کے حرکت کرتے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔

"یہ محض تمہارا وہم ہے' ورنہ اس گھر کے مکینوں سے میرا بہت گہرا تعلق ہے' پرخلوص اور غیر مشروط۔" وہ لفظ غیر مشروط پر زور دیتے ہوئے بولا۔

"پھر مجھے ایسا کیوں نہیں لگتا۔" وہ اس کے برابر میں آن کھڑی ہوئی' ہر بات کو طول دینا اس کی عادت تھی اور اس وقت بھی وہ دے رہی تھی۔

"تمہاری توقعات کچھ اس قسم کی ہیں جن پر میں پورا نہیں اتر سکتا' شاید اس وجہ سے تم مجھے ایسا سمجھتی ہو۔" وہ چائے کو پیالیوں میں انڈیلتے ہوئے بولا۔

"کیسی توقعات؟" وہ اچنبھے سے گویا ہوئی۔

"تم سمجھ سکتی ہو وضاحت کرنا ضروری نہیں ہے۔" وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

"میری توقعات کچھ ایسی ناجائز اور غلط بھی نہیں ہیں۔" تھوڑے سے توقف کے بعد وہ بولی۔

"کسی کو توجہ دینا یا چاہنا کیا غلط بات ہے تمہارے نزدیک۔" وہ خاموش رہا تو تعبیر نے پوچھا۔

"بعض چاہتیں ہماری قسمت کے گوشوارے میں ہی نہیں ہوتیں' پھر ان کے پیچھے بھاگنا لاحاصل ہوتا ہے اور تم لاحاصل کے لیے تگ و دو کر رہی ہو۔" وہ اس کی جانب مڑتے ہوئے بولا۔ وہ کچھ دیر اسے بے حس و حرکت دیکھتی رہی۔

"مجھے حاصل یا لاحاصل کی کوئی فکر نہیں ہے میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ جو کچھ میں کر رہی ہوں وہ رائیگاں نہیں جائے گا ایک دن تم میری محبت اور میرے خلوص کی قدر ضرور کرو گے۔" وہ اتنا کہہ کر وہاں سے باہر نکل گئی بہزاد خاموشی سے اسے جاتا دیکھتا رہا۔ پھر سر جھٹک کر چائے کی ٹرے اٹھا کر آغا جان کے کمرے کی طرف چل دیا۔ چائے پینے کے دوران بھی اس کا ذہن مسلسل تعبیر کی باتوں میں الجھا رہا وہ ان دنوں اسے معمول سے زیادہ اہمیت دینے لگی تھی۔ اور یہی بات اسے پریشان کیے دے رہی تھی کہ دل کی جس مسند پر وہ متمکن ہونا چاہ رہی تھی وہاں شانزہ براجمان تھی۔

☼ ☼ ☼

تعبیر نے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر سرتاپا اپنا جائزہ لیا۔ اس کی تیاری مکمل تھی۔ آج اس کی سالگرہ تھی اور اسے یقین تھا کہ بہزاد اسے ضرور وش کرے گا اس نے صرف اسی کی خاطر گھر میں چھوٹی سی پارٹی کا اہتمام بھی کر ڈالا تھا۔ وہ آئینے کے سامنے گھومتے ہوئے ہر زاویئے سے اپنے آپ کو دیکھنے لگی۔ سفید شیفون کے سوٹ پر فیروزی کڑھائی میں جگ مگ کرتے سفید نگینے بہت خوب صورت لگ رہے تھے۔ اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھے جیولری باکس میں سے فیروزی نگوں والے خوب صورت آویزے اٹھا کر کانوں میں سجا لیے۔ وہ اپنی تمام حشر سامانیوں سے بہزاد کی آنکھوں کو خیرہ کرنے کا مصمم ارادہ کیے بیٹھی تھی۔ وہ اس کو جیتنے کے لیے ہر حربہ آزمانا چاہتی تھی اور اس بار اسے مکمل یقین تھا کہ وہ اسے نظر انداز نہیں کر سکے گا۔ وہ خوب صورتی کے ہر ہتھیار سے اپنے آپ کو لیس کر رہی تھی۔

دھیرے دھیرے سورج اپنی تمام تر تمازتوں کو سمیٹ کر گھر جانے کی تیاری میں لگ گیا۔ اس نے مغربی سمت کھلنے والی کھڑکی سے باہر دیکھا دھوپ نارنجی رنگ اختیار کر چکی تھی اس نے دوبارہ پردے برابر کر دیئے اور بے چینی سے شام ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ آج پارٹی میں پھپھو کی فیملی بھی مدعو تھی مگر تعبیر

دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ شانزہ نہ آئے کیونکہ اس کی موجودگی میں بہزاد کا اس کی طرف مائل اور متوجہ ہونا تقریباً" ناممکن تھا اگر وہ بھی آگئی تو اس کی تمام تر محنت اکارت جائے گی۔ گیٹ کے باہر بہزاد کی بائیک کا ہارن اس کی سماعتوں سے ٹکرایا تھا۔ اس نے جلدی سے کھڑکی سے نیچے جھانک کر دیکھا وہ گھر کے اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکا تھا وہ دوبارہ آئینے کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ اپنا عکس آئینے میں دیکھنے کے بعد اس کے لبوں پر خود بخود مسکراہٹ عود آئی۔

"بہزاد صاحب! آج میں دیکھوں گی کہ آپ کی خود ساختہ بے نیازی اور غرور کی دیواریں کتنی مضبوط ہیں آج تو ان میں دراڑیں ضرور پڑیں گی اور پھر مجھے ان کو ملبے کا ڈھیر بنتے دیکھنا ہے۔" وہ نخوت سے بالوں کو پیچھے کی طرف جھٹکتے ہوئے اپنے عکس سے مخاطب تھی۔

"تم نے میری انا، خودداری اور غرور کو اپنے پاؤں تلے روندا ہے میں ایک دن ان سب کا حساب ضرور چکتا کروں گی، تعبیر فاروق اتنی ارزاں نہیں ہے بہزاد جتنا تم نے کر دیا ہے۔" اس نے اپنی صراحی دار گردن میں لپٹی نازک سی چین کو انگلیوں کی پوروں سے چھوتے ہوئے خود کلامی کی۔

"آپی!" باہر صبا نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"ہاں...... آجاؤ!" وہ چونک کر پلٹی۔

"میں نے ٹیبل سجا دی ہے اور آغا جان اور پھپھو بھی پہنچ گئے ہیں مگر لگتا ہے آپ کی تیاری ابھی مکمل نہیں ہوئی۔" صبا بے زاری سے بولی وہ پچھلے چار گھنٹوں سے اکیلی ہی سارے انتظامات دیکھ رہی تھی جب تعبیر اپنی تیاری کی غرض سے کمرے میں چلی آئی تھی۔ کچن سے ڈرائنگ روم تک کے چکروں نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا۔

"میں آرہی ہوں تم چلو۔" وہ بیڈ پر رکھا اپنا ڈوپٹہ اٹھاتے ہوئے بولی۔

"شانزہ نہیں آئی پھوپھو کے ساتھ؟" اس نے باہر نکلتی صبا سے پوچھا۔

"نہیں" صبا نے مختصراً" کہا۔

"کیوں؟" اس نے دوبارہ پوچھا۔

"مجھے نہیں پتا کیوں، آپ خود پھوپھو سے پوچھ لیں میری تو ان سے سرسری سی ملاقات ہوئی ہے۔" وہ اسے آگاہ کر کے باہر چلی گئی۔ تعبیر کے چہرے پر ایک مرتبہ پھر مسکراہٹ عود آئی آج قسمت مکمل اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ شانزہ کی عدم موجودگی سے اسے ایک کمینی سی خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ جس محفل میں وہ موجود ہو بہزاد تعبیر پر کم ہی نظر التفات ڈالتا تھا۔ اور آج قدرت نے یہ موقع بھی اسے فراہم کر دیا تھا اور وہ اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ وہ اسی مسکراہٹ کو لبوں پر سجائے شعلہ جوالہ بنی ڈرائنگ روم کی طرف چلی آئی۔ پھوپھو نے اسے پیار سے گلے لگایا تو اس نے رسماً" شانزہ کے بارے میں دریافت کیا۔

"بیٹا اس کی طبیعت کچھ خراب تھی صبح سے گلا دکھ رہا تھا میں نے خود ہی احتیاطاً" اسے آنے سے منع کر دیا تھا مبادا طبیعت زیادہ نہ خراب ہو جائے۔" پھوپھو نے اس کی غیر حاضری کی وجہ بیان کی تو وہ سرہلا کر آغا جان کے پاس چلی آئی انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا کیک کاٹنے سے پہلے وہ میز پر رکھے لوازمات کا جائزہ لے رہی تھی جب بہزاد ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ وہ تعبیر کو دیکھ کر ایک دم رک گیا ٹیبل پر ذرا سا جھک کر ترتیب سے پلیٹیں رکھنے والی وہ تعبیر نہیں کسی اور دنیا کی باسی لگ رہی تھی۔ بلاشبہ آج وہ بہت دلکش سراپے میں تھی۔ وہ وہیں سے واپس مڑ گیا کہ تعبیر کے لیے لایا گیا بکے تو اس کے کمرے میں ہی رہ گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو سب لوگ ٹیبل کے اردگرد کھڑے تھے۔ کیک کاٹنے سے قبل اس نے نظر اٹھا کر سامنے دیکھا پشت پر دونوں ہاتھ باندھے بہزاد اسے ہی دیکھ رہا تھا مگر وہ اس کے چہرے کے تاثر سے کوئی اندازہ نہ لگا سکی اس نے احساس تفاخر سے دوبارہ نظریں کیک پر جما دیں۔

"ہیپی برتھ ڈے۔" کیک کاٹنے کے بعد جب سب لوگ لذت طعام و دہن میں لگ گئے تو وہ بکے اور

کارڈ لے کر اس کے پاس چلا آیا۔

"تھینک یو۔" اس نے آہستگی سے دونوں چیزیں تھامتے ہوئے کہا وہ مسکرا کر پلیٹ میں رکھا پزا کھانے لگا۔

"میں کیسی لگ رہی ہوں بہزاد؟" بلا آخر کچھ دیر بعد اسے خود ہی پوچھنا۔

"پریٹی!" اس نے صاف گوئی سے کہا تو وہ مسکرا اٹھی۔

"نہیں خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے میں نے تو معمولی سی تیاری ہی کی تھی۔" وہ حد درجہ کسر نفسی اور انکساری سے کام لے رہی تھی جس کا مقصد بہزاد کے منہ سے چند اور تعریفی اور توصیفی کلمات سننا تھا۔

"جتنی بھی کی ہے وہ نظر آرہی ہے محنت رائیگاں نہیں گئی۔"

وہ شرارت سے بولا تو اس کی امیدوں پر اوس سی پڑ گئی وہ تو بہزاد کے منہ سے اپنے بارے میں طویل قصیدہ سننے کی متمنی تھی مگر وہ اسے ٹال گیا تھا۔

"شانی کیوں نہیں آئی؟" اس کی تان اس کے ذکر پر ہی ٹوٹی تھی تعبیر کلس کر رہ گئی۔

"آئی ڈونٹ نو!" وہ کندھے اچکا کر وہاں سے ہٹ گئی اب وہاں کھڑے رہنے کا فائدہ بھی نہ تھا کہ اب ان دونوں کے درمیان شانزہ کا ذکر آگیا تھا اور اس پر بہزاد بلا تکان بول سکتا تھا۔

وہ بظاہر سب سے مسکرا کر باتیں کرتی رہی مگر اس کا ذہن شانزہ پر ہی اٹکا ہوا تھا۔ اگر وہ راستے میں حائل نہ ہوتی تو بہزاد کا دل جیتنا اتنا مشکل نہ تھا۔ اس پر اب واضح ہونے لگا تھا کہ جب تک بہزاد کے دل کی طرف جانے والی شاہراہ پر وہ کھڑی ہے اس کے لیے کوئی راستہ نہیں ہے اور اس راستے کو اب شانزہ کے وجود سے خالی کرنا ناگزیر ہو گیا تھا اس کے بعد ہی وہ محبت کے میدان میں اپنی فتح کا جھنڈا گاڑ سکتی تھی۔

دوسرے دن صبح سویرے ہی شانزہ گفٹ لیے اس کے کمرے میں چلی آئی۔

"سوری یار کل نہیں پہنچ سکی ہیپی برتھ ڈے۔" وہ اس سے ہاتھ ملا کر خلوص سے بولی۔

"کوئی بات نہیں تم بھی کل ہوتیں تو بڑا مزا آتا رئیلی بہت مس کیا تمہیں۔" وہ سفید جھوٹ بہت آسانی سے بول گئی تھی۔

"میرا بھی بہت جی چاہ رہا تھا مگر تھوڑا سا ٹمپریچر ہو گیا تھا سوچا آج وش کر لوں۔" وہ اس کے بیڈ پر بے تکلفی سے بیٹھتے ہوئے بولی۔

"یہ تمہارا گفٹ۔" وہ ہلکے آسمانی رنگ کی پیکنگ میں لپٹا ہوا امپورٹڈ پرفیوم اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔

"تھینک یو۔" وہ اسے کھولتی ہوئے بولی۔

"واؤ زبردست تمہاری اور بہزاد کی پسند ہمیشہ بہت اعلا ہوتی ہے۔" اس نے اپنی پسندیدہ خوشبو دیکھتے ہوئے خوشی سے کہا۔

"اچھا! بہزاد نے کیا گفٹ کیا؟" شانزہ متجسس ہوئی۔

"اس نے بھی ایک زبردست چیز گفٹ کی ہے۔" وہ پرفیوم کو سائیڈ پر رکھتے ہوئے معنی خیزی سے بولی۔

"دکھاؤ نا ہم بھی ملاحظہ کریں کہ بہزاد صاحب کی پسند کیسی ہے۔" شانزہ عام سے لہجے میں گویا ہوئی تعبیر فوراً" اٹھ کر سامنے الماری کی طرف بڑھی اور اس کی سیف میں سے ایک نیلے رنگ کا مستطیل نما مخمل کا ڈبا نکال لایا اور اسے کھول کر شانزہ کے سامنے رکھ دیا اندر بہت نفیس گولڈ کی چین پڑی تھی جس کے لاکٹ پر انگریزی حروف تہجی سے تعبیر کا نام جگمگا رہا تھا۔ شانزہ کے چہرے پر ایک سایہ سا آکر گزر گیا تعبیر اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی اس کا چلایا ہوا تیر اپنے ہدف پر پہنچ گیا تھا۔

"پیارا ہے۔" وہ ڈبے کو بند کر کے تعبیر کی طرف کھسکاتے ہوئے بولی۔

"مجھے تو کل بہزاد نے حیران ہی کر دیا، پارٹی کے سارے انتظامات اس نے اپنے ہاتھوں سے کیے میرے منع کرنے کے باوجود اس نے اچھی خاصی ڈیکوریشن کر ڈالی۔" وہ شانزہ کی حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے

جھوٹ پر جھوٹ بولنے لگی اور وہ اس ساری من گھڑت صورت حال کو بے یقینی سے سن رہی تھی۔

"اوہو' باتوں میں مجھے خیال ہی نہیں رہا تم بیٹھو میں چائے کا کہہ کر آتی ہوں۔" وہ بیڈ سے اٹھ کر باہر چلی گئی۔

وہ اسے منع کرنا چاہتی تھی مگر نہ کر سکی الفاظ اس کے اندر ہی کہیں گھٹ کر رہ گئے تھے۔ اس کی نظریں ایک بار پھر مخملیں ڈبے کی طرف چلی گئیں جو اس کے سامنے ہی دھرا تھا۔

"اچھا تو تم مجھے ہی بے وقوف بناتے رہے۔ بہزاد؟" وہ لب کاٹتے ہوئے سوچنے لگی۔ تعبیر سے بے زاری اور نفرت کی خود ساختہ کہانیاں سنا کر وہ کیا ثابت کرنا چاہتا تھا وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی وہ مسلسل ڈبیا پر نظریں گاڑے ہوئے تھی۔ اسے بہزاد کی دوغلی پالیسی پر شاک سا لگا تھا۔ آخر وہ اسے اندھیرے میں کیوں رکھ رہا تھا وہ ڈبل گیم کیوں کھیل رہا تھا۔ ایک طرف اسے اور دوسری طرف تعبیر کو خوش رکھا ہوا تھا اور وہ کس جگہ پر تھی اس نے اپنے دل کو ٹٹول کر دیکھا کیا وہ تعبیر سے حسد کرنے لگی تھی مگر اس کا جواب نفی میں تھا اسے جیلسی کی بجائے دکھ ہو رہا تھا کیونکہ وہ بہزاد کی محبت میں اس قدر نہیں ڈوبی تھی کہ اسے حسد جیسی منفی کیفیات سے گزرنا پڑے مگر بہزاد کی یوں تعبیر پر وارفتگی اور التفات اسے حیران ضرور کر گئے تھے بہزاد کے قول و فعل کے تضاد نے اسے شدید تکلیف دی تھی۔ جتنی دیر وہ بیٹھی رہی تعبیر سے زبردستی ہنستی بولتی رہی جیسے ہی اس نے چائے ختم کی وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ تعبیر اسے ڈرائنگ روم تک لے آئی۔ اسی اثناء میں بہزاد اندر داخل ہوا تھا۔

"ارے تم اتنی صبح صبح کیسے نازل ہو گئیں۔" شانزہ کو سامنے دیکھ کر اسے خوشگوار سی حیرت ہوئی تھی۔

"میں تعبیر سے ملنے آئی تھی۔" وہ چاہنے کے باوجود بھی مسکرا نہ سکی۔

"اتنی جلدی جا رہی ہو' بیٹھو کچھ دیر!" وہ بائیک کی چابیاں ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولا۔

"آج سنڈے ہے مجھے مما کے ساتھ بازار جانا ہے رک نہیں سکتی۔" یہ کہہ کر اس نے سامنے صوفے پر بیٹھ کر ٹی وی دیکھتے تیمور کو بلایا۔

"تیمور مجھے گھر چھوڑ آؤ فیصل پتا نہیں کس وقت آئے!" وہ فیصل کے ساتھ آئی تھی اور اسے یہ کہہ کر واپس بھیج دیا تھا کہ وہ دوپہر تک ادھر ہی رکے گی مگر اب اسے اپنا پروگرام تبدیل کرنا پڑا تھا۔

"میں چھوڑ آتا ہوں۔" اس سے پہلے کہ تیمور اٹھتا بہزاد بول اٹھا۔

"نہیں تم آرام کرو میں تیمور کے ساتھ چلی جاؤں گی نو پرابلم!" اس نے کندھے اچکا کر کہا۔

"تیمور اٹھو۔" تعبیر نے بھائی کو آنکھیں دکھائیں وہ ریموٹ صوفے پر پھینک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"اوکے تعبیر۔" وہ ہاتھ ہلا کر باہر نکل گئی۔

بہزاد مرقع حیرت بنا اسے جاتا دیکھتا رہا۔ تعبیر کے لیے یہ تمام صورت حال بہت خوش کن تھی اس نے ایک نظر حیران و پریشان کھڑے بہزاد پر ڈالی اور گنگناتے ہوئے واپس پلٹ گئی۔ اس کی چال کامیاب رہی تھی۔ دو دلوں کے درمیان پہلا بال آگیا تھا۔ محبت کی بساط پر جو چال اس نے چلی تھی وہ اس کے حق میں سود مند ثابت ہو رہی تھی اور اسے یقین تھا کہ آہستہ آہستہ وہ ساری بازی پلٹ دے گی۔

بہزاد دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ شانزہ کا اجنبی سا رویہ اسے نیزے کی دھار کی طرح لگا تھا۔ اس کی حالت الگنی پر لٹکے کپڑوں سی ہو رہی تھی بے حس و حرکت مگر اندر تلاطم برپا تھا۔ دوسرے روز وہ یونیورسٹی پہنچا تو دو پریڈ اٹینڈ کرنے کے بعد اردو ڈیپارٹمنٹ کی طرف چلا گیا۔ وہ بیگ کندھے پر لٹکائے کینٹین سے نکل رہی تھی آج وہ اس کے بغیر ہی کینٹین سے ہو آئی تھی۔

"شانزہ بات سنو۔" وہ تیزی سے اس کی طرف لپکا وہ ذرا سی رکی۔

"کیا بات ہے؟" وہ قریب آیا تو اس نے سپاٹ سے لہجے میں پوچھا۔

"یہی میں تم سے پوچھنے آیا ہوں' ایی پرابلم؟" وہ

سوالیہ نظروں سے شانزہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"تو۔" وہ اتنا کہہ کر آگے بڑھ گئی وہ بھی اس کے ہمراہ چلنے لگا۔

"شانی کچھ تو ہے بتاؤ' تمہارا رویہ بڑا عجیب سا ہو رہا ہے۔" وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولا۔

"کہا نا کچھ نہیں۔" وہ قدرے روکھے سے لہجے میں گویا ہوئی۔

"پلیز۔" وہ مصر ہوا وہ رک گئی۔

"کہا نا بہزاد کچھ بھی نہیں ہے' پلیز یوں میرے پیچھے پیچھے نہ پھرو لوگ کیا سوچیں گے۔" وہ درشتگی سے اتنا کہہ کر آگے بڑھ گئی اور وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا وہ تانا بانا سلجھانے آیا تھا مگر وہ تو مزید الجھ گیا تھا شانزہ کا یہ رویہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

☆ ☆ ☆

کبھی کبھی دل پہ چاہتا ہے
تمہاری شاموں کا حال پوچھوں
سوال پوچھوں
کہ فکر فردا میں کیسی گزری
یونہی کبھی میرا نام آیا تمہارے ہونٹوں پہ ایک پل کو
میری محبت کی یاد مہکی کبھی تمہارے بھی راستوں میں
کبھی عبادت کی کیفیت میں تمہیں بھی میرا گمان گزرا
تمہارے صحن دعا سے میرا بھی دھیان گزرا
کبھی تمہارے بدن پہ بھی شب' عذاب بن کر ٹھہر گئی تھی
کبھی دل یہ چاہتا ہے سوال پوچھوں
مگر میں چپ ہوں
ہمارے مابین یہ جو دیوار اجنبیت ہے
یہ غنیمت ہے
اسی میں توقیر حرف و لب ہے
یہیں پہ ترک و طلب کی حد ہے

عصر کا وقت ڈھل رہا تھا وہ کافی دیر سے پارک کے قدرے نیم تاریک اور ویران گوشے میں گھاس پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ وہ یہاں اکثر آتا رہتا تھا مگر آج اسے اردگرد کی کوئی چیز بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ پچھلے دو گھنٹوں سے وہ بیٹھا گھاس کے تنکے نوچ رہا تھا وہ خود وہاں موجود تھا مگر ذہن کہیں اور تھا اس بے چینی کی وجہ وہ بخوبی جانتا تھا۔ پچھلے چند دنوں سے شانزہ کا بدلا بدلا سا رویہ اور اجنبی پن اسے شدید کوفت میں مبتلا کر رہا تھا۔

پچھلے دو ہفتوں میں اس کی شانزہ سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ اسے مسلسل نظر انداز کیے ہوئے تھی۔ اس کی حالت ایسے مجرم کی سی تھی جسے اپنا جرم تک معلوم نہ ہو اور اس پر فرد جرم بھی عائد کی جا چکی ہو۔ وہ گہری سانس لے کر دور پارک میں دوڑتے بھاگتے بچوں کو بے دھیانی سے دیکھنے لگا۔ اس کا ذہن ابھی بھی ادھر ہی اٹکا تھا۔ اس نے وجہ معلوم کرنے کے لیے شانزہ سے ایک دوبار بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ بہت عجیب سے انداز میں اسے ٹال کر راستہ بدل لیتی اور وہ بے بسی سے اسے جاتا دیکھتا رہتا۔ اس نے اپنے تئیں اسے قائل کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ جیسے نہ بولنے کا تہیہ کر کے بیٹھی تھی۔

"ٹھیک ہے شانزہ بی بی! جیسے تمہاری مرضی کہ تم خود ہی راستے الگ کرنے پر تلی بیٹھی ہو مگر تمہیں شاید یہ معلوم نہیں کہ جو تعلق بلاوجہ قطع کیے جائیں وہ عمر بھر کا پچھتاوا بن جاتے ہیں۔" وہ بوجھل قدموں سے اینٹوں کی بنی روش پر چلتے ہوئے سوچنے لگا۔

"اتنی دیر سے کہاں تھے تم؟" وہ جیسے ہی شام کو گھر داخل ہوا کاریڈور سے گزرتے ہوئے اس کی تعبیر سے مڈبھیڑ ہو گئی۔

"پارک میں گیا تھا واک کے لیے۔" وہ اتنا کہہ کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔

"مگر یہ کون سا وقت ہے واک کرنے کا وہ تو تم صبح کرتے ہو۔" وہ اس کی معیت میں چلتی ہوئی کمرے تک آگئی۔

"واک کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں، کسی بھی وقت کی جاسکتی ہے۔" وہ بے زاری سے بیڈ پر بیٹھ کر بوٹوں کے تسمے کھولنے لگا۔

"مگر تم اس سے پہلے تو اس وقت واک نہیں کرتے تھے۔" وہ بھی بال کی کھال اتارنے بیٹھی تھی۔

"تمہارا مطلب ہے میں جھوٹ بول رہا ہوں۔" اس کے ماتھے پر شکن سی نمودار ہوئی ایک تو پہلے ہی اس کا سر درد سے پھٹا جارہا تھا اوپر سے تعبیر کی بے جا تفتیش نے اس کی طبیعت مکدر کردی تھی۔

"میرا مطلب۔"

"تمہارا مطلب جو بھی ہے پلیز مجھے اس وقت آرام کرنے دو۔" وہ اس کی بات کاٹ کر ترش لہجے میں بولا تو اسے بھی تاؤ سا آگیا۔

"سوری بہزاد صاحب! میں آپ کے آرام میں مخل ہوئی اگر یہ بات میرے بجائے شانزہ پوچھتی تو آپ یقیناً" اسے بہت تفصیل سے بتاتے یہی تو فرق ہے اس میں اور مجھ میں۔" وہ طنزیہ انداز میں اتنا کہہ کر واپس مڑنے ہی لگی تھی کہ بہزاد بجلی کی سرعت سے اٹھا اور اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف موڑ لیا۔ تعبیر کے لیے یہ بہت غیر متوقع تھا وہ ایک جھٹکا کھا کر اس کی جانب مڑی۔

"آج کے بعد اس کا ذکر میرے سامنے مت کرنا ورنہ بہت برا ہوگا، تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تم ہر بات میں میرا، اس کا یا اپنا موازنہ کرو۔" وہ تقریباً" غراتے ہوئے بولا وہ سہم کر گنگ سی اسے دیکھنے لگی۔ اسے بہزاد کی آنکھوں سے پہلی بار خوف سا آیا تھا جن میں غصہ، دکھ، شکوہ اور نجانے کیا کیا تھا۔

"بہزاد میں اس کو۔"

"کہا نا آئندہ کبھی میرے سامنے اس کا نام مت لینا۔" وہ ذرا سا منمنائی ہی تھی کہ بہزاد نے اس کی بات اچک لی اور اسے دروازے سے ایک طرف ہٹاتے ہوئے دھاڑ کی آواز کے ساتھ دروازہ بند کرکے باہر نکل گیا۔ وہ حیرت زدہ بت بنی کمرے کے وسط میں کھڑی تھی۔ اس نے بہزاد کا یہ روپ پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ جو اس کے لیے نیا اور توقع کے برعکس تھا۔ وہ تو بہت ٹھنڈے مزاج کا انسان تھا۔ تعبیر نے اپنی زندگی میں پہلی بار بہزاد کو اس قدر طیش میں دیکھا تھا۔ وہ شانزہ کے نام پر اس قدر بھڑکا کیوں تھا وہ نہیں سمجھ پارہی تھی۔

وہ کچھ دیر بے چینی سے کاریڈور میں چکر کاٹتا رہا وہ اپنے کمرے میں گیا تو آرام کی غرض سے تھا مگر تعبیر کے فضول سوالات نے اس کے ذہن کو مزید الجھا دیا تھا اسے اور کچھ نہ سوجھا تو وہ آغا جان کے کمرے کی طرف چلا آیا۔ وہ کمرے کے ایک کونے میں وہیل چیئر پر بیٹھے نماز پڑھ رہے تھے۔ بیڈ پر ان کی کتاب کھلی پڑی تھی۔ جس کے اوپر ان کا چشمہ دھرا تھا۔ وہ خاموشی سے صوفے پر بیٹھ کر ان کے نماز سے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ نماز ختم کرنے کے بعد ان کی نظر چپ چپ بیٹھے بہزاد پر پڑی تو وہ سمجھ گئے کہ کوئی معاملہ ضرور درپیش ہے۔ وہ وہیل چیئر کو حرکت دے کر اپنے بیڈ کے قریب لائے تو بہزاد نے آگے بڑھ کر انہیں بیڈ پر منتقل ہونے میں مدد دی۔

"تھینک یو بیٹا۔" وہ بیڈ پر بیٹھ کر ممنونیت سے بولے۔ بہزاد ہٹ کر دوبارہ صوفے پر بیٹھنے لگا تو انہوں نے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔

"یہاں بیٹھو میرے پاس۔" وہ ان کے قریب ٹک گیا۔

"کیا بات ہے تم آج کچھ پریشان سے لگ رہے ہو۔" وہ کھوجنے والے انداز میں اسے دیکھنے لگے۔

"کچھ نہیں آغا جان بس ایسے ہی۔" وہ کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے بجھے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔

"تم مجھ سے وہ کیوں چھپا رہے ہو برخوردار جو تمہارے لٹکے ہوئے چہرے سے عیاں ہے۔" وہ اس کے ہاتھ کو شفقت سے تھپکا کر بولے۔

"آج مما اور بابا بہت یاد آرہے تھے پتا نہیں کیوں؟" وہ کتاب ایک طرف رکھ کر قالین کی طرف دیکھنے لگا۔ اب وہ آغا جان کو کیا بتاتا کہ اس کی اداسی کی وجہ کون ہے۔

"لیکن تمہاری پریشانی کی وجہ یہ بھی نہیں ہے تم

شاید مجھے بتانا نہیں چاہتے۔" آغا جان کے لہجے میں شکوہ سا عود آیا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے آغا جان نے اس کے اندر تک جھانک لیا تھا اور اس کی اداسی کی وجہ بھانپ گئے تھے اس نے لب کھولنے سے پہلے ایک نظر ان کی طرف دیکھا۔

"بولو کیا بات ہے۔" وہ منتظر بھی تھے اور مصر بھی اور اسے بتانا پڑا۔

"شانزہ ناراض ہے آغا جی۔" اتنا کہہ کر اس نے دوبارہ قالین پر نظریں مرکوز کردیں۔

"کیوں ناراض ہے؟" انہوں نے حیرانی سے بہزاد سے پوچھا۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم کہ وہ کس وجہ سے ناراض ہے۔" وہ گہری سانس لے کر کھڑکی سے باہر گہری ہوتی شام کو دیکھنے لگا۔

"تو معلوم کرو نا کوئی بلاوجہ ناراض تھوڑی ہوا کرتا ہے۔" وہ چشمہ اٹھا کر اپنی ناک پر ٹکاتے ہوئے بولے۔

"مجھے تو بلاوجہ ناراض لگ رہی ہے وجہ ہوتی تو ضرور بتاتی، ٹھیک ہے ایک بار یہ شوق بھی پورا کرلے میں بھی اب اس کی منتیں کرنے نہیں جاؤں گا۔" خفگی اس کے چہرے پر ثبت تھی۔

"اگر تم دونوں اپنی ضد پر اڑے رہے تو اس طرح تو معاملہ مزید خراب ہوگا کسی ایک کو تو پہل کرنی ہوگی۔" وہ اسے رسان سے سمجھاتے ہوئے بولے۔

"آغا جان معاملہ وہ خود بگاڑنے پر تلی ہوئی ہے اور منانے میں پہل بھی میں نے کی ہے مگر وہ سنتی ہی نہیں!" وہ زچ ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہوسکتا ہو اسے تمہارے متعلق کوئی غلط فہمی ہوگئی ہو تم ایک کوشش اور کرو دیکھو ہوسکتا ہے وہ مان جائے۔" آغا جان شانزہ کو قصوروار ٹھہرانے سے ہچکچا رہے تھے۔ وہ خاموش رہا۔

"تم ایسا کرو آج یا کل پھپھو کے گھر سے ہو آؤ سب سے مل بھی لینا اور اسے بھی منا لینا اور ہوسکتا ہے منانے کی نوبت ہی نہ آئے وہ اس بات پر ہی خوش ہوجائے کہ تم اس کے گھر آئے ہوا!" آغا جان نے اسے نئی راہ سجھائی۔

"دیکھتا ہوں کل تو نہیں سنڈے کو چکر لگاؤں گا۔" وہ جیسے ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا آغا جان سے بحث کرنا عبث تھا۔

"جب بھی جاؤ لیکن جانا ضرور یہ چھوٹی چھوٹی غلط فہمیاں دلوں کے اندر دراڑیں ڈال دیتی ہیں جنہیں بعد میں بھرنا بہت مشکل ہوجاتا ہے۔" آغا جان نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ طویل سانس کھینچ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"اوکے آپ آرام کیجیے۔" وہ اتنا کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

کچھ بھی تو نہیں ویسا
جیسا تجھے سوچا تھا
جتنا تجھے چاہا تھا
محسوس یہ ہوتا ہے
دکھ جھیلے تھے جواب تک
بے نام مسافت میں
بے سود ریاضت تھی
بے فیض عبادت تھی
جو خواب بھی دیکھے تھے
ان جاگتی آنکھوں نے
سب خام خیالی تھی
پھر بھی تجھے پانے کی
دل کے کسی گوشے میں
خواہش تو بچالی تھی

وہ یونیورسٹی کے نیو کیمپس کی سرسبز گھاس پر بیٹھی گھٹنوں پر ٹھوڑی جمائے گھاس نوچنے میں مصروف تھی۔ موسم نے یکبارگی اپنا انداز بدلا تھا۔ اب فضا میں خنکی کا احساس قدرے کم ہو رہا تھا نیو کیمپس میں جابجا گیندے کے پھول اپنی دلکشی اور جوبن کے ساتھ کھلے تھے۔ وہ پتا نہیں کب سے اسی انداز میں بیٹھی تنکا تنکا کرکے گھاس نوچ رہی تھی۔ بہزاد اس کو

ڈھونڈتا ہوا اس طرف آنکلا وہ کسی گہری سوچ میں غلطاں تھی۔ بہزاد اس سے کچھ فاصلے پر رک گیا آج وہ کافی دنوں بعد اسے نظر آئی تھی۔

وہ یونیورسٹی تو آرہی تھی مگر وہ جانتا تھا کہ وہ دانستہ طور پر اس کا سامنا کرنے سے کترا رہی تھی۔ پہلے اس نے واپس مڑنے کا ارادہ کیا کہ دل میں اتنا جاگ اٹھی تھی مگر پھر ذہن میں آغا جان کے الفاظ گونجے تھے وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اس کی طرف بڑھنے لگا وہ اس کی آمد سے بے خبر جوں کی توں بیٹھی رہی۔ اس کی سیاہ رنگ کی مخصوص فائل اس کے قریب رکھی تھی جس کے اوپر چند کاغذات بے ترتیبی سے بکھرے پڑے تھے جو اس بات کی غمازی کررہے تھے کہ انہیں شانزہ کی توجہ نصیب نہیں ہوئی اور وہ اس کی بے التفاتی کا شکار ہو کر یونہی بکھرے تھے۔ وہ اس کے بالکل قریب آن کھڑا ہوا وہ ذرا سی آہٹ محسوس کرکے چونکی اور پھر اوپر سر اٹھا کر دیکھا بہزاد عین اس کے سامنے کھڑا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے نظروں کا زاویہ تبدیل کرلیا اور پھر ٹھوڑی گھٹنوں پر جما کر گھاس کے تنکوں سے کھیلنے لگی۔ جیسے بہزاد وہاں موجود ہی نہ ہو۔ وہ کچھ لمحے مہر بہ لب کھڑا رہا پھر عین اس کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گیا۔

"کب تک نظریں چراتی رہو گی مجھ سے، کھل کر مجھ سے لڑلو وہ زیادہ اچھا نہیں ہے ایسی ناراضی کا فائدہ؟" گفتگو میں پہل اس نے ہی کی۔

"تمہیں کس نے کہا کہ میں تم سے ناراض ہوں۔" وہ سپاٹ سے انداز میں بولی مگر بہزاد کی طرف دیکھنے کی بجائے اپنے مشغلے میں مصروف رہی۔

"اچھا تو پچھلے دس دن سے آپ میرے ساتھ مذاق فرمارہی ہیں میں سمجھا آپ سیریس ہیں شاید مجھے سمجھنے میں غلطی ہوئی۔" بہزاد طنز کو مزاح میں سمو کر بولا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو، تمہیں واقعی سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے یہ تو بس مجھے خوش فہمی سی تھی کہ تم ہمیشہ درست سمجھتے ہو ہم دونوں نے ایک دوسرے کے بارے میں غلط اندازے لگائے ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔" اس کا انداز اگرچہ عام سا تھا مگر بہزاد لفظوں کی کاٹ محسوس کرسکتا تھا۔

"تم کہنا کیا چاہتی ہو، میرا خیال ہے تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے اگر کھل کر بات کرو تو الجھن دور ہو سکتی ہے۔" وہ اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھ رہا تھا جن میں اکھڑی گئی گھاس کے کئی چھوٹے چھوٹے تنکے تھے۔

"تمہیں ہی کوئی الجھن ہوگی میرے لیے تو سب کچھ واضح ہو گیا ہے۔" وہ کٹھور پن سے بولی تو اسے ایک دم غصہ آگیا۔

"ہاں تمہیں الجھن یا پریشانی کیوں ہوگی تم تو صرف میرے لیے الجھنیں پیدا کرتی ہو۔"

"کیا مطلب؟" وہ سوالیہ نظروں سے بہزاد کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"مطلب تم اچھی طرح سمجھ رہی ہو اتنے دن سے فضول میں ڈرامہ رچا کر پوچھتی ہو کیا مطلب۔" وہ تپ گیا۔

"میں نے کوئی ڈرامہ نہیں کیا ڈرامہ تو تم رچا رہے تھے، مجھے بہت دکھ ہوا ہے تمہارے دوغلے رویے پر بہزاد تم ایک نہیں دو لڑکیوں کو بے وقوف بنا رہے ہو وہ بھی ان کو جن سے تمہارے خون کے رشتے ہیں۔" وہ شانزہ کی بات پر حیرت اور ناسمجھی سے اسے تکنے لگا۔

"کس کو بے وقوف بنایا ہے میں نے کیا کہہ رہی ہو تم۔" اسے شانزہ کی ذہنی حالت پر شک سا ہوا۔

"بہزاد اگر تم تعبیر کو پسند کرتے ہو تو میرے سامنے اتنا بننے کی کیا ضرورت تھی ایسی بھی کیا پردہ پوشی، تعبیر پر اپنی محبتیں تم ویسے بھی نچھاور کر سکتے تھے مجھ سے چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔" وہ بالآخر اپنے اندر کا غبار باہر لے ہی آئی تھی۔ بہزاد استعجاب کے عالم میں اسے دیکھ رہا تھا۔

"اگر مجھے تعبیر ساری بات نہ بتاتی تو میں پتا نہیں کب تک تمہارے ہاتھوں فول بنتی رہتی۔"

"کون سی بات کیسی محبتیں تم کیا بات کررہی ہو میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کیا بتایا ہے تعبیر نے تمہیں۔" جب اس کو کچھ بھی واضح نہ ہو سکا تو وہ زچ ہو کر بولا شانزہ نے ساری صورت حال اس کے گوش گزار کردی وہ لب بھینچے شانزہ کو دیکھتا رہا۔

"اور تم نے یقین کرلیا۔" وہ تھوڑی دیر بعد آہستگی سے گویا ہوا۔

"تو اور کیا کرتی۔" وہ دور سفیدے کے درختوں کو دیکھ کر بولی۔

"تم نے اس پر اعتبار کرلیا، مجھ پر نہیں۔" وہ افسوس اور دکھ سے بولا تو شانزہ نے نظریں اس پر جمادیں۔

"محبت کے معاملے میں یقین بہت جلدی ڈگمگا جاتا ہے بہزاد اور اس نے تو مجھے ایسی سچائی سے یقین دلایا کہ میرے پاس اس کی بات ماننے کے سوا چارہ نہ تھا۔"

"یہ جانتے ہوئے بھی کہ تعبیر کسی بھی حد سے گزر سکتی ہے تم اس کی چال میں آگئیں اگر کوئی اور اس طرح مجھے تمہارے بارے میں بدگمان کرتا تو میں کبھی یقین نہ کرتا اور تم نے اتنی بڑی بات کو مجھ سے منسوب کرکے خود کو مجھ سے دور کرلیا۔"

وہ تاسف سے اسے دیکھ رہا تھا اور شانزہ کو ندامت اور شرمندگی کے احساس نے آن گھیرا تھا۔

"کیا محبت واقعی اتنی کمزور ہوتی ہے کہ وہ شک اور بدگمانی کی زد میں آکر معدوم ہو جائے۔" وہ اسے مزید شرمندہ کرنے پر تلا ہوا تھا۔ بدگمانی اور غلط فہمی کے بادل چھٹے تو شانزہ کو تمام منظر واضح نظر آنے لگا تھا۔

"آئی ایم سوری!" وہ کچھ دیر بعد دھیمی آواز میں اتنا ہی کہہ سکی۔

"یہ لفظ اتنے دنوں کے کرب اور کشمکش کی تلافی نہیں کرسکتا شانی۔" وہ گہری سانس لے کر بولا۔

"تو کیا اب ناراض ہونے کی تمہاری باری ہے۔" وہ ذرا سا مسکرائی۔

"میں تمہاری طرح عقل سے پیدل تھوڑی ہوں۔" اس نے ترت جواب دیا تو وہ ہنس پڑی۔

"پھر تلافی کس طرح ممکن ہے؟" وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔

"کیسی تلافی، تم نے مجھے بے قصور قرار دے دیا یہی بہت ہے۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"پلیز شرمندہ مت کرو۔" وہ بھی فائل اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔

"پھر ایسا کرو آئس کریم ہی کھلا دو کچھ تلافی تو ہو جائے گی۔" وہ شرارت سے بولا تو وہ سرہلا کر کینٹین کی طرف چل پڑی۔

☆ ☆ ☆

شام کی تاریکی دھیرے دھیرے اپنے پر پھیلانے لگی۔ سورج کی نارنجی شعاعیں وسیع و بسیط آسمان سے غائب ہونے لگیں۔ پرندوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں جو صبح دم تلاش رزق میں نکلی تھیں اب اپنے اپنے گھونسلوں کی جانب محو پرواز تھیں۔ بہزاد ٹیبل پر رکھی اپنی پسندیدہ کتاب "جنٹل مین بسم اللہ" کو بے دھیانی سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے تھک کر کتاب بند کردی وہ پچھلے ایک گھنٹے سے اپنے ذہن کو یکسوئی دینے میں ناکام رہا تھا۔

اس کا دماغ مسلسل اسی بات کو سوچے جارہا تھا کہ تعبیر نے اتنا بڑا ڈرامہ کیوں رچایا وہ ان اوچھے ہتھکنڈوں سے کیا نتائج حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ آج تعبیر سے سارا حساب بے باق کرنا ہو گا اس کی نرمی اور بے تکلفی نے اسے اتنا حوصلہ بخش دیا تھا کہ وہ ان دونوں کے مابین غلط فہمیاں پیدا کرنے سے بھی نہیں چوکی وہ دونوں کرب کی آگ میں جلتے رہے اور وہ مزے سے تماشا دیکھتی رہی۔ وہ اچانک اٹھا اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ اس نے پہلے کچن میں جھانکا وہاں تعبیر کی بجائے صبا کھٹ پٹ کرنے میں مصروف تھی وہ یہ دیکھ کر واپس پلٹ گیا اور تعبیر کے کمرے کی طرف چلا آیا کمرے کا دروازہ بند تھا مگر اندر بجنے والے بے ہنگم میوزک کی آواز باہر کاریڈور تک آرہی تھی۔ اس نے دروازے کو پہلے ہلکے ہاتھوں سے دستک دی مگر جب اس نے نوٹس نہ لیا تو اس نے پوری قوت سے دھڑ دھڑایا۔

اگلے ہی لمحے وہ دروازے کے دونوں پٹ کھولے اس کے روبرو کھڑی تھی۔ وہ اس کی آنکھوں میں حیرانی اور استعجاب دیکھ سکتا تھا ایسا موقع شاذونادر ہی آتا تھا کہ وہ کسی کام کے لیے تعبیر کے کمرے تک آئے۔

"زہے نصیب! آج آپ کیسے رستہ بھول پڑے میں بھی سوچوں یہ انجان سی دستک کس کی ہے۔" اس کی مسکراہٹ میں حیرت کے ساتھ ساتھ طنز کی بھی آمیزش تھی۔

"مجھے تم سے ایک بات کرنا تھی۔" وہ حد درجہ ضبط سے گویا ہوا۔

"ضرور! کیا دروازے پر کھڑے کھڑے سب کہہ دو گے اندر آجاؤ۔" وہ دروازے سے ایک طرف ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دے کر بولی۔

وہ کچھ سوچ کر اندر چلا آیا ورنہ طے یہی تھا کہ دروازے پہ کھڑے کھڑے اس کی طبیعت صاف کر ڈالے مگر وہ تہذیب اور شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ کمرے کے اندر میوزک اب بھی بج رہا تھا کسی بے ہنگم اور تیز یورپی میوزک کی صوتی لہریں کمرے کے آسودہ ماحول کو پریشان کیے ہوئے تھیں۔ بہزاد کو ایسے میوزک سے سخت کوفت ہوتی تھی تعبیر نے آگے بڑھ کر پلیئر کا بٹن آف کردیا تو ایک دم سکون کا احساس ہوا۔ لیکن بہزاد کے اندر اب بھی جھکڑ سے چل رہے تھے۔

"بیٹھو۔" تعبیر نے اسے سامنے دھری کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"نہیں میں بیٹھنا نہیں چاہتا تم سے کچھ پوچھنا تھا۔" وہ سپاٹ سے لہجے میں بولا۔

"پوچھو۔" وہ دونوں بازو لپیٹ کر سینے پر باندھے ہوئے اطمینان سے گویا ہوا۔

"تم نے شانزہ سے جھوٹ کیوں بولا۔"

بہزاد نے دوٹوک الفاظ میں پوچھا تو اس کے چہرے کا رنگ ایک دم سفید پڑ گیا۔

"کک۔ کیسا جھوٹ؟" وہ گھگھیا کر بولی۔

"تم جانتی ہو میں کون سے جھوٹ کی بات کر رہا ہوں۔" وہ چبھتے ہوئے انداز میں گویا ہوا۔

"تم نے میرے اور اس کے درمیان بہت بڑی غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔"

"تم۔ میں نے تو مذاق کیا تھا اور وہ سچ مان گئی۔" اس نے فوراً" پینترا بدلا۔

"یہ مذاق نہیں ایک سوچی سمجھی سازش تھی مگر افسوس تمہاری اس سازش سے پردہ بہت جلد ہی اٹھ گیا کیوں کیا تم نے ایسا؟" وہ غرا کر بولا۔

"دیکھو میں نے کہا نا یہ سب میں اسے تنگ کرنے کے لیے کیا تھا جسٹ فار انجوائے منٹ۔" وہ کندھے اچکا کر بولی۔

"لیکن اتنے دن گزرنے کے باوجود بھی تم نے اس مذاق کی وضاحت نہیں کی صرف اس لیے کہ یہ مذاق یا غلط فہمی ہمارے درمیان دیوار ڈال دے۔" وہ زہر خند لہجے میں بولا۔

"میرا نہیں خیال تھا کہ شانزہ اس حد تک بے وقوف ہو سکتی ہے۔ ورنہ میں اسی وقت کلیئر کردیتی۔" وہ معصومیت سے بولی تو بہزاد جل کر رہ گیا۔

"چھوڑو اس بات کو میں صرف یہ کہنے آیا تھا کہ تم ان اوچھی حرکتوں سے میرے دل میں اپنا مقام بنا نہیں گرا رہی ہو اور یہ حرکت جو تم نے اب کی ہے تم کیا سمجھتی ہو اس کے بعد میں تمہارے آگے بچھ بچھ جاؤں گا۔" وہ اس کے روبرو ہوا۔

"ایک بات تو بتاؤ بہزاد۔" وہ کچھ دیر بعد عام سے لہجے میں گویا ہوئی وہ خاموش کھڑا رہا۔

"وہ کیا ہے۔ جو شانزہ میں ہے اور مجھ میں نہیں نہیں جتنا تمہارے قریب آتی ہوں تم اتنا دور بھاگتے ہو کیا جادو کر رکھا ہے اس نے تم پر۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔

"کسی نے کوئی جادو نہیں کیا اور میں نے پہلے بھی تم سے کہا ہے کہ اپنا موازنہ شانزہ سے مت کیا کرو' وہ میری ایک اچھی کزن اور اچھی دوست ہے۔ جو بھی رشتہ ہے ہمارے درمیان وہ بہت پاکیزہ اور کھرا ہے۔" وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اس پر واضح کرتے ہوئے بولا۔

"تم اس کو مجھ پر ترجیح دے رہے ہو؟" وہ سوالیہ انداز میں بہزاد کی طرف دیکھنے لگی۔

"بات ترجیح یا فوقیت دینے کی نہیں ہے' کوئی زبردستی کسی کے دل میں جگہ بنا سکتا ہے نہ کسی کو نکال سکتا ہے اور میں کسی کا پابند نہیں ہوں کہ اس کے اشاروں کا تابع ہو کر اپنی زندگی گزاروں۔" وہ صاف گوئی سے بولا۔

"میں تمہیں پابند کر بھی نہیں رہی' جیسے چاہو اپنی زندگی گزار سکتے ہو مگر تم مجھے بھی پابند نہیں کر سکتے میں جیسے چاہوں گی ویسا کروں گی' اسے تم میری ضد سمجھ لو یا محبت اس میں کسی تیسرے کو برداشت نہیں کر سکتی وہ شانزہ ہو یا کوئی اور۔" جیسے حتمی فیصلہ سناتے ہوئے بولی وہ لب بھینچے اسے دیکھتا رہا وہ واقعی اسے اپنی ملکیت سمجھ رہی تھی اور وہ اس بات سے چڑتا تھا۔

"کیا کرو گی تم؟" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"یہ تو وقت بتائے گا کہ میں کیا کروں گی مگر اتنا ضرور یاد رکھنا کہ میں تم سے شدید محبت کرتی ہوں اور اس کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔" اس کے لہجے کی مضبوطی ابھی بھی جواں تھی۔

"اگر واقعی محبت کرتی ہو تو محبت تو قربانی کا تقاضا کرتی ہے تم کو محبت سے مطلب ہونا چاہیے اس کے حصول سے نہیں' طالب کو مطلوب کی فکر نہیں ہوتی۔"

"اب ایسی فلسفیانہ سوچ نہیں چلتی بہزاد صاحب' یہ ضروری نہیں کہ عورت ہی ہمیشہ قربانی کی زمین کو سینچتی رہے۔" وہ اتنا کہہ کر اس کے پاس سے گزر کر باہر نکل گئی۔ وہ گہری سانس لے کر قالین کے ڈیزائن کو دیکھنے لگا تعبیر کو اپنے کیے پر اب بھی ذرا ندامت نہ تھی جو کچھ وہ کر رہی تھی وہ اس میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھ رہی تھی۔ کبھی بہزاد کو اس پر نفسیاتی مریض کا گماں ہونے لگتا تھا جس کا جھکاؤ منفی طرز عمل کی طرف تھا۔ بہزاد نے اب مستقل چپ سادھ لینے کا فیصلہ کیا تھا اب وہ اسے سختی سے نہیں نرمی سے سمجھانے کے بارے میں سوچنے لگا۔

☼ ☼ ☼

شانزہ نے دوپٹہ استری کرنے کے بعد پلگ اتار دیا ملازمہ پچھلے دو دن سے چھٹی پر تھی جس کی وجہ سے اسے گھر کی صفائی ستھرائی بھی کرنا پڑی تھی حالانکہ آج سنڈے تھا اور وہ آرام کرنا چاہ رہی تھی مگر آرام کی بجائے اس نے چھوٹے موٹے کاموں کو نبٹانے کا سوچا جو کئی دن سے سر اٹھائے کھڑے تھے پچھلے چالیس منٹ سے کھڑے ہو کر کپڑے استری کرنے کی وجہ سے اس کی کمر تختہ ہو گئی تھی وہ تھک کر بیڈ پر بیٹھ گئی تھکن کا احساس کچھ کم ہوا تو وہ کچن میں چلی آئی تاکہ دوپہر کے کھانے کا کچھ انتظام کر سکے وہ سنڈے کے دن ماما کو ریسٹ دینا چاہتی تھی ان دنوں ان کی طبیعت بھی کچھ اچھی نہ تھی سو وہ ہاتھ بٹانے میں پیش پیش تھی۔

کچن میں آئی تو شہناز دوپہر کے کھانے کے لیے جتی ہوئی تھیں۔

"ارے آپ بیٹھیں نا' میں کر لیتی ہوں۔" وہ ان کے ہاتھ سے چھری لیتے ہوئے بولی جس سے وہ سبزی بنا رہی تھیں۔

"تم صبح سے کام میں لگی ہو' تھوڑا آرام کر لو کچھ نہیں ہوتا۔" وہ سنک پر ہاتھ دھوتے ہوئے بولیں۔

"آپ کو ریسٹ کی ضرورت ہے ماما' اس طرح تو کام نہیں چلے گا پھر درد بڑھ گیا تو۔" وہ شیلف پر رکھے چاول چنتے ہوئے بولی۔

"بیٹا ان چھوٹے موٹے کاموں سے کچھ نہیں ہوتا اب یہ کمر اور گھٹنوں کا درد تو عمر کے ساتھ چلے گا اب بندہ سارا دن مریضوں کی طرح بیڈ پر پڑا رہے۔" وہ اپنی بیماری سے نالاں سی نظر آرہی تھیں۔

"چلیں آج تو میں گھر پہ ہوں آپ فی الحال جا کر لیٹ جائیں۔" وہ انہیں لاڈ سے پکڑ کر دروازے تک لے آئی انہیں چاروناچار کچن سے نکلنا پڑا۔ کھانا تیار کر کے وہ ٹی وی لاؤنج میں آکر بیٹھ گئی ابھی اس نے ریموٹ ہاتھ میں پکڑا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی وہ ریموٹ صوفے پر رکھ کر ٹیلی فون اسٹینڈ کی جانب

لپکی۔

"ہیلو۔" اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا دوسری طرف بہزاد تھا مگر نہایت گھبرایا ہوا اس نے پھوپھو کے بارے میں دریافت کیا۔

"وہ تو اپنے کمرے میں ہیں کیوں خیریت؟"

"خیریت نہیں ہے فاروق چچا کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے ہم انہیں لے کر ہسپتال آئے ہوئے ہیں۔" بہزاد نے نہایت پریشانی کے عالم میں اسے بتایا تو وہ بھی ایک دم گھبرا گئی۔

"میں بتاتی ہوں ماما کو ہم ابھی آ رہے ہیں۔" اس نے عجلت میں ریسیور پٹخا اور ماما کے کمرے کی طرف بھاگی۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ہسپتال میں تھیں فاروق احمد کو آئی سی یو میں رکھا گیا تھا۔ وہ دونوں بہزاد کی ہمراہی میں وہاں چلی آئیں جہاں تعبیر، تیمور اور ان کی امی کھڑی تھیں تعبیر رو رہی تھی شانزہ نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اللہ بہتر کرے گا تعبیر، ماموں ٹھیک ہو جائیں گے۔" اس نے سسکتی ہوئی تعبیر کو دلاسا دیا پھوپھو بھی بھیگی آنکھوں سے دعاؤں میں مشغول تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر نے بتایا کہ ان کی حالت اب خطرے سے باہر ہے تو سب نے اللہ کا شکر ادا کیا لیکن ڈاکٹرز کی ہدایات کے مطابق ابھی کچھ دن فاروق احمد کو ہسپتال میں رہنا تھا شانزہ شام کو فیصل کے ساتھ گھر واپس چلی گئی جبکہ شانزہ کی ماما ہسپتال میں ہی رک گئیں۔ تعبیر گھر جانے پر آمادہ نہ تھی مگر پھوپھو نے اسے بھی گھر بھجوا دیا کہ صبا اور آغا جان گھر میں اکیلے تھے سو وہ بھی کچھ دیر بعد تیمور کے ہمراہ گھر آ گئی۔ بہزاد ہسپتال میں ہی تھا۔ صبح وہ کھانا لینے کی غرض سے گھر گیا تو تعبیر کچن میں کھانا تیار کر رہی تھی۔

"کتنی دیر ہے۔" تھوڑی دیر بعد بہزاد نے اس سے پوچھا۔

"بس چند منٹ اور۔ میں قیمہ بھون لوں، سوپ تو میں نے تیار کر کے فلاسک میں ڈال دیا ہے۔" وہ عجلت میں ہاتھ چلاتے ہوئے بولی۔

"ذرا جلدی کرو میں پھوپھو اور آنٹی کو بس چند منٹ کا کہہ کر آیا تھا تم نے تو لمبا کام کر دیا۔" وہ سینے پر ہاتھ باندھے دروازے کے وسط میں بے زاری سے کھڑا تھا۔

"تم نے ناشتا کر لیا۔" اس نے بہزاد سے پوچھا۔

"نہیں مجھے بھوک نہیں ہے ویسے بھی ناشتا کرنے بیٹھ گیا تو دیر ہو جائے گی دس بجے ڈاکٹر نے راؤنڈ لینا ہے میرا وہاں ہونا ضروری ہے۔" اس نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا بیٹھ تو جاؤ اب میرے سر پر سوار رہو گے کیا؟" وہ ہاٹ پاٹ میں چپاتیاں رکھتے ہوئے بولی تو وہ اندر آ کر اسٹول پر بیٹھ گیا۔ وہ تیزی سے ہاتھ چلا کر کھانا پیک کرنے لگی۔

"اگر تم تھکے ہوئے ہو تو کچھ دیر آرام کر لو، میں تیمور سے کہہ دیتی ہوں وہ ہسپتال چلا جائے گا۔" وہ جانتی تھی کہ بہزاد تمام رات ہسپتال میں رہا ہے اور اس نے یہ رات یقیناً" آنکھوں میں کاٹی ہو گی وہ اس کے تھکے تھکے انداز سے اخذ کر چکی تھی کہ وہ تمام رات نہیں سویا۔

"نہیں میں ٹھیک ہوں۔" وہ آنکھیں رگڑ کر بولا۔

"جیسے تمہاری مرضی لیکن ناشتا ضرور کر لینا۔" وہ ٹفن میں قیمہ ڈالتے ہوئے بولی تو وہ سر ہلا کر رہ گیا۔ وہ بہت سرعت سے تمام سامان ترتیب سے پلاسٹک کی ٹوکری میں رکھ رہی تھی بہزاد چپ چاپ اس کی نقل و حرکت دیکھ رہا تھا کبھی کبھی اسے تعبیر کی شخصیت بہت بدلی ہوئی لگتی اور کبھی ایسا ہوتا کہ وہ بہت عامیانہ حرکتوں پر اتر آتی، کبھی اس کا بہزاد کے ساتھ رویہ اتنا اچھا ہوتا کہ وہ آپوں آپ شرمندہ سا ہو جاتا تو کبھی وہ بہزاد کو اپنا سب سے بڑا حریف سمجھ کر دو بدو مقابلے پر اتر آتی۔ اس کی طبیعت میں عجیب سا مدو جزر تھا۔ کبھی یوں لگتا کہ واقعی وہ اسے دیوانگی کی حد تک چاہتی ہے اور کبھی اس کی یہ کیفیت محض ایک ڈرامہ ہی لگتا کہ وہ صرف بہزاد کو زچ کرنے اور شانزہ سے حسد کرنے کی وجہ سے ایسا کرتی ہے وہ آج تک اس گتھلک کو نہیں سلجھا پایا تھا کہ تعبیر کا اصل روپ کون سا ہے۔

"کہاں کھو گئے بہزاد؟" تعبیر کی آواز پر وہ سوچوں کے بھنور سے باہر نکل آیا۔

"کھانا پیک ہو گیا ہے۔" وہ ٹوکری اٹھا کر اس کے سامنے کرتے ہوئے بولی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم بھی چلو گی ہسپتال!" کچن سے باہر نکلتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"میں تھوڑی دیر تک تیمور کے ساتھ آ جاؤں گی تم جاؤ۔" وہ سہولت سے انکار کرتے ہوئے دوبارہ واپس پلٹ کر کچن کا پھیلاوا سمیٹنے لگی۔

تین دن بعد فاروق احمد کو ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا تھا وہ اچانک بہت کمزور اور نحیف سے ہو گئے تھے جیسے بیماری کے ایک ہی جھٹکے نے ان کی ساری قوت زائل کر دی ہو۔ ڈاکٹرز نے انہیں ابھی مزید آرام کا مشورہ دیا تھا اور اس سلسلے میں گھر میں مکمل خاموشی کی تاکید کی گئی تھی جس پر حتی الامکان عمل کیا جا رہا تھا۔

فائنل ایئر کا آخری سمسٹر بھی اختتام کو پہنچا تھا۔ بہزاد اور شانزہ دونوں یونیورسٹی سے فارغ ہو گئے تھے بہزاد کو کسی اچھی پوسٹ پر اپلائی کرنے سے پہلے رزلٹ کا انتظار کرنا تھا۔ اور وہ بے چینی سے کر رہا تھا۔ بہزاد کی شانزہ کے لیے پسند آغا جان سے ڈھکی چھپی نہیں تھی اور اب وہ چاہ رہے تھے کہ کسی دن موقع ملنے پر وہ بہزاد سے بات کر کے شانزہ کا ہاتھ اس کے لیے مانگ لیں۔ ایک رات جب وہ آغا جان کو دودھ کا گلاس پکڑا رہا تھا انہوں نے اسے اپنے پاس بٹھا کر پوچھ ڈالا۔ وہ کچھ دیر حیرانی سے آغا جان کو دیکھتا رہا۔

"کیا دیکھ رہے ہو۔۔۔ بھئی کیا میں نہیں جانتا کہ تم کیا چاہتے ہو کہو تو تمہاری پھوپھو سے بات کروں۔" وہ اسے خاموش دیکھ کر دوبارہ گویا ہوا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں آغا جان لیکن آپ کچھ جلدی نہیں کر رہے ہیں میں چاہتا ہوں پہلے کوئی اچھی سی ملازمت تلاش کر لوں اپنے قدموں پر کھڑا ہو جاؤں پھر اس بارے میں سوچتے۔" وہ اپنی جگہ پر درست تھا مگر آغا جان کی بھی اپنی منطق تھی۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن تمہاری پھوپھو سے بات کر لینے میں کیا حرج ہے، بیٹیوں والوں کے سر پر بڑا بوجھ ہوتا ہے شہناز سے بات کرنے کے بعد کم از کم وہ تمہارے بارے میں اپنا ذہن تو بنا لیں گے شادی تو خیر بعد کی بات ہے تم مجھے فی الحال اپنی منشاء سے آگاہ کرو۔" وہ دودھ کا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولے تو بہزاد مسکرا دیا۔

"جیسے آپ کی مرضی آپ تو سب جانتے ہیں آغا جی۔" وہ ان کے ہاتھ دبا کر آہستگی سے بولا تو وہ بھی مسکرا دیئے۔

"سب جانتا ہوں اس لیے تو کہہ رہا ہوں۔" وہ شرارت سے گویا ہوئے تو وہ کسی کام کا بہانہ کر کے اٹھ آیا۔

☼ ☼ ☼

"شہناز مجھے تم سے ایک بات کرنا تھی۔" ویک اینڈ پہ وہ آغا جان کی طبیعت کا پتا کرنے آئیں تو انہوں نے موقع میسر آتے ہی بات چھیڑی اور وہ جو اٹھنے کا ارادہ کر رہی تھیں دوبارہ بیٹھ گئیں۔

"جی کہیے کوئی خاص بات ہے؟" وہ ان کے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے نرمی سے گویا ہوئیں۔

"ہاں خاص ہی سمجھ لو میں کتنے دنوں سے سوچ رہا تھا کہ خود چکر لگاؤں مگر وہی سستی سی غالب آ جاتی ہے آج تم خود آئی ہو بہتر ہے کہ تم سے بھی رائے لے لوں۔" وہ اپنی پشت پر تکیہ درست کرتے ہوئے بولے۔ وہ ہمہ تن گوش تھیں اور آغا جان تمہید باندھ رہے تھے۔

"میں نہیں جانتا بیٹا میری زندگی اب کتنی رہ گئی ہے۔ بہرحال اب تو یہی سمجھو کہ کوئی بھروسہ نہیں کب اجل کا بلاوا آ جائے میں چاہتا ہوں اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھ لوں۔" شہناز ناسمجھی کے عالم میں انہیں دیکھ رہی تھیں وہ ابھی تک ان کی تمہید سے کچھ بھی اخذ نہ کر پائیں۔

"شاید تم نے غور نہ کیا ہو مگر میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ شانزہ اور بہزاد ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ اگر دونوں بچے راضی ہیں تو ان کو ایک کرنے میں کوئی حرج نہیں۔" وہ اپنی بات ختم کر کے ان کی طرف دیکھنے لگے وہ خاموشی سے اپنے ہاتھوں کو دیکھے جا رہی تھیں شاید انہیں توقع نہیں تھی۔ کہ آغا جان اس موضوع پر بات کریں گے۔

"میری بات سن رہی ہو شہناز؟" آغا جان نے انہیں سوچ کے عمیق سمندر میں غرق پایا تو قدرے اونچی آواز میں پوچھا۔

"جی میں نے سن لی آپ کی بات مگر۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے دانستہ خاموش ہو گئیں۔

"ہاں ہاں بولو میں تم پر اپنی مرضی مسلط نہیں کرنا چاہتا بہزاد میرا پوتا ہے اور شانزہ نواسی مگر تم اپنی بیٹی کے بارے میں مجھ سے بہتر سوچ سکتی ہو۔" وہ شہناز کی خاموشی کو ناگواری پر محمول کرتے ہوئے گویا ہوئے تو وہ فوراً" بول پڑیں۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آغا جان دونوں آپ کے ہی بچے ہیں اور آپ سے بہتر ان کے بارے میں کون سوچ سکتا ہے مگر میں یہ سوچ رہی تھی کہ مجھ سے زیادہ فاروق بھائی کا حق بنتا ہے کہ بہزاد ان کا داماد بنے آخر انہوں نے بھی کچھ تو سوچ رکھا ہو گا۔ تعبیر کے بارے میں' یوں اچھا نہیں لگتا کہ میں تعبیر کے ہوتے ہوئے شانی کی بات کروں۔" وہ اپنے دل کے خدشات زبان پر لاتے ہوئے بولیں جو کسی حد تک درست بھی تھے۔

"مجھ سے ابھی تک فاروق نے ایسی کوئی بات نہیں کی مگر میں جانتا ہوں کہ وہ اس بات کا برا نہیں منائے گا کہ شانزہ اس گھر میں آجائے تم تسلی رکھو۔" آغا جان نے اپنے تئیں انہیں ضمانت فراہم کی۔

"وہ تو ٹھیک ہے آغا جان مگر وہ بھی بیٹیوں والے ہیں اگر منہ سے کچھ نہ بھی کہیں مگر دل میں تو خواہش ہوتی ہے میرا خیال ہے آپ پہلے ان سے بات کریں۔"

"جہاں تک مجھے سمجھ آئی ہے شہناز تم شاید خود کو اس رشتے پر راضی نہیں کر پا رہیں اگر ایسی بات۔۔۔"

"نہیں آغا جان ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے بول پڑیں۔

"بہزاد بہت اچھا اور سلجھا ہوا لڑکا ہے کوئی بھی اپنی بیٹی اسے بخوشی دے سکتا ہے میرا مطلب کچھ اور ہے میں تعبیر کو بھی اپنی شانزہ کی طرح سمجھتی ہوں دوسرا دونوں حال ہی میں اپنی پڑھائی سے فارغ ہوئے ہیں بہتر نہیں ہے کہ بہزاد پہلے کوئی جاب تلاش کر لے۔" وہ دھیمے دھیمے انداز میں آغا جان کو سمجھا رہی تھیں۔

"میرے لیے بھی تعبیر اور شانزہ میں کوئی فرق نہیں ہے مگر بات اتنی سی ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اگر بہزاد کے دل میں تعبیر کے لیے پسندیدگی ہوتی تو میں یقیناً" تمہارے بجائے فاروق احمد سے بات کرتا اور جہاں تک بہزاد کی جاب کی بات ہے تو میں بھی شادی کی بات نہیں کر رہا نسبت طے ہو جائے شادی تو ان شاء اللہ اسی وقت ہو گی جب وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو گا۔" آغا جان رسان سے بولے۔

"چلیں ٹھیک ہے میں آج ہی فون پر شانی کے پاپا سے بات کرتی ہوں مجھے امید تو ہے کہ اگلے ماہ وہ پاکستان آجائیں گے۔" شہناز نے اپنے شوہر حسن علی کے متعلق کہا جو روزگار کے سلسلے میں کینیڈا مقیم تھے۔

"دراصل بہزاد کی نہ تو ماں زندہ ہے نہ باپ جو اس کی زندگی کے بارے میں فیصلہ کریں یہ ذمہ داری بھی میرے ہی کمزور کندھوں پر ہے میں نہیں چاہتا کہ زندگی کے کسی موڑ پر اسے احساس ہو کہ اس کی خواہش کا احترام کرنے والے اس دنیا میں نہیں میں چاہتا ہوں کہ وہ خوش رہے۔" وہ گہری سانس لے کر گویا ہوئے۔

"آپ فکر نہ کریں آغا جان اسے کبھی ماں باپ کی کمی کا احساس نہیں ہو گا اگر ان دونوں کا ساتھ آسمانوں پر لکھا جا چکا ہے تو کوئی رد و بدل نہیں کر سکتا' بس آپ دعا کریں کہ ہمارا فیصلہ ان کے حق میں صائب اور بہتر ثابت ہو۔" وہ آغا جان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ

رکھتے ہوئے بولیں تو وہ ممنونیت سے شہناز کو دیکھنے لگے۔

ان کے نحیف چہرے پر عود آنے والی مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ ان کی آنکھوں کے گوشے بھی بھیگ سے گئے تھے اور یہ آنسو یقیناً" خوشی کے تھے جن سے ان کا پور پور معمور ہو گیا تھا۔ وہ آغا جان کی رائے کا ہمیشہ احترام کرتی آئی تھیں اور اب بھی انکار کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ وہ اٹھ کر باہر چلی گئیں تو آغا جان نے آنکھیں موند لیں۔

☼ ☼ ☼

حالات نے ایک نیا رخ اختیار کیا تھا جو شانزہ اور بہزاد کے لیے بہت خوش کن تھا۔ ان کے راستے میں اب کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ قدرت جیسے ان کی محبتوں کو امر کرنا چاہ رہی تھی سو ان دونوں کے ایک ہونے کے اسباب پیدا کر رہی تھی' آغا جان نے اس سلسلے میں فاروق احمد سے بھی بات کی۔ تو انہوں نے کوئی اعتراض نہ کیا مگر تعبیر کی امی زینت بیگم کو اچھا نہ لگا۔

"ہماری تعبیر میں کیا کمی تھی کہ آغا جان کو وہ نظر ہی نہیں آئی اور اپنی نواسی بھا گئی۔" رات کو وہ سونے سے قبل اپنے شوہر سے مخاطب تھیں۔

"انہوں نے کچھ سوچ کر ہی شانزہ کا انتخاب کیا ہو گا اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تعبیر میں کوئی خامی ہے۔" وہ ٹی وی چینل سرچ کرتے ہوئے آرام سے گویا ہوئے۔

"یہ کیا بات ہوئی' وہ تعبیر کے بارے میں نہیں سوچ سکتے تھے سچ پوچھیے میں تو اپنا ذہن بنا کے بیٹھی تھی کہ بہزاد گھر کا لڑکا ہے اور تعبیر کے لیے اس سے زیادہ اور کوئی موزوں نہیں' کیا اچھا نہیں تھا کہ تعبیر بھی شادی کے بعد ہماری نظروں کے سامنے رہتی۔" انہیں اپنے منصوبے کی ناکامی کا ازحد قلق تھا۔

"ارے اب ایسی باتوں کا کیا فائدہ' آغا جان نے تو آپا سے بھی بات کر لی ہے اور فکر مت کرو تعبیر کے لیے اللہ بہتر ہی کرے گا۔" وہ انہیں تسلی دیتے ہوئے بولے۔

"ہونہہ! ان ماں بیٹی کی منشا' تو پوری ہو گئی ہر وقت پھانسنے کے چکر میں ہی رہتی تھیں دونوں' بالآخر انگلی پہ لپیٹ لیا نا آغا جان کو بھی اور بہزاد کو بھی۔" وہ جلے بھنے انداز میں بولیں تو فاروق احمد کوفت میں مبتلا ہو گئے۔

"ارے بھئی چھوڑو بھی اس موضوع کو' رشتے آسمانوں پر طے ہوتے ہیں اگر تعبیر کا کہیں اور لکھا گیا ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔" وہ بے زاری سے گویا ہوئے۔

"آپ بھی ان کی ہی طرف داری کریں گے کبھی اپنے مفاد کے بارے میں نہ سوچیے گا پال پوس کر ہم نے جوان کیا اور اس پر حق جتائیں شہناز آپا۔" وہ چپ ہونے میں نہیں آرہی تھیں تو فاروق احمد نے ٹی وی بند کر کے غصے سے ریموٹ سامنے صوفے پر پھینک دیا۔

"پلیز چپ ہو جاؤ' میرے سر میں درد شروع ہو گیا ہے۔" وہ تکیے کو اپنے سر کے اوپر دبا کر رکھتے ہوئے چڑ کر بولے تو زینت بیگم کچھ دیر کے لیے چپ سی ہو گئیں مگر آنے والے دنوں میں ــــــ جب بھی موقع ملتا وہ انہیں جتانا نہ بھولتیں کہ آغا جان نے ان کے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا۔ اب انہیں بہزاد بھی کھٹکنے لگا تھا کہ جس پیڑ سے آپ کو پھل نہ ملے اس کی آبیاری بوجھ ہی لگتی ہے۔

☼ ☼ ☼

تعبیر کو جب اس بندھن کی خبر ملی جس میں بہزاد اور شانزہ بندھنے والے تھے تو اس کے اندر جھکڑ سے چلنے لگے ایک ابال تھا جو کم ہونے میں نہیں آرہا تھا اس کا ایک ایک پل جلتے اور سلگتے گزر رہا تھا ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ کسی چیز پر ہاتھ رکھے اور اسے کوئی دوسرا لے اڑے بچپن سے لے کر آج تک کوئی ایسا موقع نہیں آیا تھا کہ کوئی خواہش اس کے لبوں تک آئی ہو اور فاروق احمد نے پوری نہ کی ہو۔ اسے ناکامی کا

منہ دیکھنے کی عادت نہیں تھی۔

وہ فاروق احمد کے آنگن میں شادی کے چھ سال بعد آئی اور پھر تیمور کی آمد بھی اس کے چار برس بعد ہوئی لہٰذا اس نے گھر میں لاڈلی ہونے کا اعزاز ہمیشہ اپنے پاس رکھا اور یہ اس کی ماں اور باپ کا بے جا لاڈ پیار تھا جس نے اسے منتقم مزاج اور شدت پسند بنا دیا تھا۔ اس نے بہزاد کو بچپن سے ہی اپنے گھر میں دیکھا تھا دونوں ہم عمر ہونے کی وجہ سے اکٹھے پروان چڑھے تھے مگر تعبیر کی حاسدانہ اور حاکمانہ طبیعت ہمیشہ بہزاد کو بری لگا کرتی تھی وہ دھیمے مزاج کا تھا اور یہی کمزوری تعبیر کے ہاتھ لگ گئی اور وہ بچپن سے لے کر لڑکپن تک اس پر حاوی رہی۔ مگر جیسے ہی بہزاد نے شعور کی دنیا دیکھی وہ تعبیر کے مزاج کو سمجھ کر اس سے کترانے لگا تھا اور وہ اسے اپنی ملکیت سمجھ کر چاہنے لگی تھی مگر اس چاہت میں اپنائیت سے زیادہ حاکمیت اور خود پسندی تھی یہی وجہ تھی کہ وہ بہزاد کو کبھی بھی اپنی طرف مائل نہ کر سکی اور اب جب اسے پتا چلا کہ بہزاد کسی اور کا ہونے والا ہے تو وہ جلے پیر بلی کی طرح گھر میں ادھر سے ادھر بے تابی سے پھرنے لگی اس کے دل میں شانزہ کے لیے ایک خاص قسم کا حسد تھا جو اب سوا ہو گیا تھا۔ بہزاد کے چہرے پر پھیلی ایک مخصوص مسکراہٹ اس کا خون جلائے دے رہی تھی۔

وہ اسٹڈی روم سے نکل کر ابھی اپنے کمرے میں آیا ہی تھا کہ دروازہ کھول کر تعبیر اندر داخل ہوئی اس نے چونک کر کلاک کی جانب نظر اٹھائی رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ وہ ابھی تعبیر کے آنے کی وجہ پر غور کر رہا تھا کہ وہ خود ہی بول پڑی۔

"آئی ایم سوری میں نے تمہیں بے وقت ڈسٹرب کیا لیکن ایک پرابلم ہو گیا تم ذرا میرا کمپیوٹر چیک کر دو' میرے خیال میں کوئی سوفٹ ویئر کا مسئلہ ہے۔" وہ دروازے کے پاس کھڑے کھڑے بولی۔

"صبح دیکھوں گا اس وقت تو رات کافی ہو گئی ہے۔" وہ ہچکچایا۔

"نہیں پلیز مجھے انٹرنیٹ پہ کچھ کام ہے صبح تو تیمور بھی دیکھ سکتا ہے وہ آج گھر پر نہیں ہے۔" وہ ملتجیانہ انداز اختیار کرتے ہوئے بولی تو بہزاد کو چار و ناچار اٹھنا پڑا۔ اس سے قبل بھی اس کے کمپیوٹر میں ایک دو مرتبہ گڑبڑ ہوئی تو بہزاد نے ہی اپنی خدمات پیش کی تھیں مگر رات کے اس پہر جب سب اپنے اپنے کمروں میں دبک گئے تھے اسے تعبیر کے کمرے میں جانا معیوب لگ رہا تھا۔

"تم چلو میں آتا ہوں۔" وہ بالوں میں سلیپر اڑستے ہوئے بولا تو وہ سر ہلا کر واپس چلی گئی۔ وہ کچھ دیر بیڈ پر بیٹھا رہا تھکاوٹ سے اس کا برا حال تھا اور اب وہ سونا چاہتا تھا مگر تعبیر نے اسے کمپیوٹر کے مسئلے میں الجھا دیا تھا حالانکہ یہ کام صبح بھی ہو سکتا تھا مگر اسے بہزاد کا امتحان لینے کی عادت تھی اور وہ "مجبوراً" اس کی بات ماننے پر مائل بھی ہو جاتا۔

اس نے ایک نظر پھر کلائی پر بندھی گھڑی پر ڈالی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ تعبیر کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور وہ کمپیوٹر کے اوپر ہی جھکی ہوئی تھی۔ بہزاد کو اندر آتے دیکھا تو ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ چیئر پر بیٹھ کر مانیٹر کو دیکھنے لگا۔ تعبیر اس کے عین پیچھے کھڑی تھی۔

"معمولی سا مسئلہ ہے ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ ماؤس کو حرکت دیتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں گویا ہوا۔ وہ خاموش رہی وہ پورے انہماک سے اپنے کام میں لگا تھا کمرے میں مکمل سکوت تھا صرف افقی دیوار پر لگے وال کلاک کی ہلکی سی ٹک ٹک اس سکوت میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کمپیوٹر کو شٹ ڈاؤن کرتا اچانک بجلی منقطع ہو گئی۔

"اوہ نو۔" وہ گھبرایا تھا کمرا دبیز تاریکی کی لپیٹ میں آ گیا تھا اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے موبائل کی ٹارچ آن کرنے کے لیے اپنی شرٹ کی سامنے والی جیب میں ہاتھ ڈالا مگر مایوسی کا سامنا کرنا پڑا وہ اپنا موبائل کمرے میں ہی چھوڑ آیا تھا۔ وہ کرسی پیچھے دھکیل کر اٹھ کھڑا ہوا اسے اب اندازے سے ہی دروازے کی جانب بڑھنا تھا دروازے تک کا فاصلہ

نہیں دیکھا جا رہا تھا۔ تعبیر کہاں تھی اسے کچھ پتا نہ تھا نہ ہی اس کی آواز آ رہی تھی۔ اس کا پاؤں کسی سخت چیز سے ٹکرایا تھا اس نے ہاتھ بڑھا کر سامنے کی دیوار ٹٹولنے کی کوشش کی تو شاید تعبیر کے کندھے سے اس کا ہاتھ چھوا تھا جو اس کے سامنے ہی کھڑی تھی۔ تعبیر نے بجلی کی سی سرعت سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

"کیا کر رہے ہو بہزاد؟" وہ "تقریباً" چلائی تھی۔

"آئی ایم سوری مجھے اندھیرے کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آ رہا۔" وہ اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے بولا مگر اس کی گرفت مضبوط تھی۔

"ہاؤ ڈیئر یو' تم نے مجھے ہاتھ لگانے کی جرات کیسے کی۔" وہ اندھیرے میں روہانسی ہو کر چلائی بہزاد کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا تعبیر نے اس کی شرٹ کو سامنے سے مضبوطی سے جکڑ لیا اور گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑنے لگی۔ بہزاد کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا تھا۔ یہ تمام صورت حال اس کے لیے غیر متوقع تھی۔ وہ اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی پوری کوشش کر رہا تھا مگر وہ چیخنے کے ساتھ ساتھ اس کے گریبان کو بھی کھینچ رہی تھی۔ اب بہزاد پر جیسے حقیقت کھلنے لگی تھی۔ اسے اب پتا چلا تھا کہ اچانک کمرے کی لائٹ کیسے آف ہو گئی تھی وہ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں معاملے کی تہ تک پہنچ گیا تھا وہ ہسٹریائی انداز میں اس کی شرٹ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر مغلظات بک رہی تھی۔

"تعبیر چھوڑو مجھے یہ کیا کر رہی ہو؟" بہزاد نے پوری قوت سے اسے پیچھے کی طرف جھٹکا دیا وہ لمحے کو ڈگمگائی مگر پھر اس کا کالر دبوچ لیا۔

"گھٹیا انسان' مجھے نہیں پتا تھا تمہاری نیت اتنی بری ہو گی۔" وہ حلق کے بل چیخی تو بہزاد نے اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے پوری قوت سے اس کے چہرے پر ہاتھ جڑ دیا۔

اسی لمحے کمرے کا دروازہ کسی نے دھاڑ سے کھولا تھا اور ٹک کی آواز کے ساتھ پورا کمرہ روشن ہو گیا۔ دروازے کے عین وسط میں فاروق احمد اور ان کے پیچھے زینت کھڑی تھیں۔ انہیں کچھ بھی سمجھنے کی ضرورت نہ تھی سب کچھ ان کے سامنے کھلا پڑا تھا۔ اپنے رخسانہ پر ہاتھ رکھے روتی چیختی تعبیر بھاگ کر فاروق احمد کے سینے سے جا لگی۔ وہ ایک سکتے کے عالم میں بہزاد کو دیکھ رہے تھے۔ جس کی شرٹ کے سامنے کے دو بٹن لٹک رہے تھے اور گریبان کھلا پڑا تھا زینت ہکا بکا منہ پر ہاتھ دھرے کھڑی تھیں جیسے اپنی چیخیں روک رہی ہوں۔ تعبیر فاروق احمد سے لپٹ کر ہچکیاں لے کر رو رہی تھی۔ انہیں یہ پوچھنے کی ضرورت نہ تھی کہ کیا ہوا تھا مگر کیوں ہوا تھا یہ ابھی پوچھنا باقی تھا۔ بہزاد کی حالت ایسے شخص کی سی تھی جس کے جسم سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا گیا ہو وہ اپنی جگہ سے ایک انچ نہ ہلا تھا۔ اس کے پاس اپنی صفائی دینے کو جیسے کچھ بچا ہی نہ تھا۔ سچ تھا تو کمرے میں ابھرنے والی تعبیر کی دبی دبی سسکیاں اور اس کا چاک گریبان اور یہی اس کے ناکردہ جرم کو ثابت کرنے کے لیے کافی تھا۔ وہ لب بھینچے کھڑا تھا اور فاروق احمد متوحش سے اسے دیکھ رہے تھے انہوں نے آہستگی سے تعبیر کو اپنے آپ سے الگ کیا اور بمشکل چلتے ہوئے بہزاد کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے ان کی آنکھیں شعلہ بار تھیں اور لب کپکپا رہے تھے۔

"کوئی اپنے گھر میں بھی نقب لگاتا ہے۔؟" وہ حد درجہ ضبط سے کام لیتے ہوئے گویا ہوئے۔ بہزاد کے لیے یہ الفاظ نہیں بھالے تھے۔ ان کے نقاہت زدہ چہرے پر دکھ' حیرانی اور غصہ تھا۔

"م۔ میرا کوئی قصور نہیں تھا تایا جان۔" اسے پتا تھا ان صفائیوں کی اب کوئی وقعت نہ تھی مگر وہ بولا تھا۔

"مت کہو مجھے تایا۔" وہ دھاڑے تھے۔

"ارے دیکھتے کیا ہیں' جان سے مار دیں اس ذلیل انسان کو' نمک حرام سنپولیا۔" تائی روتی ہوئی تعبیر کی کلائی پکڑ کر چلائی تھیں۔ ان کے پیچھے افتاں و خیزاں صبا بھی نمودار ہو گئی تھی کمرے کا منظر اس کی سمجھ سے بالاتر تھا وہ شور سن کر جاگی تھی۔ اور صورت حال سمجھنے میں اسے شاید کافی دیر لگتی۔ مگر زینت بیگم کے جملوں

سے اسے پس منظر سمجھ آ گیا۔

"شرم نہ آئی اسے یوں رات گئے اس معصوم سے دست درازی کرتے ہوئے' ارے کچھ تو خیال کیا ہوتا اپنے تایا کی عزت کا۔" وہ اب باقاعدہ رو رہی تھیں۔ فاروق احمد کا کانپتا ہوا ہاتھ اس کے ادھ کھلے گریبان کی طرف چلا گیا تھا۔

"کیوں کیا تم نے ایسا؟" ان کی بپھری ہوئی آواز کمرے میں گونجی۔

"میری بات تو سنیں یہ سب کچھ ویسا نہیں جیسا آپ سمجھ رہے ہیں پلیز میرا اعتبار کیجیے۔" وہ گڑگڑایا تھا۔ مگر جن آنکھوں میں غصے کا دھواں بھرا ہو انہیں سامنے کا منظر کبھی صاف دکھائی نہیں دیتا اور فاروق احمد کو ہر چیز دھندلی نظر آ رہی تھی انہوں نے بہزاد کا گریبان پکڑ کر ایک طمانچہ رسید کر دیا۔ وہ ہکا بکا سا انہیں دیکھنے لگا۔ تعبیر اب زینت بیگم کے عقب میں کھڑی سسکیاں لے رہی تھی۔ بہزاد سے اس نے اس کی سکت اور بساط سے بڑھ کر انتقام لیا تھا اس کا جرم اتنا بڑا نہ تھا جتنی سنگین اس نے سزا دے ڈالی تھی۔

"آپ یقین کیجیے یہ سب ایک ڈرامہ ہے سوچی سمجھی سازش ہے میرے خلاف' پلیز میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا جو آپ سمجھ رہے ہیں۔" اس نے جیسے آخری کوشش کی۔

"بکواس نہ کرو' جو کچھ ہماری آنکھوں نے دیکھا ہے وہ جھوٹ کیسے ہو سکتا ہے کیا کرنے آئے تھے تم تعبیر کے کمرے میں۔" وہ اسے گریبان سے پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے گرجے تھے۔

"اس نے خود بلایا تھا مجھے' پوچھ لیجیے اس سے۔" وہ انگلی سے تعبیر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا تو ممانی بھڑک اٹھیں۔

"دیکھا' دیکھا آپ نے اب سارا الزام ہی بیٹی پر دھر رہا ہے' یہی ان جیسے لوگوں کا آخری حربہ ہوتا ہے۔ شرم نہیں آتی اس معصوم کو پھانستے ہوئے۔" وہ لب کاٹ کر رہ گیا وہ ایسی عدالت میں کھڑا تھا جہاں اس کی پیروی کرنے والا کوئی وکیل تھا نہ گواہ۔

"نکل جاؤ اس گھر سے تم سچے ہو یا جھوٹے میں اس معاملے میں نہیں پڑنا چاہتا مجھے آئندہ تمہاری شکل نظر نہ آئے۔" انہوں نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا تھا۔ تعبیر نے جو کہا تھا وہ سچ کر دکھایا تھا اس نے بہزاد کی شرافت کو ایسا داغ لگایا تھا جو وہ شاید کبھی بھی دھو نہ پائے اس نے واقعی اسے سر اٹھانے کے قابل نہ چھوڑا تھا۔ وہ خاموش ہو گیا تھا کہ اب اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہ تھا وہ خود کو گھسیٹتے ہوئے اپنے کمرے میں آیا۔ اس کے عقب میں تائی جان کی اونچی اونچی آوازیں ابھر رہی تھیں وہ یقیناً" آستین کے سانپ کے ظاہر ہو جانے پر تبصرہ فرما رہی تھیں' چیخ رہی تھیں گالیاں دے رہی تھیں۔ وہ چپ چاپ کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔

سچ ہے جب کوئی عمر بھر کی پونجی چھین لے تو انسان ایسے ہی تہی دست و تہی داماں ہو جاتا ہے جیسے وہ ہو گیا تھا۔ کمرے کی ہر چیز اس کی بے بسی پر ہنس رہی تھی اور وہ رو رہا تھا۔ وہ جانتا تھا اس گھر میں اس کی آخری رات ہے مگر یہ رات اتنی بھاری اور کٹھن ہو گی اس نے سوچا بھی نہ تھا۔ اس کے اعصاب جواب دینے لگے تھے۔ اس رات کے بعد طلوع ہونے والا دن اس کے لیے قیامت کے سوا اور کیا لا سکتا تھا وہ کیسے سامنا کر پائے گا آغا جان کا وہ تو جیتے جی در گور ہو جائیں گے جو منصوبہ تعبیر نے بنایا تھا اس کی تہہ تک تو شاید کوئی بھی نہ پہنچ سکے کہ اس نے زلیخا کی طرح دامن پیچھے سے نہیں پکڑا تھا۔ وہ سر نیہوڑائے بیٹھا تھا۔ دل میں غصہ اور آنکھوں میں نمی بھری تھی۔ کیا وہ شانزے کا سامنا کر پائے گا کیا وہ اس بار بھی اس کی بے گناہی کو تسلیم کر لے گی کہ اب تو بہت گواہ موجود ہیں اس کے جرم کو ثابت کرنے کے لیے اور اس کے پاس اپنی صفائی میں کچھ کہنے کے لیے تھا ہی نہیں۔ وہ اٹھا آنکھیں رگڑ کر صاف کیں اور الماری سے بیگ نکال کر اس میں ضروری چیزیں ٹھونسنے لگا۔ بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے اس نے ایک نظر کونے میں پڑے فوٹو فریم کو دیکھا جس میں اس کے امی ابو کی یادگار تصویر

تھی ان دونوں کے درمیان وہ کھڑا تھا چہرے پر شرارت بھری مسکان تھی اس نے شہادت کی انگلی سے فریم کو چھوا اور کچھ دیر یونہی دیکھتا رہا۔ وہ الٹے قدموں آہستگی سے چلتا ہوا باہر نکلا کاریڈور میں اب مکمل سکوت تھا۔ ہنگامہ جو برپا ہوا تھا اب سرد پڑ چکا تھا مگر وہ جانتا تھا یہ وقتی سکوت ہے جیسے ہی صبح کا سورج طلوع ہو گا یہ قیامت خیز ہنگامہ پھر اٹھ کھڑا ہو گا اور وہ پھر سے کٹہرے میں کھڑا ہو گا مگر عدالت لگنے سے پہلے ہی اس پر فرد جرم عائد کر کے فیصلہ سنایا جا چکا تھا اسے ہر صورت میں گھر چھوڑنا تھا اور اب وہ یہاں رہنا بھی نہیں چاہتا تھا جو کچھ تعبیر نے اس کے ساتھ کیا تھا اس کے بعد ایک ہی چھت تلے رہنا ناممکن ہی نہیں اذیت ناک بھی تھا۔

وہ اب اس کی صورت دیکھنے کا بھی روادار نہ تھا۔ وہ چپکے سے آغا جان کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ وہ گہری نیند میں تھے۔ وہ آہستگی سے چلتا ہوا ان کے بیڈ کے قریب آیا ان کو جگانے کے لیے ذرا سا ہاتھ آگے بڑھایا مگر اگلے لمحے کسی خیال کے تحت ہاتھ کو روک لیا۔

"اللہ حافظ آغا جان۔" اس کے لبوں نے حرکت کی اس کے قدم بھاری ہو رہے تھے مگر واپس تو پلٹنا تھا اور وہ واپس پلٹ گیا تھا۔ اس کے پاس زاد راہ کے لیے کچھ بھی نہ تھا ماسوائے کپڑوں کے چند جوڑوں کے اس نے کمرے میں آ کر بائیک کی چابی اٹھائی اور گھر سے باہر نکل گیا وہ نہیں جانتا تھا اس کی اگلی منزل کیا تھی اور کہاں تھی۔

☼ ☼ ☼

فاروق احمد غصے سے ڈرائنگ روم میں چکر لگا رہے تھے اور آغا جان بے یقینی کی حالت میں بیٹھے تھے رات کی جو بات انہیں فاروق احمد اور زینت کی زبانی معلوم ہوئی تھی وہ اس پر یقین کرنے کو تیار نہ تھے۔

"آغا جان اگر وہ بے قصور ہوتا تو یوں چوروں کی طرح رات کو گھر سے فرار ہو جاتا بتایئے؟" وہ ان کے سامنے آن کھڑے ہوئے وہ مہر بہ لب بیٹھے رہے۔

"اگر وہ نہ بھی جاتا تو میں اسے ایک منٹ بھی اس گھر میں نہیں رہنے دیتا اچھا ہوا وہ رات کے اندھیرے میں ہی نکل گیا۔" وہ دوبارہ گویا ہوئے اور آغا جان جیسے سن ہی نہ رہے تھے۔

"ارے کچھ تو شرم کی ہوتی جس تھالی میں کھایا اسی میں چھید کرنے لگا تھا وہ تو شکر ہے ہم لوگ تعبیر کی آواز سن کر دوڑے چلے گئے ورنہ وہ تو ہماری عزت خاک میں ملا دیتا۔" زینت بیگم ہاتھ ملتے ہوئے قدرے اونچی آواز بولیں۔

"کوئی غلط فہمی نہ ہو گئی ہو فاروق' میں تو ڈرتا ہوں وہ بن ماں باپ کا بچہ ہے کوئی زیادتی نہ ہو گئی ہو۔" آغا جان وہیل چیئر کی پشت سے سر ٹکا کر دکھ سے بولے۔

"آپ اب بھی ماننے کو تیار نہیں' ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اسے تعبیر کے کمرے میں وہ بے چاری مدد کو پکارنے لگی تو اس کے منہ پر تھپڑ دے مارا خبیث نے' اب بھی آپ اسے قصوروار سمجھنے میں تامل سے کام لے رہے ہیں۔" فاروق احمد سیخ پا ہوئے۔

"ٹھیک ہے ایسا ہی ہوا ہو گا مگر اس نے ایسا کیا کیوں وہ تو بہت شریف النفس تھا پھر کس کے بہکاوے میں آ گیا میں یہ دن دیکھنے سے پہلے مر کیوں نہ گیا۔" وہ اپنا سر تھام کر ٹوٹے ہوئے لہجے میں گویا ہوئے ڈرائنگ روم میں صرف فاروق احمد اور زینت بیگم موجود تھیں۔

تعبیر اپنے کمرے میں بند تھی۔ اس کو اب اس بات سے کوئی غرض نہ تھی کہ کس پر کیا گزری ہے اس نے اپنے من چاہے نتائج حاصل کر لیے تھے وہ بہزاد کو یونہی تہی دست اور ذلیل ہی تو کرنا چاہ رہی تھی اگر وہ اس کی قسمت میں نہ تھا تو یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ اس گھر میں بھی رہے اور شریک زندگی کے طور پر شانزہ کو ہی چنے جو کھیل اس نے کھیلا تھا اس کے بعد یقیناً" شانزہ اور اس کے گھر والے بھی بہزاد کو ہرگز قبول کرنے والے نہیں تھے۔ پورے گھر پر ایک مرگ کی سی کیفیت طاری تھی پرسکون تھی تو صرف تعبیر فاروق' آغا جان کے منع کرنے کے باوجود فاروق احمد

نے اپنی بہن کے گھر فون کردیا۔ ایسے کیسے ہو سکتا تھا کہ بہزاد جس نے ان کی بیٹی سے دست درازی کرنے کی کوشش کی تھی وہ شہناز بیگم کا داماد بنے یہ ان کو کسی صورت قبول نہ تھا۔

دوپہر کو حیران و پریشان شہناز بیگم دوڑی آئیں ان کی حالت بھی آغا جان سے کچھ مختلف نہ تھی۔

"ارے شکر کریں آپا آپ بال بال بچ گئیں، ساری عمر شانزہ پچھتاتی ارے ایسے بدکردار مرد کے ساتھ کون عورت گزارا کرتی۔" زینت بیگم کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے رہی تھیں۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھیں جیسے بہزاد کے جرم میں وہ برابر کی شریک ہوں وہ فیصل کے ساتھ آئی تھیں کہ شانزہ کو بتانے سے پہلے وہ خود تصدیق کرنا چاہ رہی تھیں۔ گھر میں بہزاد موجود نہ تھا۔ اور اس کی صفائی دینے والا بھی کوئی نہ تھا۔ پھوپھو نے اس کے موبائل پر نمبر ملایا تو اس نے آف کردیا۔ اس کا یوں گھر سے چلے جانا اور موبائل آف کردینا اس کے جرم پر مہر تصدیق ثبت کررہا تھا۔ شہناز بیگم کچھ دیر ملول سی آغا جان کے پاس بیٹھی رہیں پھر اٹھ کر گھر چل دیں اب انہیں یہ سب شانزہ کے گوش گزار کرنے کے لیے کتنا حوصلہ چاہیے تھا صرف وہی جانتی تھیں۔

"آپ نے اس ساری کہانی پہ یقین کرلیا مما؟" وہ حیران ہونے کی بجائے ماں کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اور شہناز جو یہ سوچ کر بیٹھی تھیں کہ شانزہ یہ سن کر شدید صدمے سے دوچار ہوگی وہ اسے یوں پرسکون دیکھ کر چونکی تھیں ان کی بتائی گئی بات اس پر بجلی بن کر نہیں گری تھی وہ منتظر نگاہوں سے اپنی ماں کی طرح دیکھ رہی تھی۔

"مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آرہا مگر تمہارے ماموں جھوٹ کیسے بول سکتے ہیں اتنے سارے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اپنی آنکھوں سے اسے تعبیر کے کمرے میں دیکھا وہ خود گواہ ہیں اس واقعہ کے۔" وہ خود بھی پریشان تھیں۔

"اچھا تو ایک رات میں نا صرف یہ ڈرامہ تخلیق کیا گیا بلکہ گواہ بھی پیدا کرلیے گئے۔" وہ طنز سے گویا ہوئی۔

"تم نہیں سمجھ سکتیں شانزہ وہاں کیسی قیامت آئی ہوئی ہے تم تو....."

"یہ قیامت آئی نہیں لائی گئی ہے۔ بہزاد ایسا نہیں کرسکتا۔" وہ اپنے موقف سے ایک انچ ہٹنے کے لیے تیار نہ تھی اب وہ دوسری بار اس پر بلا تحقیق شک نہیں کرسکتی تھی جو کچھ پہلے تعبیر نے اس کے ساتھ کیا تھا اس سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔

"تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو کہ بہزاد ایسا نہیں ہے انسان کے بھٹکنے اور بہکنے میں دیر کتنی لگ سکتی ہے۔" شہناز بیگم حیرانی سے شانزہ کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

"مما آپ کو نہیں پتا تعبیر کس حد تک جاسکتی ہے وہ بہت منتقم مزاج ہے اور بہزاد کو وہ ایک آنکھ نہیں بھاتی یہی وجہ ہے کہ وہ اسے نظروں سے گرانے کے طریقے تلاش کرتی رہتی ہے۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔

"بہزاد کہاں ہے؟" اس نے اپنی بات ختم کرکے پوچھا۔

"پتا نہیں۔" انہوں نے مختصراً کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ اچنبھے سے گویا ہوئی۔

"وہ گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے۔" شہناز بیگم نے گہری سانس لے کر کہا تو اس کے پیروں کے نیچے سے جیسے زمین غائب ہوگئی ہو وہ گنگ سی ماں کو دیکھنے لگی۔

"کب کیوں؟" وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

"مجھے نہیں پتا کیوں لیکن وہ رات کو ہی کہیں چلا گیا ہے۔" وہ قالین کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں وہ شانزہ کی دلی کیفیات سے بے خبر نہیں تھیں وہ جانتی تھیں کہ وہ بہزاد کو چاہتی ہے اور اب تو اس کی نسبت بھی طے کی جاچکی تھی اس کا یوں سراسیمہ ہونا فطری سی بات تھی۔

"وہ کیوں چلا گیا ایسے کم از کم اپنا دفاع تو کرتا مجھے تو بتاتا۔" وہ شہناز بیگم کی طرف دیکھ کر یوں کہہ رہی تھی جیسے وہ انہیں بتا کر گیا تھا۔

"یہی تو بات ہے اگر وہ اپنے موقف میں سچا تھا تو یوں جانے کی بجائے کم از کم سامنا تو کرتا ایسے راتوں رات گھر سے نکل جانا کس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور یہ کہاں کی دانشمندی ہے۔" وہ اپنی دانست میں درست کہہ رہی تھیں مگر شانزہ کچھ اور سوچ رہی تھی۔

"گھر چھوڑنا کوئی معمولی بات نہیں ہے مما یقیناً" وہ شدید اذیت سے گزرا ہوگا یا پھر اس کو مجبوراً" ایسا کرنا پڑا ہوگا میں نہیں مان سکتی کہ وہ خود گھر چھوڑ کر گیا ہے۔" وہ جیسے اس کی تمام کیفیات سے آگاہ تھی۔ اس کا دل بہزاد کے خلاف کچھ بھی سننے یا ماننے پر آمادہ نہ تھا۔

"بہرحال جو بھی ہے معاملہ اب بالکل یکطرفہ ہوگیا ہے۔ کسی کے پاس کوئی ایسا ثبوت نہیں ہے کہ وہ تعبیر کو جھٹلا سکے اور بہزاد کے جانے کے بعد یہ شک اور پختہ ہوجاتا ہے کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے چاہے تم یقین کرو یا نہیں حقیقت وہی ہے جواب تک سامنے ہے بہزاد بے قصور ہے یا قصوروار اللہ بہتر جانتا ہے۔" وہ اتنا کہہ کر اٹھیں اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔ وہ شدید ذہنی خلجان میں مبتلا تھی اس نے بہزاد سے رابطہ کرنے کے لیے جتنی بار بھی نمبر ملایا وہ بند ملا۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ کیا کرے اور کس سے پوچھے کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ سب کے معمولات زندگی آہستہ آہستہ اپنی نہج پر آگئے تھے۔

بہزاد کو گھر سے گئے ہوئے ایک دن ہونے کو تھا اس نے ابھی کسی سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ اب شہناز بیگم کی ساری ہمدردیاں بھی تعبیر کے گھر والوں کے ساتھ تھیں۔ تعبیر کی سازش کا پردہ چاک کرنے والا کوئی نہ تھا جو تھا وہ صبح طلوع ہونے سے پہلے ہی کہیں چلا گیا تھا بظاہر ہر طرف خاموشی تھی تلاطم تھا تو شانزہ کے اندر تھا اسے کسی پل چین نہیں تھا اس کے لیے جیسے آٹھ پہر سولی تھی اس پہ شہناز بیگم نے یہ فیصلہ سنا کر اسے مزید نڈھال کردیا تھا کہ اب بہزاد واپس آئے یا نہ آئے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب وہ کسی صورت شانزہ اور بہزاد کا رشتہ قائم نہیں رکھیں گی اور اس فیصلے کا محرک فاروق احمد کا دباؤ تھا اور وہ بہزاد کی خاطر اپنا میکا کیسے چھوڑ سکتی تھیں حالات نے ایک دم نیا رخ اختیار کرلیا تھا۔ جو کچھ وقوع پذیر ہوا تھا اس کا تو کسی کو اندازہ نہ تھا۔ بہزاد گھر سے نکل کر کدھر گیا تھا کسی کو معلوم نہ تھا بس قیاس آرائیاں تھیں اندازے تھے اور شبہات تھے۔

☼ ☼ ☼

زندگی تیری قسمت کہ تجھے مفت ملے
ہم سے دانا
جو کمالات کیا کرتے تھے
خشک مٹی کو بھی عمارات کیا کرتے تھے
اے محبت تیرا بخت کہ بن مول ملے
ہم سے انمول
تیری تحویل میں آنے سے ذرا پہلے تک
ہم بھی
اس شہر میں عزت سے رہا کرتے تھے
ہم بگڑتے تو کئی کام بنا کرتے تھے
اور
اب تیری سخاوت کے گھنے سائے میں
خلقت شہر کو ہم زندہ تماشا ٹھہرے
جتنے الزام تھے مقسوم ہمارا ٹھہرے
اے محبت انداز بدل لے اپنا
تجھ کو آئندہ بھی عشاق کا خوں پینا ہے
ہم تو مرجائیں گے
تجھ کو تو مگر جینا ہے!!!!

وہ پچھلے چوبیس گھنٹوں سے سڑکوں پر تھا اور ان چوبیس گھنٹوں میں پانی کی ایک بوند تک اس کے حلق سے نہ اتری تھی۔ عجیب سی آگ تھی جس سے اس کا سارا وجود جل رہا تھا تعبیر نے کتنی آسانی سے اسے سب کے سامنے بے مایہ کردیا تھا اس کا سر ہمیشہ کے لیے جھکا دیا تھا۔ وہ اگر چاہے بھی تو اپنی بے گناہی ثابت نہیں کرسکتا تھا۔

وہ گھر سے بہت دور نکل آیا تھا۔ ایک درخت کے سائے میں وہ بائیک کھڑی کرکے انہی سوچوں میں الجھا

تھا جن سے وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے پیچھا نہیں چھڑا پا رہا تھا۔

”شانزہ پر کیا گزری ہوگی جب اس نے سنا ہوگا کہ میں۔۔۔“ اس سے زیادہ وہ کچھ نہ سوچ سکا اس کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا تھا ایک ایسی ہستی جو آپ کی نظروں میں بہت معتبر ہو اور محبت جیسے پاکیزہ جذبے کے سنگھاسن پر براجمان ہو اس کی نظروں میں گر جانا کتنا تکلیف دہ تھا صرف وہی محسوس کر سکتا تھا جو اس احساس سے دوچار ہوا ہو۔ اس نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اس میں صرف چھ سو روپے موجود تھے۔ پچھلے کئی گھنٹوں سے وہ بھوک سے جنگ لڑ رہا تھا مگر اب ہمت جواب دینے لگی تھی۔ ایک پل کو خیال آیا کہ شانزہ سے بات کی جائے سڑکوں پر کسی ٹھکانے کی تلاش میں مارا مارا پھرنے کی بجائے وہ پھوپھو کے گھر جا کر انہیں تمام صورت حال سے آگاہ کرے ہو سکتا ہے وہ اسے بے قصور سمجھیں مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا! وہ لب کاٹ کر دور بھاگتی دوڑتی ٹریفک کو دیکھنے لگا۔ ان کو یقین دلانے کے لیے میرے پاس ہے ہی کیا اور کیا شانزہ اب دوسری بار مجھ پر اعتبار کرے گی اگر کر بھی لے تو کیا میں اس کے سامنے بے قصور ہوتے ہوئے بھی نظریں اٹھا کر چل سکوں گا۔ کتنا بے وقعت کر کے رکھ دیا تھا تعبیر نے اسے وہ گہری سانس لے کر ہاتھ میں تھامے نوٹوں کو دیکھنے لگا۔ کسی خیال کے تحت اس نے وہ پیسے دوبارہ اپنی جیکٹ کی سامنے والی جیب میں ڈالے اور بائیک لے کر ایک سمت چل دیا تھا کچھ دیر بعد وہ موٹر سائیکل شوروم کے سامنے کھڑا تھا۔

”کیا کام ہے سر جی؟“ ڈیلر نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

”مجھے یہ موٹر سائیکل بیچنی ہے کیا دو گے؟“ وہ چابی نکالتے ہوئے بولا۔

”موٹر سائیکل نئی لگتی ہے اچھے پیسے مل جائیں گے۔“ ڈیلر نے بائیک کو ٹھوک بجا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

”کتنے؟“ وہ ڈیلر کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”پچپن ہزار۔“

”چوری کی نہیں ہے مناسب دام بتاؤ۔“ وہ بگڑا۔

”اس سے زیادہ اور کیا مناسب ہو سکتے ہیں۔“ وہ گدی کھجاتے ہوئے بولا۔

”یہ نئی موٹر سائیکل ہے، مجبوری میں بیچنا پڑ رہی ہے تم مجبوری سے فائدہ مت اٹھاؤ۔“

”ہماری بھی تو مجبوری ہے سر آپ شریف آدمی لگتے ہیں اس لیے زیادہ بحث نہیں کروں گا آپ کے لیے ساٹھ ہزار دے دیتا ہوں اس سے زیادہ نہیں۔“ وہ حتمی انداز میں بولا۔

”ٹھیک ہے۔“ بہزاد نے ہامی بھر لی مطلوبہ رقم وصول کرنے بعد اب اسے کسی ٹھکانے کو تلاش کرنا تھا اسے سب سے پہلا خیال سہیل کا آیا جو اس کا دوست اور کلاس فیلو تھا اور اسی شہر میں کرائے کا ایک فلیٹ لے کر رہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس کے فلیٹ میں بیٹھا تھا وہ اس سے بہت گرمجوشی سے ملا تھا۔

بہزاد نے بغیر کسی حیل و حجت کے ساری کہانی اس کے گوش گزار کر دی وہ کچھ دیر ترحم آمیز نظروں سے بہزاد کو دیکھتا رہا پھر اس کا ہاتھ تھپتھپا کر گویا ہوا۔

”کوئی بات نہیں یار انصاف انسانوں کے بس کی بات نہیں یہ تو اللہ ہی کرے گا ایک دن تم یہاں جب تک چاہو رہ سکتے ہو۔“ وہ فراخدلی سے بولا۔

”بہت شکریہ یار میں کل سے ہی کوئی جاب تلاش کرتا ہوں باقی میرے پاس کچھ رقم ہے اس سے مل کر اس کمرے کا کرایہ اور روزانہ کا خرچہ بانٹ لیں گے میں تم پر بوجھ نہیں بننا چاہتا۔“ وہ لگرفتہ سا ہو کر بولا۔

”ارے ایسی باتیں نہ کرو اپنے جگر کے لیے تو جان بھی حاضر ہے جب تک کوئی جاب ہاتھ نہیں آتی موج کرو۔“ وہ اس کا کندھا سہلا کر بولا تو وہ ممنونیت سے مسکرا دیا۔

”ایک بات کہوں تم سے۔“ رات کو سہیل نے اسے مخاطب کیا۔

”ہوں۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکا۔

”تم کچھ دن بعد جب معاملہ ٹھنڈا ہو جائے تو ایک بار گھر جا کر سارے واقعے کی وضاحت ضرور کرنا اور میرے خیال میں وہ تمہیں معاف کر دیں گے۔“

”کیسی معافی؟“ وہ بھڑک اٹھا۔

”یار تمہیں سب کچھ بتایا تو ہے اب میری اس گھر کیا حیثیت ہوگی تم سے ڈھکی چھپی نہیں اور تم معافی کی بات کرتے ہو معاف کر دینے کا مطلب ہے میں نے واقعی وہ جرم کیا تھا۔“ وہ چیخ کر بولا۔

”تم اس وقت صرف جذبات کے زیر اثر ہو اگر ٹھنڈے دماغ سے سوچو تو تمہارا یوں غائب ہو جانا شکوک و شبہات کو مزید تقویت دے گا۔“ وہ اسے رسان سے سمجھاتے ہوئے بولا۔

”مجھے اب اس سے کوئی غرض نہیں ہے میں اب اس جگہ قدم بھی نہیں رکھوں گا جب تک تعبیر وہاں ہے تم کیا سمجھتے ہو میں نے گھر چھوڑنے سے پہلے کچھ نہیں سوچا ہوگا۔ میں نے ہر پہلو پر غور کیا تھا مگر وہاں رہنا میرے لیے ممکن نہیں تھا میں ساری زندگی نادم ہو کر نہیں رہ سکتا تھا مجھے انتظار ہے اس لمحے کا جب تعبیر خود میری بے گناہی کی گواہی دے گی اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے کہ میں کسی کو اپنی صفائی دے کر اس پر مائل کر سکوں کہ اس سارے کھیل میں میرا کوئی دوش نہیں تھا۔“ وہ تلخ سا ہو کر گویا ہوا۔

”اچھا یار جیسے تمہاری مرضی مگر شانزہ کا کیا ہوگا؟“ سہیل نے ایک نظر بہزاد کو دیکھا تو وہ لب بھینچ کر سامنے دیوار کو دیکھنے لگا۔

”وہ اب میرا اعتبار نہیں کرے گی اور ویسے بھی کوئی لڑکی کسی ایسے شخص کو قبول نہیں کر سکتی جس پر اتنا بڑا الزام لگایا گیا ہو میں اس وقت تک اس کا سامنا نہیں کروں گا جب تک سب اس بات پر یقین نہیں کر لیتے کہ یہ ایک سوچی سمجھی سازش تھی۔“

”تمہارا کیا خیال ہے انہیں بیٹھے بٹھائے یقین آجائے گا۔ جب تک تم انہیں تمام حقیقت بتاؤ گے نہیں وہ کیسے یقین کریں گے۔“ سہیل پھر گویا ہوا۔

”کہاں نا کچھ انتظار کرنا ہوگا ابھی وہ سب میرے خلاف بھڑکے ہوئے ہیں انہیں جب صحیح اور غلط کا اندازہ ہوگا تو خود مجھے ڈھونڈیں گے اور مجھے اسی لمحے کا انتظار ہے۔“ وہ بیڈ کے کراؤن سے سر ٹکاتے ہوئے بولا۔

”اور جہاں تک شانزہ کی بات ہے تو وقت سب سے بڑا مرہم ہے وہ آہستہ آہستہ سب کچھ بھلا دے گی میں نہیں چاہتا وہ ساری زندگی میری وجہ سے سر جھکا کر چلے۔“ وہ گہری سانس لے کر بولا تو سہیل خاموشی سے اسے تکنے لگا اسے اب بھی بہزاد کی منطق سے اختلاف تھا مگر وہ چپ رہا۔

☼ ☼ ☼

شب و روز پر لگا کر اڑنے لگے تھے۔ بہزاد کے لوٹ آنے کی امیدیں جو شانزہ کے دل میں روشن تھیں وہ معدوم ہونے لگی تھیں۔ دو ماہ کا عرصہ بظاہر تو پلک جھپکتے گزر گیا تھا مگر کیسے گزرا تھا یہ صرف آغا جان اور شانزہ جانتے تھے۔ اور ان کے لیے وقت جیسے رک سا گیا تھا۔ اس دو ماہ کے عرصے میں شانزہ ایک بار بھی اس گھر میں نہ جا سکی جس سے بہزاد کی یادیں وابستہ تھیں تعبیر سے اس کا ایک دو بار سامنا ہوا وہ بھی کسی خاندانی فنکشن میں مگر اس نے تعبیر سے بات کرنے کی کوشش نہ کی۔ پھر انہی دنوں میں تعبیر کی فاروق احمد کے دوست کے بیٹے کے ساتھ منگنی بھی ہو گئی۔ وہ بظاہر بہت خوش تھی مگر اس خوشی کے پیچھے ایک عجیب سا احساس زیاں تھا اور وہ جتنا خود کو اس کیفیت سے نکالنے کی کوشش کرتی اتنا ہی الجھنے لگتی۔ منگنی کے دو ماہ بعد لڑکے والوں نے شادی کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا تو فاروق احمد نے بلا تامل رخصتی کی تاریخ دے دی۔

”فاروق بھائی تعبیر کی شادی کر رہے ہیں اگلے ماہ مجھے تم اپنا فیصلہ بتاؤ۔“ ایک شام جب وہ یونہی خاموشی سے لان میں بیٹھی کسی غیر مرئی نقطے کو گھور رہی تھی شہناز بیگم نے اس سے آکر پوچھا۔

”کیسا فیصلہ؟“ وہ نا سمجھی کے عالم میں انہیں دیکھنے لگی۔

”آخر کب تک اس کے انتظار میں بیٹھی رہو گی اس نے آنا ہوتا تو اب تک آچکا ہوتا۔“ وہ کچھ توقف

کے بعد گویا ہوئیں۔

"ابھی کچھ عرصہ ہی تو گزرا ہے کون سی صدیاں بیت گئی ہیں آپ کو اتنی جلدی کیا ہے۔" وہ بے تاثر سے چہرے کے ساتھ بولی۔

"ہمیں کیا جلدی ہو سکتی ہے تم جانتی ہو' دو ماہ تک تمہارے پاپا مستقل پاکستان آرہے ہیں میں چاہتی ہوں کہیں تمہارا رشتہ طے ہو جائے تو ان کے آنے کے بعد رخصتی کردوں۔" شانزہ حیرانی سے انہیں دیکھنے لگی۔

"مما یہ کرنا واقعی اتنا آسان ہے جتنی آسانی سے آپ نے یہ بات کردی۔" وہ روہانسی ہو کر بولی تو وہ گہری سانس لے کر دوسری طرف دیکھنے لگیں۔

"بیٹا جب ایک بات طے ہے کہ اس کے اور ہمارے راستے جدا ہیں تو انتظار لاحاصل نہیں ہے کیا؟ اگر اسے تمہارا اتنا ہی خیال ہوتا تو اب تک تم سے رابطہ ضرور کرتا جن لوگوں کے دل میں چور ہوتا ہے وہ یونہی چھپ کر زندگی گزارتے ہیں اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتی کچھ دن ہیں تمہارے پاس' سوچ لو اور مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کرو۔" وہ قطعی لہجے میں کہہ کر واپس چلی گئیں وہ کرسی کی پشت سے سر ٹیک کر ایک بار پھر اپنی سوچوں میں غلطاں ہو گئی جن سے باہر نکلنا اس کے لیے بہت مشکل ہو گیا تھا۔

"مما ٹھیک کہہ رہی تھیں اسے کم از کم مجھے تو بتانا چاہیے تھا کیا اس کے سامنے میری کوئی اہمیت نہ تھی وہ ایسے کیوں روپوش ہو گیا۔ میں کتنا عرصہ اس کا انتظار کروں وہ کوئی اشارہ تو دیتا۔" وہ لب بھینچ کر تاسف سے سوچنے لگی شام کو اس نے فون پر آغا جان سے بات کی تھی۔

"بیٹا میں کیا کہہ سکتا ہوں تمہاری ماں بھی اپنے موقف میں درست ہے میں تو ہر صبح اس امید پر اٹھتا ہوں کہ شاید وہ کہیں سے آجائے اب تو ان بوڑھی آنکھوں میں انتظار کی سکت بھی نہیں رہی۔" ان کی آواز میں آنسوؤں کی نمی گھل گئی تھی۔

"آغا جان آپ مما کو سمجھا سکتے ہیں جہاں اتنے ماہ گزر گیا وہاں تھوڑا سا انتظار اور کرلیں مجھے یقین ہے کہ وہ واپس آجائے گا۔" مایوسی کے اندھیروں میں امید کا ننھا سا جگنو اب بھی موجود تھا جسے شانزہ اپنی مٹھی میں لیے بیٹھی تھی۔

"اور اگر وہ نہ آیا تو' تمہاری ماں ساری عمر مجھے مورد الزام ٹھہرائے گی۔ اور مجھے پتا ہے وہ اتنی جلدی واپس آنے والا نہیں ہے۔" آغا جان دکھ سے بولے۔

"یہ جو عزت نفس ہوتی ہے نا' یہ بہت عجیب چیز ہوتی ہے اس کو ذرا سی بھی ٹھیس لگے تو انسان ٹوٹ پھوٹ سا جاتا ہے اور اس کو بچانے کے لیے وہ کبھی کبھی سب کچھ تیاگ دیتا ہے بہزاد کی عزت نفس کو بھی شدید زک پہنچی ہے میرا نہیں خیال کہ وہ ہماری دہلیز پر دوبارہ قدم رکھے۔" وہ مایوس ہو بیٹھے تھے۔

"لیکن آغا جان اسے ایک بار رابطہ تو کرنا چاہیے' کہاں ہے؟ کیسا ہے اور دوسرے کتنی اذیت میں ہیں اس کی عدم موجودگی پر۔" وہ شکوہ کناں تھی۔

"ہو سکتا ہے وہ ہم سے زیادہ اذیت میں ہو' مظلوم وہ ہے ہم نہیں اس لیے دعا ہی کر سکتا ہوں کہ وہ واپس آجائے مگر میں جانتا ہوں وہ بہت ضدی اور اصول پسند ہے بالکل اپنے باپ کی طرح اور ضد کسی منطق اور مجبوری کو نہیں مانتی۔" آغا جان نے کہا تو اس نے مایوس ہو کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ آغا جان سے بات کرنے کے بعد وہ حوصلہ مجتمع کرنے کی بجائے زائل کر بیٹھی تھی ان کی باتوں کا لب لباب یہی تھا کہ وہ بہزاد کی آس لگا کر بیٹھنے کی بجائے اپنی ماں کی بات مان لے اور یہ اس کے لیے بہت مشکل تھا۔

جاڑے کی راتیں ایک بار پھر لوٹ آئی تھیں وہ کافی کا مگ لیے کمپیوٹر کے آگے بیٹھی تو ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گئی اس کے ای میل بکس میں بہزاد کی ای میل موجود تھی۔ وہ کراچی میں ہی کہیں تھا مارے خوشی کے اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں اس نے آنکھوں کی نمی صاف کر کے کئی بار ای میل کو پڑھا اس نے لکھا تھا۔

"بکھرنے کے عمل کے بعد خود کو اکٹھا کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے اس کا اندازہ مجھے ان چند مہینوں میں ہو گیا ہے میں جانتا ہوں شانی جو کچھ میں نے کیا وہ ٹھیک نہیں تھا مگر جو کچھ میرے ساتھ ہوا وہ بھی ٹھیک نہیں تھا۔ تعبیر نے مجھے کچھ اس طرح اپنے انتقام کی بھینٹ چڑھایا کہ میرے پاس اپنے دامن پر لگے داغ کو دھونے کے لیے جیسے کچھ بچا ہی نہ تھا۔

مجھے پتا ہے تم بھی مجھے معاف نہیں کرو گی مگر پتا نہیں کیوں کچھ دنوں سے دل پر ایک بوجھ سا رہنے لگا تھا جو شاید تمہیں بتا کر ہلکا کرنے لگا ہوں میں اپنی پاک دامنی کی گواہی تو نہیں لا سکتا مگر زندگی میں کبھی کوئی ایسا لمحہ آئے کہ وقت میرے حق میں گواہی دے تو مجھے بتا دینا میں لوٹ آؤں گا تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ اپنی زندگی کے لیے کوئی اچھا سا شریک سفر منتخب کرلینا میں نہیں جانتا کہ وقت میرے حق میں فیصلہ کب دے گا اور پتا نہیں دے گا بھی یا نہیں تم اپنی زندگی کو میرے انتظار میں گھٹن مت بنانا میرے لیے تو یہ زندگی نہیں بیگار ہے اور بیگار کی مدت مقرر نہیں ہوتی۔ آغا جان سے کہنا مجھے معاف کردیں میں ان کی توقع سے بڑھ کر نالائق نکلا۔

تمہارا بہزاد احمد۔

اسے سمجھ نہیں آرہی تھی وہ ای میل پڑھ کر ہنسے یا روئے خوشی اس بات کی ہو رہی تھی کہ وہ جہاں بھی تھا اسے بھولا نہیں تھا اور دکھ اس بات کا تھا اس نے واپس آنے کی کوئی امید نہیں بندھائی تھی۔ بہر حال وہ اتنا ضرور جانتی تھی کہ آہستہ آہستہ وہ اسے قائل کرلے گی اس نے بہزاد کا ای میل ایڈریس نوٹ کرلیا تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ اب جلد ہی لوٹ آئے گا۔ وہ کمرے سے نکل کر تیز تیز قدم اٹھاتی شہناز بیگم کو بتانے چل دی تھی۔

☼ ☼ ☼

تعبیر کی شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں فاروق احمد کے گھر پہلی شادی کی تقریب تھی اور وہ سارے چاؤ پورے کر رہے تھے انہوں نے اپنی استطاعت سے بڑھ کر تعبیر کا جہیز تیار کیا۔ شادی میں صرف ایک ہفتہ باقی رہ گیا تھا۔ اتوار کو ممانی نے فون کر کے زبردستی شانزہ کو بلا بھیجا۔ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی جانا پڑا حالانکہ وہ تہیہ کر کے بیٹھی تھی کہ صرف تعبیر کی بارات پر ہی جائے گی۔ مگر شہناز بیگم کی سرزنش پر اسے چاروناچار اپنا فیصلہ بدلنا پڑا ویسے بھی جس دن سے اسے بہزاد کی ای میل موصول ہوئی تھی وہ جیسے زندگی کی طرف لوٹ آئی تھی یہ اور بات کہ اس کے بعد اس نے جتنی بار بھی اس کو ای میل کیا ادھر سے کوئی جواب نہیں آیا بہر حال وہ پر سکون تھی۔

ممانی اسے تعبیر کا جہیز دکھاتی رہیں وہ بے دلی سے ہوں ہاں ہی کرتی رہی کہ اسے ان مادی چیزوں سے بالکل دلچسپی نہ تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ تعبیر خلاف معمول کچھ چپ چپ ہے مگر اس نے وجہ نہیں پوچھی کہ اب دونوں میں اتنی بے تکلفی نہ رہی تھی۔ وہ جتنی دیر وہاں رہی تعبیر اس سے کتراتی رہی مگر شانزہ اس کی آنکھوں کی الجھن اور متوحش سے چہرے کو بھانپ گئی تھی۔ صبا نے بتایا کہ تعبیر آپی کئی دنوں سے رات کو اٹھ کر یونہی کاریڈور میں چکر لگاتی رہتی ہیں اور اکثر خواب میں ڈر جاتی ہیں شانزہ اس کی بات سن کر حیران سی ہوئی شاید وہ شادی کے بعد گھر چھوڑنے کے خیال سے گھبرائی ہوئی تھی اور یہ ایک فطری سی بات تھی شانزہ نے اس چیز کا زیادہ نوٹس نہ لیا اور آغا جان کے کمرے میں چلی آئی۔

"اس نے پھر رابطہ کیا؟" جیسے ہی وہ ان کے پاس بیٹھی انہوں نے پہلا سوال ہی بہزاد کی بابت کیا۔

"نہیں آغا جان' میں نے کئی بار ای میل کی وہ شاید مصروف ہے یا پھر جواب نہیں دینا چاہتا مگر آپ فکر مت کیجیے اب وہ زیادہ عرصہ ہم سے دور نہیں رہ سکے گا۔" وہ ان کے جسم پر کمبل اوڑھاتے ہوئے پر یقین سے انداز میں بولی۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" وہ ہاتھ میں پکڑی تسبیح کے دانے گراتے ہوئے گویا ہوئے وہ کچھ دیر ان کے پاس بیٹھی رہی پھر فیصل سے چلنے کو کہا جو ٹی وی لاؤنج

میں تیمور سے گپ شپ میں مصروف تھا۔

"شانزہ میری بات سنو۔" اس کے عقب سے تعبیر کی آواز ابھری اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تو وہ کھڑی تھی۔

"مجھے تم سے بات کرنی ہے چند منٹ کے لیے اگر میرے کمرے میں آسکو۔" وہ ملتجیانہ انداز میں گویا ہوئی تو شانزہ نے کچھ سوچ کر سر ہلایا اور اس کی معیت میں کمرے تک آئی وہ کچھ دیر یوں ہی شانزہ کو دیکھتی رہی جیسے کچھ کہنے کے لیے جملہ ترتیب دے رہی ہو شانزہ نے غور کیا کہ وہ بہت دلگیر اور الجھی ہوئی تھی۔

"تمہیں کچھ پتا ہے بہزاد کہاں ہے؟" وہ گھٹے گھٹے انداز میں بولی تو شانزہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"تمہیں اس کی فکر کب سے ہونے لگی؟" شانزہ چاہتے ہوئے بھی اپنے لہجے کی کڑواہٹ کو نہ چھپا سکی۔

"تم یقین تو نہیں کرو گی مگر پتا نہیں کیوں کچھ دنوں سے مجھے ایک عجیب سے احساس نے گھیر رکھا ہے میں خوش ہونا چاہتی ہوں مگر ہو نہیں پا رہی مجھے لگتا ہے جیسے میری رگوں میں خون کی بجائے خوف گردش کر رہا ہے۔" وہ صاف گوئی سے کہہ رہی تھی اور شانزہ یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔

"شانزہ تم میری مدد کر سکتی ہو۔" وہ اس کے ہاتھ تھام کر گڑگڑائی۔

"میں جانتی ہوں تم بہزاد کو بہت چاہتی ہو اور وہ تمہیں‘ اس رات کے واقعہ کے بعد تم دونوں کے درمیان کتنا فاصلہ پیدا ہو گیا ہے مجھے اس کا احساس ہے اور یہی احساس مجھے چین نہیں لینے دے رہا اگر اس۔۔۔"

"میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں۔" وہ اس کی بات قطع کرتے ہوئے سپاٹ سے لہجے میں بولی۔

"تم کہیں سے بہزاد کو ڈھونڈ لاؤ‘ میں اس سے معافی مانگنا چاہتی ہوں۔" اس نے ڈبڈبائی ہوئی آواز میں کہا تو شانزہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

"قصور تو اس کا ہے تم کیوں معافی مانگو گی۔" وہ طنز سے بولی۔

"اس کا کوئی قصور نہیں ہے مجھے غلط فہمی ہوئی تھی اس رات۔" وہ بظاہر تو انکشاف کر رہی تھی۔ مگر یہ شانزہ کے لیے انکشاف نہ تھا وہ تو کب سے منتظر تھی اس لمحے کی کہ کب تعبیر فاروق اپنے منہ سے اعتراف کرے گی کہ بہزاد کا کوئی قصور نہیں تھا۔

"تمہیں پتا ہے تمہاری اس غلط فہمی نے کتنی زندگیوں پر اثر ڈالا ہے۔" شانزہ کاٹ دار لہجے میں بولی۔

"تمہاری تو صرف ایک غلط فہمی تھی مگر اس نے بہزاد جیسے شریف النفس انسان کا سال اور مستقبل تاریک کر دیا وہ دربدر ہو گیا کیونکہ تم نے اس کے لیے اس بار کوئی راستہ نہیں چھوڑا تھا اب کیا فائدہ جب اتنا کچھ ہو گیا اور آپ کو احساس ندامت نے آن گھیرا ہے۔" وہ بغیر لگی لپٹی رکھے اس سے مخاطب تھی۔

"تمہارا یہ احساس شرمندگی کیا اس کے دامن پر لگے داغ کو دھو سکتا ہے تمہیں اپنی خوشیوں کی تو فکر ہے اس کی نہیں تھی۔"

"شانزہ پلیز اس سے کہو واپس آجائے‘ میں اس سے معافی مانگ لوں گی بس ایک بار وہ آجائے اگر وہ نہ آیا تو یہ پچھتاوا مجھے اندر ہی اندر ختم کر دے گا مجھے ایک پل چین نہیں ہے۔" وہ گڑگڑائی تھی سازش اور انتقام کا جو جال اس نے بنا تھا وہ خود اس میں الجھ کر رہ گئی تھی۔ اسے بہت جلد احساس ندامت اور احساس جرم نے آن گھیرا تھا۔

"تمہیں پتا ہے تعبیر‘ کسی کی ذات پر بہتان لگانا کتنا بڑا گناہ ہے اور جو بہتان تم نے لگایا تھا وہ تو بہت سنگین اور شدید نوعیت کا تھا اب اگر بہزاد واپس بھی آجائے تو تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ وہ تمہیں معاف کر دے گا جو کچھ اس پر گزری ہے کیا وہ فراموش کر سکتا ہے تمہارا معذرت کا ایک لفظ کیا اس کی ساری اذیتوں کا مداوا کر سکے گا؟" شانزہ اسے حقیقت کا تلخ رخ دکھاتے ہوئے بولی۔

"تم کہو گی تو وہ معاف کر دے گا‘ محبت میں بڑی

طاقت ہوتی ہے شانی اور وہ تم سے شدید محبت کرتا ہے وہ تمہاری بات کیسے ٹال سکتا ہے۔" وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے منت بھرے لہجے میں بولی۔

"یہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہی ہو۔" وہ اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولی۔

"مجھے بتاؤ میں کیا کروں شانی مجھے ہر وقت خوف کی پرچھائیاں گھیرے ہوئے ہیں مجھے لگتا ہے کچھ دن اور ایسی کیفیت رہی تو میں پاگل ہو جاؤں گی پلیز کچھ کرو میں تمہارے علاوہ اور کسی سے یہ سب کچھ نہیں کہہ سکتی پلیز!" اس کی آنکھوں میں سیلن سی اترنے لگی تھی مگر شانزہ کو اس پر ترس آنے کی بجائے طیش آ رہا تھا۔

"تم نے بہت ظلم کیا تعبیر۔" وہ تاسف سے بولی۔

"تم آج اگر معافی مانگ رہی ہو تو وہ بھی صرف اپنے مفاد کے لیے تاکہ تمہارا احساس جرم کم ہو جائے اور تم زندگی کی خوشیوں کو انجوائے کر سکو اس لیے نا۔" وہ غصے سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی تو وہ نظریں چرا گئی۔

"ایک شرط پہ میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔" وہ کچھ دیر بعد بولی۔

"بتاؤ۔" تعبیر آنکھیں رگڑتے ہوئے اس کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

"تم پہلے ماموں جان اور گھر والوں کو ساری حقیقت بتاؤ جب انہیں بہزاد کی بے گناہی کے بارے میں معلوم ہو گیا تو وہ خود اسے ڈھونڈ لائیں گے تمہاری معافی کی بات بعد میں آتی ہے پہلے ضروری ہے کہ اس کو گھر واپس آنے کے لیے راضی کیا جائے اگر وہ واپس آگیا تو تمہارا پچھتاوا بھی کچھ کم ہو جائے گا وہ تمہیں معاف کرتا ہے یا نہیں یہ اس کا معاملہ ہے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"میں کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں بس تم اسے راضی کر لو کہ وہ گھر واپس آجائے۔" وہ روہانسی ہو کر بولی تو شانزہ بغیر کچھ کہے کمرے سے باہر نکل گئی۔

وہ آغا جان کے پاس بیٹھی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہے تھے شانزہ نے گھر جانے سے پہلے سب کچھ آغا جان کے گوش گزار کر دیا تھا انہوں نے فوراً تعبیر کو بلا بھیجا۔

"یہ کیا کیا تم نے۔" انہوں نے بس اتنا ہی کہا تھا کہ وہ دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ کر سسکیاں بھرنے لگی۔

"مجھے تو ایک پل بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ وہ ایسا کر سکتا ہے مگر تمہارے باپ اور ماں نے جب یہ کہا کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے تو میں کیا کر سکتا تھا مگر مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ میری تربیت اتنی خراب ہو سکتی ہے۔" وہ غم اور غصے کی حالت میں تھے۔

"مجھے معاف کر دیجیے آغا جان‘ وہ سب کچھ اچانک ہوا تھا مجھے غلط فہمی ہوئی تھی شاید اس کی نیت ایسی نہیں تھی ٹھیک کہتا تھا میں نے خود کمپیوٹر ٹھیک کرانے کے لیے اسے بلایا تھا پھر پتا نہیں۔۔۔" اس کی آواز آنسوؤں میں دب گئی۔ وہ اب بھی پوری حقیقت بتانے سے گریزاں تھی کہ اپنا بھرم بھی تو رکھنا تھا۔

"پھر لائٹ چلی گئی تھی وہ شاید باہر نکلنے لگا تھا کہ اس کا ہاتھ میرے کندھے کو چھو گیا جو میں سمجھی کہ۔۔۔ اس کی نیت ویسی نہ تھی آغا جان بہت بڑی غلط فہمی ہو گئی تھی مجھے۔" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی تو آغا جان گہری سانس لے کر رہ گئے چھ ماہ قبل جو گھر میں طوفان بپا ہوا تھا اس کا محرک تعبیر تھی انہیں یہ جان کر بہت صدمہ پہنچا تھا۔ تعبیر ان کے بولنے کی منتظر تھی مگر وہ مہر بہ لب بیٹھے تھے جیسے کہنے کو کچھ بچا ہی نہ ہو انہیں اس بات کا بھی دکھ تھا کہ اتنے دن گزرنے کے بعد تعبیر کو ادراک ہوا تھا کہ اس کی نیت بری نہ تھی اور وہ اس کی پاداش میں نہ جانے کتنی اذیتوں سے گزر رہا ہو گا۔

فاروق احمد کے گھر میں ایک مرتبہ پھر سوگ کی کیفیت طاری تھی مگر اب اس کیفیت کی نوعیت غصہ نہیں ندامت اور شرمندگی تھی۔ چھ ماہ کے عرصے میں پہلی بار فاروق احمد نے بہزاد کے نام کے ساتھ خبیث کا لاحقہ نہیں لگایا تھا۔ تعبیر ان سے اور وہ آغا جان سے کتراتے پھر رہے تھے۔ اب وہ بہزاد سے معافی مانگنے پر بھی راضی تھے مگر ان کے پاس اس کا ایڈریس تھا نہ فون نمبر اور شانزہ کی ای میل کا وہ جواب نہیں

دے رہا تھا۔ شانزہ خوشی سے ہواؤں میں اڑ رہی تھی اسے یقین تھا کہ اب بہزاد واپس آجائے گا کہ حالات اس کے حق میں ہو گئے تھے۔ اس نے شام کو ایک بار پھر اس کے ای میل ایڈریس پر میل بھیجی مگر دو دن تک کوئی جواب موصول نہ ہوا یا تو وہ میل پڑھتا نہیں تھا یا پھر اس کا ای میل ایڈریس تبدیل ہو گیا تھا شانزہ کو ایک بار پھر مایوسی نے آن گھیرا تھا۔

تعبیر کی مہندی سے ایک دن قبل وہ کچھ خریدنے کے لیے طارق روڈ گئی تھی وہ گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر سامان سے بھرا شاپر رکھ کر سیدھی ہوئی ہی تھی کہ اس کی نظر بائیں طرف بنے پلازہ سے نکلتے بہزاد پر پڑی وہ تیزی سے دوسری سمت جا رہا تھا وہ جلدی سے گاڑی کا دروازہ بند کر کے اس کی طرف دوڑی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا فیصل حیرت سے اسے سڑک کی دوسری جانب جاتا دیکھ رہا تھا۔

"بہزاد' بہزاد بات سنو۔" وہ پھولے ہوئے سانسوں کے درمیان تقریباً" چلائی تھی۔ وہ رک گیا اسے شاید وہم سا ہوا تھا کہ کسی نے اسے پکارا تھا اس سے پہلے کہ وہ پھر قدم اٹھاتا شانزہ اس کے قریب پہنچ گئی تھی۔

"بہزاد ٹھہرو۔" شانزہ کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی اس نے پلٹ کر دیکھا وہ اس کے عین سامنے کھڑی تھی تیز چلنے کی وجہ سے اس کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا اور وہ بہزاد کو' کتنا کمزور اور ویران سا ہو گیا تھا ان چند مہینوں میں شانزہ اس کی بجھی بجھی آنکھوں کو دیکھ کر سوچ رہی تھی۔

"کہاں تھے تم بھلا ایسے بھی کوئی کرتا ہے تم نے سب سے ہی قطع تعلق کر لیا کیوں؟" اس کے دل میں ڈھیروں سوالات بھرے تھے اس نے ایک ہی سانس میں کر ڈالے وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

"بولتے کیوں نہیں ہو تم' چلو میرے ساتھ۔" وہ زچ ہو کر بولی۔

"کہاں؟" اس نے بس اتنا ہی کہا۔

"گھر اور کہاں!" وہ بہت عجلت میں تھی۔

"جس جگہ سے آپ کو نکل جانے کو کہا گیا ہو وہ گھر تو نہیں رہتا۔" وہ زخمی سی مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوا۔

"لیکن اب وہی گھر تمہارا منتظر ہے' چلو بہت ناراض ہو لیے۔" شانزہ اس کا بازو کھینچتے ہوئے بولی۔

"کیا مطلب تم مجھے ایسے کیسے لے جا سکتی ہو۔" وہ اپنا بازو چھڑاتے ہوئے ناسمجھی سے شانزہ کی طرف دیکھنے لگا۔

"اب کیا ساری باتیں سڑک پر پوچھو گے' تم میرے ساتھ چلو میں سب کچھ بتاتی ہوں۔" وہ مصر تھی اسے ہار ماننا پڑی وہ اس کی معیت میں گاڑی تک آیا تو فیصل مارے حیرت اور خوشی سے اس سے لپٹ گیا۔

"چلو بیٹھو۔" شانزہ نے اگلا دروازہ اس کے لیے کھولا تو وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔ گاڑی کا رخ اب شانزہ کے گھر کی طرف تھا۔

پھپھو بے یقینی سے بہزاد کو دیکھ رہی تھیں ان کی آنکھوں میں نمی سی بھر گئی تھی وہ کتنی دیر اسے سینے سے لگائے سسکتی رہیں۔ سب کی آنکھوں سے اشک کی دھند چھٹ گئی تو سب کچھ بالکل صاف اور اجلا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سب کے درمیان بہت خاموشی سے بیٹھا رہا۔ پچھلے چھ ماہ کا کرب اور دکھ اس کے چہرے سے عیاں تھا۔

"تم نے کہا تھا نا کہ جب وقت تمہارے حق میں گواہی دے گا تو تم واپس آجاؤ گے تو سمجھ لو لوٹنے کا لمحہ آگیا ہے۔" شانزہ اس سے مخاطب تھی وہ ایک بار پھر ناسمجھی کے عالم میں اسے دیکھنے لگا۔ پھپھو کسی کام سے کچن میں گئی تھیں اور اب اس کے پاس صرف شانزہ موجود تھی۔

"پرسوں تعبیر کی رخصتی ہے۔" شانزہ کی بات پر وہ لب کاٹ کر نیچے قالین کی طرف دیکھنے لگا تھا تعبیر کے ذکر پر اس کے چہرے پر ایک سایہ سا آکر گزر گیا تھا اور اس سائے میں نفرت کا عکس واضح تھا۔

"اور رخصتی سے پہلے اس نے تمہاری بے گناہی کی شہادت دی ہے اس نے تسلیم کیا ہے کہ اس رات کا واقعہ محض ایک غلط فہمی تھی۔ سب بہت شرمندہ ہیں اور تمہارے منتظر ہیں۔" شانزہ کی بات پر وہ طنز سے مسکرا دیا۔

"ان کی شرمندگی میری روح پر لگے گھاؤ مندمل کر سکتی ہے۔ جو اذیت اور ندامت میرے حصے میں آئی تھی اس کا مداوا کر سکتی ہے؟" وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"جو بھی ہے' بہزاد قدرت نے تعبیر کے دل میں اتنا رحم ضرور ڈال دیا ہے کہ وہ تم سے معافی مانگنے پر تیار ہے۔" شانزہ نے آہستگی سے کہا۔

کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

وہ شانزہ کی بات پر تلخی سے سوچ کر رہ گیا۔

"ان دنوں وہ بہت کرب سے گزر رہی ہے۔ جب تک تم اسے معاف نہیں کرو گے وہ احساس جرم کی آگ میں جلتی رہے گی۔"

"اور جس آگ میں میں جلتا رہا ہوں اس کا تمہیں احساس نہیں۔" وہ تڑخ کر بولا۔

"احساس ہے' بہزاد تم اسے معاف کر دو گے تو دلوں کی سب کدورتیں صاف ہو جائیں' تعبیر اور تم میں بہت فرق ہے' جو تمہارے اندر بڑا پن ہے وہ اس کے اندر نہیں ہے۔" وہ لب بھینچے خاموشی سے شانزہ کو دیکھتا رہا۔

"تعبیر کہتی ہے تم مجھ سے محبت کرتے ہو اور میری بات نہیں ٹال سکتے' میرا بھرم رکھو گے بہزاد؟" وہ اس کے ہاتھ پر اپنا نرم و ملائم ہاتھ رکھتے ہوئے محبت سے بولی۔

"اور تم کیا کہتی ہو؟" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نرمی سے بولا۔

"میں نہیں میرا دل کہتا ہے کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو اور محبت میں لیکن نہیں ہوتا۔" وہ پیار بھرے انداز میں بولی۔

"اگر تم اس بات پر اڑ گئی ہو کہ میں اسے معاف کر دوں تو میں نہ کیسے کر سکتا ہوں' تعبیر بھی جانتی ہے کہ میں واقعی تمہاری بات ٹال نہیں سکتا۔" وہ اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولا تو وہ ممنونیت سے مسکرا دی۔

"تو پھر تم چلو گے؟" اس نے پوچھا۔

"کہاں؟"

"آغا جان کے پاس؟" وہ محبت سے بولی۔

"ضرور چلوں گا' مگر آج نہیں۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"کیوں!" وہ متعجب ہوئی۔

"میں تعبیر کو معاف کرنے کے باوجود اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا کہ اس کو جب بھی دیکھوں گا میرے زخم تازہ ہو جائیں گے' میں اس کی رخصتی کے بعد گھر جاؤں گا۔" وہ قطعی لہجے میں گویا ہوا تو شانزہ خاموش ہو گئی۔

"آغا جان سے کہنا میں چند روز تک آجاؤں گا' مگر اکیلے نہیں کسی کو ساتھ لے کر۔" وہ اٹھنے لگی تو بہزاد نے کہا۔

"میں سمجھی نہیں۔" وہ مسکرائی۔

"تم نہ سمجھو وہ تو سمجھ جائیں گے۔" بہزاد شرارت سے بولا تو وہ ہنس دی۔

"تم پہلے تو ایسی ذو معنی گفتگو نہیں کرتے تھے جو مجھے نہ سمجھ آئے۔" وہ کچھ توقف کے بعد گویا ہوئی۔

"ویسے تو تمہیں ہر بات سمجھ آجاتی ہے' یہ کیوں نہیں آرہی' اپنے دل سے پوچھو تو سارے مفہوم کھل جائیں گے۔" وہ اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں بولا۔

"دل کا کیا ہے وہ تو اپنی مرضی کا مفہوم بنا لے گا۔" شانزہ نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

"دل کبھی محبت کا مفہوم نہیں بدلتا' تم کبھی آزما کر دیکھنا۔" وہ مسکرایا تو وہ شانت سی ہو کر واپس مڑ گئی۔ خزاں رسیدہ پیڑوں پر پھر سے نئے شگوفے پھوٹنے کو تھے کہ بہار ہمیشہ خزاں کے دم سے ہی تو جنم لیتی ہے۔ شاخوں سے برگ زرد جدا ہونے کے بعد نئی کونپلیں وجود میں آنے کو تھیں اور اس نے دامن کے ساتھ ساتھ اپنا دل بھی کشادہ کر لیا تھا۔

☆ ☆

فوزیہ یاسمین

دستِ کوزہ گر

زوبیہ کو اپنے گھر میں اپنی خالہ شائستہ کی روح نظر آتی ہے۔ لیکن وہ اس سے بات نہیں کرتی۔۔۔ جبکہ زوبیہ ان سے بات کرنے کے لیے بے چین ہے ۔۔۔ اس کی ملاقات رخسار سے ہوتی ہے۔ جو کالج میں اس کے ساتھ پڑھتی ہے اور روحوں سے بات کرنے کا دعوا بھی کرتی ہے۔۔۔ زوبیہ اسے رات کے دو بجے اپنے گھر کی چھت پر لے جاتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس کی خالہ کی روح کو بلائے۔۔۔ وہ روح کو بلانے کی کوشش کرتی ہے۔

رومیلہ، سنبل اور نمل کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن مل جاتا ہے۔ اور اسی خوشی میں نمل ان دونوں کو لنچ کی دعوت دیتی ہے۔۔۔ اس آفر پر دونوں حیران رہ جاتی ہیں۔ جبکہ دوسری طرف خرم، ذکی سے شرط ہارنے کے بعد اس کی عجیب و غریب شرط کو قبول کرلیتا ہے۔ اور انہیں لنچ کے لیے کہہ دیتا ہے۔

زوبیہ اپنی خالہ سے بات کرنے کے بعد بہت مطمئن ہوتی ہے جبکہ رخسار اس کے بے وقوف بن جانے پر خوش ہے۔ وہ دونوں واپس جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھتی ہیں کہ اچانک لائٹ چلی جاتی ہے؟ اور کوئی رخسار کو اندھیرے میں زخمی کردیتا ہے۔۔۔

(اب آگے پڑھیے)

۱۴
چودھویں قسط

رومیلہ کچھ دیر تو بے بسی سے اسے دیکھتی رہی، پھر گہرا سانس کھینچتے ہوئے بولی۔
"تم نے ماموں (عظمت خلیل) کا غصہ خرم پر نکالا ہے، ورنہ یہ کوئی ضروری نہیں کہ یہ سب خرم کا ہی کیا دھرا ہو۔"
"What ؟" نمل حیرت کی زیادتی سے چیخ پڑی تھی۔
"یہ تم کہہ رہی ہو رومیلہ؟ تم جو خرم کے پلان کے متعلق سب کچھ پہلے سے جانتی تھیں، اس سمیر نامی شخص نے یہ ہی سب کہا تھا تا مجھے ابو کا غصہ کسی پر نکالنے کی ضرورت نہیں ہے، کاش کہ میں ابو کے خلاف کچھ کر سکتی، لیکن اگر میں ان کے اگینسٹ کوئی ایکشن نہیں لے سکتی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ادھر ادھر اپنی فرسٹریشن نکالتی پھروں۔
کم از کم مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی کہ تم میرے بارے میں ایسا سوچو گی۔" نمل کا غصہ ایک دم بے بسی میں تبدیل ہو گیا۔
رومیلہ پر جیسے گھڑوں پانی گر گیا، وہ نمل کے پاس آ کر اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے شرمندگی سے بولی۔
"میرا... میرا وہ مطلب نہیں تھا تم پلیز غلط مت سمجھو۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہ رہی تھی، اگر کل رات ماموں سے وہ جھگڑا نہ ہوا ہوتا تو شاید تم اتنی آسانی سے اپنا ٹیمپر لوز نہ کرتیں۔
لیکن جو بھی ہوا بہر حال اچھا نہیں ہوا میرے خیال سے تم ایک، دو دن یونیورسٹی نہ آؤ تو بہتر ہے۔"
"کیوں... میرے نہ آنے سے کیا ہو گا؟" نمل نے ایک جھٹکے سے اپنے ہاتھ چھڑا لیے۔
"کیا تم میری غیر موجودگی میں خرم سے بات کر کے اسے ٹھنڈا کرنا چاہتی ہو، تاکہ وہ مجھے کوئی نقصان نہ پہنچائے۔" رومیلہ واقعی یہ ہی سوچ رہی تھی، پتا نہیں خرم نے ایسا کوئی پلان بنایا تھا بھی یا نہیں، جس کا تذکرہ سمیر نے کیا تھا۔ کیا پتا وہ ان ساری باتوں سے واقف ہی نہ ہو۔
اگر ایسا تھا تو وہ خرم سے نمل کی غیر موجودگی میں مل کر اسے نمل کی اس غلط فہمی کے بارے میں بتانا چاہتی تھی، تاکہ وہ نمل کے اقدام پر کسی رد عمل کا مظاہرہ کرنے سے پہلے اسے سمجھ سکے۔
مگر اب جبکہ نمل نے یہ اندازہ لگا لیا تھا تو رومیلہ کے پاس اسے جھٹلانے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔
"نہیں یار ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ ہو سکتا ہے خرم غصے کی زیادتی کی وجہ سے بھرے مجمع میں کوئی سین کری ایٹ کرنے کی کوشش کرے، جبکہ ہو سکتا ہے ایک، دو دن میں اس کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہو جائے۔
تم سمجھ رہی ہو نا میں کیا کہہ رہی ہوں، کیا فائدہ ہے اسے ایسا موقع دینے کا کہ دوسرے لوگ بھی متوجہ ہو جائیں۔" رومیلہ نے ہر ممکن حد تک کوشش کی تھی ایسے الفاظ استعمال کرنے کی جنہیں سن کر نمل کا ٹھنڈا پڑتا اشتعال دوبارہ نہ بھڑک اٹھے، بلکہ نمل کو کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر اس کی توجہ دوسری جانب مبذول کرانے کے لیے وہ فوراً" ہی موضوع بدلتے ہوئے بولی۔
"میں شمائلہ اور اس کی ماں سے ملنا چاہ رہی تھی، کیا تم آج جاؤ گی ان کی طرف۔"
"نہیں! میں اب کبھی وہاں نہیں جاؤں گی۔" جواب بالکل توقع کے برعکس تھا، رومیلہ بے ساختہ اچنبھے کے ساتھ بولی۔
"کیوں؟"
"کیوں جاؤں میں وہاں؟ ان کی بے بسی کا تماشا دیکھنے یا یہ دیکھنے کہ اپنے مجرم کے عنایت کیے ٹکڑوں پر وہ اپنے معذور بیٹے کا علاج کیسے کرا رہے ہیں۔" نمل زہر خند لہجے میں بولی۔

"جو ہونا تھا وہ ہو چکا، نمل اب اس پر رونے کی بجائے شمائلہ کی مدد کرنے کا سوچو۔ ماموں بھلے ہی سارا خرچ اٹھا رہے ہیں، لیکن ہمارے وہاں جانے سے انہیں جذباتی طور پر بھی تھوڑا سہارا ملے گا۔"
"میں جانتی ہوں تم یہ سب صرف مجھے بہلانے کے لیے کہہ رہی ہو، ورنہ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو جو ہونا تھا وہ ہو چکا، یہ کہہ کر ہم اپنی جان نہیں چھڑا سکتے، کیونکہ جو آج ہوا ہے وہ کل پھر ہو گا۔ آج حسام کے ساتھ ہوا ہے، کل کو کسی اور کے ساتھ ہو گا، میں خاموش رہ کر صرف حسام کے ساتھ نہیں بلکہ سب کے ساتھ زیادتی کر رہی ہوں، ان تمام لوگوں کے ساتھ جو کل کو ابو کی شہرت کی بھینٹ چڑھ سکتے ہیں۔" نمل تلخی سے بولی۔
رومیلہ اس سے پوری طرح متفق ہونے کے باوجود محض اس کا دل رکھنے کے لیے تسلی دینے والے انداز میں کہنے لگی۔
"ایسا کوئی دو یا چار کیسز میں ہوتا ہے کہ ماموں اپنی شہرت اور اپنے نام کے لیے انہیں سولی پر چڑھا دیتے ہیں، ورنہ ان کا ٹرسٹ بہت سارے نیک کام بھی کر رہا ہے۔ بھلے ہی ماموں اپنی خود غرضی سے کچھ لوگوں کو تباہ کر رہے ہیں، لیکن اپنے ٹرسٹ اور اپنی نیک نامی کے پروپیگنڈے کے لیے کچھ لوگوں کو آباد بھی کر رہے ہیں، نیت چاہے ان کی جو بھی ہو کچھ لوگ تو فلاح پا رہے ہیں نا۔" رومیلہ کی بات پر نمل نے کوئی تبصرہ نہیں کیا، بلکہ خاموش ہی رہی تو رومیلہ مزید کہنے لگی۔
"انسان کے پیش نظر صرف اپنا فائدہ ہوتا ہے، اب ابرار بھائی کو ہی دیکھ لو، بزنس میں اپنے فائدے کے لیے وہ کسی کو بھی خریدنے اور کچھ بھی بیچنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ انہیں اس بات سے غرض ہی نہیں ہے کہ ان کے فیصلے کی زد میں کون کون آ رہا ہے۔
مجھے یقین ہے میری شادی بھی ایسی ہی کسی بزنس ڈیل کا نتیجہ ہے، اپنا کاروبار چمکانے کے لیے ہی ابرار بھائی نے یہ رشتہ منظور کیا ہو گا، انہیں اگر سیدھی انگلی سے گھی نکلتا نظر نہیں آتا تو وہ فوراً" انگلی ٹیڑھی کر لیتے ہیں۔
ایسے میں ماموں کا کام تو لاکھ گنا بہتر ہے وہ اگر دس لوگوں کو نقصان پہنچاتے ہیں تو بیس لوگوں کو کئی نقصان سے محفوظ بھی رکھتے ہیں۔ تم ان کے منفی پہلو پر نظر رکھنے کی بجائے مثبت پہلو پر غور کیا کرو، تمہارے سکون کے لیے یہ طرز فکر بہت ضروری ہے۔" رومیلہ رسانیت سے کہتی رہی۔ نمل بے دلی سے اسے سنتی رہی۔
وہ کسی چیز کو محض اس لیے قبول نہیں کر سکتی تھی کہ دوسری چیزیں اس سے بھی زیادہ بری تھیں۔
رومیلہ کی باتیں اسے محض دل بہلانے کا سامان لگ رہی تھیں جو کہ کم از کم نمل کو بہلانے کے لیے ناکافی تھیں۔
رومیلہ نے اس موضوع کا آغاز نمل کا دھیان بٹانے کے لیے کیا تھا، مگر خود اس کا اپنا دھیان بٹ گیا تھا، وہ خود کلامی کے انداز میں بولنے لگی تو نمل نہ چاہتے ہوئے بھی توجہ دینے پر مجبور ہو گئی۔
"تم اگر ماموں کے رویے کو برداشت کر رہی ہو یا ان کے سامنے خاموش کھڑی ہو تو تمہارے پیش نظر تمہاری ماں کی بھلائی ہے۔ ان کی خاطر تم ہر کڑوے سے کڑوا گھونٹ پی جاتی ہو، مگر میرے پاس تو خاموش رہنے کی کوئی وجہ ہی نہیں ہے۔
جب میں سوچتی ہوں کہ میں یہ سب کیوں برداشت کر رہی ہوں اور ایک ایسی شادی کے لیے کیوں راضی ہو گئی ہوں، جس پر میرا دل راضی نہیں ہے۔ تو میرے پاس اپنے سوال کا کوئی جواب ہی نہیں۔ بس میں یہ سوچ کر خود کو تسلی دے دیتی ہوں کہ ہمارے معاشرے میں بہت ساری لڑکیوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔
میرے ساتھ کچھ انوکھا نہیں ہو رہا، اس لیے میں ایک ایسی شادی پر تیار ہوں، جس کی طرف سے مجھے اتنے شک و شبہات ہیں، پتا نہیں یہ گلفام کون ہے؟ کیا کرتا ہے؟ اتنے عرصے سے دیار غیر میں مقیم ہے، اس کی عادت

مزاج کیسے ہیں' کیا پتا اس نے وہاں پہلے ہی ایک شادی کر رکھی ہو' پتا نہیں وہ وہاں کس طرح رہتا ہو؟ پتا نہیں وہ مجھے وہاں کس طرح رکھنے والا ہے' کیا ان سب سوالوں پر ابرار بھائی نے غور کیا ہو گا؟ نہیں۔۔۔ مجھے سو فیصد یقین ہے اگر بابا جانی کو خیال آیا بھی ہو گا تو انہوں نے بھی یہ سوچ کر خود کو تسلی دے دی ہو گی کہ ابرار نے کچھ سوچ کر ہی فیصلہ کیا ہو گا۔

جبکہ مجھے یقین ہے ابرار بھائی نے ایسا کچھ سوچا ہی نہیں ہو گا' انہیں تو یہ سب غیر ضروری باتیں لگ رہی ہوں گی۔

ان کے ایک کاروباری واقف نے رشتہ دے دیا' جس سے یقیناً" ابرار بھائی کو مستقبل میں فائدہ پہنچنے کی امید ہو گی۔

چنانچہ انہوں نے بغیر چھان بین کیے رشتہ منظور کر لیا' اب یہ میری قسمت ہے کہ یہ ہی رشتہ میرے حق میں اچھا ثابت ہو جائے' ورنہ برا نکلنے کی صورت میں بھی الزام مجھ پر ہی آتا ہے کہ سر پر ماں تو تھی نہیں اچھا برا سکھانے والی' لہٰذا لڑکی کی پرورش صحیح طریقے سے نہیں ہو سکی۔ کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے صاف انکار کر دوں' لیکن شاید مجھ میں ہمت نہیں ہے بولنے کی۔" نمل سب کچھ بھول بھال کر بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی۔

وہ جانتی تھی رومیلہ اپنی شادی کی وجہ سے پریشان ہے' مگر وہ اتنی پریشان ہے' یہ اندازہ نمل کو اب جا کر ہوا تھا۔

وہ تو یہ ہی سمجھ رہی تھی کہ اچانک شادی طے ہو جانے پر رومیلہ ذہنی طور پر تیار نہیں ہو پا رہی' مگر اس کا ذہن منتشر نہیں تھا' بلکہ ایک منفی نکتے پر آ کر مرکوز ہو گیا تھا اور افسوس کی بات یہ تھی کہ وہ نکتہ اتنا منفی بھی نہیں تھا۔

ابرار بھائی کو نمل بھی بچپن سے جانتی تھی' وہ خاصے لیے دیے رہنے والے اکھڑ قسم کے آدمی تھے' وہ کس حد تک خود غرض تھے یہ تو نمل نہیں جانتی تھی۔ البتہ اتنا اسے یقین تھا کہ انہیں ایک مخلص شخص نہیں کہا جا سکتا تھا۔

ایسے میں رومیلہ نے جتنے بھی اندازے لگائے تھے انہیں بے جا سوچ یا منفی خیالات نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہ واقعی شادی ہو کر بہت دور جانے والی تھی' ایک اجنبی ملک کے اجنبی شہر میں' ایک بالکل اجنبی کے ساتھ رہنے کا خیال اگر روح فرسا تھا تو اس خوف کو تقویت دینے والی تحریک یہ حقیقت تھی کہ یہ انتخاب ایک ایسے شخص نے کیا تھا جس کے فیصلے پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا اور یہ ہی ایک احساس دوسرے تمام وسوسوں کا موجب تھا۔ نمل تھوڑی دیر کے لیے اپنی پریشانی بھول کر رومیلہ کو سمجھانے میں لگ گئی۔

"تم اس طرح کیوں سوچ رہی ہو' اگر تمہارا دل اس رشتے کے لیے نہیں مان رہا تو میں پھوپھا جان (بابا جانی) سے بات کرتی ہوں۔ تم اتنی مجبور نہیں ہو کہ چار و ناچار اس رشتے پر راضی ہو جاؤ۔" نمل کی بات پر رومیلہ تلخی سے مسکرا دی اور مرے ہوئے لہجہ میں بولی۔

"تم کیا بات کرو گی ان سے' یہ کہ میرا دل نہیں مان رہا' وہ کہہ دیں گے شادی کے وقت تو سب ہی لڑکیاں پریشان ہوتی ہیں اور وہ اتنی دور جانے کے خیال سے خوف زدہ ہے' اتنی سی بات پر اتنا اچھا رشتہ چھوڑا نہیں جا سکتا۔" نمل پل بھر کے لیے چپ ہو گئی' رومیلہ غلط نہیں کہہ رہی تھی' اس کے بابا جانی نمل کی بات سن کر کم و بیش کچھ ایسا ہی کہنے والے تھے' مگر وہ جیسے ہار نہ مانتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے گلفام بھائی کے بارے میں تمہارے جو بھی شک و شبہات ہیں انہیں میں خود دور کروں گی' تمہیں ابرار بھائی کے فیصلے پر بھروسہ نہیں ہے' لیکن مجھ پر تو یقین ہے نا۔ میں خود کینیڈا جاؤں گی' گلفام بھائی سے ملنے اور یہ دیکھنے کہ وہ وہاں کس طرح رہتے ہیں۔" نمل پرعزم لہجے میں بولی تو رومیلہ ایک دم ہنس پڑی' عجیب سی ہنسی تھی اس کی جیسے اپنا ہی مذاق اڑا رہی ہو' نمل مصنوعی ناراضی دکھاتے ہوئے شکوہ کناں لہجے میں بولی۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے' میں نے کوئی لطیفہ نہیں سنایا ہے' میں بالکل سیریس ہوں۔"

"تو میں کب کہہ رہی ہوں کہ تم مذاق کر رہی ہو۔ for your kind information شادی میں بہت کم وقت رہ گیا ہے۔ تمہارے پاس کینیڈا جا کر معلومات کرنے کا ٹائم ہی نہیں ہے۔" رومیلہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے گویا اس کی یاد دہانی کرائی تو نمل پہلے تو اس کی بات پوری ہونے تک اسے مطمئن نظروں سے دیکھتی رہی پھر ٹھیک اسی کے انداز میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔" میرے لیے کینیڈا جانا کوئی مشکل کام نہیں ہے' مجھے جس وقت کی سیٹ مل جائے' میں اسی وقت کینیڈا افلائی کر سکتی ہوں' میرے پاس کینیڈین پاسپورٹ ہے' مجھے ویزا لینے کا انتظار بھی نہیں کرنا ہو گا۔"

رومیلہ بری طرح چونک گئی۔

یہ بات تو اسے یاد ہی نہیں رہی تھی کہ عظمت خلیل کے پاس کینیڈین نیشنلٹی تھی' مگر وہ ملک و قوم کی خدمت کے لیے پاکستان میں رہتے تھے۔

"مگر۔۔۔ تم وہاں کہاں جاؤ گی' کہاں رہو گی' ممانی تو تمہارے ساتھ جا نہیں سکتیں' ان کی طبیعت۔۔۔"

"ان کی طبیعت اگر ٹھیک بھی ہوتی تو بھی میں انہیں لے کر نہ جاتی' میں وہاں جا کر ہوٹل میں ٹھہروں گی اور صرف دو یا تین دن میں آ جاؤں گی' تاکہ امی کو پریشانی بھی نہ ہو۔

ویسے بھی مجھے صرف گلفام بھائی سے ہی تو ملنا ہے' ان کا نمبر اور ایڈریس میں ابرار بھائی سے لے کر جاؤں گی اور میں ان سے یہ نہیں کہوں گی کہ میں خاص ان سے ملنے جا رہی ہوں' ورنہ تو وہ مجھے ایڈریس کبھی نہیں دیں گے۔

بلکہ جس طرح کی ضدی طبیعت کے وہ ہیں' اگر انہیں بھنک بھی پڑ گئی کہ میں صرف اس لیے خاص طور سے اتنی دور جا رہی ہوں کہ یہ دیکھ سکوں کہ جسے انہوں نے چنا ہے وہ رومیلہ کے قابل ہے بھی یا نہیں تو وہ ایک دم بھڑک اٹھیں گے' بلکہ ان سے کوئی بعید نہیں کہ ابو کو فون کر کے وہ انہیں بھی بھڑکا دیں کہ ذرا بیٹی کو قابو میں رکھیں۔" نمل کافی جوش سے بول رہی تھی۔

رومیلہ اس طرح اس کے اکیلے اتنی دور جا کر ہوٹل میں رہنے کے حق میں تو نہیں تھی' مگر جس مقصد سے وہ یہاں آئی تھی وہ ضرور پورا ہوتا نظر آ رہا تھا۔

وہ حشام والے معاملے سے اس کا دھیان ہٹانا چاہتی تھی اور ساتھ ہی اس کی یہ بھی خواہش تھی کہ نمل کچھ دن یونیورسٹی نہ جائے' تاکہ وہ اس کے پیچھے خرم سے بات کر سکے اور اس کی طرف سے معافی تلافی کر کے معاملہ رفع دفع کر دے۔

چنانچہ رومیلہ متفق نہ ہوتے ہوئے بھی بظاہر خاموش ہو گئی' یہ سوچ کر کہ ممانی بھی اسے اکیلے اتنی دور جانے نہیں دیں گی اور وہ رشیدہ کی بات کبھی نہیں ٹالتی' جبکہ نمل اس کی خاموشی کو اس کی رضامندی سمجھتے ہوئے اسی وقت موبائل نکال کر ابرار بھائی سے بات کرنے لگی۔

"وہ دراصل میں نے آپ کو اس لیے فون کیا تھا ابرار بھائی کہ ہم سب کینیڈا جا رہے ہیں' ابو کو کچھ کام ہے وہاں۔ ہم جلدی ہی واپس بھی آ جائیں گے۔ تو میں سوچ رہی تھی' کیوں نا وہاں گلفام بھائی سے بھی مل لوں' آخر رشتے داری ہونے والی ہے۔"

"ارے یہ تو بہت اچھی خبر سنائی تم نے۔ یہ تو بہت اچھا رہے گا' اگر ماموں بھی اس سے مل لیں۔" ابرار بھائی خوشدلی سے بولے تو نمل نے بے اختیار مسکراتے ہوئے مٹھی بند کر کے رومیلہ کو دائیں ہاتھ کا انگوٹھا دکھایا گویا مشن کامیاب ہونے کا اشارہ کیا۔ رومیلہ آنکھیں پھیلائے اور منہ کھولے اسے دیکھے گئی' جو کہہ رہی تھی۔

"تو آپ ایسا کریں مجھے گلفام بھائی کا ایڈریس وغیرہ دے دیں۔"

"ہاں ہاں ابھی لکھ لو' بلکہ میرے اس دوست کا ایڈریس اور فون نمبر بھی لکھ لو جو گلفام سے مل چکا ہے' ان فیکٹ اسی کے اپروکرنے پر میں نے اس رشتے کے لیے ہامی بھری ہے۔

وہ وہاں اپنے بیوی' بچے کے ساتھ کافی عرصے سے رہ رہا ہے' اس سے رابطہ کرکے تمہیں گلفام سے ملنے میں آسانی ہوگی۔" ابرار بھائی نے اسی وقت اپنے موبائل میں سے گلفام اور اپنے دوست کا ایڈریس اور نمبر نکال کر لکھوادیا' جسے نمل نے بڑی احتیاط سے نوٹ کرلیا۔

"تو پھر کب جارہے ہو تم لوگ؟" ابرار بھائی نے پوچھا۔

"بس ابرار بھائی سیٹ ملنے پر ڈیپینڈ کرتا ہے۔" نمل نے الوداعی کلمات کہہ کر فون بند کردیا۔

"جب ابرار بھائی کو پتا چلے گا کہ تم اکیلی گئی ہو تو جانتی ہو کیا ہوگا۔" رومیلہ نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں جانتی ہوں انہیں کافی برا لگے گا ہو سکتا ہے وہ فوراً" ابو کو فون کرکے ان کی خود سر اور باغی بیٹی کی شکایت بھی کردیں۔ لیکن یہ سب کچھ میرے کینیڈا جانے کے بعد ہوگا' وہاں جاکر میں ایک بار گلفام بھائی سے مل لوں گی اور آنے کے بعد ابو اور ابرار بھائی کی تھوڑی سی ڈانٹ یا جلی کٹی سن لوں گی۔ ابو کے منہ سے میں ایسے القابات سنتی ہی رہتی ہوں' کوئی نئی بات تو ہے نہیں۔"

"لیکن ماموں تمہارے پیچھے ممانی پر بگڑیں گے۔"

"اسی لیے میں فوراً" جاکر فوراً" واپس آؤں گی' بس دعا کرو میرے آنے تک ابرار بھائی کی ابو سے بات نہ ہوسکے' میرے آنے کے بعد اگر کچھ پتا چلتا بھی ہے تو کوئی فرق نہیں پڑتا مگر میرے پیچھے ابو کوئی ہنگامہ نہ کھڑا کریں' کیونکہ جب انہیں پتا چلے گا تو غصہ تو انہیں یقیناً" بہت آئے گا۔" نمل حالات کا صاف گوئی سے تجزیہ کرتے ہوئے بولی۔

"اور اگر۔۔۔" رومیلہ نے کچھ کہنا شروع ہی کیا تھا نمل نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تم صرف اتنا بتاؤ کیا تم نہیں چاہتیں کہ میں گلفام بھائی سے ملوں۔"

"مجھے تو بہت خوشی ہوگی' اگر تم ایک بار ان سے مل لوگی' لیکن۔۔۔"

"یہ بات ہے تو بس اس کے آگے سارے اگر' مگر' لیکن' سب بھول جاؤ اور مجھے کرنے دو جو میں کرنے جارہی ہوں۔" نمل کے حتمی انداز پر رومیلہ گہرا سانس کھینچ کر رہ گئی۔

اسے چپ دیکھ کر نمل سکون سے ٹریول ایجنسی کا نمبر ملانے لگی اسے کون سی لمبی چوڑی شاپنگ اور پیکنگ کرنی تھی' وہ پہلی فلائٹ سے وہاں جانا چاہتی تھی اور سیٹ بھی اسے ایک ہی چاہیے تھی' چنانچہ اس کی خواہش پر عمل ہونا بہت آسان تھا۔

اسی لیے فون رکھنے کے بعد وہ فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ رومیلہ کو دیکھنے لگی جو اس کی یک طرف کی گفتگو سے اتنا جان ہی گئی تھی کہ کل دوپہر کی کوئی فلائٹ اسے مل گئی ہے' تب ہی اسے یاد دلاتے ہوئے بولی۔

"سیٹ مل جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے' بڑی بات تو تب ہے' جب تمہیں اجازت مل جائے۔"

"امی کے سامنے میں دو' چار جذباتی جملے بولوں گی اور وہ اجازت دے دیں گی اور رہا سوال ابو کا تو انہیں بتانے کی ضرورت ہی نہیں' میں کہہ دوں گی تمہارے گھر رہنے جارہی ہوں۔" نمل نے کمال بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

"یہ سب اتنا آسان بھی نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہی ہو' ابرار بھائی کو پتا ہے اور وہ ماموں جان سے پوچھ سکتے ہیں کہ آپ کو گلفام کیسا لگا؟" رومیلہ قائل نہ ہوتے ہوئے بولی۔

"نہیں صرف یہ پتا ہے کہ ہم جارہے ہیں' یہ نہیں پتا کہ ہم کب جارہے ہیں' ایک بار میں ہو کر آجاؤں اس کے بعد ابو کو پتا چلتا بھی ہے تو کیا فرق پڑتا ہے' بس میری غیر موجودگی میں وہ امی کو پریشان نہ کریں' آنے کے بعد تو میں ان کی لن ترانیاں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دوں گی؟ Who cares ۔" رومیلہ جو بڑی سنجیدگی سے اسے دیکھ رہی تھی اس کے لاپروائی سے آخری جملہ کہنے پر بے اختیار مسکرادی۔

"تم نے بھی خرم کا انداز اپنالیا ہے۔"

"کیا مطلب؟" نمل واقعی نہیں سمجھی۔

"بھئی اتنا ٹائم ہوگیا ہے' ہمیں یونیورسٹی میں پڑھتے ہوئے یہ تو تم بھی جان گئی ہوگی کہ یہ ڈائیلاگ اکثر و بیشتر خرم بول رہا ہوتا ہے۔" رومیلہ نے قدرے شوخی سے کہا۔

"اس نے کہہ دیا تو اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ اب یہ جملہ کوئی بول ہی نہیں سکتا۔" نمل اپنے سابقہ لاپروا انداز میں بولی تو رومیلہ دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرنے لگی' جس نے اس کی خواہش کے مطابق نمل کا دھیان حشام کی معذوری پر سے ہٹادیا تھا۔

ایک طرح سے وہ اس کے محض اپنی خاطر اتنی دور جانے پر راضی بھی اسی لیے ہوئی تھی کہ نمل کے مزاج پر چھایا بوجھل پن گلفام سے ملنے کے خیال سے ایک دم چھٹ گیا تھا۔

اور یہ تو رومیلہ بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ نمل کے لیے اتنا مہنگا ٹکٹ لینا اور وہاں جاکر ٹھہرنا کوئی مسئلہ نہیں۔ عظمت خلیل نے رشیدہ کے اکاؤنٹ میں اتنا پیسہ جمع کر رکھا تھا کہ وہ ایسے دس ٹرپ بھی آرام سے افورڈ کرسکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

بلال اختر نے عائشہ اختر کے بگڑنے اور ناراض ہونے کی پروا کیے بغیر فوراً ہی دوسرے گھر میں شفٹ ہونے کی تیاریاں شروع کردیں۔

گھر بیچنے کے لیے جتنی بھی کاغذی کارروائی درکار تھی' بلال اختر اس کے پورے ہونے کا انتظار نہیں کرسکتے تھے۔ ان کا خیال تھا ہم یہاں سے شفٹ ہوجاتے ہیں' باقی سارے کام بعد میں ہوتے رہیں گے۔

انہوں نے دوسرا گھر دیکھ کر پروفیشنل پیکرز (سامان باندھنے والوں) کو بلالیا۔ عائشہ اختر مزدوروں کے سامنے بھلا کیا بولتیں' وہ صبر کا گھونٹ پی کر رہ گئیں۔

ویسے بھی ان کی ڈاکٹر شکیلہ سے بات ہوئی تھی' بات کیا ہوئی تھی ڈاکٹر شکیلہ نے خود ہی انہیں فون کرکے بلال اختر کے فیصلے کی حمایت کی تھی۔

بلال اختر نے عائشہ اختر کو اتنا ناراض دیکھ کر ڈاکٹر شکیلہ سے رجوع کیا تھا اور انہوں نے بلال اختر کے فیصلے کو خوب سراہا تھا اور کہا تھا وہ خود عائشہ اختر سے بات کریں گی۔

عائشہ اختر' ڈاکٹر شکیلہ کی مداخلت پر جیسے بالکل بے بس ہو کر خاموش ہوگئی تھیں' بلال اختر نے جو گھر جلدی میں لیا تھا' وہ ویسے تو ہر لحاظ سے اچھا تھا' مگر اس گھر سے موازنہ کرنے پر کچھ بھی نہیں تھا' اس لیے عائشہ اختر پر ایک بے زاری چھائی ہوئی تھی۔

سامان ٹرک میں لوڈ ہونا شروع ہوگیا تھا۔ مزدور اتنے سارے تھے کہ اتنے بڑے گھر کے بے تحاشا سامان کو بھی انہوں نے صرف دو دنوں میں پیک کرلیا تھا اور پھر بلال اختر فوری طور پر سارا سامان لے جا بھی نہیں رہے تھے۔ جو گھر انہوں نے لیا تھا وہ اتنا بڑا نہیں تھا کہ یہاں موجود سارا کا سارا سامان وہاں کھپایا جاسکتا' بہت ساری چیزیں

بلال اختر بیچنے والے تھے' کچھ سامان وہ یہیں چھوڑ کر جارہے تھے' ان کے گھر میں موجود دو' دو اسٹورز میں سے ایک اسٹور میں تو بالکل ہی پرانا کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔

وہ اسٹور تو بلال اختر کا کھولنے کا ارادہ بھی نہیں تھا' کیونکہ اسے کھولنا صرف اور صرف وقت کا ضیاع تھا اور بلال اختر کے پاس بالکل وقت نہیں تھا۔

وہ ضروری سامان اٹھا کر جلد سے جلد یہاں سے چلے جانا چاہتے تھے اور بہت سارا سامان ان کا بعد میں منگوا لینے کا ارادہ تھا' جبکہ کچھ چیزیں وہ فرقان حسن کے سر تھوپ رہے تھے کہ آنے سے پہلے وہ خود صفائی کرا کر جو چیز جہاں پھینکنا چاہیں یا جسے دینا چاہیں ان کی مرضی پر منحصر تھا۔

اپنے کپڑے اور ضروری چیزیں عائشہ اختر اور زوبیہ نے خود پیک کی تھیں' بلال اختر نے بڑے بڑے ڈبے زوبیہ کے کمرے میں بھجوا دیے تھے کہ جو سامان چاہو رکھ لو' باقی فرنیچر وغیرہ مزدور اٹھالیں گے۔

زوبیہ نے اپنے کپڑے اور کتابیں تو ساری رکھ لیں' مگر دیگر اشیاء کو وہ جیسے الجھن بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ اس کی درازوں میں سے شائستہ خالہ کی بنائی ہوئی بہت ساری تصویریں تو عائشہ اختر نے نکال لی تھیں' لیکن اس جیسی دوسری کئی تصویریں اور ٹیڑھے میڑھے نقوش بدستور اس کے پاس تھے۔

وہ انہیں اپنے ساتھ لے جانا نہیں چاہتی تھی' لیکن انہیں یہاں چھوڑ کر جانا بھی نہیں چاہتی تھی' کہیں کسی اور کی نظر نہ پڑجائے' پہلے تو اس نے سوچا انہیں پھاڑ کر پھینک دے' مگر اتنی ساری ردی کو وہ پھاڑ کر کم از کم عائشہ اختر سے نظر بچائے بغیر نہیں پھینک سکتی تھی۔

عائشہ اختر ہر وقت سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتی تھیں' کالج جانا بھی اس کا چھوٹ گیا تھا' چنانچہ وہ ایک عجیب سی گھٹن کا شکار ہوگئی تھی۔

اس وقت بھی عائشہ اختر اتنی دلبرداشتہ تھیں اور اتنی مصروف بھی اس کے باوجود پچھلے دو گھنٹوں میں وہ تین بار اس کے کمرے میں آکر جھانک چکی تھیں۔

"زوبیہ کیا کررہی ہو؟"

"کپڑے رکھ رہی ہوں۔ معلوم تو ہے آپ کو کیوں پوچھے جارہی ہیں۔" زوبیہ عاجز آگئی تھی' پھر بھی وہ باز نہیں آرہی تھیں۔

زوبیہ اس بنڈل کو دیکھتے ہوئے سوچ ہی رہی تھی کہ ایک بار پھر عائشہ اختر بغیر دستک دیے اس کے کمرے میں جھانکتے ہوئے بولیں۔

"کتنی پیکنگ باقی ہے؟"

"بس ہو ہی گئی ہے۔" زوبیہ نے ایک دم وہ سارے کاغذات ایک ڈبے میں ڈال دیے۔

"بہت جلدی کرلی تم نے۔ میں نے تو ابھی صرف کپڑے ہی رکھوائے ہیں' یہ بشریٰ (ملازمہ) بھی ہر کام سستی سے کرتی ہے' تم ذرا میرے کمرے میں آکر فٹافٹ میری جیولری —— اور جوتے' پرس وغیرہ رکھوا دو' انہیں تو چیزیں رکھنے کی بھی تمیز نہیں ہے' سب خراب کردیں گی۔" وہ جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولیں۔ زوبیہ نے ایک نظر ہینڈ بیگ کے سائز کے اس ڈبے پر ڈالی اور اسے پاؤں سے سرکا کر بیڈ کے نیچے کرکے۔ "چلیں۔" کہتی ان کے پیچھے چل پڑی۔ ان کا کمرہ واقعی بری طرح پھیلا ہوا تھا' ایک تو ان کے پاس ہر چیز کی بھرمار تھی' دوسرے بشریٰ تمام چیزیں الماری اور درازوں سے نکال کر زمین پر ڈال چکی تھی اور ڈبوں میں رکھنے میں کاہلی کا مظاہرہ کررہی تھی۔

اس نے عائشہ اختر کے پرس ایسے بھر دیے تھے کہ ان میں جڑے نفیس پرس ایک دوسرے میں الجھ گئے تھے۔ زوبیہ گہرا سانس کھینچتی سارے پھیلاوے کے بیچ آکھڑی ہوئی اور بشریٰ کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگی۔

"بشریٰ تم چھوڑ دو' یہ میں کرلوں گی' تم نیچے جاکر لاؤنج کا جائزہ لو۔"

"ہاں' بلکہ ایسا کرو میرے لیے ایک کپ چائے بنا دو' سر ہل گیا ہے مزدوروں کی اٹھا پٹخ دیکھ دیکھ کر۔" عائشہ اختر نے بستر پر لیٹتے ہوئے نڈھال سے لہجے میں کہا تو زوبیہ بغور انہیں دیکھنے لگی۔

اس گھر کو چھوڑنے کا دکھ ان سب کو تھا' مگر عائشہ اختر کی شخصیت میں تو ایک تھکن اور بے زاری اتر آئی تھی' جیسے اس گھر کو بیچ کر انہوں نے اپنا کوئی مان' کوئی غرور کھو دیا ہو۔

"مما۔" بشریٰ کے کمرے سے نکلنے کے بعد زوبیہ نے انہیں پکارا تو وہ جو آنکھوں پر بازو رکھ چکی تھیں' بغیر ہلے جلے صرف ہنکارا بھر کر رہ گئیں۔

"مما آپ شادی ہو کر اس گھر میں آئی تھیں' جبکہ پاپا تو پیدا ہی اس گھر میں ہوئے تھے' جب وہ اس گھر کو بیچ کر اتنے مطمئن ہیں تو آپ اتنی شکست خوردہ کیوں لگ رہی ہیں؟" عائشہ اختر نے ایک جھٹکے سے بازو اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا اور دیکھتی چلی گئی تھیں۔

"کیا میں نے کچھ غلط کہہ دیا؟" زوبیہ نے خود پر جمی ان کی نظروں کا مطلب اخذ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ سوچ رہی ہوں تمہاری بات کا کیا جواب دوں۔" عائشہ اختر کے چہرے پر واقعی سوچ کے سائے لہرا رہے تھے۔ وہ اب بھی زوبیہ کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں' لیکن ان کے چہرے پر زوبیہ کے لیے کوئی سختی یا غصہ نہیں تھا۔ اسی لیے وہ دل میں مچلتے سوالوں کو زبان دیتی ان کے بیڈ کے کنارے پر آ ٹکی۔

"آپ پاپا سے کون سی قربانیوں کا ذکر کر رہی تھیں' جو آپ نے اس گھر کے لیے دیں۔" زوبیہ کو امید تھی وہ اب اسے بری طرح جھڑکنے والی ہیں' لیکن خلافِ توقع وہ اس پر سے نظریں ہٹا کر چھت کو تکتے ہوئے گہری سانس کھینچ کر بولیں۔

"چھوڑو بے کار کی باتیں' جن قربانیوں کی شوہر کو قدر نہ ہو' حالانکہ وہ شوہر کی خاطر ہی دی ہوں' وہ قربانیاں رائیگاں چلی جاتی ہیں۔ لہٰذا ان پر بات کرنا ہی بے کار ہے۔" ان کے نرم لہجے پر جیسے زوبیہ کی ہمت اور بڑھ گئی۔

"لیکن پھر بھی آپ نے کیا ختم کیا تھا۔ کیا اپنا زیور وغیرہ بیچا تھا۔ اس کی زیبائش و آرائش کے لیے۔" عائشہ اختر کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ ابھر آئی۔

"تم بھی اپنے باپ کی طرح یہ ہی سوچتی ہو نا کہ مجھے کپڑوں اور زیور کے علاوہ زندگی سے اور کچھ چاہیے ہی نہیں۔"

"نہ..... نہیں مما میں تو....."

"ہاں مجھے واقعی زیور' کپڑا' میک اپ' جوتے' ہر چیز کا بہت شوق ہے' بلکہ کریز ہے اور ہمیشہ رہے گا' لیکن ان سب چیزوں کے علاوہ بھی میری زندگی میں کچھ چیزوں کی اہمیت ہے۔ جیسے اس گھر کی' جیسے تمہاری اور جیسے..... خیر چھوڑو میں سوچ رہی تھی ایک بار ہم اس نئے گھر میں سیٹ ہو جائیں' پھر میں تمہارا کسی نئے کالج میں ایڈمیشن کرا دوں گی۔ تم گھر میں بیٹھ کر پرائیویٹ پڑھائی کر سکتی ہو' لیکن اس طرح تم بالکل ڈل ہو جاؤ گی' تمہارے لیے لوگوں سے ملتے جلتے رہنا سخت ضروری ہے' تم میں ویسے بھی کانفیڈنس کی کمی ہے' لوگوں سے کٹ کر تم بالکل ہی اپنے خول میں بند ہو جاؤ گی۔" زوبیہ کو ان کا موضوع بدلنا بہت چبھا تھا' پھر جو ذکر انہوں نے چھیڑا تھا وہ بھی اسے کوفت میں مبتلا کر گیا تھا۔

اس کا بالکل دل نہیں چاہتا تھا' کسی بھی کالج میں جا کر پڑھائی کرنے کا نہ یہاں نہ کسی اور کالج میں' اسی لیے وہ ان کی کہی بات سے پہلو تہی کرتے ہوئے اسی موضوع کو چھیڑتے ہوئے بولی۔

"میرے کانفیڈنس کو کوئی کالج نہیں' صرف آپ ٹھیک کر سکتی ہیں۔ آپ مجھے شائستہ خالہ کے بارے میں کھل کر کیوں نہیں بتا دیتیں۔" عائشہ اختر لیٹے سے اٹھ بیٹھیں۔

"کتنی بار بتا چکی ہوں میں تمہیں۔ اب اگر تم میرا یقین نہیں کرتیں تو میں کیا کروں۔" پہلی بار اس موضوع پر بات کرتے ہوئے انہیں غصہ نہیں آیا تھا' بلکہ ایک بے بسی اور احتجاج چھپا تھا ان کے لہجے میں۔

اور یہ ہی چیز زوبیہ کو ان سے اس موضوع پر بات کرنے کی ہمت دے رہی تھی' ورنہ بھنا کر جھڑک دینا ہر بار اسے خاموش ہو جانے پر مجبور کر دیتا تھا۔

"آپ تو کہتی ہیں شائستہ نام کی کوئی بہن آپ کی ہے ہی نہیں۔ تو پھر یہ روح کس کی ہے اس گھر میں۔"

"اس گھر میں کوئی روح نہیں ہے' یہ صرف تمہارا ذہنی فتور ہے' اسی لیے صرف تمہیں نظر آتی ہے' اگر کوئی روح ہوتی تو مجھے اور تمہارے پاپا کو بھی تو کچھ محسوس ہوتا' کبھی تو کچھ نظر آتا۔

جب تک تم خود کو یہ یقین نہیں دلاؤ گی کہ یہاں کچھ نہیں' تب تک تمہارا وہم ختم نہیں ہوگا۔" عائشہ اختر کے چہرے پر چھائی مایوسی ان کی آواز اور لہجہ تک میں گھل گئی تھی۔

زوبیہ یک ٹک سپاٹ نظروں سے انہیں دیکھے گئی۔ جب جب شائستہ خالہ کا بھیانک چہرہ اس کے سامنے آتا تھا اس کی بھوک اور نیند سب اڑ جاتی تھی۔ ہوش سنبھالنے سے لے کر آج تک اس نے اپنی زندگی کسی پل صراط پر گزاری تھی۔

ہر پل' ہر لمحہ وہ ایک اذیت سے گزرتی تھی اور اس کی اپنی سگی ماں اس کی تکلیف کو سمجھنے کی بجائے اسے اس کا ذہنی فتور کہہ رہی تھی۔

حالانکہ زوبیہ کو لگتا تھا اگر عائشہ اختر شائستہ خالہ کے ساتھ ہوئے سانحہ پر سے پردہ اٹھا دیں تو اس کی الجھنیں دور ہو سکتی تھیں۔ مگر اس کی ماں جانتے بوجھتے اسے اس گھٹن سے نہیں نکال رہی تھی۔

وہ اس کے بچپن سے لے کر آج تک اپنے سنگھاسن پر بیٹھی ایک ہی راگ الاپ رہی تھی۔

"یہ تمہارا وہم ہے' یہ تمہارا وہم ہے۔" اب تو زوبیہ تنگ آگئی تھی اس جملے سے' کبھی کبھی تو اسے سخت گھبراہٹ ہوتی تھی' کیا وہ اس الجھن سے کبھی نکل بھی سکے گی' کیا وہ ساری زندگی ایسے ہی رہے گی ذہنی مریضہ۔

کیا یہ سوال کبھی جواب پا سکیں گے۔ جو اس کی زندگی پر حاوی ہو گئے تھے۔

اگر ہاں تو آخر ایسا کب ہوگا؟ اور کون ہوگا جو اسے اس اذیت سے چھٹکارا دلائے گا۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو زوبی؟ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو' یہ صرف تمہارا وہم ہے۔" عائشہ اختر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے پھر وہ ہی الفاظ دہرا رہی تھیں جو اس کے اعصاب پر ہتھوڑوں کی طرح برستے تھے۔

اس نے آنکھیں میچ کر جیسے اپنا ضبط بڑھانے کی کوشش کی تھی' مگر اگلے ہی پل آنکھیں کھولتے ہوئے جو جملہ اس کی زبان سے پھسلا تھا وہ عائشہ اختر کو بھی سمجھا گیا تھا کہ اب اس کا ضبط جواب دے گیا ہے۔

"کیا شائستہ خالہ کے ساتھ ہوئے سانحہ میں آپ کا بھی کچھ ہاتھ تھا جو آپ ان کے وجود سے ہی انکاری ہو گئی ہیں۔"

"زوبیہ۔" عائشہ اختر کے لہجے میں بے یقینی ہی بے یقینی تھی۔ زوبیہ نے زچ ہو کر کہہ تو دیا تھا لیکن اب ان کا انداز دیکھ کر وہ جیسے شرمندہ ہو کر رہ گئی۔

"مما میں....."

"میں نے تمہیں یہاں پیکنگ کرنے کے لیے بلایا تھا۔ لیکن شاید تمہارا موڈ نہیں ہے' تم جاؤ اپنے کمرے میں۔" زوبیہ نے کچھ کہنا چاہا تھا' مگر عائشہ اختر نے اس کی بات کاٹ دی' وہ اس طرح ان کے کمرے سے نہیں جانا چاہتی تھی' بلکہ اپنی کہی بات پر شرمندگی کا اظہار کرنا چاہتی تھی' لیکن تب ہی بشریٰ چائے لے کر اندر آگئی۔

"تم جاؤ زوبیہ' بشریٰ پیکنگ کرلے گی۔" انہوں نے واپس اپنی جگہ پر لیٹتے ہوئے بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔ زوبیہ کچھ دیر کشمکش و پیچ میں گھری انہیں دیکھتی رہی' پھر اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

کمرے سے نکلتے وقت بھی اس نے پلٹ کر ایک نظر انہیں دیکھا تھا جو ہنوز ویسے ہی لیٹی تھیں' بشریٰ کی لائی چائے سائیڈ ٹیبل پر رکھی تھی اور زوبیہ کو یقین تھا یہ ایسے ہی رکھے رکھے ٹھنڈی ہوجائے گی۔

☼ ☼ ☼

خرم اگلے دن یونیورسٹی معمول سے کافی لیٹ آیا تھا۔ کیونکہ آج اس کا کوئی کلاس اٹینڈ کرنے کا ارادہ ہی نہیں تھا' وہ تو صرف نمل جلیل کا بائیوڈیٹا پتا کرنے آیا تھا۔ اس کے والدین کون تھے' کیا کرتے تھے' کہاں رہتے تھے' وغیرہ وغیرہ۔

مگر اپنے ارادے کے متعلق وہ اپنے کسی بھی دوست کو کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا' وہ سب کل کے حادثے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے' انہیں خوامخواہ کی آگاہی بخشنا خرم کو خود اپنی بے عزتی لگ رہی تھی اور پھر جو کچھ وہ کرنا چاہتا تھا اسے عملی جامہ پہنانے سے پہلے وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو بھنک بھی پڑے اس کے منصوبے کی۔

لیکن ابھی اس نے آفس جاکر نمل کے بارے میں کچھ پتا بھی نہیں کیا تھا کہ اس کی نظر رومیلہ پر پڑی جو تیزی سے اس کی طرف ہی آرہی تھی۔ خرم اسے دیکھ کر اپنی جگہ رک گیا' تو وہ عین اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"آج آپ بہت لیٹ آئے ہیں۔" اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ یہ جملہ بے ساختہ اس کے منہ سے پھسلا ہے' جو اس کے بہت دیر سے منتظر ہونے کو ظاہر کررہے تھے۔ خرم جواب دینے کی بجائے خاموشی سے اسے دیکھتا رہا' انداز ایسا تھا جیسے۔۔۔۔

"تم سے مطلب۔" رومیلہ کچھ خجل ہوکر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی۔

"دراصل میں آپ سے بات کرنا چاہ رہی تھی' اگر آپ برا نہ مانیں تو۔۔۔"

"بولیں۔" خرم بے نیازی سے بولا۔

"کیا ہم کہیں بیٹھ سکتے ہیں۔" رومیلہ کے لہجے میں التجا تھی۔

خرم کا اس وقت اس سے بات کرنے کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا' مگر اس کے ذریعے وہ نمل کے متعلق کافی کچھ جان سکتا تھا' چنانچہ بے دلی سے بولا۔

"آئیں میرے ساتھ۔" یہ کہہ کر خرم پلٹ گیا تو رومیلہ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

خود اسے بھی اس طرح خرم سے بات کرنا عجیب لگ رہا تھا' مگر وہ بہت صلح جو قسم کی لڑکی تھی' اس کی خواہش ہوتی تھی کہ ہر کام خوش اسلوبی سے بغیر کسی بدمزگی کے ہوجائے۔

نمل اس کی اس عادت کو بزدلی کا نام دیتی تھی' جس کی رومیلہ کو قطعاً" پروا نہیں تھی' بلاوجہ کی دشمنیاں پالنا اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو طول دے کر اپنے لیے اور دوسروں کے لیے مسائل کھڑے کرنا اس کی نظر میں کوئی بہادری نہیں تھی۔

ڈیپارٹمنٹ کے احاطے میں ایک چبوترے پر خرم کے سامنے بیٹھتے ہوئے رومیلہ کی پوری پوری کوشش تھی کہ وہ فورا" بات کرکے اٹھ جائے۔

"میں کل کے ہوئے حادثے پر بہت شرمندہ ہوں اور نمل کی طرف سے معافی مانگنے آئی ہوں اصل میں۔۔۔"

"کیا نمل نے آپ کو بھیجا ہے؟" خرم نے اس کی بات کاٹ دی۔ رومیلہ کو امید تھی وہ یہ ہی سمجھے گا' اس لیے وہ اس جواب کے لیے پہلے سے تیار تھی۔

"نہیں۔۔۔ لیکن وہ کسی غلط فہمی کا شکار ہے' میں وہ کلیئر کرنے آئی ہوں۔"

"مجھے پتا ہے' سمیر کی وجہ سے وہ میری طرف سے بدگمان ہوئی ہے۔" خرم نے ایک بار پھر اس کے کچھ بھی کہنے سے پہلے کہہ دیا۔

رومیلہ کو سن کر تھوڑا سا اطمینان ہوا کہ اسے اب غیر ضروری تفصیل میں وقت ضائع نہیں کرنا پڑے گا' تب ہی فورا" کہنے لگی۔

"اگر آپ کو پتا ہے تو پھر آپ کو اس بات کا بھی احساس ہوگا کہ اس کا آپ پر ہاتھ اٹھانا غلط ہوتے ہوئے بھی اتنا غلط نہیں ہے۔

مجھے احساس ہے آپ کو سخت انسلٹ فیل ہوئی ہوگی' اسی لیے میں اس کی طرف سے معافی بھی مانگ رہی ہوں۔ آپ پلیز اس بات کو بھول کر وہیں ختم کردیں' مجھے یقین ہے نمل کو بھی بہت جلد اپنی غلطی کا احساس ہوگا اور وہ بھی آپ سے معذرت کرلے گی۔" رومیلہ نے آخری جملہ سراسر مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے ادا کیا تھا۔ ورنہ اسے یقین تھا نمل کو کبھی اپنی غلطی کا احساس ہوگا اور نہ وہ کبھی معذرت کرے گی۔

مگر یہ سب کہہ کر وہ فی الحال خرم کے غصے کو دبانا چاہتی تھی' بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ خرم اس کی بات پر کچھ دیر اسے دیکھتا رہا' پھر بہت ٹھہر ٹھہر کر بولا۔

"تم نمل کی دوست ہو' لیکن تم سے زیادہ نمل کو میں جانتا ہوں۔ وہ کبھی اپنے کیے پر پچھتائے گی اور نہ معذرت کرے گی۔ لیکن تم یہ سب شاید اس ڈر سے کہہ رہی ہو کہ میں اس کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی نہ کروں' ہے نا۔" خرم کے وثوق سے کہنے پر رومیلہ ایک بار پھر شرمندہ ہوکر ادھر ادھر دیکھنے لگی' پھر آخر دل کڑا کرتے ہوئے بولی۔

"کیا آپ کا کوئی انتقامی کارروائی کرنے کا ارادہ ہے۔" خرم کا جی چاہا قہقہہ مار کر ہنسے' کسی فلمی ولن کی طرح اور اس لڑکی کو اتنا ڈرا دے کہ وہ جاکر نمل کو بھی خوف زدہ کردے۔

لیکن اچانک خرم کو احساس ہوا تھا کہ نمل کے متعلق ساری معلومات آفس سے نکلوانے سے زیادہ آسان تھا رومیلہ سے نکلوانا' کیونکہ وہ زیادہ مستند بھی ہوگی۔ تب ہی خرم اپنے لہجے کو سنجیدہ بناتے ہوئے بولا۔

"کاش ۔۔۔ میں کوئی انتقامی کارروائی کرپاتا۔ دل تو بہت چاہ رہا ہے اس سے بدلہ لینے کا۔ مجھے اس تھپڑ سے تکلیف نہیں ہوئی' لیکن اس الزام سے بہت اذیت پہنچی ہے' جو اس نے مجھ پر لگایا ہے' میں ایسی تھرڈ کلاس حرکتیں نہیں کرتا اور وہ بھی نمل کے ساتھ تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" رومیلہ چونک کر خرم کو دیکھنے لگی۔

"کیوں؟" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا تھا۔

"کیوں کیا تمہیں نہیں معلوم محبت انسان کو کمزور بنادیتی ہے۔" خرم پوری سنجیدگی سے گویا ہوا' مگر اگلے ہی پل چہرے پر پھیلائی سنجیدگی کو قائم رکھنا اس کے لیے مشکل ہوگیا۔

رومیلہ کی آنکھیں حیرت کی زیادتی سے پھٹ گئی تھیں' وہ پورا کا پورا منہ کھولے اسے دیکھ رہی تھی۔

خرم کے لیے پل پڑنے والی ہنسی کو روکنا مشکل ہوگیا۔ پھر بھی وہ کمال مہارت سے اپنے چہرے کے تاثرات پر قابو کیے بیٹھا رہا اور اپنی آواز میں مظلومیت بھرتے ہوئے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

"یقین نہیں آرہا نا' جس انکشاف پر میں خود حیران ہوں اس پر تمہیں کیوں یقین آئے گا اور اس نمل کو تو خیر

کبھی بھی نہیں بھروسہ ہوگا۔" رومیلہ اتنے بڑے شاک میں گھری تھی کہ اس کے لیے کچھ بولنا ہی ناممکن ہوگیا تھا' جبکہ خرم کو اس سے بہت ساری معلومات حاصل کرنا تھیں۔ تب ہی اسے بولنے پر اکساتے ہوئے بولا۔

"مجھے خود نہیں پتا یہ سب کب اور کیسے ہوگیا' بس اتنا معلوم ہے کہ اس پوری کائنات میں میرے لیے نمل سے زیادہ اہم کچھ نہیں۔ وہ اگر مجھ سے میری جان بھی مانگ لے تو میں وہ بھی آرام سے دے سکتا ہوں۔

لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ وہ مجھے کتنا غلط سمجھتی ہے' اگر مجھے ایک موقع ملے تو میں اس کی ساری غلط فہمی دور کر سکتا ہوں۔ لیکن وہ تو مجھ سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی تو موقع کیا دے گی۔

کیا تم نمل کو سمجھا سکتی ہو۔ یا کم از کم صرف مجھ سے بات کرنے پر آمادہ کرلو۔" خرم التجائیہ انداز میں بولا۔

جب اس نے نمل کے ساتھ فلرٹ کرنے کی شرط ودکی کے ساتھ لگائی تھی تب نمل کے سامنے کھڑے ہو کر ایسے جملے بولنا بھی اسے اپنی بے عزتی لگ رہی تھی۔

مگر اب رومیلہ سے یہ سب کہتے ہوئے اسے بڑا مزا آرہا تھا۔ رومیلہ کے تاثرات ہی ایسے تھے وہ ہونق بنی اسے دیکھ رہی تھی۔

اس کی اتنی حیرانی اس بات کی دلیل تھی کہ وہ خرم کی بات پر یقین نہیں کرنا چاہ رہی' مگر اسے جھٹلا بھی نہیں پا رہی' جبکہ نمل سے ایسے کسی رد عمل کی امید نہیں تھی' کسی شش و پنج میں گرفتار ہونا تو در کنار نمل تو اس کی پوری بات سنے بغیر ہی چل پڑتی' اس کے برعکس رومیلہ میں تو ملنے کی بھی سکت نہیں تھی۔

"میں نمل کو ساری دنیا کے سامنے پورے قاعدے قانون کے ساتھ اپنانا چاہتا ہوں' کیا تم اس کام میں میری مدد کرو گی صرف یہ سوچ کر کہ ایسا کر کے تم اپنی دوست کے لیے ایک شاندار مستقبل اور بہت محبت کرنے والا شریک حیات چن رہی ہو۔" خرم اتنی سچائی سے ایک ایک لفظ بول رہا تھا کہ رومیلہ کی بے یقینی یقین میں بدلنے لگی۔

اصل میں وہ خرم کی طرف سے ایسے کسی اظہار کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھی' ورنہ جہاں تک سوال خرم کی محبت کا تھا تو خرم کی نمل میں غیر معمولی دلچسپی کا اندازہ تو اسے بہت پہلے ہو گیا تھا' بلکہ اس نے نمل سے کہا بھی تھا۔

جب یونیورسٹی کے اگلے ہی دن نمل نے چھٹی کرلی تھی' تب خرم نے اس کی بابت جس بے چینی سے پوچھا تھا رومیلہ کو تو تب ہی لگنے لگا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے' اپنے اس اندازے کا اظہار اس نے نمل کے سامنے بھی کیا تھا' جس پر نمل اچھا خاصا بگڑ بھی گئی تھی' بلکہ یہاں تک کہا تھا۔

"اگر ایسا کچھ ہوتا بھی ہے تو ایسے لوگوں کا دماغ ٹھیک کرنا مجھے اچھی طرح آتا ہے۔" لیکن اب جو بات وہ کر رہا تھا وہ تو بہت مناسب تھی۔ وہ کوئی معیوب طریقہ نہیں اپنا رہا تھا' اس کا ہاتھ ساری دنیا کے سامنے تھامنا چاہ رہا تھا۔

مگر وہ خرم کی اس معاملے میں مدد کرتی تو نمل کو یقیناً "برا لگتا" نمل کی اجازت کے بغیر وہ مدد کرنا تو در کنار مدد کرنے کی ہامی بھی نہیں بھر سکتی تھی۔ لہٰذا وہ اس موضوع سے پہلو تہی کرتے ہوئے بولی۔

"خرم میں بھلا آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں' آپ اس معاملے میں نمل سے ہی بات کرلیں تو زیادہ بہتر ہے۔"

"ظاہر ہے نمل سے ہی بات کروں گا' لیکن اس سے پہلے میں چند چیزیں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں' جیسے وہ کہیں انگیجڈ تو نہیں' اس کی فیملی میں خاندان سے باہر شادی ہو سکتی ہے یا نہیں' اس کے فادر کون ہیں اور کیا کرتے ہیں؟" رومیلہ کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ بھاگنے کو پر تول رہی ہو' اسی لیے خرم نے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔

رومیلہ جیسے مشکل میں پھنس گئی وہ ان میں سے کسی بھی سوال کا جواب دینا نہیں چاہ رہی تھی' مگر سمجھ نہیں آرہا تھا اسے کیسے ٹالے۔

"دیکھیں میں کچھ زیادہ جانتی نہیں ہوں' مجھے۔۔۔"

"اتنا تو پتا ہوگا کہ اس کی کہیں منگنی ہوئی ہے یا نہیں۔" خرم نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"دراصل اس کے فادر سارے ڈی سیشنز خود لیتے ہیں' کیا پتا انہوں نے اس کی بات کہیں طے کر رکھی ہو۔" رومیلہ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا تو خرم بھی اس کے ساتھ اٹھتے ہوئے بولا۔

"اگر اس کے فادر نے ایسا کوئی فیصلہ کیا ہوگا تو کم از کم اس کی ماں کو یا کسی بھائی کو تو پتا ہوگا' کیا انہوں نے بھی کبھی نمل سے ذکر نہیں کیا۔"

"اس کا کوئی بھائی' بہن نہیں ہے اور اس کے فادر اتنے بزی رہتے ہیں کہ انہیں اس کی ماں کو بھی کچھ بتانے کا ٹائم نہیں ملتا اور اس کی ماں ہیں بھی بہت گھریلو قسم کی۔" رومیلہ بس کسی بھی وقت جانے کے لیے پلٹ سکتی تھی۔

خرم کو بڑی مایوسی ہوئی تھی اس سے بات کر کے' وہ سمجھ گیا تھا وہ اس کی کوئی مدد نہیں کرے گی' پھر بھی اس نے جیسے اپنی بوریت دور کرنے کے لیے سوال نہیں کیا' بلکہ چڑ کر کہا۔

"اتنا کتنا بزی رہتے ہیں آخر' ایسا کیا کام کرتے ہیں۔"

"وہ اتنے ہی بزی رہتے ہیں' بہت بڑے عہدے پر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ چیریٹی کا کام بھی کرتے ہیں' ان کے اپنے کئی ٹرسٹ ہیں۔" جس سوال پر اسے کسی ڈھنگ کے جواب کی توقع نہیں تھی' اسی سوال پر رومیلہ نے خاطر خواہ معلومات فراہم کردی۔

اگر وہ کسی بہت بڑے عہدے پر کام کر رہے تھے اور کئی ٹرسٹ بھی چلا رہے تھے تو ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے رومیلہ کی خوشامد کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی' وہ دوسرے ذرائع استعمال کر کے بھی یہ مقصد حاصل کر سکتا تھا۔

"اس کے فادر کا نام کیا ہے؟" خرم نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

"عظمت خلیل۔" اب کی بار رومیلہ تیزی سے آگے بڑھ گئی' تاکہ خرم کچھ پوچھ نہ سکے' جبکہ وہ تو حیران ہی رہ گیا۔

"عظمت خلیل۔" خرم نے زیر لب دہرایا۔

ان کے نام اور شہرت سے بھلا کون واقف نہیں تھا آئے دن تو اخبار میں ان کی تصاویر اور خدمت خلق کی تفصیلات چھپتی رہتی تھیں بلکہ سماجی اور متحرک شخص کو تو اس کے ڈیڈ فرقان حسن یقیناً "ذاتی طور پر بھی جانتے ہوں گے۔

فرقان حسن کا حلقہ احباب اتنا وسیع تھا کہ مختلف تقاریب میں شرکت کرنے کے باعث ایسے بہت سارے لوگوں سے ان کی سلام دعا تھی جن سے ان کے کوئی بہت گہرے مراسم نہیں تھے۔

وہ تو نمل کا پورا بایو ڈیٹا جاننے آیا تھا لیکن یہاں تو صرف ایک نام پتا چلنے سے ہی اس کا پورا حسب و نسب سامنے آگیا تھا اب تو ضرورت ہی نہیں تھی یونیورسٹی کے ریکارڈ کو کھنگالنے کی۔ اسے صرف فرقان حسن کو عظمت خلیل کا نام بتانا تھا باقی سب فرقان حسن خود ہی اس سے زیادہ مستند ذرائع سے پتا کر لیتے بلکہ شاید پتا کرنے کی بھی ضرورت نہ ہو وہ پہلے ہی بہت کچھ جانتے ہوں۔

یعنی خرم کو اب صرف گھر جا کر بات کرنے کی ضرورت تھی باقی کا پورا میدان تو صاف ہو چکا تھا۔

خرم مطمئن نظروں سے لحہ بہ لحہ دور ہوتی رومیلہ کی پشت کو دیکھتا رہا جو کچھ نہ بتاتے ہوئے بھی اسے سب بتا گئی تھی۔

تیز تیز چلتی رومیلہ نے اپنے طور پر بڑی احتیاط برتی تھی مگر عظمت خلیل کی شہرت ہی اتنی زیادہ تھی کہ صرف ان کا نام بتادینا ہی رومیلہ کے خانے میں ایک غلطی کے طور پر شامل ہوگئی تھی حالانکہ اس کے نہ بتانے سے بھی خرم آج نہیں تو کل سب جان ہی جاتا بس اس کی وجہ سے خرم کا کام ذرا جلدی ہوگیا تھا اور پھر رومیلہ کو کون سا اس کے ارادوں کا پتا تھا یہ اتنی پہلو تہی بھی اس نے محض یہ سوچ کر برتی تھی کہ کہیں نمل کو برا نہ لگ جائے ورنہ سچ تو یہ تھا کہ خرم سے بات کر کے اسے کافی اطمینان ہوگیا تھا۔

وہ جو اس کی طرف سے کسی انتقامی کارروائی کا ایک ڈر سا تھا وہ خوف اس کی باتیں سن کر پوری طرح مٹ گیا تھا۔

اب اگر اسے کوئی فکر تھی تو وہ بھی یہ کہ پتا نہیں نمل کا کیا ردعمل ہوگا۔

ابھی کچھ گھنٹوں میں وہ کینیڈا کے لیے فلائی کرنے والی تھی وہاں سے اسے آنے میں تین چار دن تو لگنے تھے اس کے بعد ہی خرم کی اس سے بات ہوگی کم از کم چار دن تو سکون تھا (صرف اس کی نظر میں کیونکہ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ خرم تو آج کے آج ہی سب کچھ کرنے والا ہے۔)

رومیلہ پرس سے موبائل نکال کر سنبل کو فون کرنے لگی جس نے ڈر کے مارے چھٹی کرلی تھی۔

اسے کل رات ہی پتا چل گیا تھا کہ نمل کینیڈا جارہی ہے ایک تو سنبل پہلے ہی خوفزدہ تھی کہ پتا نہیں خرم اب کیا کرے گا اس پر اسے جب یہ پتا چلا کہ نمل ہی نہیں آرہی تو اس نے فوراً "کل چھٹی کرلینے" کا اعلان کردیا۔

اب جب اسے یہ پتا چلے گا کہ خرم بدلہ لینے کی بجائے نمل کو پرپوز کرنے والا ہے تو حیرت تو اسے ہوگی لیکن شاید اسے خوشی بھی ہو۔

خرم کی ظاہری پرسنالٹی اتنی اچھی تھی اور پھر جب سے اس نے نمل کے پیسے واپس کردیے تھے تب سے تو اس کا تاثر سنبل کی نظر میں کافی اچھا ہوگیا تھا۔

ایسے میں یہ خبر اس کے لیے خوشخبری ہی ہوگی۔ البتہ وہ نمل کو فی الحال کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی۔

نمل اتنے لمبے سفر پر اکیلی جارہی تھی وہ بھی عظمت خلیل کو بتائے بغیر اور کسی حد تک رشیدہ کی بھی رضامندی کے بغیر ایک مجبوری کی دی گئی اجازت کے ساتھ لہٰذا اس کے ذہن پر پہلے ہی کافی بوجھ تھا۔

ایسے میں خرم کے احساسات کے بارے میں سن کر فوری طور پر تو اسے بھڑکنا ہی تھا اچھا ہی تھا جتنے دن وہ سکون سے رہ لے۔

☼ ☼ ☼

نمل اتنے سکون سے تو نہیں جارہی تھی رشیدہ کا حیران پریشان چہرہ اسے شرمندہ کررہا تھا مگر رومیلہ کے مستقبل کی خاطر یہ قدم اٹھانا ضروری تھا۔

رشیدہ نے بھی محض اسی لیے خاموشی اختیار کرلی تھی ورنہ ان کا دل کسی طور نہیں مان رہا تھا۔

رومیلہ کی جس انداز میں آنا "فانا" شادی طے ہوئی تھی اس سے انہیں بھی اختلاف تھا جس دن بات پکی ہوئی تھی اس دن انہوں نے خود ابرار سے پوچھا تھا لڑکا کیسا ہے۔

تو ابرار نے یہی جواب دیا تھا کہ وہ خود تو کبھی نہیں ملا اس کے دوست نے مل کر بتایا ہے کہ بہت اچھا ہے۔

محض دوست کی رائے پر اتنے بڑے فیصلے کا انحصار انہیں پریشان کرگیا تھا مگر انہوں نے رومیلہ اور نمل کے سامنے اپنی پریشانی چھپالی تھی۔

ایسے میں نمل کا وہاں جاکر اس سے ملنا انہیں غلط تو نہیں لگ رہا تھا مگر اس کے اکیلے اتنی دور جانے پر وہ فکرمند

ضرور تھیں خاص طور پر ایسی صورت میں جبکہ عظمت خلیل کو بھی کچھ نہیں پتا تھا۔

لیکن پہلے ہی نمل دو تین دن سے بہت مضطرب تھی حشام کے ساتھ ہوئے المیہ اور عظمت خلیل کے ساتھ ہوئی اس کی تلخ کلامی نے اسے بہت بڑا صدمہ پہنچایا تھا ایسے میں اسے اس وقت جانے سے روکنا رشیدہ کی ممتا کے لیے ایک کڑا امتحان تھا۔

خود نمل کو ان کے تمام خدشات اور اسے بھیجنے کی وجوہات کا علم تھا اسی لیے اپنے درست ہونے کا یقین ہونے کے باوجود ایک بے چینی نے اس کا احاطہ کر رکھا تھا جو اس وقت سوا ہوگئی جب ایئرپورٹ کی لابی میں سے گزرتے ہوئے اس کے موبائل پر ابرار بھائی کا فون آگیا۔

"نمل ماموں اور تم لوگ کون سے ہوٹل میں ٹھہرنے والے ہو۔ میں نے اپنے دوست کو انفارم کردیا ہے وہ کہہ رہا ہے میرا گھر ہوتے ہوئے تمہارے ماموں اور ان کی فیملی کو کسی ہوٹل میں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں۔"

"آں...... ابرار بھائی ابھی تو ہمارا جانا ہی کنفرم نہیں ہے، جب جانے لگیں گے تب بتادیں گے۔" نمل نے سوچتے ہوئے کہا۔

"کنفرم نہیں ہے۔" ابرار بھائی نے حیرت سے دہرایا۔

"مگر صبح تو میری ممانی سے بات ہوئی تھی وہ تو کہہ رہی تھیں تم لوگ آج جارہے ہو میں نے تو اپنے دوست کو فون کرکے تمہاری فلائیٹ کا ٹائم بھی بتادیا ہے۔" نمل کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لے۔

رشیدہ کو اتنا سمجھایا تھا اس نے کہ انہیں یہ کہنا ہے اور یہ نہیں کہنا وغیرہ پھر بھی انہوں نے فلائیٹ کے بارے میں بتادیا۔

اگر اس وقت ابرار بھائی نے اس کی جگہ عظمت خلیل کو فون کرلیا ہوتا تو کیا ہوتا۔

ابھی اس نے یہ سوچا ہی تھا کہ دوسری طرف ابرار بھائی کہنے لگے۔

"میں تو ابھی ماموں کو فون کررہا تھا مگر ان کا موبائل مستقل بزی جارہا ہے تب میں نے سوچا تمہارے نمبر پر ٹرائی کرلوں۔ میں تو سمجھا تم لوگ آج جارہے ہو۔" ابرار بھائی کی بات پر نمل نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اپنے اعصاب یکجا کرکے کہا۔

"دراصل میں ابرار بھائی ابو کو کچھ ضروری کام آگیا۔ تو وہ اور امی نہیں جارہے فی الحال میں اکیلی جارہی ہوں۔"

"کیا؟" ابرار بھائی اس کی بات پر حسب توقع اچھل کر رہ گئے۔

"تم اکیلی۔" ان کے لہجہ میں بلا کی حیرت تھی۔

"جی وہ ابرار بھائی میں اس وقت ایئرپورٹ پر ہوں میں آپ سے بعد میں بات کرتی ہوں۔" اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا بہانہ بنائے۔

اصل میں سچ اس نے اس لیے بھی بتادیا تھا کہ وہاں جاکر ابرار بھائی کے دوست کے ذریعے وہ گلفام سے جلدی اور آسانی سے مل سکتی تھی ورنہ ایک اجنبی ملک میں ایک اجنبی کو تلاش کرنا اس کے لیے ناممکن تھا۔

چنانچہ جب اس نے سنا ابرار بھائی کے دوست انہیں لینے ایئرپورٹ آرہے ہیں اور اپنے گھر میں ٹھہرنے کی آفر کررہے ہیں تو اسے بھی ان کے پاس جاکر رہنا زیادہ معقول لگا۔ بہ نسبت ٹیکسی ڈرائیور سے کسی ہوٹل کا پتا پوچھنے کے۔

حالانکہ رومیلہ کے سامنے اس نے بڑے دعوے کیے تھے کہ ہوٹل میں جاکر ٹھہر جاؤں گی اور دو تین دن میں واپس آجاؤں گی صرف گلفام سے ملنا ہی تو ہے۔

مگر اب جبکہ وہ حقیقتاً "وہاں جارہی تھی تو اسے گھبراہٹ ہورہی تھی کہ اس طرح انجان جگہ پر کسی ہوٹل میں

ٹھہرنا اور پھر کسی کا ایڈریس ڈھونڈتے ہوئے اس تک پہنچنا کتنا مشکل اور خطرناک تھا۔

عظمت خلیل کو آج نہیں تو کل اس کے اٹھائے قدم کے بارے میں پتا چلنا ہی تھا پھر محض ان سے چھپانے کے لیے وہ اپنی جان اور عزت کو اس طرح خطرے میں کیوں ڈالے پتا چلا رومیلہ کی پریشان دور کرنے کے چکر میں اس نے اپنی ماں کو جیتے جی مار ڈالا۔

اسی لیے اس نے ایک پل میں ابرار بھائی کے دوست کے ساتھ ان کے گھر جانے کا فیصلہ کرلیا ہاں البتہ اب بھی اس کے دل میں یہ خواہش تھی کہ عظمت خلیل کو کچھ بھی اس کے واپس آنے سے پہلے پتا نہ چلے اسی لیے ایک طرف تو اس نے ابرار بھائی کو فون بند کرنے کا عندیہ دیا تو دوسری طرف یہ بھی پوچھ بیٹھی۔

"ابرار بھائی میں تو صرف دو تین دن کے لیے جارہی ہوں کیا آپ کے دوست مجھے اپنے گھر ٹھہرا سکتے ہیں۔"

"ٹھہرنے کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے وہ تو تمہیں پک کرنے بھی آرہا ہے مگر میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا تم اکیلی وہاں گئی کیوں ہو وہ بھی صرف دو تین دن کے لیے کیا تمہارا ارادہ بھی ہوٹل میں ٹھہرنے کا تھا۔" ابرار بھائی کے لہجے میں جھنجلاہٹ محسوس کی جاسکتی تھی۔

"آپ میں۔ میں کہہ رہی ہوں نا میں آپ سے بعد میں بات کرتی ہوں آپ پریشان مت ہوں امی ابو ایک دن بعد میرے پاس آنے والے ہیں۔ بس میں ایک دن پہلے جارہی ہوں اور ابو مجھے اپنے کسی دوست کے گھر ہی ٹھہرا رہے تھے مگر میں نے سوچا وہاں میں بعد میں چلی جاؤں گی امی ابو کے آنے کے بعد۔ پہلے آپ کے دوست کے گھر چلی جاتی ہوں وہ ایئرپورٹ پر پک کرنے آئیں گے تو مجھے مشکل نہیں ہوگی۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ میں تمہارا نام وغیرہ سب اسے ابھی بتادیتا ہوں وہ تمہیں لے لے گا مگر مجھے تمہارا جانا بالکل بھی مناسب نہیں لگا ہے خیر۔ جب ماموں کو ہی اعتراض نہیں۔ اچھا میں بعد میں بات کروں گا اللہ حافظ۔" ابرار بھائی نے بڑبڑانے والے انداز میں کہہ کر فون بند کردیا۔

شاید وہ خود بھی بہت جلدی میں تھے تبھی نمل کی بات پر زیادہ بحث نہ کرسکے جو بھی تھا اس وقت ان کے فون نے نمل کو کافی فکرمند کردیا تھا۔

اتنا تو سمجھا بجھا کر آئی تھی وہ امی کو پھر بھی جانے کیسے انہوں نے نمل کی فلائٹ کا ذکر کردیا نمل نے سوچا امی کو فون کرکے ساری صورت حال بتادے۔ مگر تبھی اس کی فلائٹ کا اناؤنسمنٹ ہوگیا تو وہ موبائل شولڈر بیگ میں رکھتی تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔

☼ ☼ ☼

شام کی چائے وہ لوگ اکثر باہر لان میں بیٹھ کر پیا کرتے تھے اسی لیے جب خرم کی گاڑی پورچ میں داخل ہوئی تو فرقان حسن اور مسز فرقان دور سے ہی خوش گپیوں میں مصروف نظر آگئے۔

خرم گاڑی لاک کرتا ذہن میں جملے ترتیب دیتا ان کے نزدیک چلا آیا اور سلام کرکے وہیں ایک کرسی پر ٹکتے ہوئے بولا۔

"ڈیڈ آپ کیا عظمت خلیل کو جانتے ہیں۔"

"عظمت خلیل۔" انہوں نے سوالیہ انداز میں خرم کو دیکھا تو مسز فرقان بھی اسے ایسے دیکھنے لگیں جیسے اس کے سوال کا پس منظر سمجھنا چاہ رہی ہوں۔

"بتائیں نا جانتے ہیں یا نہیں۔"

"میں تو کافی اچھی طرح جانتا ہوں بلکہ انہیں تقریباً" سارا شہر ہی جانتا ہے آج کل بھی روز ہی ٹی وی پر نظر

آرہے ہیں۔ وہ کسی پولیس انسپکٹر نے ایک لڑکے کو......"

"بس بس رہنے دیں ایسے وائلنٹ (پرتشدد) قصے میرے سامنے مت چھیڑا کریں۔" مسز فرقان نے فرقان حسن کی بات کاٹتے ہوئے جھرجھری لی تو فرقان حسن مسکراتے ہوئے ایک نظر انہیں دیکھ کر خرم کو دیکھنے لگے۔

"تم کیوں پوچھ رہے ہو ان کے بارے میں۔"

"بس جاننا چاہتا تھا آپ انہیں کتنا جانتے ہیں لوگ تو انہیں بہت اچھا انسان سمجھتے ہیں۔" خرم نے سرسری انداز میں کہا۔

"لوگ سمجھتے نہیں ہیں بلکہ وہ واقعی اچھے ہیں، تمہیں معلوم نہیں ہے ان کا ادارہ کیا کیا کررہا ہے پاکستان میں اگر تین چار لوگ بھی ایسے اور پیدا ہوجائیں نا تو سمجھ لو ہمارا ملک چند مہینوں میں ٹھیک ہوجائے۔" فرقان حسن نے سنجیدگی سے کہا۔

"اور ان کی فیملی وغیرہ کے بارے میں کیا خیال ہے۔"

"پہلے تم یہ بتاؤ اچانک ان سوالوں کی وجہ کیا ہے یہ سب تم ایسے ہی تو نہیں پوچھ رہے۔" فرقان حسن نے جانچتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ ہلکے سے مسکرا کر مسز فرقان کو دیکھنے لگا۔

"وجہ یہ ہے کہ ماما کہتی ہیں وہ کسی بھی لڑکی سے میری شادی کرسکتی ہیں بس لڑکی خاندانی ہونی چاہیے تو میں پتا کررہا ہوں عظمت خلیل کی بیٹی ماما کی نظر میں خاندانی ہوگی یا نہیں۔" خرم کے شوخ سے انداز پر مسز فرقان اور فرقان حسن کچھ پل کے لیے تو کچھ بھی نہیں سمجھ سکے اور کبھی اسے اور کبھی ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"کیا ہوا ماما کیا بہت مشکل بات کہہ دی ہے میں نے یا مجھ سے آپ توقع نہیں کررہی تھیں ایسی بات کی۔"

"تم کہہ کیا رہے ہو میری سمجھ میں نہیں آرہا۔" مسز فرقان نے آگے کو جھکتے ہوئے چائے کا کپ میز پر رکھ دیا۔

"میں نے آپ کے لیے بہو ڈھونڈلی ہے۔" خرم کو صاف لفظوں میں کہنا پڑا۔

وہ دونوں واقعی اس کی طرف سے ایسی کسی بات کی توقع نہیں کررہے تھے تبھی بری طرح چونک اٹھے مسز فرقان نے چونکنے کے ساتھ ہی سوالوں کی بوچھاڑ کردی۔

"کون ہے؟"

"کیسی ہے؟"

"کیا کرتی ہے؟"

"کب سے جانتے ہو؟"

"مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔؟"

"ماما سب سے پہلے آپ کو ہی بتایا ہے ابھی تک تو میرے دوستوں کو بھی خبر نہیں ہے اور رہے آپ کے باقی کے سوال تو سنیں۔ نمل نام ہے۔ چند ماہ سے جانتا ہوں اسے۔ بہت زیادہ نہیں جانتا لیکن اتنا پتا ہے کہ عظمت خلیل کی بیٹی ہے۔" خرم نے گن گن کر ایک ایک انگلی کھڑی کرکے ان کے سوالوں کے جواب دیے۔

"عظمت خلیل کا فیملی بیک گراؤنڈ تو بہت اچھا ہے۔ بہت بار مل چکا ہوں میں، خاندانی لوگ ہیں مگر ان کی بیٹی کیسی ہے یہ یاد نہیں آرہا۔ پتا نہیں اسے کبھی کسی تقریب میں دیکھا بھی ہے یا نہیں۔" فرقان حسن ذہن پر زور دیتے ہوئے بولے۔

"ہمارے بیٹے نے پسند کیا ہے تو اچھی ہی ہوگی مگر پھر بھی ایک بار تو ضرور دیکھوں گی میں اسے۔ خرم تم مجھے ابھی اور اسی وقت اس کے گھر لے چلو۔" مسز فرقان نے بے چینی سے کہا تو فرقان حسن ہنس دیے۔

"بیگم ذرا سا صبر کرلیں آپ وہاں لڑکے کی ماں کی حیثیت سے جائیں گی تو انہیں بھی آپ کا استقبال ذرا اہتمام

اور تیاری کے ساتھ کرنا ہوگا۔
ابھی اور اسی وقت پہنچنے کی تو کوئی تک نہیں ہے کسی دن باقاعدہ فون کرکے جانا ہوگا۔" خرم صرف فرقان حسن کو دیکھ کر رہ گیا۔

وہ سمجھ رہے تھے نمل اور وہ باہمی رضامندی اور پسند سے یہ شادی کررہے تھے چنانچہ نمل کے گھر میں بھی سب کو ان کی آمد کی وجہ معلوم ہوگی۔

خرم نے فی الحال خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا وہ ابھی سے کچھ کہنا نہیں چاہ رہا تھا البتہ اتنا ضرور بولا۔

"لیکن ڈیڈ یہ صبر/صبر آزما نہیں ہونا چاہیے اس کے کافی رشتے آئے ہوئے ہیں کہیں ایسا نہ ہو۔۔۔"

خرم نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا تو فرقان حسن معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولے۔

"اوہو تو معاملہ اتنا سیریس ہے۔" خرم نہ چاہتے ہوئے بھی جھینپ گیا۔

"ظاہری بات ہے بھئی ہمارا بیٹا کوئی دل پھینک تو ہے نہیں وہ سیریس ہے تبھی تو گھر میں بات کررہا ہے۔" مسز فرقان نے فوراً" اس کی طرف داری کی۔

اسی وقت خرم کا موبائل بجنے لگا تو خرم اپنی جگہ سے اٹھتا موبائل جیب سے نکال کر نسبتاً" پرے آکھڑا ہوا۔

"ہاں کیا بات ہے وکی؟" اسکرین پر وکی کا نمبر دیکھ کر خرم نے کان سے موبائل لگاتے ہوئے پوچھا۔

"خرم تم کل یونیورسٹی آئے تھے کیا؟" وکی نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"نہیں تو! کیوں کیا ہوا؟" خرم اس غیر متوقع سوال پر الجھتے ہوئے بولا۔

"یار جھوٹ مت بول۔ تم کل یونیورسٹی آئے تھے مگر فوراً" ہی چلے گئے تھے شاید اور ہم سمجھے کہ تم آئے ہی نہیں۔" وکی نے صاف رد کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے کیا ضرورت ہے جھوٹ بولنے کی اور بائی دا وے تمہیں ایسا کیا کام آپڑا ہے جو اس وقت فون کرکے میرے کل آنے یا نہ آنے کی ڈیٹیل پوچھ رہے ہو۔" خرم چڑ گیا۔

"تم خود سے کچھ نہیں بتاتے تو پوچھنا تو پڑے گا نا۔"

"کیا نہیں بتایا میں نے۔" خرم زچ ہوگیا۔

"کل کیا ہوا تھا تمہارے اور نمل کے بیچ۔" وکی کے جرح کرنے والے انداز پر خرم چونک اٹھا۔

ایسا تو نہیں ہوسکتا تھا کہ اسے کچھ پتا چل گیا ہو وہاں صرف نمل اور اس کی دوست موجود تھیں جو وکی یا کسی بھی دوسرے شخص کو اس واقعے کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتی تھیں۔

لیکن اگر اسے کچھ پتا نہیں تھا تو اس سوال کا کیا مقصد ہوسکتا تھا یقیناً" وہ کچھ نہ کچھ تو جان ہی گیا تھا اور یہ انکشاف خرم کے لیے جان لیوا تھا۔

وہ تو اس بات کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ کسی کو اس بات کی بھنک بھی پڑے اور وکی کو تو کسی قسم کا اندازہ بھی ہوجائے یہ بھی اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔

اس نے آنکھیں موندتے ہوئے جیسے خود کو کسی بہت بری خبر کے لیے تیار کرتے ہوئے کہا۔

"کھل کر بات کرو وکی تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

☼ ☼ ☼

ابرار بھائی نمل سے بات کرکے کچھ تپ گئے تھے انہوں نے ایک بار پھر عظمت خلیل کا نمبر ملایا مگر ان کا فون ابھی تک بزی تھا تو انہوں نے کینیڈا اپنے دوست کو فون کرکے نمل کی تفصیلات بتادیں اور دوبارہ اپنے کام میں

لگ گئے وہ اس قدر مصروف رہتے تھے کہ تھوڑی دیر بعد ان کے ذہن سے بھی اتر گیا کہ انہیں عظمت خلیل سے بات کرنی تھی مگر شام میں عظمت خلیل کا خود ہی فون آگیا۔

ان کے موبائل پر ابرار کی اتنی کالز آئی تھیں کہ انہوں نے بھی اپنی مصروفیت میں سے بمشکل وقت نکال کر اسے فون کیا تھا۔

ابرار بھائی پر عظمت خلیل کی آواز سنتے ہی صبح والی کیفیت پھر عود کر آئی تبھی اپنے مخصوص کھردرے انداز میں اپنی ناگواری چھپائے بغیر بولے۔

"آپ نے نمل کو اتنی دور کینیڈا بھیج دیا وہ بھی اکیلے۔ لڑکی ذات کو اتنی آزادی تھوڑی دی جاتی ہے ایسا بھی کیا ضروری کام تھا کہ آپ نے اسے اکیلے بھیج دیا۔" ابرار بھائی کو یہ فکر نہیں تھی کہ نمل اتنی دور اکیلی گئی ہے۔ خدانخواستہ کوئی بات ہوجائے

انہیں فکر تھی تو صرف یہ کہ لڑکی کو اتنا خود اعتماد بنانے کی کیا ضرورت ہے کہ وہ اتنا طویل سفر بغیر کسی سہارے کے کرلے اس طرح تو وہ بہت خود مختار ہوجائے گی۔

"کینیڈا۔" دوسری طرف عظمت خلیل کچھ سمجھے ہی نہیں۔

"ہاں میں تو سمجھا تھا آپ سب کی فلائیٹ ساتھ ہے لیکن آج دوپہر نمل سے بات ہوئی تو پتا چلا کہ وہ اکیلی جارہی ہے۔ بڑی حیرت ہوئی آپ اسے اتنی دور بھیج رہے ہیں وہ بھی ایک دوست کے گھر خیر وہ دوست تو آپ کے بھروسے کا ہوگا مگر جب آپ جاتے تب ہی لے جاتے۔

اب آپ کا کب جانے کا ارادہ ہے میں نے نمل کو گلفام کا فون نمبر اور ایڈریس سب دے دیا ہے مگر میں چاہتا ہوں وہ اس سے تب ہی رابطہ کرے جب آپ وہاں جاچکے ہوں۔

کیا پتا اسے برا لگ جائے پہلے وہ ملنے جارہی ہے۔ پھر آپ جارہے ہیں۔" ابرار بھائی کی بات سن کر عظمت خلیل دم بخود رہ گئے تھے۔ مگر انہوں نے فوراً" ہی خود کو سنبھال لیا۔

"اچھا ابرار میں ذرا جلدی میں ہوں تو تم سے بعد میں رابطہ کروں گا۔" انہوں نے ابرار بھائی کو کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر فون بند کردیا۔

اپنی عزت اور انا انہیں ہر چیز سے بڑھ کر عزیز تھی وہ کبھی یہ برداشت نہیں کرسکتے تھے کہ انہیں ذرا سی بات سے بھی بے خبر رکھا جائے اور یہاں تو نمل نے بہت بڑا قدم اٹھالیا تھا۔

عظمت خلیل کو جتنا بھی غصہ آتا کم تھا لیکن وہ جوش میں ہوش نہیں کھوتے تھے اب بھی انہوں نے ابرار پر اسی لیے کچھ ظاہر نہیں کیا کہ اس طرح ان کی اپنی عزت نفس مجروح ہورہی تھی اور پھر اپنی بھڑاس نکالنے کے لیے ان کے پاس ایک ایسی ہستی تھی کہ انہیں کسی اور کے سامنے کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

وہ اسی وقت گھر کے لیے روانہ ہوگئے۔

"رشیدہ۔" کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک دھاڑ کے ساتھ انہوں نے رشیدہ کو پکارا تھا۔

وہ نماز کے بعد دعائیں پڑھنے میں مشغول تھیں عظمت خلیل کے لہجہ کی گرج پر اندر تک دہل گئیں۔

دعاؤں کی کتاب فوراً" بند کرکے انہوں نے میز پر رکھ دی اور وہیل چیئر ان کی جانب موڑتے ہوئے ان کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔

"نمل کہاں ہے؟" ایک تو وہ پہلے ہی نمل کی طرف سے پریشان تھیں اور اب عظمت خلیل کا جلال سے بھرے انداز پر کچھ وہ ہولے ہولے کانپنے لگی تھیں۔

"میں نے پوچھا ہے نمل کہاں ہے؟" وہ ایک بار پھر چیخ کر بولے۔

"وہ...... وہ......" رشیدہ کا دماغ ماؤف ہونے لگا تھا وہ تو عظمت خلیل سے اتنا ڈرتی تھیں کہ ان کے سامنے سچ بولتے وقت ان کی جان جاتی تھی کجا کہ جھوٹ بولنا۔ وہ بھی اس معاملے میں جھوٹ جس پر خود ان کا دل مطمئن نہیں تھا۔

ایک جوان لڑکی کو اس طرح تن تنہا اتنی دور بھیج دینا خود ان کی اپنی سرشت میں نہیں تھا' ایسے میں وہ بھلا عظمت خلیل کو اس فیصلے کی حمایت میں کیا دلیل دیتیں۔

"وہ کینیڈا چلی گئی ہے اور تم یہ نہیں کہنا کہ تمہیں کچھ نہیں معلوم۔ اتنا پیسہ اسے تم نے ہی دیا ہوگا جو وہ اتنا لمبا سفر کرسکے۔" عظمت خلیل انہیں بولنے کے قابل نہ پاتے ہوئے خود ہی کہنے لگے۔

"کیسی ماں ہو تم۔ یہ تربیت دی ہے تم نے اپنی اولاد کو کہ اپنے باپ سے پوچھنا تو درکنار اسے مطلع کرنا بھی اس نے ضروری نہیں سمجھا۔" عظمت خلیل غلط نہیں کہہ رہے تھے مگر ان کی اگلی بات اتنی غلط تھی کہ رشیدہ بھی تڑپ اٹھیں۔

"اکیلی گئی ہے یا کسی کے ساتھ منہ کالا کیا ہے۔"

"خدا کے لیے ایسا نہ کہیں۔ وہ وہاں گلفام سے ملنے گئی ہے جس لڑکے سے رومیلہ کی شادی ہونے والی ہے وہ ایک بار اس سے ملنا اور اسے دیکھنا چاہتی تھی۔"

"کیا؟" عظمت خلیل کا دماغ گھوم گیا تھا یہ سن کر۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں۔)

☆ ☆

بقیہ ثناء ریحان

دلچسپ بات یہ کہ تین مرتبہ انگوٹھی ڈالی گئی اور تینوں مرتبہ میں نے ہی ڈھونڈلی...... ہوا یہ کہ میں نے دلہن کا ہاتھ پکڑا اور آنکھیں دکھائیں کہ تم نہیں ڈھونڈو گی۔" قہقہہ۔

* "اوہو حکمرانی سے پہلے ہی حکمرانی کا رعب ڈال دیا...... مگر یہ تو شروع شروع کی بات ہوتی ہے بعد میں تو بیگم ہی حاوی ہوجاتی ہے؟"

☆ قہقہہ...... "بالکل ٹھیک کہا آپ نے اور رسم تو کوئی رسم نہیں تھی لیکن ایک بات کا افسوس ہوا تھا کہ ہم دونوں اسٹیج پہ بیٹھے تھے اور جب کھانے کا وقت ہوا تو ہم دونوں کو کسی نے کھانا نہیں پوچھا۔ یہ بہت بڑا ظلم تھا ہمارے ساتھ کہ دولہا دلہن کو کسی نے کھانا نہیں پوچھا اور جب کھانا سرد ہوا تو باپ بیٹی کا نہ رہا بیٹی باپ کی نہ رہی کوئی کسی کو نہیں پہچان رہا تھا سب کھانے میں مصروف ہوگئے۔"

* "اور یہ حقیقت ہے کہ شادی میں جب کھانا کھانے کا کہا جاتا ہے تو لوگ اسی طرح کھانے پہ لپکتے ہیں جیسے پتا نہیں کتنے دن کا فاقہ کرکے آتے ہیں ایسا کیوں ہوتا ہے مینرز نہیں لوگوں میں؟"

☆ "آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میں نے فائیو اسٹار ہوٹلز کے "بوفے" ڈنر بھی دیکھے ہیں وہاں بھی لوگ کھانے کے لیے ایسے ہی لپکتے ہیں جیسے پتا نہیں کب سے...... اگر لوگ ایک دوسرے کا خیال کریں تو ایسا مسئلہ کبھی نہ ہو۔"

* "سسرال تو خالہ کا گھر ہے۔ کتنی سالیاں اور کتنے سالے ہیں اور سب کیسے ہیں؟"

☆ "دو سالیاں اور تین سالے ہیں۔ سالی آدھے گھر والی ہوتی ہے اور سالوں کے لیے کہا جاتا ہے کہ ساری خدائی ایک طرف اور جورو کا بھائی ایک طرف...... اور زندگی میں محبتیں تو مجھے ویسے ہی بہت ملی ہیں۔ (قہقہہ) ہر طرح کی محبت ملی ہے۔"

* "بیگم کی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیں اور بیگم تو آل ان ون ہوتی ہے؟"

☆ "بری عادت تو ابھی تک کوئی نظر نہیں آئی یا پھر ابھی تک بری عادت دکھائی نہیں ہے۔ باقی ساری عادتیں اچھی ہیں۔ میرا خیال رکھتی ہیں محبت کرتی ہیں اور آل ان ون کی بات نہیں ہے۔ میں اپنے کام تو زیادہ تر خود ہی کرتا ہوں۔ کپڑے باہر سے دھل کر آجاتے ہیں۔ جوتے میں خود ہی صاف کرلیتا ہوں۔ لیکن کپڑے نکال کردینا اور کھانا وغیرہ دینا یہ تو بیگم کا ہی کام ہوتا ہے اور یہ کام وہ بہت احسن طریقے سے کرتی ہیں۔"

* "منہ دکھائی میں کیا دیا تھا؟ اور ہنی مون منایا تھا اور کیا آپ چاہیں گے بیگم جاب کریں؟"

☆ "گولڈ کی چین اور لاکٹ دیا تھا اور بدقسمتی سے ہنی مون منانے کا موقع نہیں مل سکا کیونکہ آفس کی مصروفیات بہت زیادہ تھیں لیکن ان شاء اللہ جلدی جائیں گے۔

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ لڑکی کے لیے گھر کی ذمہ داریاں بھی کافی ہوتی ہیں اس لیے اگر ان ذمہ داریوں کو وہ سنبھال لیں تو زیادہ بہتر ہے...... ہاں اگر گھر کے حالات ایسے ہیں کہ آپ کو ایک helping hand چاہیے تو پھر ضرور جاب کرنی چاہیے ورنہ کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

* "آپ کے پروگرام شوق سے سنتی ہیں کیا؟ اور کیا تاثرات ہوتے ہیں ان کے؟"

☆ "پہلے کبھی کبھار سنا کرتی تھیں اب وہ ریگولر سنتی ہیں اور تاثرات پوزیٹو ہی ہوتے ہیں ہاں شاعری سے وہ ذرا کم آشنا ہیں اور میرے پروگرام زیادہ تر ہوتے ہی شاعری کے ہیں۔"

* "سگھڑ ہیں؟ امور خانہ داری سے لگاؤ ہے؟ فضول خرچ ہیں اور پہلی مرتبہ کیا پکا کر کھلایا تھا؟"

☆ بالکل سگھڑ ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ گھر کی بڑی یعنی اپنے بہن بھائیوں میں بڑی ہیں تو گھر کی ذمہ داری بھی انہی پر تھی۔ فضول خرچی کے بارے

میں ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا۔ کیونکہ ابھی تو نئی نئی شادی ہے اور ابھی تو بہت کچھ ہے اور ابھی تک تو کچھ بھی پکا کر نہیں کھلایا کیونکہ والدہ نہیں چاہتیں کہ وہ ابھی کام کریں کیونکہ بقول امی کے کہ یہ کام تو ساری زندگی کرنا ہے۔"

* "اچھی زندگی کے لیے محبت زیادہ ضروری ہے یا پیسہ اور لڑکی لڑکے کی شادی کی عمر کیا ہونی چاہیے؟"

☆ "خوشحال زندگی کے لیے پیسہ بھی ضروری ہے اور محبت بھی۔۔۔ تھوڑا پیسہ ہو اور محبت زیادہ ہو تب بھی گزارا ہو جاتا ہے اور زیادہ پیسہ ہو اور محبت نہ ہو تب گزارا نہیں ہوتا اور میرا خیال ہے کہ دونوں کی عمر میں 25 سال ضروری ہونی چاہیے۔"

ثنا ریحان اسدی

○ "جی ثنا جی کیسی ہیں۔۔۔ اور لگتا ہے کہ آپ کے میاں جی بہت مصروف رہتے ہیں۔ اس لیے آپ سے انٹرویو میں مشکل ہوئی اس مصروفیت کی وجہ سے گھر بھی دیر سے آتے ہوں گے؟"

* "جی یہ آج کل بہت مصروف رہتے ہیں اور گھر بھی دیر سے آتے ہیں۔"

☆ "یہ بتائیں نئی زندگی کیسی لگ رہی ہے اور مشہور بندے سے شادی کر کے کیسا لگ رہا ہے؟"

* "نئی زندگی کی شروعات ہیں۔ اس لیے ابھی تو اچھی لگ رہی ہے اور مشہور بندے سے شادی کر کے بھی اچھا لگ رہا ہے اور آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں کہ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے ان کے موبائل پہ لڑکیوں کی کال آنا بند ہو گئی ہے۔"

☆ "آپ اپنے گھر کی بڑی اور بہو بھی آپ ایک ہی۔۔۔ بہت محبت اور توجہ مل رہی ہو گی اور ریحان چھ فٹ چھ انچ لمبے ہیں آپ کا قد کتنا ہے؟"

* "جی بڑی گھر کی اور ان کے یہاں اکلوتی بہو بہت محبت مل رہی ہے اور میرا قد 5 فٹ 4 انچ ہے اور ان سے بہت کم ہوں اور ان کے ساتھ ہیل کے بغیر گزارا نہیں ہے۔۔۔ گھر میں ہیل نہیں پہنتی لیکن باہر پہن کر جانا پڑتا ہے۔"

☆ "بے شک آپ اپنی خالہ کے گھر آئی ہیں مگر پھر بھی اپنے گھر اور دوسروں کے ماحول میں فرق ہوتا ہے فرق لگا؟"

* "نہیں مجھے بالکل فرق نہیں لگا۔ ہم دونوں گھروں کا ماحول ایک جیسا ہے اور خالہ سے میری بہت بے تکلفی ہے اور کزنز سے بھی بہت دوستی ہے۔ لیکن جب منگنی ہو گئی تو ملاقات اور بات چیت پہ پابندی لگا دی گئی کیونکہ یہ ہمارے یہاں کی روایت ہے۔"

☆ "آپ جوائنٹ فیملی میں آئی ہیں؟"

* "جی جوائنٹ فیملی ہے۔ ساس سسر ہیں دو نندوں کی شادی ہو گئی ہے اور دو ہمارے ساتھ ہیں اور میں ہمیشہ سب کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔"

☆ "شادی کی رسموں میں کون سی انجوائے کی کون سی بوریت کا باعث بنی اور جہیز کی ڈیمانڈ ہوئی تھی؟"

* "رسموں سے تو بور نہیں ہوئی لیکن دو باتوں سے بہت بور ہوئی ایک تو فوٹو سیشن سے اور دوسرے اسٹیج پہ دیر تک بیٹھنے سے اور جہیز کی ڈیمانڈ بالکل نہیں ہوئی خالہ تو منع کر رہی تھیں کہ کچھ نہیں لاؤ اور ریحان بھی منع کر رہے تھے۔"

☆ "نکاح سے ایک دن پہلے اور رخصتی کے وقت کیا احساسات تھے اور خالہ میں ساس کا روپ نظر آیا؟"

* "مجھے یہ فکر نہیں تھی کہ ماحول کیسا ہو گا کیونکہ وہ میری خالہ کا گھر تھا۔ ہاں یہ احساسات ضرور تھے کہ میں اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں کیونکہ ایک عرصہ گزارا ہوتا ہے ہم نے اپنے ماں باپ کے ساتھ تو والدین اور بہن بھائیوں کو چھوڑنے کا دکھ تھا اور مجھے خالہ میں ساس کا کوئی روپ نظر نہیں آیا۔ میری خالہ مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں۔"

☆ "ریحان کو مزاج کا کیسا پایا؟ اور ابھی تو نئی نئی شادی ہے۔ اگر کبھی انہوں نے دوسری شادی کا سوچا تو؟"

* "بہت ٹھنڈے، بہت ہی ٹھنڈے مزاج کے انسان ہیں بالکل بھی غصہ نہیں آتا۔ اور مجھے بھی غصہ زیادہ نہیں آتا۔ اگر آتا بھی ہے تو بہت کم اور جلدی چلا بھی جاتا ہے اور جہاں تک دوسری شادی کی بات ہے تو

ایسا نہ کہیں۔۔۔ میں تو ان کو بالکل بھی اجازت نہیں دوں گی۔ میری موجودگی میں یہ دوسری شادی کر ہی نہیں سکتے۔"

☆ "رومانٹک مزاج ہیں؟ لڑائی جھگڑا ہوتا ہے؟"

* "بہت زیادہ ہیں اور لڑائی جھگڑا ابھی تک نہیں ہوا ہے کیونکہ ان کو غصہ نہیں آتا تو لڑائی کیا کریں گے۔"

☆ "ریحان کی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیں؟"

* "بری عادت ان کی یہ ہے کہ یہ نیند کے بہت شوقین ہیں سونا انہیں بہت پسند ہے جہاں جب انہیں موقع ملتا ہے یہ سو جاتے ہیں اور اچھی عادت یہ ہے کہ بہت اچھے انسان ہیں۔ بہت محبت کرتے ہیں۔ بہت خیال رکھتے ہیں میرا۔"

☆ "آپ دونوں ایک دوسرے کو کس نام سے بلاتے ہیں اور منہ دکھائی میں کیا ملا تھا؟"

* "ہم دونوں ایک دوسرے کو نام سے ہی بلاتے ہیں۔۔۔ اور منہ دکھائی میں سونے کا چین اور لاکٹ ملا تھا۔"

☆ "کھانے کے معاملے میں کیسے ہیں۔ کھانا وقت پر نہ ملے تو کیا کیفیت ہوتی ہے۔ کھانا کھانے گھر سے باہر گئے ہیں؟"

* "کھانے کے زیادہ شوقین نہیں ہیں۔ بس جو مل جاتا ہے شوق سے کھا لیتے ہیں اور کھانا کھانے گھر سے باہر ہم لوگ جا چکے ہیں اور مجھے خود بھی پکانے کا شوق ہے اور میں بہت اچھا پکا لیتی ہوں، لیکن ابھی سسرال میں میں نے کھانا پکانا شروع نہیں کیا ہے۔"

☆ "شوہر سے لڑائی ہو تو لڑکیاں میکے روٹھ کر چلی جاتی ہیں اور انہیں اپنے ماں باپ پر بڑا مان ہوتا ہے؟"

* "میرے ساتھ تو کچھ بھی ہو گا میں روٹھ کر میکے کبھی نہیں جاؤں گی۔ کیونکہ گھر میں بھی تو بات ہو جاتی ہے اور اب تو سسرال ہی میرا گھر ہے۔"

☆ "آپ ریحان کو کس روپ میں اچھی لگتی ہیں سادگی میں یا بنی سنوری اور فضول خرچ ہیں۔۔۔؟"

* "میں انہیں بنی سنوری اچھی لگتی ہوں۔۔۔ میں نہ بہت زیادہ سگھڑ ہوں اور نہ ہی بہت زیادہ فضول خرچ

بس نارمل ہوں۔"

☆ "یہ بتائیں کہ اگر ریحان سے شادی نہ ہوئی ہوتی تو کیا زندگی اسی طرح مزے میں گزر رہی ہوتی؟"

* "شاید نہیں۔۔۔ شاید ایسی اچھی زندگی نہ ہوتی۔"

☆ "اور کیا جب رات کو ریحان گھر آتے ہیں تو سارا دن کی روداد انہیں سناتی ہیں یا اپنی باتیں ہوتی ہیں؟"

* "یہ نیند کے بہت شیدائی ہیں اس لیے اپنی باتیں کم ہی ہوتی ہیں اور میں سارا دن کی باتیں انہیں بتاتی ہوں مگر انہیں تو نیند آ رہی ہوتی ہے۔"

☆ "انسان فرشتہ نہیں ہوتا گھر میں کبھی خالہ سے لڑائی ہو تو ریحان کو بتائیں گی؟"

* "مجھے امید ہے کہ ان شاءاللہ ایسا کچھ نہیں ہو گا اور اگر ہوا بھی تو انہیں نہیں بتاؤں گی۔"

☆ "اور جناب یہ بتائیں کہ کمرے میں آ کر پہلا جملہ کیا بولا تھا ریحان نے؟"

* بے ساختہ ہنستے ہوئے "بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔"

☆ "اب آپ چاہیں گی کہ آپ کے ساتھ گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹائیں؟"

* "نہیں مجھے اچھا نہیں لگتا کہ شوہر کام کریں۔۔۔ اور نہ ہی گھر میں اس بات کو کوئی پسند کرے گا۔"

☆ "بیوی کو کمانا چاہیے کہ نہیں اور کیا ریڈیو پہ ان کی طرح کام کرنے کی خواہش ہے؟"

* "اگر ضرورت پڑے تو کمانا چاہیے۔ اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے اور ریڈیو پہ کام کرنے کا مجھے کوئی خاص شوق نہیں ہے۔ ویسے میں ان کے پروگرام شوق سے سنتی ہوں۔"

☆ "اچھی بیوی کی طرح کھانے پہ انتظار کرتی ہیں؟"

* "انہوں نے مجھے اجازت دی ہوئی ہے کہ بھوک لگے تو میرے آنے سے پہلے کھا لیا کرو۔ مگر میں پھر بھی ان کا انتظار کرتی ہوں اور میری کوشش ہوتی ہے کہ ان کے سارے کام میں خود کروں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے انٹرویو کا اختتام کیا۔

☆ ☆

دو کا پہاڑہ

صائمہ قریشی

1 "کوئی دو نام جن کے لیے آپ سوچتی ہیں کہ کاش یہ میرے ہوتے؟"

★ "مجھے عائشہ اور سحر بہت پسند ہیں۔ لیکن میرا اپنا نام بھی بہت خوب صورت ہے۔ اس نام نے تو مجھے پہچان دی ہے۔"

2 "آپ کے دو لکی نمبر؟"

★ "چھ اور تین۔"

3 "دو تاریخی ادوار جن میں آپ جانا چاہتی ہیں؟"

★ "مغلیہ دور۔۔۔ میں دیکھنا چاہوں گی کہ لوگ کس طرح زندگی گزارتے تھے۔ ان کا رہن سہن جو ہم کتابوں میں پڑھتے چلے آرہے ہیں کیا ویسا ہی تھا لوگوں کے ساتھ کس طرح انصاف ہوتا تھا اور دوسرا حضرت آدم علیہ السلام کا دور کہ اس دور میں جبکہ انسان کو بنیادی سہولتیں میسر نہیں تھیں تو وہ کیسے زندگی گزارتے تھے۔"

4 "کن دو افراد کے SMS کے جواب فوراً "دیتی ہیں؟"

★ "میری کزن ہے قدسیہ اور شوبز کی کنول نذر کے SMS کے جواب فوراً "دیتی ہوں۔"

5 "کوئی دو بری عادتیں جنہیں آپ چھوڑنا چاہتی ہیں؟"

★ "غصہ بہت آتا ہے۔ اسے چھوڑنا چاہتی ہوں اور میں بحث بہت کرتی ہوں۔ مجھے اپنی یہ عادت بھی بری لگتی ہے۔"

6 "دو جھوٹ جو آپ اکثر بولتی ہیں؟"

★ "جھوٹ بولتے وقت اپنی فیملی کو زیادہ انوالو کرتی ہوں کہ فیملی میں مصروف تھی اور دوسرا یہ فون گھر پر چھوڑ گئی تھی یعنی بھول گئی تھی۔"

7 "اپنے بارے میں دو باتیں جن کو سن کر غصہ آجاتا ہے؟"

★ "ایک یہ کہ فلاں سین میں تم بہت موٹی لگ رہی تھیں اور دوسری بات یہ کہ بہت برے بال بنائے ہیں۔"

8 "حالات حاضرہ کے دو اینکر جو آپ کے خیال میں پرچی سے آئے ہیں؟"

★ "کامران خان اور ڈاکٹر شاہد مسعود۔"

9 "مارننگ شو کے دو بہترین اینکر؟"

★ "نادیہ خان اور نادیہ خان۔"

10 "دو دوست جن پر آپ بھروسہ کر سکتی ہیں؟"

★ "میری ایک ہی دوست ہے نازنین جس کو میں نازو کہتی ہوں اور یہاں دوسری دوست سورا ہے۔"

11 "دو مشہور شخصیات جن کے ساتھ آپ دنیا گھومنا چاہتی ہیں؟"

★ "سیف علی خان اور مائیکل ڈگلز۔"

12 "دنیا کی دو ایسی شخصیات جن کی قسمت پر رشک آتا ہے؟"

★ "مادھوری ڈکشٹ اور کرینہ کپور۔"

13 "دو تہوار جو آپ اہتمام سے مناتی ہیں؟"

★ "ویلنٹائن ڈے اور عید۔"

14 "دن کی چار پہر میں دو پہر جو اچھے لگتے ہیں؟"

★ "صبح سویرے کا وقت بہت خوب صورت لگتا ہے اور پھر رات کا وقت جب میں گھر میں اپنی فیملی میں ہوتی ہوں۔"

15 "پہلی ملاقات میں کون سے دو جملے لازمی بولتی ہیں؟"

★ "بولتی کم اور شخصیت کا جائزہ زیادہ لیتی ہوں۔۔۔ ویسے السلام علیکم ہاں میں ٹھیک ہوں بولتی ہوں۔"

16 "دو کھانے جنہیں کھا کر کبھی بور نہیں ہوتے؟"

★ "دال چاول اور چائنیز۔"

17 "دو افراد جن سے معافی مانگنے میں شرم محسوس نہیں کرتیں؟"

★ "اپنی امی سے اور اپنے دوستوں سے۔"

18 "دو پسندیدہ کھلاڑی جن کی وجہ سے آپ کرکٹ دیکھتی ہیں؟"

★ "رمیز راجہ اور عمران خان کی وجہ سے دیکھتی تھی۔"

19 "کن دو خوب صورت دنوں کی منتظر ہیں؟"

★ "میں اپنے آپ کو بہت اوپر بہت اعلا مقام پر دیکھنا چاہتی ہوں۔"

20 "دو چیزیں جنہیں لیے بغیر آپ گھر سے نہیں نکلتیں؟"

★ "ہینڈ بیگ اور موبائل۔"

21 "دو الفاظ یا محاورے جو بہت زیادہ استعمال کرتی ہیں؟"

★ "توبہ اور ہاں۔"

22 "پسندیدہ صحافی؟"

★ "یہ تو سوچنا پڑے گا۔"

23 "سات دنوں میں کون سے دو دن اچھے لگتے ہیں؟"

★ "ہفتہ اور جمعہ۔"

24 "بارہ مہینوں میں کون سے دو مہینے اچھے لگتے ہیں؟"

★ "نومبر تو نومبر میں میری برتھ ڈے ہوتی ہے اور دسمبر کیونکہ نیو ایئر کا انتظار ہوتا ہے۔"

25 "اپنے گھر میں دو پسندیدہ جگہیں؟"

★ "اپنا ڈرائنگ روم اور اپنا باتھ روم۔"

26 "گھر کے دو کام جو کرنا پسند نہیں؟"

★ "استری کرنا اور برتن دھونا یہ دونوں کام بہت برے لگتے ہیں۔"

27 "دو پسندیدہ پکنک پوائنٹس؟"

★ "دبئی اور اسکاٹ لینڈ۔"

28 "دو سیاست دان جو ملک کے لیے بوجھ ہیں؟"

★ "ظاہر ہے جو ہمارے اوپر مسلط ہیں وہ ہمارے اوپر بوجھ ہیں اور یہی اول اور آخر ہیں۔"

29 "کن دو ممالک کی ترقی سے متاثر ہیں؟"
★ "انڈیا اور امریکہ۔"
30 "کون سے دو رنگ کے لباس پسند ہیں؟"
★ "بلیک اور ریڈ۔"
31 "اپنے ملک کے دو پسندیدہ شہر؟"
★ "اسلام آباد اور کراچی۔"
32 "اگر ایک دن کے لیے ساری دنیا سو جائے سوائے آپ کے تو آپ کون سی دو چیزیں چرائیں گی؟"
★ "بہت ساری چاکلیٹ اور بہت سارے کپڑے۔"
33 "لڑکیوں کے لیے کوئی دو نصیحتیں؟"
★ "زبان پہ قابو رکھیں اور اپنے ہم عمر سے دوستی کریں بڑوں سے نہیں۔"
34 "لڑکوں کے لیے دو نصیحتیں؟"
★ "اچھی صحبت اختیار کریں اور خواتین کی عزت کریں۔"
35 "سال کے چار موسموں میں سے دو پسندیدہ موسم؟"
★ "سردی اور برسات۔"
36 "لڑکوں کی دو ناپسندیدہ باتیں؟"
★ "گھورنا اور بلاوجہ فری ہونا۔"
37 "صبح اٹھتے ہی کون سے دو کام پہلے کرتی ہیں؟"
★ "پہلے ٹوتھ برش کرتی ہوں اور پھر دودھ کا گلاس پیتی ہوں۔"
38 "دو مرد حضرات جنھوں نے آپ کی زندگی بنانے میں اہم رول ادا کیا ہو؟"
★ "میرے والد اور میرے شوہر۔"
39 "آپ کے نزدیک دنیا کے دو خوب صورت ترین مرد؟"
★ "میرے والد جو کہ ہر لحاظ سے ہر طرح سے اچھے تھے اور میرے شوہر وہ بھی ہر لحاظ سے بہت اچھے ہیں۔"
40 "دو پسندیدہ پروفیشن؟"
★ "ایئر فورس میں جانا چاہتی تھی۔ اس لیے مجھے ایئر فورس کا پروفیشن بہت اچھا لگتا ہے اور میں ایئر ہوسٹس کے پروفیشن کو پسند کرتی ہوں۔ میں نے گلف میں اپلائی بھی کیا تھا اور منتخب بھی ہو گئی تھی...... لیکن کچھ مسائل ایسے ہو گئے کہ میں نہیں جا سکی۔ سچ بات تو یہ تھی کہ امی کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔"
41 "آپ کی نظر میں دنیا کے دو بہترین سیاست دان؟"
★ "پرویز مشرف پسند تھے اور بل کلنٹن۔"
42 "والدین کی دو باتیں جو گرہ سے باندھ لی ہوں؟"
★ "ہمیشہ جو بھی فیصلہ کرو پوچھ کر کرو...... اور مشورے کے بغیر کوئی فیصلہ نہ کرو اور کسی کی بھی صورت دیکھ کر کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیشہ انسان کی سیرت دیکھنی چاہیے۔"
43 "اپنے دو ڈرامے جو آپ کبھی فراموش نہیں کر سکتیں؟"
★ "خوشبو کا گھر" یہ آج کل انڈر پروڈکشن ہے۔ اس میں میرا کردار بہت ہی اچھا ہے اور شاید کبھی فراموش نہیں کر پاؤں گی اور ایک سیریل کیا تھا "بہشت" اس میں میرا رول بہت شاندار تھا۔"
44 "اپنے کیے گئے دو فیصلے جو غلط ثابت ہوئے ہوں؟"
★ "اپنی مرضی سے جو بھی فیصلے کیے وہ غلط ہی ثابت ہوئے۔"
45 "کن دو باتوں سے پرہیز کرتی ہیں؟"
★ "کہ غصہ نہ آئے اور بحث نہ ہو۔ کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ انہی وجوہات کی بنا پر بات بہت بڑھ جاتی ہے۔"
46 "پانچ وقت کی نمازوں میں کون سی دو وقت کی نمازیں لازمی پڑھتی ہیں؟"
★ "الحمد للہ میں پانچوں وقت کی نمازیں پڑھتی ہوں۔"
47 "بیرون ملک شاپنگ میں کون سی دو چیزیں لازمی خریدتی ہیں؟"

★ "گلاسز اور پرفیومز۔"
48 "وہ لوگ جن کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"
★ "اپنے شوہر کے اور اپنے غصے سے دونوں کے ہی غصے خطرناک ہیں۔"
49 "کن دو لوگوں کی تعریف میں بخل سے کام نہیں لیتیں؟"
★ "مجھے کبھی بھی کسی کی بھی بات اچھی لگتی ہے میں تعریف ضرور کرتی ہوں اور اپنی فیملی کی تعریف میں بھی کنجوسی سے کام نہیں لیتی۔"
50 "دو پسندیدہ مشروب جن کے بغیر نہیں رہ سکتیں؟"
★ "پیپسی اور نیس ویٹا کا دودھ۔"
51 "ملک میں کون سی دو تبدیلیاں بہت ضروری ہیں؟"
★ "ٹریفک کا نظام ٹھیک ہونا ضروری ہے اور پاسپورٹ آفس کے نظام میں تبدیلی بہت ضروری ہے۔"
52 "آج کے دور کے دو گلوکار جن کو سننا پسند کرتی ہیں؟"
★ "ابرار الحق اور راحت فتح علی۔"
53 "شادی کی دو رسمیں جو آپ انجوائے کرتی ہیں؟"
★ "مہندی اور مایوں۔"
54 "دو باتیں جو آپ کا موڈ خراب کر دیتی ہیں؟"
★ "میری مرضی کے خلاف کوئی بھی بات ہو میرا موڈ خراب ہو جاتا ہے۔ چاہے میں غلط ہی کیوں نہ ہوں۔"
55 "اپنے لباس میں کن دو باتوں کا خاص خیال رکھتی ہیں؟"
★ "ایک یہ کہ میں لمبی قمیص پہنوں چاہے جینز ہو یا شلوار اور دوسری یہ کہ میرا لباس ٹرانسپیرنٹ نہ ہو۔"
56 "کن دو افراد کے ساتھ بارش انجوائے کرتی ہیں؟"
★ "اپنے دوستوں کے ساتھ اور اپنی فیملی کے ساتھ۔"
57 "کن دو کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"
★ "ہر کیڑے سے لگتا ہے۔"
58 "وہ ریسٹورنٹ جہاں کھانا کھانا پسند ہے؟"
★ "کوئی بھی چائنیز اور پزاہٹ۔"
59 "اپنے ملک کے دو شاپنگ مال جہاں سے شاپنگ کرنا پسند کرتی ہیں؟"
★ "دو کانوں سے کرتی ہوں۔ مال میں نہیں جاتی ویسے جنریشن سے زیادہ شاپنگ کرتی ہوں۔"
60 "دو چینل جو آپ شوق سے دیکھتی ہیں؟"
★ "میوزک چینل اور نیوز۔"
61 "دو تبدیلیاں جو آپ اپنی شخصیت میں لانا چاہتی ہیں؟"
★ "بہت حساس ہوں۔ اس بات کو ختم کرنا چاہتی ہوں اور بہت زیادہ جذباتی بھی ہوں۔ اسے بھی ختم کرنا چاہتی ہوں۔"
62 "کھانے کی ٹیبل پر کیا دو چیزیں نہ ہوں تو کھانے کا مزا نہیں آتا؟"
★ "براؤن بریڈ اور دہی۔"
63 "دو چیزیں جو آپ کے بیگ یا والٹ میں لازمی ہوتی ہیں؟"
★ "پیسے اور میری فیملی کی تصویریں۔"
64 "کن دو شخصیات کو اغوا کرنا چاہیں گی اور تاوان میں کیا وصول کریں گی؟"
★ "تاوان اچھا ہو تو کسی کو بھی اغوا کر سکتی ہوں اور پیسوں کی خاطر اور زرداری (صدر پاکستان) کو تو اتنا لوٹوں گی کہ حد نہیں اور پھر آخر میں..."

✿ ✿

سرورق کی شخصیت

ماڈل ____ جیا
میک اپ ____ روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر ____ موسیٰ رضا

رِدا کی باتیں

نایاب جیلانی

ریڈیو کی مقبولیت میں کسی بھی دور میں کمی نہیں آئی۔ کیونکہ ریڈیو مصروفیت ہو یا فراغت دونوں صورتوں میں سنا جاتا ہے۔ موجودہ دور میں سائنسی ترقی کے باعث نت نئی ایجادات نے بے شمار آسانیاں بھی پیدا کردی ہیں۔ ہینڈ فری اور ایئر فونز کی بدولت آپ باسہولت ریڈیو کی نشریات سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے گھریلو امور بھی باآسانی سرانجام دے سکتے ہیں۔

ایک دور میں ریڈیو کی خریداری عام انسان کے لیے کچھ اتنی ممکن بھی نہیں تھی مگر دور حاضر میں موبائل فونز تک رسائی نے ایف ایم کے سامعین کی تعداد میں حیرت انگیز حد تک اضافہ کیا ہے اور آج کا ہر پاکستانی ملکی حالات سے آگاہ ہے۔

عوام الناس کو فہم اور ادراک بخشنے۔ ایوانوں کے بند کواڑوں کے پیچھے ریشم کے دھاگوں جیسی الجھی سلجھی سیاست کو منظر پر لانے میں "میڈیا" کا بہت اہم کردار رہا ہے۔ چاہے وہ پرنٹ میڈیا ہو یا الیکٹرانک۔

اسی طرح ریڈیو بھی ایک ایسا میڈیا ہے۔ جو عوام کی بے داری میں نمایاں کام کر رہا ہے اور ایف ایم کے پریزینٹرز کی مدھر، میٹھی اور رسیلی آواز دور دراز تک کے علاقوں اور چھوٹی چھوٹی بستیوں کے مکینوں کو اپنا دیوانہ بنا چکی ہے۔ انہی میں ایک آواز حنا عباس ہنجرا کی ہے جو ایف ایم نائنٹی تھری سرگودھا کی "ڈی جے ردا" کے نام سے مشہور ہیں۔

○ "کیسی ہیں ردا؟ آج کل کیا ہو رہا ہے؟"

☆ "الحمد للہ، ٹھیک ٹھاک ہوں۔ آج کل ایگزامز سر پر ہیں اور آپ تو جانتی ہیں کہ میڈیکل کی پڑھائی کس قدر ٹف ہوتی ہے۔ سو کتابوں کے علاوہ کچھ اور نظر نہیں آتا۔"

○ "ڈیٹس گڈ...... تو کیا ڈاکٹر بننے کا ارادہ ہے؟"

☆ "خواہش تو یہی ہے...... کیونکہ فیملی میں ڈاکٹروں کی تعداد زیادہ ہے۔ اس لیے میرے ابو کی خواہش ہے کہ میں بھی ڈاکٹر ہی بنوں۔"

○ "کچھ اپنی فیملی کے بارے میں بتائیے؟"

☆ "میرا تعلق ایک تعلیم یافتہ زمیندار گھرانے سے ہے۔ میرے ابو نے وکالت کی تعلیم حاصل کی ہے اور میرے چاچو چائلڈ اسپیشلسٹ ہیں۔ میرے دادا نے میرے ابو اور چاچو کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی تھی۔ حالانکہ وہ ایک زمیندارانہ بیک گراؤنڈ رکھتے تھے۔ اس کے باوجود دادا کو اپنے بچوں کو اعلا مقام پر دیکھنے کا شوق تھا۔ اسی طرح یہ شوق ہمارے ابو میں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔"

○ "آپ کے والد روشن خیال اور تعلیم یافتہ انسان ہیں؟ کیا ان کی سوچ ایک روایتی زمیندار جیسی نہیں وہ بھی فیوڈل لارڈز کی اکثریت کی طرح گھریلو سیاست اور جذباتی بلیک میلنگ کا شکار نہیں ہوئے؟ آپ یقیناً جانتی ہوں گی کہ میرا اشارہ کس طرف ہے؟"

☆ "جی...... میں آپ کے سوال کا اصل متن سمجھ چکی ہوں...... اگرچہ یہ سوال کافی پرسنل ہے مگر اس کا جواب میں قارئین کی دلچسپی کے لیے نہیں بلکہ ایک عورت کے جذبات کی وضاحت کے لیے ضرور دوں گی...... میری امی، میرے والد کی دوسری بیوی ہیں۔

اس شادی کا پس منظر کچھ یوں تھا کہ میرے والد اولاد نرینہ سے محروم تھے۔ چار ذہین اور خوب صورت بیٹیوں کے باپ تھے۔ عموماً" ہمارے ہاں کے لوگوں کا یہی تصور رہا ہے کہ اگر کسی صاحب حیثیت مرد کے ہاں

بیٹا نہ ہوا تو اس کی جائیداد ضائع چلی جائے گی۔ یا پھر صاف لفظوں میں یوں کہنا مناسب ہوگا کہ بیٹیوں کے سسرالیوں کی طرف منتقل ہو جائے گی۔ اسی نظریے کے تحت میرے دادا نے ابو کی دوسری شادی کروائی۔ اگرچہ ابو کی پہلی شادی میں محبت اور پسندیدگی شامل تھی۔ مگر باپ کے مجبور کرنے پر انہیں ہماری امی سے شادی کرنا پڑی۔ مقصد کہنے کا یا بتانے کا یہ ہے کہ اگرچہ ہم کتنے ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو جائیں۔ اس سوسائٹی اور اپنے اسی معاشرے کے مروجہ اصولوں سے بغاوت نہیں کر سکتے اور کسی نہ کسی طرح اپنے ہی بنائے گئے قوانین کا شکار ہو جاتے ہیں۔

یہاں دو عورتوں کے جذبات مجروح کیے گئے تھے۔

ایک وہ جو ابو کی پہلی بیوی تھیں۔ ان کی محبت تھیں ان کی چار بیٹیوں کی ماں تھیں اور دوسری ہماری والدہ۔ جنہیں کئی حصوں میں بٹا ہوا شوہر ملا تھا۔ جو نا صرف ایک بیٹا، بھائی اور شوہر ہی نہیں بلکہ بچیوں کا باپ بھی تھا۔"

○ "تو آپ نے اپنے والد کو کیسا باپ پایا؟ کیا آپ کے گھریلو ماحول نے کچھ کمی آپ کی شخصیت میں چھوڑی ہے؟ عموماً" دو کشتیوں کے سوار نہ آر جاتے ہیں نہ پار؟"

☆ "میرے ابو ایک بہت ہی متوازن شخصیت رکھنے والے انسان ہیں۔ ایک بااصول اور محبت کرنے والے شوہر اور باپ ہیں...... رشتہ بنانا مشکل نہیں ہوتا۔ رشتے کو نبھانا اصل فن ہے۔ اگرچہ ابو دوسری شادی کے لیے رضامند نہیں تھے۔ انہیں مجبور کیا گیا تھا مگر ہماری امی سے شادی کے بعد انہوں نے دونوں بیویوں میں توازن رکھا تھا اور اولاد میں بھی تفریق نہیں کی دیکھا جائے تو میری اسٹیپ سسٹرز زیادہ لگژریز لائف گزار رہی ہیں۔ ان کی تعلیم کی طرف ابو نے خصوصی توجہ دی ہے۔ بڑی امی کی چاروں بیٹیاں اعلا تعلیم یافتہ ہیں۔ اپنی اپنی فیلڈ میں نمایاں کارکردگی دکھاتی رہی ہیں اور ان کے بارے میں بھی کچھ وضاحت کر دیتی ہوں کہ

صائمہ آپی نے انگلش لٹریچر اور اسلامیات میں ماسٹرز کیا ہے اور آج کل لندن میں رہائش پذیر ہیں اور عظمیٰ آپی ڈاکٹر ہیں۔ وہ بھی یوکے میں ہیں۔ سلمیٰ آپی نے ہسٹری میں ماسٹرز کیا ہے اور وہ ملائشیا میں ایک نجی ادارے سے منسلک ہیں اور سب سے چھوٹی سعدیہ آپی گریجویٹ ہیں۔ بتانے کا مقصد یہ ہے کہ ابو نے دنیاوی اور دینوی طریقے کے مطابق اپنی اولاد کی تربیت کی ہے اور اپنے بچوں میں کبھی تفریق نہیں کی۔"

○ "اور کچھ اپنے بہن بھائیوں کے بارے میں بتائیے؟"

☆ "ہم بھی چار بہنیں ہیں۔ دو بھائی بھی ہیں (ماشاء

اللہ) ایک بھائی اور بہن کے بعد میرا نمبر آتا ہے۔ مجھ سے چھوٹی دو بہنیں اور ایک بھائی بھی زیر تعلیم ہیں۔"

○ "فیلڈ سے وابستگی کب ہوئی؟"

☆ "اس فیلڈ سے وابستہ ہونے کا شوق مجھے نویں کلاس میں ہوا تھا۔ جب میں کھاتے پیتے "اٹھتے بیٹھتے اور پڑھتے ہوئے بھی ایف ایم 104 سنا کرتی تھی اور مزے کی بات یہ ہے کہ ایف ایم 104 کی ریگولر کالر بھی تھی۔ مگر بد قسمتی سے مجھے 104 جوائن کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ کیونکہ میٹرک کے فوراً" بعد میں سرگودھا آگئی اور اپنا شوق میں نے ایف ایم 93 کو جوائن کرکے پورا کیا تھا۔ ایف ایم پہ میری آمد بالکل اچانک ہوئی تھی۔ جو مجھے اب تک ایک حسین خواب لگتا ہے۔ پروگرام کرنے کا شوق میرے علاوہ فیملی میں کسی کو نہیں۔ مگر فیملی کی طرف سے مجھے مکمل سپورٹ حاصل ہے۔"

○ "پہلی مرتبہ ریڈیو پر آپ کی آواز سنائی دی گئی تھی۔ کیا احساسات تھے آپ کے؟ اور پہلی مرتبہ کس نے بتایا تھا کہ آپ کی آواز دور دور تک جارہی ہے؟"

☆ "پروگرام کرنے سے پہلے جو اندیشے اور فطری سا خوف تھا اس کے برعکس جب پروڈیوسر صاحب نے بتایا کہ آپ کو سرگودھا کے نواحی علاقے اور بستیوں کے لوگ سن رہے ہیں تو بے تحاشا خوشی محسوس ہوئی تھی۔"

○ "ایف ایم کے حوالے سے یہ آپ کی پہلی شہرت تھی۔ پہلی شہرت کا نشہ اور اس کا سرور کیا ہوتا ہے؟"

☆ "قہقہہ۔۔۔ ابھی مشہور کہاں ہوئی ہوں۔"

○ "ریڈیو پر کام کرنے کا شوق کب پورا ہوا؟"

☆ "یہ ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ ہوا کچھ یوں کہ میں ہاسٹل میں اپنی روم میٹ مہوش کے ساتھ ایف ایم سن رہی تھی کہ اچانک میں نے مہوش سے اپنی خواہش کا اظہار کردیا۔ مہوش نے بھی میرا مسئلہ چٹکیوں میں حل کردیا تھا اور مجھے پروڈیوسر صاحب کا نمبر مل گیا۔ رات کے بارہ بجے ہی شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے انہیں کال کردی۔ تھی تو یہ نامناسب سی بات "تاہم پروڈیوسر صاحب کی نیند میں ڈوبی آواز سن کر میں نے اپنا مدعا بیان کردیا تھا۔ انہوں نے مجھے صبح اسٹوڈیو آنے کو کہا۔ یوں میرا آڈیشن ہوا اور میں سلیکٹ ہوگئی۔ ستمبر 2009ء میں روا کے نام سے میں نے اپنے پہلے پروگرام شاہین سرگودھا کا آغاز کیا تھا۔ اکثر لوگوں نے مجھے کنفیوز کرنے کی بھی کوشش کی تھی مگر میں نے اچھی کارکردگی دکھا کر کنفیوز کرنے والوں کے فیوز اڑا دیے تھے۔"

○ "فیلڈ میں نئے آنے والوں کو جگہ بنانے میں خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟"

☆ "جی۔۔۔ خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تاہم میرے ساتھ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ الحمدللہ ہمیشہ تعاون کرنے والے لوگوں کا ساتھ ملا ہے۔"

○ "کیا اس فیلڈ میں اپنا کیریئر بنائیں گی؟"

☆ "اگرچہ آواز کی دنیا میں بھی اپنا ہی جادو ہے۔ سامعین سے عجیب سا ایک رابطہ استوار ہو جاتا ہے تاہم اس فیلڈ میں اپنا کیریئر بنانا ہرگز نہیں چاہوں گی۔ مجھے تعلیم کے میدان میں بہت آگے تک جانا ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ ستاروں پر کمند ڈالنی ہے۔"

○ "پہلا چیک کتنے کا ملا تھا؟"

☆ "قہقہہ۔۔۔ میری کالج فیلوز رشک و حسد میں مبتلا ہو کر کہتی تھیں کہ حنا تمہیں تو اب پاکٹ منی لینے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی ہو گی اور میں اپنی پہلی کمائی جس میں شاید کولڈ ڈرنکس اور سموسے ہی آسکتے تھے کو دیکھ کر دیر تک ہنستی رہی تھی تاہم میں نے اپنی کالج فیلوز کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔"

○ "لائیو کالز میں کبھی کچھ ایسا کہا گیا۔ جس نے آپ کو ڈسٹرب کیا؟"

☆ "پروگرام میں مجھے سب سے زیادہ مزا لائیو کالز لینے میں آتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک طالب علم کی کال نے مجھے خاصا ڈسٹرب کیا تھا۔ اس نے ایف ایم 93 کو ذریعہ بنا کر اپنی آواز ان عاقبت نااندیش قوم کے معماروں تک پہنچائی تھی جو کہ نئی نسل کو نصاب کے علاوہ فحش گالیوں کے اسباق بھی یاد کرواتے ہیں۔ وہ بچہ خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔ اور اس نے بتایا کہ اسکول میں استاد محترم بچوں کو گالیاں دیتے ہیں۔ اس کال نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ قوم کے یہ معمار ہماری نئی نسل کو کون سا پیغام دے رہے ہیں۔"

○ "یونی ورسٹی میگزین پروگرام خاصا مقبول ہے۔ اس کے حوالے سے کچھ بتادیں؟"

☆ "یونی ورسٹی میگزین پروگرام میں یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس اور ٹیچرز کو متعارف کروایا جاتا ہے اور ان سے تعلیم کے حوالے سے ڈسکشن ہوتی ہے اور اسٹوڈنٹس نے جو اچیومنٹس حاصل کی ہوتی ہیں۔ اس حوالے سے ان سے گفتگو ہوتی ہے۔"

○ "کیا آپ نے کبھی پروگرام میں معروف شخصیات اور سماجی تنظیموں کے لوگوں کو مدعو کیا ہے؟"

☆ "جی ہاں۔۔۔ شاہین سرگودھا سروس ٹی پروگرام ہے۔ جس میں سرگودھا سے ریلیٹڈ جو مسائل ہوتے ہیں۔ ان کو ڈسکس کیا جاتا ہے اور مختلف حکومتی محکمے جن میں محکمہ تعلیم، محکمہ صحت، کمشنر، ڈپٹی کمشنر، سیاسی اور مختلف سماجی تنظیموں کے لوگوں کو مدعو کیا جاتا ہے۔"

○ "آپ اپنے پروگرام میں سامعین کے ساتھ کس قسم کے ٹاپکس ڈسکس کرتی ہیں؟"

☆ "زیادہ تر کوشش ہوتی ہے کہ فنی ٹاپکس رکھوں۔۔۔ تاکہ زلزلوں، سیلاب اور بم دھماکوں کی وجہ سے عوام میں جو خوف و ہراس کی فضا قائم ہو چکی ہے۔ اس کے بعد اثرات کو کچھ کم کرسکوں۔"

○ "میں نے سنا ہے، آپ غصے کی خاصی تیز ہیں۔ کبھی کسی کالر سے تو نہیں الجھ پڑیں؟"

☆ "قہقہہ۔۔۔ نہیں اللہ کا بڑا کرم ہے۔ ایسی نوبت کبھی نہیں آئی۔"

○ "ریڈیو کی مقبولیت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

☆ "کیبل ٹی وی اور کمپیوٹر کے باوجود ایف ایم کے سامعین میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ریڈیو ـــــ ایک بہترین رفیق کی طرح ساتھ دیتا ہے۔ دیہاتوں میں ریڈیو آج بھی بہت مقبول ہے۔ آج کا کسان بھی ـــــ ـــــ ہل چلاتے ہوئے ریڈیو سننا پسند کرتا ہے۔"

○ "کچھ اپنے بارے میں بتایئے؟"

☆ "میں نو نومبر 1993ء میں پیدا ہوئی۔ اس لحاظ سے میرا اسٹار عقرب ہے۔ Fsc پری میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ غصے کی بہت تیز ہوں۔ کبھی کبھی بڑی سے بڑی بات برداشت کرلیتی ہوں اور بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی رونا آجاتا ہے۔ بہت جذباتی اور ضدی ہوں۔

میرا اکیڈمک ریکارڈ اللہ کے کرم سے اب تک شاندار رہی ہے۔ ذہین اسٹوڈنٹس کی فہرست میں شامل ہوں۔ غیر نصابی سرگرمیوں میں ہمیشہ ایکٹو رہی ہوں۔ بہت اچھی ڈیبیٹر ہوں۔ تحصیل اور ڈسٹرکٹ لیول پر فرسٹ پرائز ون کرنے کا اعزاز بھی حاصل کر چکی ہوں۔ میٹرک میں اچھے مارکس لینے کی وجہ سے اسکول کی طرف سے پمفلٹ چھپے تو علاقے بھر میں اچھی خاصی مشہور ہو گئی تھی۔"

○ "کیا بچپن میں شرارتی تھیں آپ؟"

☆ "جی ہاں..... بہت زیادہ شرارتی تھی۔ میرا بچپن شرارتیں کرتے اور مار کھاتے ہی گزرا ہے۔ مار کھانے کے علاوہ میں مارنے کا کام بھی بخوبی سرانجام دیتی تھی۔ لڑکیوں سے زیادہ لڑکے میرے عتاب کا نشانہ بنتے تھے۔ لڑکوں سے بچپن میں زیادہ دوستی تھی۔ اس لیے ابھی تک لڑکوں جیسی عادتیں مجھ میں پائی جاتی ہیں۔

اکثر لوگ مجھے کہتے ہیں کہ تمہیں لڑکی نہیں لڑکا ہونا چاہیے۔ ویسے مجھے دولہن بننے کا بھی بہت شوق ہے۔ (قہقہہ) مجھے دلہنوں کے روایتی ڈریسز بہت پسند ہیں۔ ویسے مجھے ناول نگار بننے کا بھی بہت شوق ہے ہاہاہا۔"

○ "آپ کی کوئی ایسی خواہش جو ناممکن لگتی ہے؟"

☆ "ایک نہیں بے شمار خواہشات ہیں۔ جن کا پورا ہونا ناممکن ہے۔ ایک خواہش تو یہ کہ میں سلطنت عثمانیہ کے دور میں چلی جاؤں۔ مجھے طارق بن زیاد سے ملنے کا بھی بہت شوق ہے۔ (قہقہہ) اگر مغلیہ دور میں ہوتی تو کم از کم ایک ایسا قانون لاگو (نافذ) کرتی جس میں شہزادوں کو بھی محبت کرنے پر سزا دی جاتی۔ ایسی بزدلانہ محبت کا بھلا کیا فائدہ (انارکلی کے محبوب شہزادہ سلیم کے بارے میں کہا گیا ہے۔")

○ "کون سا گلوکار پسند ہے؟"

☆ "راحت فتح علی خان کے علاوہ کوئی اور سنگر پسند نہیں۔"

○ "پسندیدہ مصنف؟"

☆ "واصف علی واصف اور دور حاضر کی مصنفین ..... خواتین اور کرن کی رائٹرز۔"

○ "پسندیدہ شاعر؟"

☆ "محسن نقوی، منیر نیازی۔"

○ "ایکٹرز میں کون پسند ہے؟"

☆ "رنبیر کپور اور عمران خان ..... ہینڈسم جو ہیں۔" (قہقہہ)

○ "کوئی ایسا گیت جو اکثر نوک زباں پر مچلتا رہتا ہے؟"

☆ "میری ذات ذرہ بے نشان..... فرحت فتح علی خان کی آواز میں ہی پسند ہے۔"

○ "پسندیدہ موویز؟"

☆ "موویز بہت کم دیکھتی ہوں..... اگر دیکھنے کا موقع ملے تو رومانٹک موویز دیکھتی ہوں۔"

○ "کون سا تہوار پسند ہے؟"

☆ "میٹھی عید پسند ہے۔ اس عید پہ میرے اکاؤنٹ میں خاصی رقم جمع ہو جاتی ہے اس لیے بھی عید الفطر کا انتظار رہتا ہے۔"

○ "خوابوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

☆ "خواب دیکھنا پسند ہیں۔ مگر جاگتی آنکھوں سے نہیں۔"

○ "آپ تو کافی اسمارٹ اور گڈ لکنگ ہیں۔ ماڈلنگ کی آفر ہوئی تو.....؟"

☆ "ماڈلنگ کا بہت شوق ہے..... بلکہ بے تحاشا شوق ہے مگر ایسی کسی بھی آفر کو کبھی بھی قبول نہیں کروں گی۔"

○ "محبت، آئیڈیل اور شادی؟ کون سے آپشن کا انتخاب زیادہ بہتر ہے؟"

☆ "میرا خیال ہے شادی..... کیونکہ شادی کے بعد محبت تو ہو ہی جاتی ہے تاہم آئیڈیل کا ملنا مشکل ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے انٹرویو کا اختتام کیا تھا۔

☆ ☆

شعاع عمیر

کرن کرن خوشبو

عورتوں کو نصیحت

ابن عمر رضی اللہ' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ آپؐ نے (ایک بار) فرمایا۔

"اے عورتوں کی جماعت تم (خاص طور پر) صدقہ دیا کرو اور زیادہ استغفار کیا کرو کیونکہ دوزخیوں میں زیادہ تعداد میں نے عورتوں کی دیکھی ہے۔" ان میں ایک ہوشیار عورت بولی۔

"یا رسول اللہ! ہم نے کیا قصور کیا ہے کہ ہم دوزخ میں زیادہ جائیں گے۔" آپؐ نے فرمایا۔

"تمہیں (باہم گفتگو میں) لعنت کرنے کی زیادہ عادت ہوتی ہے اور تم اپنے شوہر کی بھی بہت ناشکری کرتی ہو میں نے تم جیسا دین و عقل میں ناقص ہو کر پھر ایک دانشمند شخص پر غالب آجانے والا کسی کو نہیں دیکھا۔"

(بخاری مسلم۔ ترجمان السنتہ)

نذر

حضرت عمران بن حصینؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ "نذر دو قسم کی ہے ایک تو وہ نذر جو اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت کے لیے مانی جائے۔ اس کا پورا کرنا ضروری ہے اس لیے یہ خاص اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور دوسری نذر وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہ کے لیے کی جائے یہ نذر شیطان کے لیے ہے اور اسے پورا کرنا جائز نہیں اور اس قسم کی نذر کا کفارہ دے جو قسم کا کفارہ دیا جاتا ہے۔"

(نسائی۔۔۔ مشکوۃ)

صائمہ۔۔۔ کراچی

لفظ جو بات کریں

☆ تو دنیا میں رہنے کے سامانوں میں لگا ہے اور دنیا تجھے اپنے سے نکالنے میں سرگرم ہے۔

☆ جس کا سرمایہ دنیا ہے اس کے دین کا نقصان زبانیں بیان کرنے سے قاصر ہیں۔

☆ عورتوں کو سونے کی سرخی اور زبان کی زردی نے ہلاک کر رکھا ہے۔

☆ جو ابتدائے اسلام میں مر گیا وہ بہت خوش نصیب تھا۔

☆ علم پیغمبروں کی میراث ہے اور مال فرعون و قارون اور کفار کی۔

☆ جو شخص زیادہ ہنستا ہے اس کی ہیبت کم ہو جاتی ہے۔

☆ محسن کا شکر ادا کرو اور شکر گزار پر احسان کرو۔

☆ انسان کا سب سے بڑا دشمن اس کا پیٹ ہے۔

☆ اخلاق یہ ہے کہ اعمال کا صلہ نہ چاہے' دنیا کو آخرت کے لیے اور آخرت تو اللہ کے لیے چھوڑ دے۔

☆ خلقت سے تکلیف دور کر کے خود اٹھا لینا حقیقی سخاوت ہے۔

☆ زبان کو شکوہ سے روک خوشی کی زندگی عطا ہوگی۔

☆ اس دن پر رو جو تیری عمر کا گزر گیا اور اس میں کوئی نیکی نہیں کی۔

☆ شکر گزار مومن عافیت کے قریب تر ہے۔

انیقہ انا۔۔۔ چکوال

پہلی کرن

○ جس قوم میں غدار پیدا ہونے لگیں' اس قوم کے مضبوط قلعے بھی ریت کے گھروندے ثابت ہوتے ہیں۔

○ انقلاب' دوست کو دشمن اور دشمن کو دوست بنا دیتا ہے۔

○ عداوت' کمزوری کی علامت اور غلامی' ذلتِ نفس کی انتہا ہے۔

○ ناکامی کا بڑا سبب' کام کرنے والوں کی باہمی بے اعتباریاں ہوا کرتی ہیں۔

○ معافی' خطا کار کے لیے ہے' غدار کے لیے نہیں ہے۔

○ جب تک انسان مشکلات و مصائب میں گرفتار نہیں ہوتا' اس کے جوہر نہیں کھلتے۔

○ جب کوئی قوم اپنی تاریخ کو بھلا دیتی ہے تو جغرافیہ بھی اس قوم کو فراموش کر دیتا ہے۔

○ جس کے ساتھ اللہ رہتا ہے۔ وہ سوائے اس کے کسی بھی طاقت سے نہیں ڈرتا۔

تسنیم چوہدری۔۔۔ آکسفورڈ یو کے

خوب صورت بات

ایک جوکر نے لوگوں کو ایک جوک سنایا تو سب لوگ بہت زیادہ ہنسے اس نے وہی جوک پھر سنایا تو کم لوگ ہنسے' اس نے وہی جوک پھر سنایا تو کوئی بھی نہ ہنسا تو پھر اس نے ایک بہت خوب صورت بات کہی۔

"اگر تم لوگ ایک خوشی کو لے کر بار بار خوش نہیں ہو سکتے' تو پھر ایک غم کو لے کر بار بار روتے کیوں ہو؟"

دیویا سونی۔۔۔ ٹنڈو الہ یار

سامنا

اس لمحے کی خاطر ہی تو
کئی جگنوں کا سفر کیا ہے
لیکن آنکھ ملاؤں کیسے
جھکی ہوئی ہیں میری پلکیں
سورج سا وہ چمک رہا ہے

(ماہ طلعت زاہدی)

ارم آفتاب۔۔۔ کراچی

دائرے

دائرے چھوٹے بڑے ہر قسم کے ہوتے ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ قریب قریب کبھی گول ہوتے ہیں۔ ایک اور عجیب بات یہ ہے کہ ان کے قطر کی لمبائی ہمیشہ نصف قطر سے دگنی ہوتی ہے۔ جیومیٹری میں اس کی کوئی وجہ نہیں لکھی گئی' جو کسی نے پرانے زمانے میں فیصلہ کر دیا ہے' وہی چلا آتا ہے۔

ایک دائرہ اسلام کا دائرہ کہلاتا ہے۔ پہلے اس میں لوگوں کو داخل کیا جاتا تھا' آج کل داخلہ منع ہے' صرف خارج کیا جاتا ہے۔

ابن انشاء کی "اردو کی آخری کتاب" سے اقتباس۔

یمنیٰ خان۔۔۔ کراچی

حسن ظن

الحمد للہ! مجھے فخر ہے کہ میں عورت ذات کے متعلق کسی بھی قسم کے تحقیر آمیز نظریات نہیں رکھتا۔ اس نے مجھے زندگی دی ہے' لہٰذا میں اس سے زندہ رہنے کا حق نہیں چھین سکتا۔ وہ میرا لباس ہے' لہٰذا میں اسے ننگ انسانیت ہونے کا طعنہ نہیں دے سکتا۔ اس نے میری نجاستیں دھو کر مجھے پاک صاف رکھا' لہٰذا میں اسے نجس مخلوق قرار نہیں دے سکتا۔ اس نے مجھے انگلی پکڑ کر زمین پر چلنے کا طریقہ سکھایا' لہٰذا میں اس کے پاؤں سے زمین نہیں کھینچ سکتا۔ اس نے میری تربیت کر کے مجھے انسان بنایا لہٰذا میں اسے فتنہ و فساد کی جڑ قرار نہیں دے سکتا۔

اس نے مجھے کامل بنایا لہٰذا میں اسے ناقص نہیں کہہ سکتا' اس نے مجھے انسان بنایا' لہٰذا میں اسے آدھا انسان قرار نہیں دے سکتا۔ اس نے اپنی زندگی کے ہر سانس کے ساتھ مجھے اپنی دعاؤں سے نوازا ہے' لہٰذا میں اسے حقارت آمیز گالیاں نہیں دے سکتا۔

اگر میں ایسا کروں تو میری اپنی ہی ذات کی تحقیر

تذلیل اور نفی ہوتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں عورت ذات کے متعلق ہر طرح کا حسن ظن رکھتا ہوں۔
غلام اکبر ملک کی تصنیف "عورت کا مقدمہ" سے اقتباس۔

نجمہ حفیظ.... کورنگی، کراچی

کارگر نسخہ

"یہ تم اخبار میں سے کیا کاٹ رہے ہو؟"
"ایک خبر.... جس میں بتایا گیا ہے کہ ایک شخص نے صرف اس لیے اپنی بیوی کو طلاق دے دی کہ وہ اکثر اس کی جیبوں کی تلاشی لیتی رہتی تھی؟"
"مگر تم اس تراشے کا کیا کرو گے؟"

"جیب میں رکھوں گا۔"

سلیمہ.... لطیف آباد

اہمیت

اس نے ساری چیزیں
اٹھا کر سنبھال لیں
سوائے میرے

زینب احسن زینی.... فیصل آباد

لفظ باتیں کریں

☆ بارش کا قطرہ سانپ اور سیپ دونوں کے منہ میں جاتا ہے لیکن سانپ اسے زہر اور سیپ اسے موتی بنا دیتا ہے۔ یہ ہر ایک کی اپنی تخلیق ہے۔
☆ اگر زندگی میں سکون چاہتے ہو تو کبھی کسی سے توقع مت رکھو۔ کیونکہ توقع کا پیالہ ہمیشہ ٹھوکروں کی زد میں رہتا ہے۔
☆ زندگی خود ایک ایسی بیماری ہے، جس کا انجام موت ہے اور مسلمان کا ایمان یہ ہے کہ نہ وقت سے پہلے موت آتی ہے اور نہ وقت کے بعد زندگی ٹھہرتی ہے۔
☆ انسان کے کردار کی دو ہی منزلیں ہیں یا تو دل میں اتر جانا یا دل سے اتر جانا۔
☆ برے وقت کو اپنے وقت پر ہی گزرنا ہے آپ کے رونے چلانے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔
☆ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے پاس کم ہوتا ہے لیکن وہ سب دے دیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو زندگی پر یقین رکھتے ہیں اور زندگی کی سخاوت پر سو ان کا صندوق کبھی خالی نہیں ہوتا۔
☆ بعض لوگوں کی زندگی میں اگر غم بڑھ جائیں تو قہقہوں میں شدت آجاتی ہے کبھی شعوری طور پر اور کبھی لاشعوری طور پر۔
☆ جب دعا سے بات نہ بنے تو فیصلہ اللہ پر چھوڑ دو' اللہ تعالیٰ بندوں کے بارے میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔
☆ تقدیر کو تدبیر سے ایسے سنوارو کہ تقدیر مسکرائے۔

سدرہ اسلم.... کہروڑپکا

حاصل مطالعہ

☆ جس کا آغاز نہ ہو اس کا انجام نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ ہر آغاز سے پہلے ہے اور ہر انجام کے بعد۔
☆ یتیم کا مال کھانے والا ہزار یتیم خانے بنائے پھر بھی سکون نہیں پائے گا۔ پیٹ میں آگ ہو تو دل میں سکون کہاں؟
☆ اگر تم نے معمولی سے معمولی انسان کو بھی دکھی کر دیا تو سارے جہاں کا جو دکھ ہے وہ تمہارے سر پر بلاوجہ آجائے گا۔
☆ کوئی مسلمان ایسا نہیں جو خوشی سے گناہ کرے۔ گناہ بیماری کی طرح اس سے لاحق ہو جاتا ہے۔
☆ لوگوں کے سامنے معزز بنا رہ کیونکہ افلاس کے ظاہر کرنے سے لوگوں کی نظر سے گر جائے گا۔
☆ ادراک کا ایک لمحہ پوری زندگی پر بھاری ہوتا ہے، مگر اپنے ساتھ یا تو زندگی کی ساری رعنائی اور دلکشی سمیٹ کر لے جاتا ہے یا پھر روشنی و رنگ خیرات کر جاتا ہے۔

☆ ☆

بشریٰ محمود

یادوں کے دریچے سے

سیّدہ ناصرہ گیلانی، کی ڈائری میں تحریر
مضطر بخاری کی غزل

دیکھ اے چشم فلک غم سے سسکتے چہرے
بھوک و افلاس سے مارے ہوئے جلتے چہرے

دن گزر جاتا ہے آتے ہیں سر شام نظر
بیٹیوں، ماؤں کے، بہنوں کے بدلتے چہرے

ہائے افسوس کہ ظلمات میں گم ہو کے رہے
غم کے سورج کی طرح درد میں ڈھلتے چہرے

روز و شب سوچتی رہتی ہے یہ مزدور کی ماں
عیش و عشرت میں کبھی پھول سے پلتے چہرے

اپنی محبت سے وہ پالیتے ہیں سکون دل بھی
کاش آرام سے کچھ دیر سنبھلتے چہرے

وہ جو معصوم ہیں آنا تھا ابھی جن پہ نکھار
شوخیاں بھول گئے ہیں وہ مچلتے چہرے

جانے کیا خون تمنا ہیں نظر آتا ہے
جانے کس خوف میں ہیں رنگ بدلتے چہرے

وہ جو مضبوط چٹانوں کی طرح لگتے تھے
وقت کی دھوپ میں دیکھے ہیں پگھلتے چہرے

فرط جذبات سے اس درد کو ڈرہے مضطر
پھونک ڈالیں نہ کہیں آگ اگلتے چہرے

ادم، کی ڈائری میں تحریر
احمد فراز کی نظم

خواب مرتے نہیں
خواب دل ہیں نہ آنکھیں نہ سانسیں کہ جو
ریزہ ریزہ ہو جائے تو بکھر جائیں گے
جسم کی موت سے یہ بھی مر جائیں گے
خواب مرتے نہیں
خواب تو روشنی ہیں، نوا ہیں، ہوا ہیں
جو کالے پہاڑوں سے رکتے نہیں
ظلم کے دوزخوں سے بھی پھکتے نہیں
روشنی اور نوا اور ہوا کے علم
مقتلوں میں پہنچ کر بھی جھکتے نہیں
خواب تو حرف ہیں
خواب تو نور ہیں
خواب سقراط ہیں
خواب منصور ہیں

نوشین اقبال نوشی، کی ڈائری میں تحریر
محسن نقوی کی غزل

مرتی ہوئی زمین کو بچانا پڑا مجھے
بادل کی طرح دشت میں آنا پڑا مجھے

وہ کر نہیں رہا تھا میری بات کا یقین
پھر یوں ہوا کہ مر کے دکھانا پڑا مجھے

بھولے سے میری سمت کوئی دیکھتا نہ تھا
چہرے پر اک زخم لگانا پڑا مجھے

اس اجنبی سے ہاتھ ملانے کے واسطے
محفل میں سب سے ہاتھ ملانا پڑا مجھے

اس بے وفا کی یاد دلاتا تھا بار بار
کل آئینے پہ ہاتھ اٹھانا پڑا مجھے

ایسے بچھڑ کے اس نے تو مر جانا تھا محسن
اس کی نظر میں خود کو گرانا پڑا مجھے

سدرہ وزیر، ناصرہ تول، کی ڈائری میں تحریر
امجد اسلام امجد کی نظم

خواب ٹوٹ جاتے ہیں،

خواب ٹوٹ جاتے ہیں
بھیڑ میں زمانے کی
ہاتھ چھوٹ جاتے ہیں
دوست دار لہجوں میں سلوٹیں پڑتی ہیں
اک ذرا سی رنجش سے
شک کی زرد ٹہنی پر پھول بدگمانی کے
اس طرح سے کھلتے ہیں
زندگی سے پیارے بھی
اجنبی سے لگتے ہیں غیر بن کے ملتے ہیں
عمر بھر کی چاہت کو آسرا نہیں ملتا
خاموشی کے وقفوں میں
بات ٹوٹ جاتی ہے اور سرا نہیں ملتا
معذرت کے لفظوں کو روشنی نہیں ملتی
لذت پذیرائی پھر کبھی نہیں ملتی۔
خواب ٹوٹ جاتے ہیں
واہموں کے سلے سے عمر بھر کی محنت کو
پل میں ٹوٹ جاتے ہیں
اک ذرا سی رنجش سے
ساتھ ٹوٹ جاتے ہیں بھیڑ میں زمانے کی
ہاتھ چھوٹ جاتے ہیں
خواب ٹوٹ جاتے ہیں

زینب احسن زینی، کی ڈائری میں تحریر
پروین شاکر کی نظم

کیسے کیسے تھے جزیرے خواب میں
بہہ گئے سب نیند کے سیلاب میں
لڑکیاں بیٹھی تھیں پاؤں ڈال کر
روشنی سی ہو گئی تالاب میں
جکڑے جانے کی تمنا تیز تھی

آ گئے پھر حلقۂ گرداب میں
ڈوبتے سورج کی نارنجی تھکن
تیرتی ہے دیدۂ خوشاب میں
وہ تو میرے سامنے بیٹھا تھا پھر
کس کا چہرہ نقش تھا مہتاب میں

ڈاکٹر سعدیہ زمان، کی ڈائری میں تحریر
راشد ترین کی غزل

تنہا ذات مسلسل دکھ ہے
ہر اک بات مسلسل دکھ ہے

ماہ و سال گزر جاتے ہیں
چاندنی رات مسلسل دکھ ہے

تم اس جیت پہ خوش رہتے ہو
میری ذات مسلسل دکھ ہے

اب تم نیند میں کم آتے ہو
اب برسات مسلسل دکھ ہے

خط میں آنسو کچھ تصویریں
یہ سوغات مسلسل دکھ ہے

اب کے راشد لوٹ آؤ تم
کالی رات مسلسل دکھ ہے

شگفتہ سلیمان

مجھے یہ شعر پسند ہے

ام ــــــــ کراچی

ہم ہی سادہ مزاج تھے ورنہ
اتنی چاہت سے کون لٹتا ہے

ریحانہ علی ــــــــ کراچی

سکوت دشت میں اک بار کھل کے برسی تھیں
پھر اس کے بعد بہت بارشوں کا کال رہا
دعا یہ کس کی تھی جو ڈھال بن گئی میری
یہ کون آکے بھنور سے مجھے اچھال رہا

امبر آصف ــــــــ کراچی

خود سے الجھتا رہتا ہوں دشت فراق میں
کیسے اسفر حیات کا کاٹا ترے بغیر

سدرہ وزیر ــــــــ خوشاب

غم کے غبار میں ہیں ستارے اٹے ہوئے
خواہش کی کرچیوں میں ہیں چہرے بنے ہوئے
اب کیا تلاش امن میں نکلیں کہ ہر طرف
مدت سے فاختاؤں کے ہیں پر کٹے ہوئے

حمنہ حبیب ــــــــ عبدالحکیم

کب سے بارش کر رکھی تھی تم نے لاکھ سوالوں کی
خود پہ اک سوال ہوا تو بارش کرنا بھول گئے

نمرہ اقرار ــــــــ کراچی

نہ سوال وصل، نہ عرض غم، نہ حکایتیں نہ شکایتیں
تیرے عہد میں دل زار کے، سبھی اختیار چلے گئے

ام رومان ــــــــ عبدالحکیم

الجھا کے رکھ دیا ہے اسی کشمکش نے مجھ کو
وہ آ بسا ہے مجھ میں یا میں اس میں کھو گیا ہوں

امامہ حبیب ــــــــ عبدالحکیم

یہ دوریاں، یہ بندشیں یہ فاصلے تمام
پھر بھی مل ہی لیتے ہیں تم سے خیال میں

سدرہ چوہدری ــــــــ عبدالحکیم

آنکھیں مصروف ہو جاتی ہیں بھلا دیتے ہیں لوگ
دور بہت دور نکلتے ہیں منزلیں گنوا دیتے ہیں لوگ
دست طلب اٹھا کے مانگتے ہیں محبت خدا سے
جو ہو دسترس میں تو خود ہی گنوا دیتے ہیں لوگ

صائمہ سلیم ــــــــ گوجرہ

بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی، ہم دور سے پہچان لیتے ہیں
طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب سنسان راتوں میں
ہم ایسے میں تیری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں

عاصمہ ــــــــ کراچی

بس اک ذرا سی بات تھی لیکن تمام عمر
وہ مجھ کو جاگنے کی سزا دے کے سو گیا

تسنیم چوہدری ــــــــ اکسفورڈ ٹوکے

میں سمندر تھا مگر ویران تھا صحرا کی طرح
میرے گھر تک چل کے آتا اتنا پیاسا کون تھا

جاسمیہ مریم فرید ــــــــ کراچی

کہیں تم اپنی قسمت کا لکھا تبدیل کر لیتے
تو شاید ہم بھی اپنا راستہ تبدیل کر لیتے
تمہاری طرح جینے کا ہنر آتا تو پھر شاید
مکاں اپنا وہی رکھتے پتا تبدیل کر لیتے

یاسمین کنول ــــــــ پسرور

سوچوں کو بیدار کرو تم
لفظوں کو شاہکار کرو تم
اچھی نہیں پھولوں سے دوری
رستہ نہ پر خار کرو تم

سونیا ربانی ــــــــ ماضیاں محلہ بالا

وعدے یاد دلاؤں تو وہ کہتا ہے
گزری باتیں دہرانا تو پاگل پن ہے
میری کچی مٹی مہکنے کو ترسے
بارش میں بھی وہی پرانا پاگل پن ہے

نوشین اقبال نوشی ــــــــ گاؤں بدو مرجان

کئی بار اس کا دامن بھر دیا حسن دو عالم سے
مگر دل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی
میرے چشم تن آسان کو بصیرت مل گئی جب سے
بہت جانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

صائمہ نبیجی ــــــــ کراچی

توڑا اس نے یوں اس ادا سے تعلق محسن
کہ ساری عمر ہم اپنا قصور ڈھونڈتے رہے

ریحانہ علی احمد

کاہل لوگ

ایک بستی میں بہت سے کاہل لوگ رہتے تھے۔ ان سب نے مل کر ایک یونین بنائی اور اپنا ایک صدر منتخب کر لیا۔ ایک دن صدر صاحب بہت تیزی کے ساتھ ایک چوک سے گزرے، وہاں پر موجود یونین کا ایک ممبر انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا کہ صدر صاحب اتنی تیزی کے ساتھ جا رہے ہیں۔ اس نے فوراً اجلاس طلب کیا اور صدر صاحب سے پوچھا۔

"آپ صدر تو کاہل یونین کے ہیں اور رفتار اتنی زیادہ... کیوں نہ آپ سے یہ عہدہ واپس لے لیا جائے؟"

صدر صاحب نے کہا۔

"میں حسب معمول سست رفتاری ہی سے جا رہا تھا مگر اچانک میرے سامنے ایک گڑھا آگیا۔ میرا پاؤں غلطی سے بریک کی بجائے ایکسیلیٹر پر آگیا۔ میں نے سوچا کہ اب جبکہ پاؤں ایکسیلیٹر پر آگیا ہے تو اسے وہاں سے کون ہٹائے..."

فوزیہ... جھنگ صدر

ڈاکٹر کا مشورہ

ایک خاتون ایک فقیر کو روزانہ کھانا کھلاتے کھلاتے تنگ آگئیں تو ایک روز چڑ کر بولیں۔

"آخر تم کھانا کھانے میرے گھر ہی کیوں آجاتے ہو؟ اس گلی میں اور بھی تو اتنے سارے گھر ہیں۔ میں نے تمہیں ان میں سے کسی کے دروازے پر جا کر کھانا مانگتے نہیں دیکھا۔"

"میں ڈاکٹر کے حکم کی وجہ سے مجبور ہوں بیگم صاحبہ۔" فقیر نے سر جھکا کر کہا۔

"کیا تمہیں ڈاکٹر نے روزانہ میرے ہاں آکر کھانا کھانے کا حکم دیا ہے؟" خاتون نے حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب نے یہ بات اس طرح تو نہیں کہی تھی... لیکن ان کا مطلب یہی تھا بیگم صاحبہ۔" فقیر نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"انہوں نے کہا تھا کہ جو خوراک تمہارے معدے کو موافق آجائے، زندگی بھر وہی کھاتے رہنا۔"

نویدہ... اسلام آباد

آثار

اللہ دتہ سے اس کے پڑوسی خیر دین نے پوچھا۔

"کیا تمہارے بیٹے فتح محمد میں آگے بڑھنے، ترقی کرنے اور امیر بننے کی لگن ہے؟"

"بہت زیادہ۔" اللہ دتہ نے جواب دیا۔

"وہ ابھی میٹرک میں ہے اور اس نے ابھی سے میری طرف اس طرح دیکھنا شروع کر دیا ہے، جیسے میں اس کا دور پار کا کوئی غریب رشتے دار ہوں۔"

حلیمہ خان... کراچی

ایک سے بڑھ کر ایک

دو صاحبان ایک ہی لڑکی سے شادی کے خواہش مند تھے۔ ان میں سے ایک نوجوان تھا جبکہ دوسرے صاحب خاصی بڑی عمر کے تھے۔ ایک روز اتفاق سے دونوں ہی آگے پیچھے لڑکی کے گھر پہنچ گئے۔ اس وقت چائے وغیرہ کا دور چل رہا تھا۔ جب نوجوان نے اپنی دانست میں بڑی عمر کے صاحب کو خجل اور شرمندہ کرنے کے لیے پوچھا۔

"بائے داوے..... آپ کی عمر کیا ہوگی؟"
"مجھے صحیح طور پر تو یاد نہیں۔" وہ صاحب ذرا بھی پریشان ہوئے بغیر بولے۔
"لیکن مجھے یہ معلوم ہے کہ گدھا بیس سال کی عمر میں ساٹھ سال کے انسان سے زیادہ بوڑھا شمار ہوتا ہے۔"

شافعہ خان..... کراچی

چونکہ.....چنانچہ

چونکہ وہ نہیں آئے لب بام چنانچہ
کھمبے پہ چڑھا ہوں میں سر شام چنانچہ
چونکہ ہے مری رنج میں محبوبہ افسر
اب دیکھیے کیا ہو مرا انجام چنانچہ
چونکہ ہے دعا چوتھی کی اب شیخ کے لب پر
بقیہ کو رہے گا بہت آرام چنانچہ
چونکہ مئے افرنگ سے کرتا ہوں غرارے
ساقی مجھے دیتا نہیں اب جام چنانچہ
چونکہ مرے ہم نام ہیں محبوب کے ابا
لیتا ہی نہیں اب وہ مرا نام چنانچہ
چونکہ تمہیں نیپال تو جانا نہیں بھائی
پھر کیوں نہ چلے جاؤ تم آسام چنانچہ
چونکہ یہ مری نوکری سرکاری ہے جیدی
کیا مجھ کو ضرورت ہے کروں کام چنانچہ

(اطہر شاہ خان جیدی)

انتخاب : رخسانہ اسحاق..... کراچی

کوئی بات راز میں نہیں رکھ سکتا

نفسیات دانوں کا ایک گروپ ایک کانفرنس میں مدعو تھا۔ ان میں چار واپس جانے لگے اور اتفاق سے اکٹھے ہی لفٹ میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا۔
"لوگ ہمارے پاس ہمیشہ اپنے خوف اور احساس جرم لے کر آتے ہیں، لیکن ہم اپنے مسائل کے لیے کس کے پاس جائیں۔" دوسرے نے پہلے کی بات سے اتفاق کیا۔
پھر ایک نے کہا کہ "کیوں کہ ہم سب پیشہ ور ہیں، کیوں نہ ہم کچھ بات چیت کرلیں اور وہ باتیں شیئر کریں جو ہم کسی سے نہیں کہہ سکتے۔"
باقی نے اس بات سے اتفاق کیا اور پھر پہلے نے اعتراف کیا۔
"میرے پاس جب بھی کوئی مریض آتا ہے، میرے دل میں اسے قتل کرنے کی شدید خواہش پیدا ہوتی ہے۔"
دوسرے نفسیات دان نے کہا۔
"مجھے قیمتی اشیاء کا شوق ہے، اس کے لیے میں اپنے مریضوں سے ناجائز طریقے سے رقم اینٹھتا ہوں۔"
تیسرے کا کہنا تھا۔
"میں منشیات فروخت کرتا ہوں اور اس کے لیے اپنے مریضوں کا استعمال کرتا ہوں۔"
چوتھے نے اعتراف کیا کہ۔
"میں کچھ بھی کرلوں لیکن میں کوئی بات راز میں نہیں رکھ سکتا۔"

سائرہ..... لاہور

شوخیاں

☆ ہر فرد کسی نہ کسی کے لیے "عجیب" کے زمرے میں آتا ہے۔
☆ دوسروں کی غلطی سے سبق سیکھنا چاہیے، کیوں کہ یہ تمام غلطیاں آپ خود مختصر سی زندگی میں نہیں کرسکتے۔
☆ تین خواتین میں راز اس وقت راز رہ سکتا ہے، جب ان میں دو انتقال کرجائیں۔
☆ پریکٹس انسان کو پرفیکٹ بنادیتی ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں کوئی پرفیکٹ نہیں تو پھر پریکٹس کیوں کی جائے؟
☆ مشکل میں بھی اگر کوئی مسکرا رہا ہو تو جان لیں کہ اس کو مسئلے کا ذمے دار ٹھہرانے کے لیے کوئی اور مل گیا ہے۔

☆ جو لوگ ہنسنا بھول جاتے ہیں وہ کھنڈر ہو جایا کرتے ہیں ویران اور اجاڑ کھنڈر۔
☆ جب کسی احساس کا قتل ہو جائے تو اس کی لاش کو سینے سے لگا کر بیٹھے رہنے سے بہتر ہے کہ اسے وقت کے قبرستان میں دفنا کر گھر واپس چلے آؤ۔
☆ بڑا آدمی وہ ہے جو ہر آدمی کے اندر بڑائی کا احساس پیدا کرلے۔

حرمت روا اکرم..... ڈلوال

علم تین چیزوں میں ہوتا ہے

ابن عمرؓ نے فرمایا، علم تین چیزوں میں ہوتا ہے۔ بولتی ہوئی کتاب، جاری رہنے والی سنت، اور مجھے نہیں معلوم۔

فوزیہ ثمر بٹ..... گجرات

دل کا مدعا

رہ طلب کے تقاضوں سے آشنا ہی نہ تھے
نماز عشق وگرنہ نہ ہم قضا کرتے
وہ میرے شہر تکلم میں گر ٹھہرتا تو
ہم بھی بیاں، اس سے دل کا مدعا کرتے

فوزیہ ثمر بٹ..... گجرات

خیر خواہ

شادی کے بعد ایک جوڑا ہنی مون منانے مری گیا اور ہوٹل میں ٹھہرا۔ آدمی کو اچھا نہیں لگتا تھا کہ لوگ انہیں نیا نیا شادی شدہ سمجھیں اور عجیب سی نظروں سے دیکھیں۔ اس لیے اس نے بیرے کو بلا کر بھاری ٹپ دی اور ہدایت کی کہ وہ کسی کو نہ بتائے کہ وہ نئے شادی شدہ ہیں۔
اس کے باوجود جوڑے نے محسوس کرنا شروع کردیا کہ وہ جب بھی ہوٹل سے نکلتے ہیں، لابی میں بیٹھے ہوئے تمام لوگ اچک اچک کر ان کی طرف عجیب نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں جبکہ عملے کے لوگ کن انکھیوں سے دونوں میاں بیوی کو دیکھ کر سرگوشیوں میں باتیں کرتے ہیں۔
ان صاحب کو یقین ہو گیا کہ بیرے نے ان کی ہدایات پر عمل نہیں کیا۔ انہوں نے بیرے کو بلا کر ڈانٹا تو وہ سر کھجاتے ہوئے سادگی سے بولا۔
"صاحب جی..... قسم لے لیں، میں نے کسی سے یہ نہیں کہا کہ آپ کی نئی نئی شادی ہوئی ہے بلکہ میں نے تو شادی کا ذکر ہی گول کردیا۔ میں نے سب کو یہی بتایا کہ ان دونوں کی شادی وادی نہیں ہوئی ہے، بس یونہی تھوڑی بہت واقفیت ہے۔"

صابرہ یار محمد..... اسلام آباد

موتیوں جیسے لفظ

☆ اگر تم اسے نہ پاسکو جسے تم چاہتے ہو تو تم اسے ضرور پالینا جو تمہیں چاہتا ہے کیوں کہ چاہنے سے چاہے جانے کا احساس زیادہ خوب صورت ہوتا ہے۔
☆ آنکھوں کے ساتھ دیکھنے کی ضرورت ہے اور مسئلے کے اندر اترنے کی ضرورت ہے جب تک تم مسئلے کے اندر اتر کر نہیں دیکھو گے تم اسی طرح بے چین و بے قرار رہو گے اور تم کو سمندر نہیں ملے گا۔ (اشفاق احمد)
☆ مشکلات ہمیشہ بہترین لوگوں کے حصے میں آتی ہیں کیونکہ وہ اس کو بہترین طریقے سے انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔
☆ جب مجھے پتا چلا کہ مخمل کے گدوں اور ننگی زمین پر سونے والوں کے خواب ایک جیسے ہوتے ہیں تو مجھے اللہ کے انصاف پر یقین آگیا۔ (خلیل جبران)
☆ مسکراہٹ روح کا دروازہ کھول دیتی ہے۔ (البیرونی)
☆ جاہلوں کی صحبت سے پرہیز رکھو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں اپنے جیسا بنادیں۔ (لقمان)
☆ میرا یقین ہے کہ ایک سو سال کے اندر یورپ میں اگر کوئی مذہب ہوگا وہ تو صرف اسلام ہوگا۔ (جارج برنارڈ شا)

سدرہ وزیر۔ خوشاب

☆

حسن و صحت

ادارہ

آنکھیں

آنکھیں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی بہت بڑی نعمت ہیں اور اس سے کوئی بھی شخص انکار نہیں کر سکتا' اگر ایک شخص کے پاس دنیا بھر کی آسائش موجود ہے۔ اور وہ آنکھوں سے محروم ہے تو وہ شخص ادھورا ہے۔ آنکھوں کے بغیر زندگی مکمل نہیں' بلکہ اس کی زندگی ادھوری ہے۔ لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ کچھ لوگ اس نعمت کی ٹھیک طرح سے حفاظت نہیں کرتے اور پھر بعد میں پچھتاتے ہیں۔

کیا آپ کی آنکھیں تندرست ہیں

جب آنکھیں بند کرنے پر کالے کالے ڈورے اڑتے دکھائی دیں۔ تو جان لیجیے کہ آنکھیں تندرست ہیں اور جب مختلف قسم کے رنگین ڈورے معلوم دیں۔ تو جان لیجیے کہ آپ کی آنکھیں تندرست نہیں۔ بلکہ ضرور ان میں کوئی نہ کوئی بیماری ہے۔ آج کل خواتین میں آنکھوں کے میک اپ کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے' مگر وہ یہ نہیں جانتیں کہ ان کو تندرست رکھنے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ کئی خواتین کی آنکھوں میں جنہیں ہم گدیں' کہتے ہیں وہ آجاتی ہیں۔ جب یہ آنا شروع ہوں تو آپ جان لیں کہ آپ کی آنکھیں تندرست نہیں' اس کے علاوہ آنکھوں کا سرخ رہنا اور جب دھوپ پڑے تو یک دم اس طرح لگتا ہے کہ جیسے کوئی کرنٹ لگ گیا ہو۔ آنکھوں سے بے تحاشا پانی آنا' آنکھوں کی سوجن' آنکھوں کے آگے جالے سے آنا یہ ساری باتیں ایسی ہیں' جن سے آپ کی آنکھیں تندرست نہیں۔

آنکھوں کی خوراک اور ان کی حفاظت

آنکھوں کی صحت کو برقرار رکھنے کے لیے سب سے پہلے آپ کو چاہیے کہ آپ اپنا ہاضمہ درست رکھیں۔ اگر آپ کو قبض کی شکایت ہے تو اسے دور کیجیے۔ اگر آپ کا ہاضمہ برابر خراب رہے گا تو آنکھوں کی بینائی دن بہ دن کمزور ہوتی جائے گی۔ آج کل آپ نے دیکھا ہو گا کہ کم عمر لڑکیوں کے چشمے لگے ہوئے ہیں جبکہ پہلے زمانے میں اس چیز کا نام و نشان نہ تھا۔ اس زمانے کے بڑے بوڑھے آج کے نوجوانوں سے لاکھ درجہ بہتر ہیں۔ وہ لوگ اپنی آنکھوں کی حفاظت کرتے تھے۔ رات کو آنکھوں میں سرمہ ڈال کر سوتے تھے جنہیں آج ہم دیہاتی طریقہ کار کہتے ہیں۔ حالانکہ سرمہ آنکھوں کے لیے بہت فائدہ مند چیز ہے۔

آپ کو غذائیں زود ہضم کھانی چاہئیں۔ بادی اور تیز مسالے والی سرخ مرچ' نشہ آور چیزیں یہ سب آنکھوں کے لیے نہایت ہی نقصان دہ ہیں۔ دھوپ سے بچنا چاہیے سبزی کھانا چاہیے' چھلکے والی دالیں' پھل اور سلاد وغیرہ آنکھوں کے لیے فائدہ مند ہیں۔ اگر آپ صبح ہی صبح اٹھ کر ایک گلاس پانی پی لیں تو یہ آپ کے لیے بہت ہی بہتر ہے یہ آنکھوں کی تیزی میں اضافہ کرے گا۔ صبح آنکھوں کو ٹھنڈے پانی سے دھونا چاہیے اور پانی کے چھینٹے آہستہ آہستہ دیں۔ تیز چھینٹے مارنے سے آنکھوں کو نقصان بھی ہو سکتا ہے۔ اگر آنکھوں کو دھواں لگ گیا ہے تو اسے ٹھنڈے پانی سے دھوئیں۔ اگر جسم میں وٹامن اے کی کمی ہے تو اسے فوراً" دور کرنا چاہیے۔ وٹامن اے پپیتا' کریم' مچھلی' انڈہ' گاجر' ٹماٹر' دودھ' مکھن' ساگ' پالک وغیرہ میں پائی جاتی ہے۔ آپ ان چیزوں کا استعمال کریں' تاکہ وٹامن اے کی کمی پوری کی جاسکے۔ رات میں کتابیں پڑھنے سے بھی پرہیز کریں۔ آنکھوں کو کبھی زور' زور سے نہ ملیں آنکھ جسم کا ایک نازک عضو ہے۔ اگر آنکھ میں کچھ کیڑا وغیرہ پڑ جائے تو اسے مسلیں نہ ورنہ آنکھ میں زخم ہونے کا خطرہ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا آپ ٹھنڈے پانی سے آنکھ میں چھینٹے ماریں۔ کیڑا خود بخود نکل جائے گا۔ اگر چبھن ہو رہی ہو تو پھر شہد کی ایک دو سلائی فوراً" آنکھ میں ڈال لیں۔ تھوڑی دیر بعد ٹھنڈک پڑ جائے گی اور آنکھیں صاف و شفاف ہو جائیں گی۔

آنکھوں کا میک اپ

آنکھوں کے میک اپ سے پہلے آپ اپنی بھنویں درست کر لیں۔ اگر بہت زیادہ باریک ہوں تو آئی برو پنسل سے انہیں درست کر لیں' اب آپ آئی شیڈو لگائیں۔ دن میں ہمیشہ اسے ہلکا لگائیں۔ اگر آپ کی رنگت سرخ و سفید ہے تو براؤن کلر کا آئی شیڈو لگائیں۔ اگر سانولی رنگت ہے اور آنکھیں براؤن رنگت کی ہوں تو اس پر نیلے یا ہرے رنگ کے آئی شیڈو استعمال کریں۔ آئی پنسل استعمال کریں' یہ اگر دن میں استعمال کریں تو زیادہ بہتر رہے گا دن میں یہ خوب صورت بھی لگتا ہے۔ آئی لائنر کے بعد آپ مسکارا کا استعمال کریں۔ یہ پلکیں بنانے کے کام آتا ہے' اس کے آپ دو تین کوٹ بنائیں۔ پہلے اوپر والی پلکوں میں پھر نیچے والی پلکوں کی وجہ سے بہت خوب صورت لگتا ہے۔ مسکارا بڑی احتیاط سے پلکوں پر لگائیں۔ بعض خواتین مسکارا بڑی بے دردی سے لگاتی ہیں۔ حالانکہ اس طرح نہیں ہونا چاہیے' یہ چپٹا برش ہوتا ہے۔ جو پلکوں کو گھنا بنانے میں مدد دیتا ہے۔ اگر آپ اپنی پلکیں بھاری اور موٹی موٹی کرنا چاہتی ہیں تو آپ کو چاہیے کہ مسکارے کے کوٹ کے دوران ان پر ٹالکم پاؤڈر استعمال کریں۔ یہ پاؤڈر استعمال کرنے سے آپ کی آنکھوں میں مزید خوب صورتی کا اضافہ ہو گا۔ اسی طرح آپ آئی لائنر کا استعمال بھی احتیاط سے کریں۔ اسے استعمال کرنے سے پہلے اس بات کی تصدیق کر لیں' آپ کی آنکھیں چکنائی اور گرد و غبار سے پاک ہوں اور بالکل خشک ہوں۔ ورنہ یہ پھیل جائے گا اور آنکھیں بری اور خراب لگیں گی' اسے اپنی رنگت کے مطابق استعمال کریں' خاص کر یہ گوری رنگت پر بہت خوب صورت لگتا ہے۔ آئی لائنر سستا بالکل نہ خریدیں۔ اس لیے کہ یہ آنکھ کا مسئلہ ہوتا ہے اور آنکھوں کے لیے بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ آئی شیڈو بھی دو طرح کا آتا ہے۔ ایک کریم آئی شیڈو اور دوسرا آئی پاؤڈر' آئی شیڈو گرمیوں میں لگانا چاہیے۔ اس میں تقریباً" تین' چار کلر آتے ہیں۔

فیروزی یا پھر سنہری کلر پپوٹے پر لگائے جاتے ہیں۔ براؤن آنکھ کے اندرونی کنارے سے لے کر پپوٹے اور ہڈیوں کے درمیانی حصے پر لگائیں۔ اور سفید آئی شیڈو' آنکھ اور ابرو کے درمیان ابھری ہوئی ہڈیوں پر لگائیں' اسی طرح بعض خواتین کو اپنی پلکیں پسند نہیں آتیں۔ اگر ایسا ہے تو بازار میں مصنوعی پلکیں بھی ملتی ہیں۔ مصنوعی پلک کی پٹی پر لیس لگا کر قدرتی پلکوں پر لگا دیں اور جب سوکھ جائیں تو آنکھیں کھول لیں۔ اگر کہیں چبھن محسوس ہو تو اسے گول تنکے سے درست کر لیں۔ جب آپ اچھی طرح مطمئن ہو جائیں تو اسے چھوڑ دیں۔ ورنہ جب درست نہ ہو تو اسے درست کرتی رہیں۔ نہیں تو یہ آپ کو پریشان کریں گی

اگر آپ کی نظر کمزور ہے اور آپ کو عینک لگی ہوئی ہے تو آپ چہرے کی مناسبت سے اس کا فریم بنوائیں اور اسی لحاظ سے اس کے شیشے بھی بنوائیں۔ فریم اس قسم کا ہو کہ وہ آپ کی رنگت کے مطابق ہو۔ ورنہ سارا میک اپ خراب لگے گا۔

آنکھوں کی ورزشیں

سب سے پہلے آپ صبح ہی صبح اٹھیں اور آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی دونوں ہتھیلیوں کو آپس میں رگڑ کر گرم کر لیں' جب دیکھیں کہ یہ گرم ہو گئی ہیں تو انہیں سیاہ حلقوں پر ملیں اور حلقوں کے اوپر والے چمڑے کو کھینچیں۔ ہتھیلیوں کے رگڑنے سے ان سے خاص طرح کی بجلی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو جلد میں سرائیت کر کے بتدریج سیاہ حلقوں کو ختم کرتی ہے۔

☼ ☼

کرن کا دسترخوان

خالدہ جیلانی

بیسنی روٹی

اجزا :

بیسن	ایک کلو
گندم کا آٹا	ایک کلو
سرخ مرچ	حسبِ ذائقہ
ہرا دھنیا	حسبِ ذائقہ
ہری مرچ	تین عدد
پیاز	دو عدد (باریک کاٹ لیں)
نمک	حسبِ ذائقہ
سیاہ زیرہ	ایک چٹکی
گھی (تلنے کے لیے)	حسبِ ضرورت

ترکیب :

پیاز، ہرا دھنیا اور ہری مرچ کو باریک کاٹ لیں۔ پھر بیسن، آٹا اور تمام اشیاء ملا کر اچھی طرح سے گوندھ لیں۔ تھوڑا سا گھی بھی آٹے میں ملا دیں۔ چاہیں تو تھوڑا دودھ بھی ڈال سکتی ہیں۔ جب آٹا اچھی طرح گوندھ جائے تو اس کی باریک باریک روٹیاں بیل کر توے پر ڈالیں، پھر گھی ڈال کر اچھی طرح سے سینک لیں۔

آلو کے پراٹھے

اجزا :

آلو	ایک کلو
میدہ	آدھا کلو
آٹا	ایک کلو
گھی	آدھا کلو
ادرک	25 گرام
پیاز	تین عدد
ہرا دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
سفید زیرہ (پسا ہوا)	دو چائے کے چمچے
دھنیا (پسا ہوا)	دو چائے کے چمچے

نمک، سرخ مرچ، ہری مرچ حسبِ ذائقہ

ترکیب :

آٹے اور میدہ کو خوب اچھی طرح سے گوندھ لیں۔ گوندھتے ہوئے تھوڑا نمک بھی ڈال دیں۔ آلو ابال کر میش کرلیں۔ اب اس میں سب مسالے ملا دیں۔ پیاز، ہری مرچ، ہرا دھنیا باریک کاٹ کر ڈالیں۔ اب آٹے کے چھوٹے چھوٹے پیڑے بنا کر ان کو بیل لیں۔ پھر ایک حصے پر تھوڑے آلو ڈال دیں۔ اور دوسرے حصے کو اس کے اوپر رکھ دیں۔ اور گھی ڈال کر اچھی طرح سینک لیں۔ جب اچھی طرح سینک لیں تو اتار لیں۔ چٹنی اور اچار کے ساتھ گرم گرم سرو کریں۔

میدے کی میٹھی پوریاں

اجزا :

میدہ	ایک کلو
تیل (تلنے کے لیے)	ایک لیٹر
پستہ	آدھا پاؤ
بادام	آدھا پاؤ
ناریل	آدھا پاؤ
کھجوریں	آدھا پاؤ
مصری	ڈیڑھ پاؤ
الائچی لونگ	ایک ایک ماشے
نمک	تھوڑا سا

ترکیب :

پاؤ بھر میدہ، آدھا چھٹانک تیل میں شامل کر کے پانی سے گوندھ لیں۔ اور ٹکیاں بنا کر تل لیں۔ اس کے بعد تلی ہوئی ٹکیوں کو خوب مل کر پسا ہوا مسالا اور باریک کترا ہوا میدہ اور مصری شامل کر کے الگ رکھ لیجیے۔ باقی میدے میں ایک چٹکی نمک اور آدھا پاؤ تیل ملا کر ٹھنڈے پانی سے گوندھ لیں اور پوریاں بنا کر ایک طرف میدہ رکھے اور دوسری طرف سے فولڈ کریں۔ تیل گرم کریں اور ڈیپ فرائی کرلیں۔ سنہری ہو جائیں تو نکال کرلیں، مزے دار میدے کی میٹھی پوریاں تیار ہیں۔

بیسن کے پراٹھے

اجزا :

بیسن	ایک پیالی
گندم کا آٹا	آدھی پیالی
سفید زیرہ (پسا ہوا)	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسبِ ذائقہ
گھی (فرائی کے لیے)	حسبِ ضرورت

ترکیب :

بیسن، آٹا اور سفید زیرہ ملا کر گوندھ لیں۔ آٹا زیادہ نرم نہ ہو پیڑے بنا کر روٹیاں بیل لیں، اور سیدھے توے پر دھیمی آنچ پر گھی ڈال کر پراٹھے تیار کرلیں۔

پوٹیٹو پزا

اجزا :

آلو	آدھا کلو
نمک	ایک چائے کا چمچہ
مکھن	ایک اونس
ٹماٹو کیچپ	1/3 کپ
انڈہ	ایک عدد
پنیر	تین کپ (کش شدہ)
تازہ اجوائن کے پتے	دو عدد
ٹماٹر اور پیاز (سلائس میں کٹا ہوا)	ایک عدد
ہری پیاز	تھوڑے سے
مرغی کا قیمہ	آدھا کپ
بریڈ کرمبز	دو کھانے کے چمچے

ترکیب :

آلو ابال کر مکھن اور 1/3 کپ پنیر، انڈہ اور ایک چائے کا چمچہ نمک ملا کر مسل لیں، پیزا پلیٹ کو چکنا کر کے بریڈ کرمبز چھڑک کر یہ مرکب پھیلا دیں۔ (دس انچ قطر کی پلیٹ ہو) اور فریج میں رکھ کر سیٹ کرلیں اور اسے سخت ہونے دیں۔ اس کے بعد ٹماٹو کیچپ اس مرکب پر پھیلائیں، اور اس پر آدھا پنیر پھیلا دیں، پھر اس پر قیمہ پھیلائیں۔ اس کے بعد ٹماٹر اور پیاز کے سلائس کے ساتھ اجوائن کے پتے، ہری پیاز کے پتے ڈال دیں۔ آخر میں پنیر اس پر پھیلا کر اوون میں رکھ کر اتنی دیر تک بیک کریں کہ اس کی سطح گولڈن ہو جائے۔ اسے چلی سوس کے ساتھ سرو کریں۔

☼ ☼

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ 1979ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں یہ سوال و جواب شائع کیے جارہے ہیں۔

ذوالقرنین

نوربانو نوری .... کراچی

س : خدا کی شان ہے ہم یوں جلائے جاتے ہیں ہمارے سامنے دشمن بلائے جاتے ہیں۔ یہ تمہاری محفل کی بات ہے نین جی؟

ج : ویسے یہ تو بتائیں کہ آپ کے سامنے کس دشمن کو بلالیا ہم نے؟

عابدہ نرجس عالم .... شکارپور سندھ

س : بیوی اور ٹی وی میں کیا فرق ہے نین جی؟

ج : دونوں ہی بور کرتے ہیں (سنا ہے)

صوفیہ شوکت .... کراچی

س : میں نے سنا ہے جب سقراط اور اس کی بیوی میں جھگڑا ہوتا تھا تو آپ صلح کرواتے تھے کیا یہ سچ ہے؟

ج : جھگڑا کروانے والے بھی کبھی صلح کراتے ہیں؟

مسرت روحی .... کراچی

س : اے صدیوں کے آدمی! ذرا یہ بتاؤ کہ عورتیں درمیان میں سے مانگ کیوں نکالتی ہیں؟

ج : آج کل کے لڑکوں کی مانگ پر غور نہیں کیا آپ نے۔

شیریں نذیر .... راولپنڈی

س : بھیا! انگلی پکڑ کر ذرا راستہ بتادو میں انجان ہوں؟

ج : آنکھیں تو ہیں انگلی پکڑ کر راستہ بتانے کی کیا ضرورت۔

س : نین بھیا! یہ مرد حضرات شکی کیوں ہوتے ہیں، ذرا تصدیق تو کردیں؟

ج : غالباً" آپ اخبار غور سے نہیں پڑھتیں خواتین بھی اس میدان میں مردوں کے شانہ بشانہ چلنے کی کوشش فرمارہی ہیں۔ بے چاری خواتین۔

نسرین مظفر .... کراچی

س : ذوقی! بال سفید ہوجائیں تو خضاب لگایا جاتا ہے اگر خون سفید ہوجائے تو کیا کیا جائے؟

ج : خون سفید ہی اچھا لگتا ہے کم از کم زخم لگنے پر احساس تو نہ ہوگا کہ خون بہہ رہا ہے۔

خورشید جمال .... کراچی

س : نادان مال کو، عقل مند کمال کو ڈھونڈتا ہے تو عام آدمی کیا ڈھونڈے گا؟

ج : ان دونوں کو۔

زبیدہ رانی .... نامعلوم

س : ماں کے پیروں کے نیچے تو جنت ہوتی ہے، ساس کے قدموں کے نیچے کیا ہوتا ہے؟

ج : وہاں مجازی خدا کی جنت۔

ام ثمامہ .... جھڈو سندھ

گھر اور گھریلو مصروفیات اور ایک عدد ننھے منے سے شریر شہزادے کے ہوتے ہوئے میں رسالوں میں تبصرے اور دیگر سلسلوں میں حصہ نہیں لے پاتی بلکہ مجھے تو پڑھنے کا بھی کم وقت ملتا ہے میرے خط لکھنے کا واحد سبب "مجھ سے ملیے" میں نایاب جیلانی کا انٹرویو ہے۔

سارے انٹرویو میں داؤ شاہ کی محبت اور جدائی کو جس طرح دہرایا گیا وہ پیار دل کو چھو گیا۔ بھائی چھوٹے ہوں یا بڑے اتنے ہی پیارے اور اپنے ہوتے ہیں۔ ان کا سر پر دھرا اک ہاتھ مان بن جاتا ہے ان کا مسکراتے ہوئے گلے سے لگا کر پیشانی چومنا انمول خوشی بن جاتی ہے بھائیوں کو اگر گرم ہوا بھی چھو جائے تو بہنوں کے دل غم سے بھر جایا کرتے ہیں ان پر آئی کوئی بھی مصیبت وہ آنکھوں میں آئی نمی اور بارگاہ الٰہی میں پھیلائی دعا کی ہتھیلیوں سے ٹال دیتی ہیں۔ میرے بھی ایک ہی بڑے بھائی ہیں اللہ انہیں اور سب بھائیوں کو زندگی، صحت اور نیکی دے اور نایاب تمہارے لیے یہی لکھوں گی کہ تمہارا خلوص، محبت اور انتظار اس بات کا ثبوت ہے کہ داؤ شاہ ایک دن تم سے آن ملے گا بالکل ویسے جیسا کہ تمہارا خواب ہے۔ (آمین)

اب باقی رسالے پر بھی تبصرہ کرلیتے ہیں۔

خواجہ عابد نظامی صاحب کی حمد کے اشعار بہت خوبصورت تھے اور حضور پاکﷺ کی مداحی کے لفظ تو ہوتے ہی اچھے ہیں اداریہ میں ہمارے پیارے وطن پاکستان کی سیاسی، سماجی اور معاشی بدحالی کا ذکر کیا تو بس اتنا ہی کہوں گی کہ جیسے ہم ہیں اور جیسے ہمارے اعمال بالکل ویسے ہی ہمارے حکمران ہیں یہ فرمان الٰہی ہے اس لیے حالات کا رونا رونے سے پہلے اپنے آپ کو ٹھیک کیجیے حالات خود بخود ٹھیک ہوجائیں گے "نبیل" سے ملاقات اچھی رہی۔

"مسز شمع شمروز" کو زندگی کا نیا سفر مبارک ہو۔

بشریٰ احمد کا "ماڈرن" اچھا موضوع تھا اور اینڈ بھی اچھا تھا۔ سلویٰ علی بٹ کا "نصیب" کہانی پر ان کی گرفت مضبوط تھی مگر اینڈ کچھ تسلی بخش نہیں تھا مگر دیہات کے ماحول کی عکاسی اچھی تھی۔

رمشا خالد کا "لوگ کہتے ہیں" مختصر مگر جامع افسانہ تھا واقعی لوگ اپنا وقت بھول کر دوسروں کے لیے لوگ بن جاتے ہیں۔

رشک حبیبہ نے اچھا لکھا مگر میری نظر میں قصور بہکنے والی کا نہیں بہکانے والے کا تھا ازل سے ابد تک ہوتا آیا ہے کہ مرد اپنی تسکین کے لیے عورت کو بہکاتا ہے اور پھر اس پر ناقابل اعتبار کا لیبل لگادیتا ہے۔

"راہ گزر کی مسافتیں" کہانی کا تھیم تو اتنا اچھا نہیں تھا مگر اینڈ اچھا تھا مجھے ہمیشہ وہ اینڈ اچھا لگتا ہے جو ساری کہانی سے ہٹ کر ہو۔

سنبل کی کوشش اس بار بھی لاجواب تھی چھوٹے سے افسانے میں چھوٹی چھوٹی باتوں کو مکمل جزئیات کے ساتھ بیان کیا۔

ثمیرا گل کے "بدلتے رشتے" میں بہت اچھا پیغام دیا گیا واقعی ایسا ہی ہوتا ہے جب بات خود پر آتی ہے تو رابطے اور رشتوں کے معنی بدل جاتے ہیں۔ ویل ڈن ثمیرا، سارے افسانے اچھے تھے کیونکہ لکھنے والا تو ہمیشہ دل سے لکھتا ہے مگر پسند ناپسند قارئین کی مختلف ہوتی ہے۔

"باتیں کچھ معنی اور بے معنی سی" میں انیقہ انا کو یہی کہوں گی کہ عمر جہانگیر جیسے سراب کے انتظار میں عمر بیت جائے گی ہاں یہ دعا ہے کہ آپ کو عمر جہانگیر سے بھی کوئی بہت اچھا اور اپنا ملے جس کی محبت خواب یا لاحاصل نہ ہو۔ ظل ہما زندگی میں ایسا وقت آتا ہے کہ سب کچھ بے معنی اور ناقابل اعتبار لگنے لگتا ہے۔ مگر اللہ کا ارشاد ہے کہ اچھوں کے لیے اچھے اور بروں کے لیے برے اس لیے جب کوئی بہت اپنا مخلص اور باعمل انسان زندگی میں آئے گا تو بیتے دنوں کا کوئی شائبہ بھی دل کے کینوس پر نہیں رہے

گا مگر نئے رشتے کو قائم کرتے ہوئے ایمانداری شرط ہے۔

عالیہ ذوالقرنین نے اپنے حج اور عمرے کے روداد اپنی خامیوں اور ناکامیوں کا جس طرح برملا اظہار کیا وہ قابل تحسین ہے عالیہ جی آپ اتنا اچھا لکھتی ہیں کبھی افسانہ لکھ کر دیکھیے مجھے امید ہے کامیابی ہوگی۔

"بول کہ لب آزاد ہیں تیرے" میں اس دفعہ بھی ام طیفوریازی لے گئیں۔

"یادوں کے دریچے سے" میں نزہت جبیں بیسٹ رہیں کیونکہ مرحومہ پروین شاکر صاحبہ کی شاعری کے آگے کچھ اور اچھا نہیں لگتا اللہ انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔

"کرن کے دسترخوان" میں مسالا بھری بھنڈیوں کو بہت پیار سے دیکھا اور سمجھنے کی کوشش کی کیونکہ پاجی کو بھنڈیاں بہت پسند ہیں۔ مسکراتی کرنوں میں ساری کرنیں روشن تھیں اور مسکرا رہی تھیں آخر میں میرا افسانہ پسند کرنے کا شکریہ ابھی تو ہم طفل مکتب ہیں اور رب کی مہربانی بزرگوں کی دعاؤں اور قارئین کے پیار کے ساتھ ابھی تو بہت دور جانا ہے۔

نوشین اقبال نوشی..... گاؤں بدر مرجان

کرن، شعاع اور خواتین کا ہمارا ساتھ اب تو کافی پرانا ہوچکا ہے تقریباً" دس گیارہ سال ہوگئے پڑھتے ہوئے اور یہ ساتھ اسی طرح روز اول والے جنون اور شدت سے قائم ہے۔ دوسرے بہت سے کالمز میں لکھا مگر خط نہیں لکھ سکی کبھی، پتا نہیں کیوں؟ حالانکہ ان گزرے سالوں میں کرن شعاع، خواتین میں کتنی ہی ایسی ایسی شاہ کار کہانیاں آئیں جب دل چاہا باقاعدہ خط لکھ کر سراہا جائے مگر پھر یہ سوچ کر چپ ہو بیٹھے کہ جہاں اتنے سراہنے والے ہیں وہاں ہماری ادنی سی تعریف کیا معانی رکھے گی؟ سو تبصرے کی جانب سے خاموشی اختیار کیے رکھی۔ مگر کبھی کبھی کچھ کہانیاں ایسی ہوتی ہیں جو قاری کو مجبور کردیتی ہیں قلم اٹھانے پر سو ہم تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں۔

کرن اس دفعہ گیارہ اپریل کو خلاف توقع جلدی مل گیا۔ ٹائٹل بس سو سو تھا۔ سب سے پہلے اپنی فیورٹ رائٹر نبیلہ عزیز کا "در دل" پڑھا نبیلہ کا یہ ناول پہلی قسط سے ہی بہت زبردست جارہا ہے اور وہ بہت خوبصورتی سے کہانی کے تمام کرداروں کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے کہانی کو آگے بڑھا رہی ہیں۔ مجھے سب سے زیادہ اس میں دل آور شاہ کا کردار پسند ہے۔ ویل ڈن نبیلہ اینڈ کیپ اٹ اپ۔

اس کے بعد "عشق آتش" اور "گوشہ عافیت" کی تعریف کرنا تو گویا میرے بس میں ہی نہیں، اتنا خوبصورت اور مکمل لکھنے پر سعدیہ راجپوت اور شگفتہ بھٹی کے لیے ڈھیروں دعائیں ہیں کہ اللہ انہیں اور اچھا لکھنے کی توفیق دے اور وہ ہمارے لیے ایسے ہی شاہکار لکھتی رہیں آمین۔

"مجھ سے ملیے" بہت نائس سلسلہ ہے نایاب جیلانی سے مل کر بہت اچھا لگا پلیز اس میں "سعدیہ عزیز آفریدی" کو بھی لائیں "باتیں کچھ معنی اور بے معنی سی" زبردست تھا "یادوں کے دریچے سے" نزہت جبیں ضیا" کا انتخاب بہت اچھا لگا اور ہاں پلیز میری موسٹ فیورٹ رائٹر سعدیہ عزیز آفریدی جن کی تحریروں کی میں دیوانی ہوں۔ ان سے کہیں وہ مکمل ناولز زیادہ لکھا کریں کوئی بہت شدت سے ان کا انتظار کرتا ہے۔ میں نے ڈائجسٹ پڑھنا صرف اور صرف سعدیہ جی کی وجہ سے شروع کیا تھا پھر جوں جوں بڑھتے گئے وقت گزرتا گیا تو یہ کھلا کہ ان ڈائجسٹ میں اور بھی ایسے بہت سے گوہر نایاب ہیں جس کا نام ہی کافی ہوتا ہے کسی کہانی کی کامیابی کے لیے۔ پر سعدیہ عزیز آفریدی دل پر ایسی چھائیں کہ اب تک بھی کوئی ان کی جگہ نہیں لے سکا۔ میری ساری نیک تمنائیں سعدیہ جی آپ کے لیے۔ پلیز یہ میرا پہلا خط ہے ضرور شامل کیجیے گا۔ زندگی نے وفا کی تو پھر سے آپ کے دلوں پر دستک دینے آجائیں گے۔

راشدہ تاج..... بی ایم

حسب معمول کرن گیارہ اپریل کو ملا سرورق بہت خوبصورت تھا اور ساتھ میں "موسم گرما اور آپ" کی کرن کتاب واہ بھئی کیا بات ہے۔ سب سے پہلے پڑھتے ہیں حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبولؐ کی طرف ماہر القادری کی نعت بہت پسند آئی۔ نعت پڑھنے کے ساتھ ہی ہم نے دوڑ لگائی اور پہنچ گئے "گوشہ عافیت" میں، یہ شگفتہ بھٹی کی دلکش تحریر ہے جو بندہ کو مسحور کردیتی ہے۔ فوزیہ یاسمین اور نبیلہ عزیز کے مسلسل ناول بھی ہمیشہ کی طرح ہی زبردست رہے فوزیہ آپی پلیز خرم اور نمل کی دوستی کروادیں اور زوبیہ کی حالت پر رحم کریں اس کے علاوہ

مکمل ناول میں سعدیہ راجپوت کا ناول "عشق آتش" بھی بہت اچھا ہے اور اس میں سب سے زبردست کردار وجدان اور ملیحہ کا ہے۔ باقی سارا ڈائجسٹ ہی زبردست ہے اپریل کا کرن بھی ہمیشہ کی طرح چھا گیا ہے "قارئین کی عدالت میں" اگر آئندہ ماہ آپ کسی بھی کرکٹر کا انٹرویو لیں تو بہت ہی اچھا ہے۔ اب اجازت دیں۔

سدرہ اسلم ۔۔۔۔ کھروڑپکا

کرن آج ہی میں شام میں خود لے کر آئی ہوں۔ سوچا تھا گھر جا کے ہی سب سے پہلے پڑھوں گی لیکن بھلا ہو لائٹ کا اور اب دس بجے میں رات کے اس پہر بہت گم سم بیٹھی خط لکھ رہی ہوں اور میرے گم سم ہونے کی وجہ سعدیہ راجپوت کا ناول "عشق آتش" ہے۔

میں نے خود کو آج تک کبھی زندگی میں اتنا بے بس نہیں محسوس کیا ہے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں کیا لکھوں مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میرا دل زور زور سے رو رہا ہو اندر ہی اندر میں نے آج تک بہت سے کرداروں کو دل سے محسوس کیا ہے۔

جب ملیحہ کی موت ہوئی مجھے ایسا لگا تھا کہ یہ وقت میری موت کا ہے جیسے جیسے وجدان سیڑھیاں اتر رہا تھا ملیحہ کے ساتھ ساتھ میرا دل ڈوب رہا تھا فرق اتنا ہوا کہ ملیحہ کی موت ہو گئی اور میں ابھی تک زندہ ہوں۔ مجھ سے کچھ اور لکھا نہیں جا رہا ہے نہ کرن کی طرف ہاتھ اٹھ رہا ہے کہ پڑھ کے کچھ اور تبصرہ کر لوں۔ یہ خط میرا کرن میں پہلا خط ہے۔

سعدیہ راجپوت جی! دل کرتا ہے کہ میں آپ سے بات کر کے آپ کو بتاؤں کہ آپ نے یہ ناول لکھ کے مجھے کس حد تک تبدیل کر دیا ہے دل کہتا ہے کہ آپ کو بتاؤں کہ ملیحہ کی موت پہ میری کیا حالت تھی۔ وجدان کے پاگل ہونے پہ میرا دل ایسا لگ رہا تھا کہ ابھی پھٹ جائے گا آپ کے اس ناول کو پڑھ کے میرا دل ایک ایک لفظ پہ روتا ہے۔

"مجھ سے ملیے" میں نایاب جیلانی کو پڑھا آپ کے بھائی کا پڑھ کے میں نے دل سے دعا کی کہ وہ جلد ہی واپس آجائیں۔ آمین۔ آخر میں یہی کہوں گی کہ کرن، شعاع اور خواتین کے لیے بہت دعا کرتی ہوں آخر کو اتنے سالوں کا ساتھ ہے ہر خوشی اور غم، ہنسی اور مسکراہٹ میں ان کا ساتھ ہمیشہ میرے ساتھ رہا ہے میری زندگی میں ان تینوں رسالوں کی بہت اہم جگہ ہے۔ بہت کچھ سیکھا ہے میں نے ان سے اپنی ہر خوشی، غم ان کے ساتھ شیئر کیا ہے مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

یاسمین کنول راجپوت ۔۔۔۔ سیالکوٹ

احوال یہ ہے کافی دیر بعد "کرن" دیکھا ہمیشہ کی طرح روشن اور تروتازہ پایا۔ افسانہ نمبر" اچھا لگا۔ مدیرہ کا اداریہ موجودہ حالات کے حوالے سے زبردست رہا۔ حمد و نعت بڑی معیاری اور اچھی لگیں۔

رخ چوہدری کے والد صاحب اور ادارہ خواتین کے شبیر احمد کے انتقال کی خبر پڑھ کر دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ دونوں کی مغفرت فرمائے ان کے درجات بلند فرمائے انہیں جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے (آمین، ثم آمین)

"فاطمہ آفندی" اور "نبیل" سے ملاقات اچھی رہی آواز کی دنیا سے "افتخار خان" کا انٹرویو زبردست رہا۔ "بول کہ لب آزاد ہیں تیرے" اچھا سلسلہ ہے۔ فاخرہ گل کا ناولٹ "محبت اب شروع ہو گی" بے حد پسند آیا۔ افسانوں میں "مسافتیں" اور "نصیبو" اچھے لگے۔ مستقل سلسلے تو ہوتے ہی اچھے ہیں۔ کرن کے ہمراہ "موسم گرما اور آپ" قارئین کے لیے کرن کا گرمی کا خاص تحفہ محسوس ہو رہا ہے گرمی سے بچاؤ کی تدابیر اور گرمی کے پکوان پڑھ کر قارئین یقیناً" ان کے شکر گزار ہوں گے۔ سرورق کی شخصیت بہت اچھی لگیں۔ اس کا ہنستا مسکراتا چہرہ اور دیکھنے کا انداز متاثر کن ہے۔ باقی باتیں آئندہ، اجازت دیں۔

نازیہ یوسف ۔۔۔۔ سرگودھا

زندگی کی مصروفیت تو کبھی کم ہو نہیں سکتی۔ کبھی گھر کی مصروفیات، کبھی رشتے داروں سے ملنا ملانا بہت کم وقت نکل پاتا ہے۔ لیکن پڑھنا تو اک نشہ ہے یا جنون جو کم ہو نہیں سکتا۔ پڑھنا تو میری زندگی کا حصہ ہے میں تمام ڈائجسٹ شوق سے پڑھتی ہوں۔ میں نے چوتھی جماعت میں ڈائجسٹ پڑھنا شروع کیا تھا۔

پرانی قاری ہوں اور پہلی دفعہ خط لکھنے کی ہمت کی ہے۔ امید ہے کہ مایوس نہیں کریں گی۔ بلکہ میرا حوصلہ بڑھایا جائے گا تاکہ میں مزید خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کر سکوں۔ کرن کے تمام سلسلے ہی زبردست ہیں۔ کہانی "عشق آتش" مجھے بہت پسند ہے۔ نبیلہ عزیز کا ناول "یادیں" بہت پسند آیا تھا۔ نایاب جیلانی بھی بہت اچھا لکھتی ہیں۔ نبیلہ ابر راجہ کہاں ہیں انہیں واپس بلائیں پلیز میرا یہ پہلا خط ہے اسے ضرور شائع کیجیے گا اللہ کرن کو دن دگنی رات چوگنی ترقی دے (آمین)

انیقہ، حنیفہ، مہوش اعوان ۔۔۔۔ اٹک

ہمارا کرن سے رشتہ تو بہت پرانا ہے لیکن خط لکھنے کی جسارت پہلی بار کی ہے کرن بہت اچھا اور معیاری رسالہ ہے کرن میں شائع ہونے والی تحریریں حقیقت کے بہت قریب ہوتی ہیں جن سے ہمیں بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ سلسلے وار ناولز میں ۔۔۔ ہمیں "دردِ دل" اور "گوشہ عافیت" بہت زیادہ پسند ہیں۔ فوزیہ یاسمین سے گزارش ہے کہ پلیز کہانی کو تیزی سے آگے بڑھائیں اور زوبیہ کی خالہ کے کردار کو واضح کریں۔

آپ نے جو نیا سلسلہ "آواز کی دنیا سے" شروع کیا ہے وہ دیکھ کر دل خوشی سے جھوم اٹھا ہے پلیز یاسر قاضی جو 94.6 شالیمار ریڈیو اسٹیشن کراچی سے پروگرام فریش مارننگ کرتے ہیں ان کا انٹرویو بمعہ تصویر شائع کریں ہمارے گاؤں میں ڈاک کی سہولت موجود نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے ہمیں بہت مشکل پیش آتی ہے ہمارے خط نہ لکھنے کی وجہ بھی یہی ہے۔ ہمارے بہت مشکل اور خلوص سے لکھے ہوئے خط کو ردی کی ٹوکری کی نذر نہ کیجیے گا۔ اگر یہ خط شائع نہ ہوا تو شاید ہم کبھی نہ لکھ پائیں۔ جی تو نہیں چاہ رہا لیکن پھر بھی ہمیں اجازت لینی ہو گی۔

ثمینہ اکرم ۔۔۔۔ بہار کالونی لیاری

اپریل کا کرن "افسانہ نمبر" تھا جسے پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ خوشی اس بات کی ہوئی کہ افسانہ نمبر میں ایک سے بڑھ کر ایک افسانہ موجود تھا اور نئی افسانہ رائٹرز نے بھی کمال کی تحریریں پڑھنے کو دیں۔ یقیناً" حوصلہ افزائی اور ستائش ان کا حق بنتی ہے۔ افسانہ نگاری کوئی اتنا آسان کام نہیں، دریا کو کوزے میں بند کرنے والی بات ہے۔ جس کو ہماری باصلاحیت اور ذہین رائٹرز نے بڑی خوبی سے نبھایا ہے۔ اس میں کئی نام رمشا خالد، بشریٰ احمد، عائشہ ندیم اور رشک حبیبہ قابل ذکر ہیں۔

"ان کا کیا اعتبار" رشک حبیبہ کا افسانہ موبائل فون کے مس یوز (غلط استعمال) کو زیر موضوع بنایا گیا۔ موبائل فون ایک وبا کی طرح بڑی تیزی سے نوجوان نسل کو ناکارہ بنا رہا ہے۔ جہاں دیکھیں اور جسے دیکھیں ہر طرف نوجوان نسل اس بیماری میں مبتلا نظر آتی ہے۔ یہ ایسا گمبھیر مسئلہ ہے جو نوجوان نسل کو تباہی و بربادی کی سمت لے جا رہا ہے اور معاشرے کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہا ہے نادانی میں ایسا قدم اٹھا کر بھلے ہم اپنی محبت پا لیں مگر پھر بھی کبھی اپنی نسوانیت، وقار اور اعتبار کھو دیتے ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے مجھے سب سے زیادہ رشک حبیبہ کا ہی افسانہ پسند آیا۔

دوسرے نمبر پر افسانہ "ماڈرن" بشریٰ احمد کا رہا ٹھوکر لگنے کے بعد بھی عقل نہ پکڑنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ سلویٰ علی بٹ کا افسانہ "نصیبو" جس میں معاشرے میں پھیلی گئی برائیوں اور بے حیائی کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی۔ یہ برائیاں اب اتنی عام ہو گئی ہیں کہ برائی برائی بھی نہیں لگتی۔ رمشا خالد کا افسانہ "لوگ کہتے ہیں" رمشا خالد نے اس افسانے میں غیبت اور تہمت کو اپنا موضوع بنا لیا غیبت کرنے کو اسلام میں اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانے سے تشبیہ دی ہے۔ مگر ہم کسی کی غیبت کرتے ہوئے ایک لمحے کو بھی نہیں سوچتے۔ کہ ہم اپنی نیکیاں کسی اور کے کھاتے میں ڈال رہے ہیں۔

اس کے علاوہ "سب ٹھاٹھ"، "مٹی سنگ خواب"، "مسافتیں" اور "بدلتے رشتے" بھی لاجواب لگے۔ "فاطمہ آفندی" سے ملاقات دلچسپ رہی۔ "دو کا پہاڑا" میں نبیل سے ملاقات نے بور کر دیا۔ نیا سلسلہ "مجھ سے ملیے" بہت اچھا لگا۔ یہ رائٹرز سے تعارف اور جان پہچان بڑھانے میں معاون ثابت ہو گا۔ نایاب جیلانی ان رائٹرز میں سے ہیں جو آ گئیں اور چھا گئیں۔ بہت کم مدت میں نایاب نے اس فیلڈ میں اپنا ایک اہم مقام، پہچان اور لوگوں کے دلوں میں جگہ بنائی ہے۔ نایاب جیلانی کی اپنے بھائی داؤد شاہ سے محبت سے بہت متاثر ہوئے اللہ کرے کہ وہ جلد آکر اپنے گھر والوں سے ملے (آمین)

"گوشہ عافیت" بھی بہت اچھا جا رہا ہے۔ اب دل چاہتا ہے کہ اسے پڑھتے ہی رہیں اس کا کبھی اختتام نہ ہو۔ اس کہانی میں عشق مجازی سے عشق حقیقی کا سفر کہانی کو بہت

خوبصورتی بخش گیا۔ اور وجیہہ کو بھی اللہ پاک نے راہ ہدایت پر ڈال دیا اپنے گھر کا دیدار نصیب کروایا۔ اور اب عصمہ کی بھی دلی آرزو پوری ہونے جارہی ہے مگر وہ جو عصمہ کو محسوس ہوتا ہے کہ "میرے دونوں پاؤں نہیں ہیں۔" تو اس بات سے شگفتہ جی نے کس بات کی طرف اشارہ دیا ہے۔ میں اس سے کنفیوژن کا شکار ہو گئی پلیز وضاحت ضرور کریں۔

"عشق آتش" کی چھٹی قسط پڑھی (بے اختیار دل سے دعا نکلی کہ کاش اس کی اقساط 60 قسطوں پر محیط ہوں۔) ہر ماہ قسط مناسب رفتار سے فاصلہ طے کرتی جارہی ہے اس ناول کی رفتار نہ بہت سست ہے اور نہ ہی بہت تیز' نہایت سلیس اور شائستہ زبان استعمال کی گئی ہے۔ الفاظ بہت سادہ اور زبان عام فہم' آج کل اس ناول میں ماضی کی کہانی بیان کی جارہی ہے اور اس قدر عمدگی سے کہ ہم جیسوں کو ذرا بھی دماغ خرچ نہیں کرنا پڑا۔ مریم نے ضد اور محبت میں آخر کار نور الہدیٰ کو حاصل تو کر لیا مگر وہ بیویوں والی جیلسی سے آزاد نہ ہو سکی۔ اور ملیحہ کو اپنے اعصاب پر سوار کر لیا۔ اس طرح خود اپنے ہی ہاتھوں اپنا گھر یلو سکون تباہ کر رہی ہے۔ وجدان مصطفیٰ کو جو ملیحہ جلتی بھڑکتی … مسکراتی نظر آتی ہے وہ واقعی میں حقیقت … اس کا الوژن ہے۔ تنزیلہ ریاض … قدر وضاحت اور مکمل معلومات۔ یہ ایک اچھے رائٹر کی اضافی خوبی ہے کہ جب وہ لکھے تو اپنے موضوع پر مکمل معلومات اور ریسرچ کرلے۔

عشق میں قربانی دے کر ملیحہ صابرین میں ہو گئی جبکہ وجدان راندہ درگاہ ہو گیا۔ مگر پھر اللہ نے اس پر اپنا کرم کیا اور ایک طویل مدت کے بعد اپنے گھر والوں سے ملن ہوا اور اس کے گھر والوں کا مہربان مشفقانہ رویہ اسے زندگی کی طرف لوٹنے پر مجبور کر گیا۔ انہوں نے اس سے ایک بھی سوال کیے بغیر اسے اپنے گلے سے لگالیا۔ یقین کریں۔ یہ ناول جب بھی میں پڑھتی ہوں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتی ہوں اور جب میں نے ناول ختم کیا تو میرا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا اس کی ہر قسط پڑھ کر مجھے رونا ضرور آتا ہے۔ ویل ڈن سعدیہ راجپوت جی۔

مہوش زرین اور خسانہ زرین۔۔۔ گاؤں ڈھوک کوا

ہم یہ دعوا تو نہیں کریں گے کہ ہم کرن کافی عرصے سے پڑھتے ہیں مگر یہ بھی جھوٹ نہیں کہ ہم کرن بہت ہی شوق سے پڑھتے اور تقریباً "ایک سال سے پڑھ رہے ہیں اور یہ شوق پڑھنے کے ساتھ ہی بڑھتا جارہا ہے۔ کرن بہت بہت اچھا اور معیاری رسالہ ہے اور اب تو یہ رسالہ ہمیں اپنے گھر کے فرد کی طرح لگتا ہے جب تک یہ ہمیں مل نہ جائے ہم بے چین رہتے ہیں اور جب کرن آجائے تو پھر مت پوچھیے کیا ہوتا ہے ہم دو بہنیں اور ہماری پیاری سی امی جان ہم تینوں کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ میں پہلے پڑھ لوں اور اسی کوشش میں ہم رسالے کو ایک دوسرے سے چھپاتے پھرتے ہیں خیر بات کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی تو بات ہو … سلسلہ … اور میری گزارش … FM.101 … رضوان … [illegible] … کرتی ہیں ہم نے کرن میں لکھنے کی جسارت پہلی بار کی ہے … کے اب اجازت دیں۔

ثانیہ جبیں ثانی۔۔۔۔نامعلوم

کرن حسب معمول انیس تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل پہ سادہ سی ماڈل اچھی لگی۔ انٹرویو سب اچھے تھے خاص کر "افتخار خان" کا انٹرویو "مجھ سے ملیے" میں نایاب جیلانی کا نام دیکھ کے جہاں خوشی ہوئی۔ وہیں ان کے بھائی کے بارے میں پڑھ کے دکھ ہوا۔ دل تو پہلے بھی اداس تھا۔ لیکن نایاب جیلانی کی باتیں پڑھ کے اور اداس ہو گیا۔ افسانے سب اچھے تھے۔ "نصیبو" کی کچھ سمجھ نہ آئی۔ فاخرہ گل کا ناولٹ حقیقت سے قریب لگا۔

"گوشہ عافیت" اور "دست کوزہ گر" دونوں ایک جگہ پہ ٹھہر گئے ہیں۔ نہ آگے اور نہ پیچھے "دردل" بھی بہت اچھا ہے۔ اس میں مجھ دل اور شاہ اور آذر کے کردار بہت پسند ہیں۔ میرا سب سے فیورٹ ناول "عشق آتش" ہے ویل ڈن! سعدیہ جی! فرحین اظفر کے ناول کا موضوع پرانا تھا

لیکن اچھے انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ ماہا ملک اور سعدیہ عزیز آفریدی کہاں غائب ہیں۔ باقی سب سلسلے اچھے تھے بھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ اگر یہ کرن اور شعاع نہ ہوتے تو شاید نہیں بلکہ یقیناً "میں پاگل ہو جاتی۔ خود غرضی یہاں کے انسانوں میں کوٹ کوٹ کے بھری ہے۔ ہر کسی کو اپنی پڑی ہے۔ لیکن خیر! اللہ تو دیکھ رہا ہے۔ میں سوچتی بہت ہوں لیکن اپنی ایک سوچ کو بھی عملی جامہ نہ پہنا سکی۔ میں وہ باتیں جو کسی سے بھی نہیں کہہ سکی۔ اسے افسانوں کے ذریعے سب کو بتانا چاہتی ہوں تاکہ میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو سکے آپی! میں افسانہ بھیجنا چاہ رہی ہوں اگر شائع کرنے کے قابل ہوا تو شائع کر دیجیے۔

ایک اور بات سوات … FM.96 … داؤد خان … آخر میں تمام … گھر والوں کو … [illegible]

آپی میں کرن … مستقل قاری ہوں لیکن پہلی دفعہ … [illegible]

اس میں مجھے کمل اور خرم کا کردار سب سے زیادہ پسند ہے براہ مہربانی ان دونوں کا اینڈ اچھا کیجیے گا۔ "دردل" نبیلہ عزیز آپ کے ناول مجھے پہلے ہی بہت پسند ہیں۔ اب تو آپ کا نام دیکھ کر مجھے پتا چل جاتا ہے کہ ناول زبردست ہو گا۔ پلیز ناول میں علیزہ کے ہیرو کو ذرا واضح کریں۔ مکمل ناولز میں "عشق آتش" ابھی پڑھا نہیں کوشش کروں گی کہ آخری قسط کے بعد مکمل تبصرہ کروں۔ ویسے اوور آل ناول زبردست ہے۔ کیونکہ میرے خیال میں یہ سعدیہ کی پہلی کاوش ہے۔

"گوشہ عافیت" میں شگفتہ بھٹی آپ کا انداز بیاں اور الفاظ کے چناؤ کیا کہنے۔ پہلی دو تین اقساط میں وہ منظر نگاری اور جزئیات نگاری تھی کہ میں تو پوری طرح کھو گئی تھی۔

"کرن کتاب" کے تو کیا کہنے کرن کے ساتھ الگ سے ایک کتاب والا سلسلہ اس کی جان ہے۔ حمد و نعت دونوں بہت اچھی تھیں۔ انٹرویو میں "فاطمہ آفندی" دو کا پیارا تھا میں "نبیل" اور آواز کی دنیا میں "افتخار خان" سے مل کر بہت اچھا لگا۔ آپی آپ FM.100 اسلام آباد کے عتیق خان کا انٹرویو بھی لیں افسانے ابھی پڑھنے ہیں۔ اور ہاں ایک بات اور "مجھ سے ملیے" والا سلسلہ پہلی انٹری میں ہی ٹھاہ کر کے چھا گیا نایاب میں یہ پڑھ کر کہ آپ 1988 کی پیدائش اور ایک بچی کی ماں ہیں بہت حیران ہوئی۔ اللہ نایاب کے بھائی کی مشکل آسان کرے (آمین) ویسے آپ کا سارا انٹرویو زبردست تھا۔ "باتیں کچھ معنی بے معنی" میں انیقہ انا کا انداز بیاں اور عمر کے بارے میں اس کے تاثرات پسند آئے۔

باقی سب سلسلے اے ون تھے۔

حرمت ردا اکرم۔۔۔۔ڈلوال

اپریل کی بارہویں سہ پہر کو کرن نے رخ روشن دکھایا تو دل گارڈن گارڈن ہو گیا۔ سرورق اچھا تھا۔ خزاں اور بہار کا امتزاج … خوبصورت سا سرورق اچھا لگا کافی خاص طور … میں سجا ہر سلسلہ۔ اشتہارات کو پلٹتے … کے تو افسانہ نمبر تھا۔ اس لیے اللہ کا پاک نام لے کر رسالے کو پڑھنا بقول امی کے چاٹنا شروع کر دیا۔

سب سے پہلے "عشق آتش" پڑھا۔ اس دفعہ بھی بہت زبردست لکھا تھا سعدیہ راجپوت نے یہ سمجھ نہیں آئی کہ مولوی عبدالخالق کا کردار تو زبردست ہے ہی مگر وجدان کا کردار زبردست تھا یا عبداللہ کا کیونکہ ایک ہی بندے نے زبردست طریقے سے اپنے کردار کے دونوں پہلوؤں کو نبھایا۔

اس کے بعد "دردل" پڑھا۔ بس پلک جھپکتے ختم ہو گیا۔ مگر چپ کر گئے کہ اب کیا کہیں فرحین اظفر کا "او بستی یون پاگل" پڑھا بس سو سو تھا۔ بہت برا اور نہ ہی بہت زیادہ اچھا۔ زینی تو بالکل مٹی کا مادھو ہی ثابت ہوئی۔ عاصم کی فیملی نے کہا "نکاح کرلو" اس نے کہا ٹھیک ہے زینی صاحبہ

اپریل کے شمارے میں اداکارہ "فاطمہ آفندی" کا انٹرویو شائع ہوا اس میں ان کا نام فاطمہ آفندی کے بجائے فاطمہ نیازی شائع ہو گیا اس سہو پر فاطمہ آفندی کی جو دل آزاری ہوئی ہے ادارہ کرن اس کے لیے معذرت خواہ ہے۔

کو ارحم نے کہا "تمہیں عزت نہیں دیتے" طلاق لے لو،' اس نے کہا ٹھیک ہے۔ اگر زینی اپنے قدموں پر جم کران کا مقابلہ کرتی تو میں نہیں سمجھتی کہ عاصم کی فیملی اسے طلاق دلوا سکتی تھی۔ جیسی بھی تھیں کم از کم اس کی ساس تو ساتھ تھیں' جبکہ دادی اور عاصم کے والد کی بھی تھوڑی بہت سپورٹ اسے تھی اسے کم از کم ڈٹ کر اپنے حق کے لیے جنگ لڑنی چاہیے تھی۔ ایک دم سے ہمت ہار جانا مجھے تو بالکل اچھا نہیں لگا۔

"ماڈرن" افسانہ پڑھا۔ اچھا تھا کہیں تھوڑا افسوس بھی ہوا اور کہیں تھوڑی سی ہنسی بھی آئی افسوس زرینہ بیچاری کی بے بسی پہ اور ہنسی اس کے اتنے بڑے حادثے کے بعد بھی اپنے ماڈرن پن کی ہی پڑی تھی۔

نایاب جی کا اپنے بھائی سے اتنی محبت بہت اچھا لگا۔ خاص طور پر سوال نمبر 37 کا جواب تو رلا گیا مجھے کیونکہ ہر وہ بہن جو بھائی کے لیے دکھی ہو مجھے اس کا دکھ' دکھی کر دیتا ہے وہ جواب تو بار بار پڑھا اور بار بار روئی اگر پورے شمارے کو ایک طرف اور نایاب جی کے کچھ جوابات کا موازنہ کیا جائے تو بلاشبہ میری نظر میں ان کے جوابات بھاری ہوں گے (یہ میرا اپنا نقطہ نظر ہے آپ لوگوں کا متفق ہونا ضروری نہیں)

"شمع فردوس اور شمروز کا نیا سفر" میرا گل کے قلم سے پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ "فاطمہ آفندی" اور "افتخار خان" سے ملاقات بھی کافی بہتر رہی۔

"دو کے پہاڑے" میں اس دفعہ "نبیل" موجود تھے۔ ان سے بھی بات چیت بھی کافی بہتر رہی۔ "نصیبو" کی بس کچھ سمجھ آئی اور کچھ نہیں۔ اس لیے بھرپور تبصرہ نہیں کرتی۔ "محبت اب شروع ہوگی" فاخرہ گل کی اچھی کاوش ہیں۔ الفاظ کا چناؤ بھی بہت اچھا تھا۔ اور ان کا ذخیرہ الفاظ بھی۔

"لوگ کہتے ہیں" رمشا خالد کا افسانہ مجھے کافی دیر تک چپ رہنے اور سوچنے پر مجبور کر گیا۔ واقعی لوگ تو ہمیشہ سے کہتے آئے ہیں ہم کب تک لوگوں کی زبان بولیں گے۔

"بدلتے رشتے" بھی ایک خوبصورت کوشش تھی' میرا گل کی۔

"گوشہ عافیت" تو عرصہ ہوا پڑھا ہی نہیں۔ اس لیے تبصرہ کیا کروں اب آتے ہیں مستقل سلسلوں کی طرف۔

"باتیں کچھ معنی اور بے معنی سی" عنوان ہی اتنا زبردست تھا کہ کیا کہوں اب میں پھر اس کو بھی پورا پڑھا۔ مگر کوئی فیصلہ نہ کر پائی کہ کس کو زیادہ اچھا کہوں سب کا ہی اپنی جگہ اچھا تھا مگر انیقہ سے کہنا تھا کہ اتنی خود پسندی بھی اچھی نہیں ہوتی۔ آپ کے ہر سروے میں صرف آپ کی اپنی ذات سے محبت ہی لکھی ہے اور جن سے آپ بقول آپ کے عشق کرتی ہیں وہ تو خود پسندی کو اچھا نہیں سمجھتی ہیں (جہاں تک عمیرہ کی تحریریں مجھے سمجھ آئی ہیں۔)

"بول کہ لب آزاد ہیں تیرے" بھی اچھا تھا۔ ام طیفور سے لے کر عقیلہ عروج تک سبھی نے لکھنے کا حق ادا کر دیا۔ "کرن کرن خوشبو" بھی تمام ہی اچھا تھا۔ "یادوں کے دریچے" سے میں نور الایمان [illegible] اور [illegible] عبر کا انتخاب پسند آیا مجھے یہ شعر پسند ہے [illegible] میں [illegible] کا انتخاب اچھا تھا۔

[illegible]

کرن کتاب بھی اچھی تھی اس دفعہ۔ شکر ہے تھوڑا [illegible] ہر ماہ [illegible]

وردہ نازـــــ ایبٹ آباد ہزارہ

سب سے پہلے میں ایک گلہ بجا لاؤں گی کہ آپ نے میرا ایک خط شائع نہیں کیا جو میں نے آپ کو گزشتہ ماہ ارسال کیا تھا۔

میں نے اپنی سب دوست واحباب کو مطلع کیا ہوا تھا کہ میرا خط شائع ہوگا لیکن آپ کی وجہ سے مجھے بہت سی ناگوار باتیں سمیٹنی پڑی ہیں سب خطوط میں آپ کی تعریف ہی ہوتی ہے تو اگر میرا تنقید بھرا خط شائع ہو جاتا تو اس میں کیا قباحت تھی۔

نایاب جیلانی صاحبہ آپ کے بارے میں جان کے اچھا بھی لگا اور آپ کے بھائی کی اسیری کے بارے میں سن کے دکھ ہوا۔ اللہ آپ کے بھائی کو جلد از جلد رہائی دے۔